

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222993**

UNIVERSAL  
LIBRARY





**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. 1915d3.4      Accession No. 21200

Author 7-1915d3.4

Title 7-1915d3.4

This book should be returned on or before the date last marked below.

---







# محکمہ

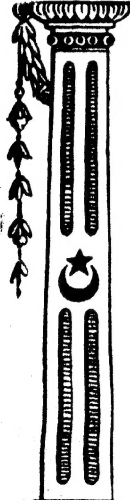
جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۱

بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ ع

جلد ۱۳

مکتبہ





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جبر جیوی ڈاکٹر عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

---

جلد ۴۴ بابۃ ماہ جنوری ۱۹۳۷ء نمبر

---

## فہرست مضامین

- ۱۔ ہزار ڈشا ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی استاد جامعہ ۲
- ۲۔ افلاس ہند ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی استاذ جامعہ عثمانیہ ۱۱
- ۳۔ تعلیم، اکی ماہیت اور اسکا اثر ڈاکٹر یوسف حسین خاں بی۔ اے (جامعہ) ڈی۔ لٹ ۲۵
- ۴۔ دنیا کیلئے کیا ہو جائیگی؟ طالب علم (پیرس) ۳۸
- ۵۔ غزلیات از حضرت اصغر و جگر ۵۰-۴۹
- ۶۔ کنیڈا سے سبق ڈاکٹر محمد نسیم صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (لندن) بیرسٹر ۵۱
- ۷۔ ریل کی شرک اور قبرستان ترجمہ از اسرار ایل احمد خاں صاحب مدرسین ل سکول رنگون ملحقہ جامعہ ۵۷
- ۸۔ سفذرات . . . . . ۷۵

## برنارڈشا

جارج برنارڈشا آئرستان کے دارالسلطنت ڈبلن میں شائع ہوا۔ اسکا خاندان آئری نسل سے تھا۔ مگر مذہباً پروٹسٹنٹ کلیسا کے پیروین<sup>(۱)</sup> فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ صوبہ آسٹر کے پروٹسٹنٹ باشندے ابتدا سے آئرستان میں انگریزی حکومت کے حامی اور مددگار تھے۔ برنارڈشا کا باپ جارج کارشا آئرستان کی سول سروس کا رکن رہ چکا تھا اور پٹن لینے کے بعد تجارت کرتا تھا۔ ہندوستانی عہدیداران سول سروس کی طرح آئرستان کے سول سروس والے بھی غریزوں میں بیگانہ ہو کر رہتے تھے۔ انہیں اپنے آبائی تمدن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ ہر بات میں اپنے حکمرانوں کی تقلید کرتے تھے اور اتحاد مذہب کے سبب سے بھارنہ تعلق ان غیر ملکیوں سے اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ مگر پھر ملی نسل کے اثر سے ان کی طبیعت میں آئری خصوصیات موجود تھیں۔ برنارڈشا کی سیرت کے سمجھنے کے لئے ان دونوں عناصر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آئرستان والوں کی سیرت تخیل، طرافت و صاحب خیال، تعقید، واقعہ بینی، سادگی، عفت اس کے نمبر میں تھی، پیورٹین مذہب کی عقلیت پسندی، سادگی، سختی، خشکی، جگجگوتی ماحول اور تربیت کے اثر سے پیدا ہوئی۔ شاکی ابتدائی عمر کا تصور کیجئے تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک عین طبیعت پاک دل نگہری نظر رکھنے والا بچہ ایک مصنوعی ماحول میں تعلیم پا رہا ہے جو وطنیت کے جذبات سے خالی قومی روایات سے بیگانہ، مہنی کے اثرات سے آزاد ہے۔ اُس کے سامنے زندگی کا ایک بلند اور مجرب تصور ہے۔ لیکن اُس

(۱) Puritan - عیسائیوں کے اس فرقے کو کہتے ہیں جو خدا کی عقلی پرورش کا قائل ہے۔ مذہب میں جدات کا عنصر داخل نہیں کرنا چاہتا۔ اور اخلاقی اصول میں سید سخت ہو۔

کی واقعی حالت سے اس کی زیر نگینوں سے، اسکی پیچیدگیوں سے واقف ہونے کا اُسے موقع نہیں ملتا۔ اس کی نظریں انسانیت کا ایک اعلیٰ اور یک رنگ تخیل ہے۔ مگر جیسے جاگتے انسانوں کی کنگش آرزو، انکے سعی و عمل کے نشیب و فراز، انکے جذبات و احساسات کے مد و جز کو دیکھنے اور سمجھنے سے وہ معذور ہے۔ وہ آنکھ کھول کر دیکھتا ہے تو اپنے ہم مذہبوں کے حلقے کو دیکھتا ہے۔ جو قومی زندگی کے بحر ذخار کے کنارے ایک چٹان کی طرح کھڑا ہے جسے نہر تک نہیں کر کوئی ہو ایسے موجوں کو حرکت دیتی ہیں۔ کون سے طوفان سمندر میں تلاطم برپا کرتے ہیں۔

ایسی بے تعلقی اور نا آشنا فی کے دامن میں پرورش پا کر انسان یا تو مردم بیزار راہب یا عالم بنتا ہے یا شدید انقلاب پسند۔ شاکا سرشت میں بنی نوع انسان کی محبت تھی اور اس کی تربیت پیورٹین مذہب پر ہوئی تھی۔ اس لئے وہ رہبانیت سے محفوظ رہا۔ اور انقلاب پسندی کی طرف جبک گیا۔ علمی ذوق اسے ابتدا سے تھا اور خیریت تک ہی۔ لیکن اخلاقی جوش اور علمی دلوں نے اسے پیشہ ورسنس اس نہ بننے دیا۔ منطقی تحلیل اور غور و فکر کی قوت کو اس نے علمی تحقیق میں صرف کرنے کے بجائے علمی زندگی کی تنقید اور اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔

تنقید کا شوق اور اصلاح کا جوش برنارڈ شا کے دل میں اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا جب وہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان اور اسکاتستان میں پیورٹین مذہب پر زوال آچکا تھا۔ اور آئرستان میں بھی اسکا انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ لوگ اس کے آہنی اصولوں کے زبان سے قائل تھے۔ مگر عمل محض برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ باطنی خلوص اور عقیدت کے گھٹنے سے ظاہری تعصب اور تشدد بڑھ گیا تھا۔ پادریوں میں نفسانیت اور تنگ نظری کا زور تھا۔ اور واپنا وقت آپس کے مناظروں میں ضائع کرتے تھے۔ دعوے شاپنہ گھر پر یہ دیکھتا تھا کہ اسکا باپ پیورٹین عقیدے کے مطابق شراب نوشی کا مخالف ہے مگر چپ کر شراب پیتا ہے۔ باہر اسے یہ نظر آتا تھا کہ دونیات کے فردعی مسائل پر دروازہ کا بٹنیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن زندگی کے اہم مسائل پر کوئی غور نہیں کرتا۔ شا کے گہرے مذہبی احساس اور سچے اخلاقی جوش کو اس کھوٹی مذہبیت سے اس قدر

وحشت ہوئی کہ وہ سرے سے مذہب ہی کا مخالف ہو گیا۔ نوعمری کی خامکاری اکثر لوگوں کو ایسے شبہات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مگر وہ عموماً انہیں چھپاتے ہیں۔ شاکے دلوے اور اسکی ہمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے مذہب کی مخالفت اور الحاد کی تائید میں ایک مضمون لکھا اور اسے اخبار میں چھپوا بھی دیا۔ مذہب نے خاندان کی مخالفت کا اثر تھا یا اور کوئی وجہ تھی کہ شاید ایک ہی مضمون لکھ کر خاموش ہو گیا۔ مگر اس کے دل میں لاندہی ایک مدت تک کے لئے راسخ ہو گئی۔ برسوں کے بعد ذاتی روحانی واردات کی صیتل نے اس کے آئینہ قلب سے اس زنگ کو دور کیا۔

اسکول کی تعلیم سے فانی ہونے کے بعد بڑا رٹو شاکو کسی تجارتی کارخانے میں معقولاً مدنی کی جگہ مل گئی۔ اور باوجودیکہ یہاں اُس کے علمی اور ادبی ذوق کے پورا ملاسنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ انتہائی ضبط نفس سے کام لیکر چار سال تک اپنے فرائض ایمانداری اور محنت سے انجام دیتا رہا لیکن اسے خدا نے ایسا دل دیا تھا جو اپنے بنی نوع کی مصیبتوں پر کڑھتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ زندگی کے طوفان خیز سمندر میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا ڈوبنے والوں کے ہاتھ پیر مارنے کا تماشا دیکھا کرتا۔ اس نے یک یک اپنے کاروبار کو چھوڑ دیا۔ اور چین کی زندگی سے منہ موڑ کر ڈبلن سے لندن چلا آیا۔ اور انقلابی تحریکوں میں شریک ہو کر ہر قسم کی سختیاں جھیلنے لگا۔

یہاں وہ ابتدا میں راجیوں اور دہریوں کے ساتھ ریاست اور کلیسا سے جنگ کرتا رہا مگر آخر میں اشتراکیوں کا ہم خیال اور شریک کار ہو گیا۔ شاکے اہم میں تنقید اور طنز کی جو بے پناہ تلوار تھی۔ اُس سے صرف اس کے مخالفین ہی نہیں بلکہ اس کے موافقین بھی بے پناہ مانگتے تھے۔ اُس کی دینداری اور انصاف پسندی کا یہ حال تھا کہ جس جماعت میں وہ شریک ہوتا تھا۔ اس کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا اپنا سب سے پہلا فرض سمجھتا تھا۔ وہ سیاسی اور سماجی انقلاب چاہتا تھا۔ لیکن انقلاب پسندوں کی جذبات پرستی اور بے اصولی پرستی سے مکمل عینیت کرتا تھا۔ وہ آزادی نسوان کا حامی تھا۔ لیکن اس بات پر شدت سے اعتراض کرتا تھا کہ عورتیں ایک طرف تو دل و دماغ میں مردوں کی برابری کا دعوے کریں اور دوسری طرف صنفِ نازک بن کر خاص رعایتوں کی طالب ہوں۔ وہ مردہ مذہب کا مخالف تھا۔ اور اس پر طعن کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ

ان لوگوں کی خبر لیتا تھا جنہوں نے سائنس کو مذہب کی حیثیت دے رکھی تھی غرض کچھ تو اس کی بیگانہ وار تربیت کا اثر تھا، اور کچھ اس کی نا آشنا طبیعت کا فیض کہ وہ کسی اصول کسی تحریک کو آنکھ بند کر کے والہانہ جوش عقیدت کے ساتھ قبول نہیں کرتا تھا۔ اس کے بمعنی ہرگز نہیں کہ وہ اپنے خیالات میں راسخ اور اپنی دھن کا پکا نہ تھا۔ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کی ہر کوشش میں وہ پوری سرگرمی سے حصہ لیتا تھا۔ لیکن دو باتوں کے سبب سے اس کے رفیق اس کے شاکی رہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ آنکھوں کا سون کا بہت سختی سے احتساب کرتا تھا دوسرے یہ کہ وہ ہر اصلاحی اور انقلابی تحریک کو محض عقل اور انصاف پر مبنی رکھنا چاہتا تھا۔ اور جذبات کے ہیجان کو جو اخلاقی احساس کا جزو اعظم ہے کمزوری کی دلیل سمجھ کر دبا دیتا تھا۔ خود اس کا دل ہمدردی اور محبت سے معمور تھا لیکن وہ انہیں منطقیانہ خشکی اور ناقدانہ طنز کے پرفے میں چھپاتا تھا۔ اس کا ورور و آشنا دل انسان تو انسان حیوانوں تک سے الفت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ ابتدا سے گوشت خواری کا مخالف تھا اور سوائے سبزی ترکاری کے کچھ نہیں کھاتا تھا۔ لیکن اس کا سبب وہ ظاہر کرتا تھا کہ گوشت کھانا اقتصادِ فطرت کے خلاف ہے۔

بزار و شاکی جدوجہد کا مرکز فیضیں سوسائٹی تھی جسے انگلستان کے چند قابل ملاحظہ دورانیہ ارباب فکر نے اشتراکیت کی تبلیغ اور ملک و قوم کی تدریجی اصلاح کی غرض سے قائم کیا تھا۔ اس کے ارکان وہ لوگ تھے جن میں سے بعض آج لیبر حکومت میں وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ شا اس حد تک ان لوگوں کا ہم خیال ہے کہ وہ ریاست کو حکومت و سیاست، اقتصاد و تجارت میں مختار رکھنا ناچاہتا ہے، لیکن مذہب و اخلاق علم و فن آرٹ و شعری غرض سارے روحانی اور ذہنی امور میں وہ انفرادی آزادی کا قائل ہے۔ طرز حکومت کے معاملے میں بھی اُسے اشتراکیوں کے تمام اصول سے اختلاف ہے وہ جمہوریت کا حامی نہیں ہے بلکہ اُس کا یہ عقیدہ ہے کہ ملک کا نظم و نسق چند دیانت دار اور روشن خیال افراد کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جو اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھ کر حکومت کریں لیکن ان اختلافات کے باوجود وہ عقائد کے اعتبار سے



سب سے زیادہ قریب انہیں اشتراکیوں کو پاتا تھا اس لئے وہ انکی جامعیت کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ وہ ان لوگوں کے لئے پمفلٹ لکھا کرتا تھا اور انکے مباحثوں میں شریک ہو کر ان کے اچھے اصولوں کی تائید اور ان کی کمزوریوں پر سختی سے تنقید کیا کرتا تھا۔

یہ شاعری کے لئے سخت دشواریوں کا زمانہ تھا۔ پورے پتھریس اس نے ایسی عسرت میں گزارے کہ اسے پیٹ بھرنے کو سوکھی روٹی اور تن ڈھکنے کو موٹا کپڑا بھی مشکل سے میسر آتا تھا۔ وہ آرٹ کی تنقید خصوصاً موسیقی کی تنقید پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ لیکن اس کی صاف گوئی اور تلخ بیانی کے سبب سے اخبارات اور رسالے بہت کم اس کی تحسیریوں کو قابل اشاعت سمجھتے تھے کبھی کبھی اسے کوئی اشتہار یا کسی تصویر کی تشریح لکھنے کو مل جاتی تھی اور اس کے قلیل معاوضے سے جیسے تیسے اسکا کام چلتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ناول بھی لکھے مگر ان میں سے کوئی مقبول نہ ہوا۔ سب سے پہلے ولیم آچرنے اس کی قدر پہچانی اور اسے سیٹریڈس ریویو کے لئے آرٹ کی تنقید

لکھنے کا کام سپرد کیا۔ اب شاعری کو فکر معاش کی طرف سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا۔ اور اپنے جوہر قابل کے اظہار کا موقع ملا۔ اس موقع سے اس نے سب سے پہلے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنا بت شکنی کا کام آرٹ اور ادب کے میدان میں بھی شروع کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ انجمنان والے بہت سے بتوں کی پرستش کرتے ہیں جیسے سامراج، امارت پسندی، قدامت پرستی لیکن ان کا سب سے جڑا بت نیکسپیر ہے۔ وہ نیکسپیر کی شاعری کا بہت قائل تھا۔ لیکن شیکسپیر کے فلسفہ زندگی کا جو خیال اس کے ذہن میں تھا اسکا وہ سختی سے مخالف تھا۔ شاعری کے جالیاتی نظریہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آرٹ کو کوئی مستقل مقصد زندگی (قدر) تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ تمدنی اور اخلاقی اغراض کا آئینہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے نیکسپیر کی شاعری پر زیادہ تر اس پہلو سے نظر ڈالی کہ وہ کائنات کی کیا فیر کرتا ہے اور زندگی کا کونسا نصب العین پیش کرتا ہے۔ اور اسے یہ نظر آیا کہ یہ شاعر جیسے انجمنان والے پوجتے ہیں زندگی کو ایک چند روزہ تماشہ، اس کے مقاصد کو کھلونا، اس کے فرائض کو کھیل جانتا ہے اور آزادی، زندگی، انسانی پن کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ باریک بینی سے اس کے نزدیک زندگی ایک

ازلی اور ابدی قوت کا مظہر، عالمگیر ارتقا کا سلسلہ، شک اور سخت گیر اخلاق کا منابطہ ہے۔ ان خیالات کو کیونکر پسند کرتا۔ اس نے اپنے زورِ قلم سے ادبی دنیا میں بھل بھادی اور شیکسپیر کے سنگین بت کو گر نہیں سکا۔ تو اس کی بنیادوں کو ہلا ضرور دیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بزار ڈشائے شیکسپیر کی شاعری کا انتشار صیح نہیں سمجھا شیکسپیر نشاۃ الثانیہ کے زمانے کا شاعر اپنے دور کے ذہنی شراب سے سرشار تھا۔ اس کے عہد میں مغربی تمدن کلیسا کی جابرانہ حکومت سے نیا نیا آزاد ہوا تھا اور صدیوں تک تنگ خیالی اور تنگ نظری کی کال کو ٹھری میں بند رہنے کے بعد نئی زندگی کی صاف روشنی اور تازہ ہوا کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وہ اپنے ہم عصروں کے ساتھ زندگی کی وسعت اور گونا گونی کے نظارے میں ایسا مگن تھا کہ اُسے اس کے مقصد اور نشا پر غور کرنے اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی فرصت نہ تھی وہ نہ تو ارتقا د تھا۔ اور نہ مصلح بلکہ محض مصور اور معنی یعنی خالص شاعر۔ وہ انسان کے جذبات و احساسات، اُس کی امیدوں اور آرزوں اس کے ارادوں اور کوششوں کا خود شاہد کرتا تھا اور دوسروں کو کرتا تھا۔ زندگی کے راحت و الم، مد و جزر، نشیب و فراز پر خود نشا اور روتا تھا اور دوسروں کو نشا مانا اور رلاتا تھا۔ اُس کے نزدیک زندگی واقعی ایک تماشہ ہے مگر عبرت آموز تماشہ۔ اس کے مقاصد واقعی کھلونے ہیں مگر دیوتاؤں کے کھلونے اس کے فرائض واقعی کھیل ہیں مگر قیمت کے کھیل۔ اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نشاۃ الثانیہ کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس سے بزار ڈشائے اپنی خلقت اور تربیت کی بدولت بیگانہ ہے جس چیز کو وہ رندی اور لالہ بالی پن سمجھتا ہے وہ اہل میں جوشِ نقوتھا اور ولولہ لیاحت جو آئینہ فطرت میں اپنی سی صورت دیکھتا تھا اور شاہدے کے کیف میں ڈوبا ہوا سکروسی سے زندگی کی راہیں ملے کر رہا تھا۔

شیوہ زنداں بے پردا خرام از من میرس      ایں قدر و انم کہ و شواراست آساں زلیتن  
مگر اسیں شک نہیں کہ یہ طرز خیال اور یہ شیوہ زندگی زیادہ دن قائم رہنے والا نہ تھا۔ مغربی تمدن

کے حاملوں کو بہت جلد یہ محسوس ہوا کہ مجوزے کی طرح کھلی کھلی کارس لینا انسانیت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔ انہیں ایک گہرے اور مستحکم عقیدے کی ضرورت ہوئی اور مذہبی اصلاح کی تحریک نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اس کے بعد ان پر عقلیت، روحانیت، عنایت کے دور گزرے جن میں ان کے دماغ میں ترتیب انکے جذبات میں گہرائی ان کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی۔ آخر میں ثبوتیت کا دور آیا۔ جس میں انکے تجربے اور مشاہدے کی قوتوں نے سجدہ ترقی کی۔ انہوں نے صنعت و حرفت، سائنس سے مدد لے کر زندگی میں ایسی سہولتیں پیدا کیں اور عیش و آرام کے لیے اسباب مہیا کئے۔ جو اس سے پہلے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے لیکن اسی کے ساتھ صنعتی انقلاب نے بڑی بڑی تحریکیں پیدا کر دیں۔ زندگی کا مادی پہلو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور روحانی پہلو کی طرف سے لوگ غافل ہو گئے۔ کسب معاش کی کشش اس قدر ہو گئی کہ سکون و اطمینان کا فور ہو گئے۔ اور مذہب کی کھیتی جو قلب مطمئن کی زمین پر سرسبز ہوتی ہے۔ مرجھا کر رہ گئی۔ زندگی کے ربط و اتحاد کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ تمدن اپنے مختلف شعبوں میں کچھ کچھ کر رہ گیا۔ ایک شعبہ دوسرے شعبے سے بے تعلق ہو گیا۔ بے تعلقی سے اختلاف اور اختلاف سے مخالفت تک نوبت پہنچی۔ اقتصاد سیاست سے دست و گریبان ہو گیا۔ آرٹ اور اخلاق میں لڑائی چھڑ گئی۔ علم نے مادی فلاح کا دامن تمام کر اور مقاصد زندگی سے قطع تعلق کر لیا۔ امیروں اور غریبوں سرمایہ داروں اور مزدوروں نے ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ غرض یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ انتشار جہتِ استماعی زندگی کے شیرازے کو توڑ کر مغربی تمدن کا خاتمہ نہ کرے۔

اب اگر ہم اس زمانے کا مقابلہ شکسپیر کے زمانے سے کریں تو صبح و شام، بہار و خزاں، شباب و پیری کا فرق نظر آتا ہے کہاں نشاۃِ ثانیہ کے آغاز کا جوش اور ولولہ اور کہاں نیلی صدی کے آخر کی افسردگی اور بیدلی۔ کہاں وہ امید سے معمور عقیدہ زندگی کہاں یہ یاس سے لبریز بے عقیدتی۔ کہاں وہ فطرتِ انسانی کی گود میں پلنے اور بڑھنے والی ہر جگہ و ہر ہم آہنگ

تہذیب کہاں یہ عقل اور سنس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے مرکز اور بے ربط تمدن - ظاہر ہے کہ فیکسپیر کا فلسفہ حیات ( اگر محض سرور زندگی کو حیات کہا جاسکے ) جس نے باد بہار کے آغوش میں پرورش پائی تھی خزاں کے دور کے لئے مناسب نہ تھا۔ یہ بیج ہے کہ وہ قلب انسانی کے ان اسرار کا ترجمان ہے جو ہر قدم اور ہر دور کے لئے یکساں ہیں۔ لیکن جدید زندگی کے اکثر مسائل ایسے ہیں جن میں وہ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہی حقیقت تھی۔ جسے بزار ڈشٹانے انگریز قوم پر جو اپنی قدامت پرستی کی بدولت اب تک فیکسپیر کا کلمہ پڑھتی تھی، وضع کرنا چاہا۔ فیکسپیر کے شاعرانہ کمال کا وہ معترف ہو لیکن یہ کمال اُس کی نظر میں زیادہ قوت نہیں رکھتا وہ افلاطون کی طرح شاعر سے معلم اخلاق کا کام لینا چاہتا ہے اور جو شاعر اس کام کا نہ ہو وہ اُسے کسی کام کا نہیں سمجھتا۔

تسا محض نقاد نہیں بلکہ مصلح بھی ہے۔ اس نے فیکسپیر کے نصب العین کی جو اس کے نزدیک ناقص اور غلط ہے۔ تردید کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ایسن کا نصب العین پیش کیا جسے وہ عہد جدید کا ادبی پیغمبر سمجھتا ہے۔ ایسن کے پیغام کے صحیح فضا سے اپنی قوم کو آشنا کرنا۔ برنارڈ شا کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں انگلستان میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا تھا۔ ایسن آسکر وائلڈ کی طرح محض جمالیات پرست شاعر ہے جو آرٹ کو اخلاق سے برتر سمجھتا ہے۔ شائے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ ایسن کی تصانیف اخلاقی رُوح اور اخلاقی جوش سے لبریز ہیں۔ البتہ اس کا نظریہ اخلاق عام روش سے علحدہ ہے۔ یہ ناروے کا ڈراما نگار جس نے تمدن و معاشرت کی تنقید کو اپنا موضوع قرار دیا تھا۔ شا کے نزدیک انسانی زندگی کا سچا مفسر اور حقیقی معنی میں آرٹسٹ اور شاعر ہے اس سے وہ اس درجہ عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کا مقلد اور اپنی تصانیف کو اس کے فلسفہ حیات کی تفسیر کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس معاملے میں بہت حسن ظن سے کام لیتا ہے۔ ایسن میں اور اُس میں سوائے اس کے اور کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں مروجہ رسوم و اخلاق

کے نقاد ہیں۔ اور نفسِ آدمی آزادی کے حامی۔ جب تک وہ محض تخریبی تنقید کرتا رہا۔ اس کے خیالات اہسن سے شاہد رہے۔ لیکن جس دن اس نے ایک مستقل نصب العین زندگی کی تعمیر شروع کی۔ اُسی دن سے وہ اہسن کی راہ سے دور ہٹنے لگا۔ خیالات کے علاوہ طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی اہسن اور شا میں بہت بڑا فرق ہے۔

ان تنقیدی مضامین کی بدولت جو اہل انگلستان کے عزیز ترین مقام کی بنیاد کو ہلاک تھے، لوگ بے زار دوشا کے نام کے دشمن ہو گئے اور اس پر ہر طرف سے نفریں کی بوجھار ہونے لگی۔ یہی سبب ہے کہ جب اس نے خود تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو اس کی کتابیں عرصے تک رواج نہ پاسکیں۔ ابتدا میں چند ناول لکھے۔ لیکن اُسے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ ادب کی اس صنف سے اس کی طبیعت کو مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے اس نے ڈراما کو اختیار کیا۔ انگلستان کے ادیب اور نقاد تو اس سے جلد بیٹھے ہی تھے۔ اس کے پہلے ناموں کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اعتراضات کی بارش چلنے لگی۔ شا نے نہایت بہت اور استقلال سے اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ لوگوں کے تعصبات پر فتح پلکے بہتوں کو اپنا ہم خیال اور قریب قریب سب کو اپنا قدردان بنالیا۔ ہم آئندہ صفحات میں اس کے ڈراما اور اس کے فلسفیانہ خیالات کی نشوونما کسی قدر تفصیل سے دکھائیں گے۔

# افلاس ہند

اور

## جدید معاشیاتی تحقیقات

مسئلہ افلاس ہند کی اہمیت ہندوستان کے معاشی مسائل میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہمارے قدیمی غربت کا ہے۔ اس مسئلہ کی تحلیل میں نہ صرف ہندو مسلمان پارسی عیسائی کوئٹل رہے بلکہ ایک حد تک عہد یرامان سلطنت نے بھی حصہ لیا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کی تحلیل صرف ”نظری احباب علم“ کو مطلوب ہو بلکہ اس کی صحیح تحلیل پر ہمارے قومی عمرانی سیاسی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار ہونی کے باعث، کیونکہ معاشی ترقی کے بغیر سیاسی یا سماجی ترقی ناممکن ہے، عملی اعتبار سے ہر بران قوم و ملت بھی اس جانب متوجہ نظر آتے ہیں۔ اس مسئلہ کی عملی اہمیت اس درجہ ہے کہ اس کی خاطر خواہل ہونے یا نہ ہونے پر ہندوستان کی ایک تہائی آبادی کی زندگی کا دار و مدار ہے، کیونکہ ہندوستان میں افلاس کی مہ گیری کا یہ حال ہے کہ کم و بیش دس کروڑ انسان معاشی اعتبار سے مفلس ہیں، نہ ان کے پاس رہنے کو مکان ہے، نہ پہننے کو کپڑا، اور نہ کھانے کے لئے کافی صحت بخش غذا۔

ہندوستان دنیا کا غریب ترین ملک ہے پست معیار زندگی، بیماریوں کی کثرت، وباؤں کا وجود اور قحطوں کی شدت حقیقۃً افلاس کے نتائج اور یہاں کی عام غربت کا بین ثبوت ہیں۔ اگر ہندوستان اس درجہ مفلس و ذوار نہ ہوتا، تو یہاں نہ وباؤں کا وجود ہوتا، اور نہ بیماریوں کی کثرت ہوتی۔ معیار زندگی بھی اس درجہ پست نہ ہوتا اور قحطوں کا واقعہ ہونا ایک امر محال ہو جاتا۔

ہندوستان کی اس انتہائی غربت کے اسباب پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے

اسباب ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں اور ہندوستانی معاشی زندگی کے ہر شعبہ میں کوئی نہ کوئی خرابی ہو۔ اگر تم تشبیہ کو موزوں خیال کریں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کے معاشی جسم میں صرف ایک ہی شکایت ہو (مثلاً گردوں کی شدید بیماری) جس کا علاج ناممکن ہے اور بقیہ اعضاء بدن اپنی ذات سے تو تندرست ہیں مگر گردوں کی شکایت کی وجہ سے قدرتی طور پر جسمانی صحت کو بے اثر رکھنے سے معذور۔ ہندوستان کی حالت اُس مریض کی سی ہے جو سدا کا روگی، اور ہمہ قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جس کے بدن پر جا بجا بیماریوں کے آثار نمایاں ہیں اور جسمانی غلاظت کے باعث جلدی بیماریوں میں مبتلا ہو طبی معائنہ سے پتہ چلتا ہے کہ اندرون جسم میں بھی خرابیاں موجود ہیں۔ فائدہ کرتے کرتے مریض میں سکت باقی نہیں رہی، خواب غذائیں کھانے سے مام صحت تباہ ہو گئی جسم ابھی طرح نشوونما نہ پاسکا۔ الغرض کئی خرابیاں ہیں۔ قابل اطمینان امر یہ ہے کہ ظاہر حالت چاہے کتنی ہی یہاں انگیزہ کیوں نہ ہو مریض لاعلاج نہیں ہو بشرطیکہ وہ خود معالجہ کے لئے آمادہ ہو جائے اور اُسے کوئی عمدہ نسیب لگائے۔ دیکھ بھال خاطر خواہ طور پر ہو، اور غذا صحت بخش ملے تو کبھی مریض ایک طاقتور انسان بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کا حال بھی ایسا ہی ہے جس کی معاشی زندگی گونا گوں اسباب کے باعث تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ مرض اگرچہ کہنہ ہے، ظاہر حالت خراب ہے لیکن علاج ناممکن ہو، اور صحت یاب ہونے کی پوری توقع۔

مسئلہ افلاس ہند کی نوعیت | معاشی نقطہ نظر سے ہندوستان سے دو بڑی شکایتیں ہیں اول تو یہ کہ ہندوستان باوجود استطاعت کے موجودہ ضروریات کے لئے جس قدر معاشی دولت دیکار ہے وہ پیدا ہی نہیں کرتا یعنی پیدائش کی کمی (under production) ہندوستان کی غربت کا ایک سبب ہو، دوسری شکایت یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشی دولت متبادلہ اور تقسیم کی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اندرون ملک اس کی قدر نہیں بڑھنے پاتی اور بین الاقوامی بازار میں ہندوستانی پیداوار اونٹے ہونے کے باعث دوسرے ممالک کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی یا نیز اسکی قدر کم ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ کہ تبادلوں میں کمتر معاشی دولت ہندوستان کے

حصہ میں آتی ہے، الفاظ دیگر ہندوستان کو اپنی محنت کا معاوضہ کم ملتا ہے۔ مثال کے طور پر کپاس اور گیہوں کے بازار پر غور کیجئے۔ مصر اور مالک متحدہ امریکہ کی کپاس کے سامنے ہندوستان کی کپاس اونٹنے قسم کی تصور کی جاتی ہے کیونکہ مقابلہ مصری یا امریکی روئی کے ہندوستانی روئی سے مضبوط دھاگہ کا تیار نہیں کیا جاسکتا حالانکہ ہندوستان میں قدرتی حالات روئی کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہیں۔ برار کی آب و ہوا اور وہاں کی کالی زمین روئی کی کاشت کے لئے اس درجہ موزوں ہیں کہ ماہرین زراعت اس کو زریں تصور کرتے ہیں۔ روئی سے بذریعہ حال گیہوں کا ہے۔ پنجاب جیسا صوبہ رکھتے ہوئے ہندوستان میں اسی سال سے کناؤاسے گیہوں بھی درآمد ہونا شروع ہوا ہے۔ مادی انظر میں یہ بات سخت تعجب نیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ہندوستان گیہوں کی درآمد کرنا نظر آئے اور دوسری طرف خود بہت سا گیہوں دوسرے ممالک کو بھیجے ہیں بیش پیش ہو۔ یہی حال نام روئی۔ دھاگے۔ کپڑے کو نیلے وغیرہ کا ہے یعنی ہندوستان خام روئی۔ دھاگہ۔ کپڑا۔ کو نیلے منگاتا بھی ہے اور بھیتا بھی ہے۔ اس معنی کی تعمیل کیا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں گیہوں، کو نیلے وغیرہ جو ماہرے منگائے جاتے ہیں اعلیٰ قسم کے اور دیسی گیہوں کو نیلے وغیرہ متوسط یا اونٹنے قسم کے ہوتے ہیں یا کم از کم بہترین نہیں ہوتے۔ چونکہ ہر ملک کو ایک ہی چیز کے مختلف اقسام کی ضرورت پڑتی ہے ایک ہی چیز کے مختلف اقسام کی درآمد و برآمد ہونے لگی ہے۔ چنانچہ ڈاک کاڑیوں کے لئے عمدہ قسم کا کو نیلے قیمتی اور پائیدار کپڑوں کے لئے عمدہ قسم کی روئی۔ عمدہ روٹیوں کے لئے اعلیٰ قسم کا گیہوں، یہ اور اسی قسم کی چیزیں باہر سے منگائی جاتی ہیں، اور ہندوستان سے متوسط اور اونٹنے قسم کا مال دوسرے ممالک کے متوسط اور اونٹنے طبقہ کے لوگوں کے لئے بھیجا جاتا ہے، زرعی پیداوار کے لئے اگر چند دن اور یہی لیل و نہار رہے تو ہندوستان صرف متوسط اور اونٹنے درجہ کی زراعتی پیداوار کے لئے تمام دنیا میں مشہور بلکہ بنام ہو جائے گا۔ اور پھر اسکی پیداوار کی قدر بین الاقوامی بازاروں میں اور بھی گھٹ جائیگی۔

پیداوار کی عمدگی کا تو یہ حال تھا اب مقدار پیداوار کا حال جیسا کچھ ابتر ہے اسکا اندازہ



حسب ذیل نقشوں اور تشریحوں سے بخوبی ہو سکتا ہے :-

ہندوستان کی زراعتی اجناس میں سب سے زیادہ اہمیت چاول کو حاصل ہے جس کی کاشت کے لئے بعض حصص ہند کی آب و ہوا اور زرخیزی خاص طور پر موزوں ہے۔ باوجود اس کے جو کچھ مقدار ہم حاصل کرتے ہیں وہ نسبت نہایت قلیل ہے جو اس نقشہ سے عیاں ہے<sup>(۱)</sup>۔

نام ملک	سال	رقبہ کاشت ہیکڑ	مقدار پیداوار (ڈوبل ٹینر)	
			بحیثیت مجموعی	فی ہیکڑ
ہسپانیہ	۱۹۲۷	۴۶,۹۶۳	۲۹,۵۵,۵۳۳	۶۲.۹
اطالیہ	۱۹۲۷	۱,۳۷,۵۰۰	۵۹,۰۹,۰۰۰	۴۳.۰
ہندوستان	۱۹۲۷	۳,۲۶,۰۷,۰۹۱	۴۸,۵۰,۹۰,۰۰۰	۱۴.۹

یعنی فی ہیکڑ ہسپانیہ میں ۶۲، اطالیہ میں ۴۳ ڈوبل ٹینر پیدا ہوتے ہیں تو ہندوستان میں صرف<sup>(۲)</sup> اسی طرح گیہوں کی مقدار پیداوار بمقابلہ غیر ممالک کے ہندوستان میں بہت قلیل ہے چنانچہ سرکاری اعداد و شمار سے چہ چلا کہ فی ہیکڑ پیچیم میں ۲۶، برطانیہ غٹے میں ۳۲ اور ہندوستان میں صرف ۸ ڈوبل ٹینر پیدا ہوتا ہے۔

ہندوستان کی زرعی پیداوار کی قلت کا ایک مزید ثبوت کپاس کی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے :-

(۱) ماخوذ از "بین الاقوامی سالانہ زرعی اعداد و شمار برائے ۱۹۲۷ء" مطبوعہ روم صفحہ ۱۲۰ جو سرکاری

بین الاقوامی زرعی ادارہ کے دفتر سے شائع کیا جاتا ہے۔

(۲) ڈوبل ٹینر بین الاقوامی بیانیہ مقدار

نام ملک	سال	رقبہ کاشت	حاصل پیداوار	
			بحیثیت مجموعی	بمقابل فی ہیکٹ
مصر	۱۹۲۴-۲۵	۷,۵۱,۰۳۷	۳۱,۸۹,۸۸۸	۴.۲
اطالیہ	۱۹۲۴-۲۵	۳,۵۰۰	۹,۸۰۰	۳.۸
ہندوستان	۱۹۲۴-۲۵	۱,۰۷,۰۸۲,۰۰۰	۱۰,۹۹,۲۰۰	صرف ۱

ان نقوشوں سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی کسانوں کو جس قدر مقدار پیداوار حاصل ہوتی ہے اس ستر دو گنی گننی بلکہ چار گنی مقدار غیر اقوام کے کسانوں کو حاصل ہوتی ہے جب کہ پیداوار  $\frac{1}{10}$  سے  $\frac{1}{20}$  کا یہ حال ہے تو قوم کس طرح مادی مرزا لمانی حاصل کر سکتی ہے!

بہر طور یہ ثابت ہوا کہ ہندوستان اول تو دولت بہت کم پیدا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہندوستانی پیداوار عمدہ یا بہتر قسم کی نہیں ہوتی۔ مسئلہ افلاس ہند اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ دونوں خرابیاں دور نہ کی جائیں۔ مگر ان خرابیوں کو دور کرنا آسان نہیں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہماری معاشی و عمرانی اور سیاسی پالیسی میں اہم تغیرات واقع ہوں یعنی یہ کہ ہماری تمدنی زندگی از سر نو ترتیب دی جائے۔ اس کے لئے ہمیں سب سے زیادہ جس عامل پیدائش کی ضرورت بحرہ تنظیم ہے۔ بغیر اعلیٰ تنظیم کے ہماری حالت درست ہونا تو ایک طرف اندیشہ ہے کہ حالت بد سے بدتر نہ ہو جائے۔

چونکہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی دو تہائی آبادی زراعت پیشہ ہے اس لئے یہاں کی معاشی ترقی اور مادی مرزا لمانی کا دار و مدار زیادہ تر زرعی ترقی پر ہے یعنی بغیر زراعتی ترقی کے صنعتی۔ معاشی۔ سیاسی۔ سماجی ترقی ناممکن ہے، اور زراعت میں کمی پیدائش اور ناقص پیداوار کی شکایت اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ عملی زراعتی تعلیم نہ دی جائے۔ مصنوعی کھاد کا استعمال نہ ہو اور انجمنہائے امداد باہمی کے ذریعہ عمدہ تخم کو بکھریا کرنا نہ ہو۔ قرضہ کا انتظام نہ کیا جائے۔ ایلوں کو جلانے کی عادت ترک نہ کی جائے۔ جس کے لئے سستی

لکڑی کا فراہم کرنا بھی ضروری ہے جو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ نئے جنگلات کا انتظام نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کاموں کا کام سولے حکومت کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح قوانین وراثت، طریق تقسیم زمین، قوانین سود و ربا، انتظام آبپاشی، طریق بندوبست اور طریق ٹیکس میں اہم تبدیلیوں کی شدید ضرورت ہے۔

موجودہ صورت میں ہندوستانی معاشی حالات پر کیا اثر پڑتا ہے اور یہ کس درجہ ہندوستانی غربت کا باعث ہیں اس کا تصور اس طرح سے آسانی کیا جاسکتا ہے کہ زوئیش چندر روت جیسے محقق معاشیات ہند، سرکاری طریق بندوبست کو ہندوستان کی اہم ترین و بدترین وجہ افلاس خیال کرتے تھے، کیونکہ اس طریق کے بموجب زمین کی ملکیت نصف سرکاری اور نصف کسان کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی بھی زمین کی حقیقی برواہ نہیں کرتا اور یہ نفس انسان کی فطری خاصیت ہے کہ وہ دوسروں کے لئے محنت و مشقت کرنا پسند نہیں کرتا۔ چونکہ یہاں لوگوں کو زمین پر مطلق حق مالکانہ حاصل نہیں ہے اس لئے وہ پوری محنت و جانفشانی سے کام نہیں کرتے، اور نہ اپنا سرمایہ اس پر خرچ کرتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر روت موجودہ طریق بندوبست کو بدترین وجہ افلاس سمجھتے تھے<sup>(۱)</sup>۔

غرضیکہ جس وقت معاشی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تعلیمی، سماجی اور سیاسی کوششیں کی جائیں گی تب ہی ہندوستان میں زرعی پیداوار زیادہ اور بہتر دستیاب ہوگی۔ تنظیم کے خصوصیات میں پیش منی مردم شناسی، معاملہ نمئی، موقع شناسی اپنی اور دوسروں کی احتیاجات کی کم و بیش صحیح اندازہ کرنی کی قابلیت سب ہی داخل ہیں۔ ملک میں یا تنہی تنظیم ملی ہوگی تو لامحالہ حکومت وقت کو پیداوار کی اغراض کے لئے محنت کروانے کا خیال ہوگا۔ وہ

(۱) وضاحت و مکمل بحث کے لئے دیکھئے "معاشی تاریخ" (بالخصوص ابواب متعلقہ طریق بندوبست) از روت

ڈرائے دھمکانے کے لئے زائد فوج (Superfluous army) نہیں رکھے گی، بلکہ انہیں قوتوں کو نئے جنگلوں کے قلم کرنے، آبپاشی کا انتظام کرنے، زراعتی عملی درگاہوں کے افتتاح کرنے، نمائشی کمیت وغیرہ قلم کرنے میں صرف کرے گی۔

ہندوستان میں افلاس کے جھنڈے کا وجود ہے، مثلاً ذات پات کا طریق، مشترکہ خاندانی زندگی، مروجہ پردہ، بچپن کی شادی، قریبی رشتہ داروں کی شادی، رسومات میں بے دریغ فضول خرچی، اصول حفظان صحت سے عدم واقفیت، علمی و علمی و فنی، زراعتی اور تجارتی ناواقفیت، عام جہالت، صنعت و حرث کی تباہی، پیشوں کی کمی، انسانی کثرت آبادی، زنا، اضافہ آبادی اور زنا پیدائش دولت میں نامناسبیت، قدیم طریق کاشت، زمین کی تقسیم، فرسودہ طریق تجارت، قدامت پرستی، پست ہمتی، تنگ خیالی، جھوٹی قناعت، بیجا سخاوت، غیر معاشی ذہنیت، آبپاشی کا ناکافی اور ناقص انتظام، غیر پیدا آور قرضہ کی بہتات مہاجروں کی ریاخوری، عام گرانی، افواج پر بیکار خرچ، سرکاری بے توجہی و عدم سرپرستی، سب کے سب درحقیقت ہندوستانی معاشی، سماجی اور سیاسی بد نظمی و بد انتظامی کا نتیجہ ہیں۔

اگر ہندوستان میں زرخیز زمینیں اور کارآمد و عاقل نہ ہوتیں۔ اگر ہندوستانیوں میں کتاب علم و ہنر کی قدرتی قابلیت نہ ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ غربت قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ ہو مگر یہ حقیقت نہیں ہے ہندوستانیوں میں علم و ہنر بھی ہے اور کتاب علم و ہنر کی قدرتی صلاحیت بھی اور انہیں قدرت کی فیاضی کی بدولت اس قدر چیزیں بھی دستیاب ہیں کہ جا بجا دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمیں جس چیز کی معاشی دولت کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ درحقیقت نظم ہے۔

انسان میں اگر تھوڑی سی ہمت ہو، مستقل مزاجی ہو، مستعدی ہو، بخاشی ہو، اور دور اندیشی ہو تو وہ تمام ضروری چیزیں اکٹھا کر سکتا ہے جو معاشی ترقی کے لئے لازمی ہیں۔ لیکن اب تک اس غلافی میں تھے کہ عالمین پیدائش صرف تین ہیں یعنی قدرت (زمین) محنت اور

سرمایہ (اصل) مگر جدید ترین معاشی تحقیقات نے باہل بجاطور پر چوتھے عامل پیدائش کا انکشاف کیا جسے تنظیم کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بعض معاشین شکایت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سرمائے نہیں جسکے ملک میں کر دھار و پیراب بھی بیکار پڑا ہو تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں ”سرمایہ“ نہیں سرمایہ نہ ہونے کے کیا معنی؟ اگر ملک میں ایسی دولت موجود ہو جو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیجاسکے تو یہ بے معنی ہے کہ ملک میں ”اصل“ نہیں دولت کو اصل اور اصل کو دولت بنانا انسان کا کام اور تنظیمی قابلیت کا معمولی کرشمہ ہے اگر ہندوستان میں دولت ہی نہ ہوتی جو بطور سرمایہ کے متعمل ہو سکے تو یہ کہنا بجا ہوتا کہ ہندوستان میں سرمایہ کی قلت ہے۔ موجودہ زمانہ میں دولت تو ہے مگر دولت کو اصل بنانے والے موجود نہیں۔ اگر تنظیمیں بنائیں تو آسانی سے حسب ضرورت سرمایہ دستیاب ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ دو چار تنظیمیں مل کر چار پانچ ہونہار ہستیاں کو اپنے کاروبار کے متعلق اطمینان دلائیں اور انہیں آمادہ کر کے انکے اور اپنے نام سے کمپنی جاری کریں۔ جب پبلک کو ترغیب دلائی جائے گی اور لوگوں کو یقین دلایا جائے گا تو وہ آپ ہی کمپنی کے حصے خرید کریں گے۔ جب ایک کمپنی ایمانداری اور دیانت داری سے کام کرے گی تو لوگ دوسری کمپنی کے قیام پر اس کی بھی امداد کریں گے۔ جس قدر ہوشیاری اور ایمانداری سے کام کیا جائے گا اُسی قدر سے ہندوستانی دولت بطور سرمایہ کے کاروبار کے لئے فراہم ہوتی رہے گی۔ اگر اب بھی لوگ اپنے اند وختہ کو بطور سرمایہ کے استعمال کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور وہ فیئوں اور سونے چاندی کے زیورات کو اصل پر ترجیح دیتے ہیں تو یہ اُنکی نادانی نہیں بلکہ عین مصلحت ہے۔ ہندوستان کے گزشتہ ساٹھ ستر سالہ کاروباری تجربات نے اسکا کافی ثبوت پیش کر دیا ہے کہ بے دریغ ہر کمپنی کے حصے خرید کر رہنا عین نادانی ہے۔ کیونکہ کمپنی کے بہانے سے پبلک کو لوٹ کر کھانیولے بالخصوص ہندوستان میں اب بھی بہت ہیں۔

ہندوستانی سرمایہ کی قلت ایک بدیہی ثبوت ہے کہ ملک میں اعلیٰ درجے کے معاشی

منظمین کافی تعداد میں موجود نہیں۔ اگر منظمین ہوتے تو ضرور کمپنیوں کے ذریعہ ملک کی صحیح ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دیتے۔

تنظیم جب اعلیٰ ہوتی ہے تو کاروبار خیر صورتوں میں اعلیٰ ہوتا ہے، کیونکہ اعلیٰ تنظیم کو بہترین کام کرنے والے ملحق جاتے ہیں، اور یہ اتفاق نہیں بلکہ حالات کا قدرتی نتیجہ ہے۔ مگر غور کر کے دیکھئے کہ ایک اعلیٰ منظم بحیثیت مردم شناس ہونے کے کس طرح عزیز و اقارب، دوست احباب، محلہ والوں، ملاقاتیوں میں سے جن جن کو بہترین لوگوں کا انتخاب کرتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ہر شخص سے اس کی قابلیت کے موافق کام لیتا ہے، نپولین کا قول ہے: "بعض اشخاص ہیں جو اگر چلائے ہیں جنہیں سیاسی عہدوں پر ہونا چاہئے تھا۔ اور بعض وزراء ہیں جو مل جوتے اور پانی دینے ہی کے لئے موزوں ہیں" (۱)

جہاں تنظیم اعلیٰ ہوتی ہے وہاں ہر شخص سے اس کی قابلیت و استطاعت کے موافق بہترین کام لیا جاتا ہے، اور اس طرح اجتماعی حیثیت سے کام بخوبی انجام پاتا ہے۔ جہاں عمدہ تنظیم ہوتی ہے وہاں فضول و غرچی نہیں ہوتی بلکہ کفایت، لاپرواہی نہیں ہوتی بلکہ احتیاط، بے قاعدگی نہیں ہوتی بلکہ ضابطہ۔

ہندوستان میں ایسے ہی اعلیٰ قسم کے منظمین کی کمی ہے جس کی وجہ سے عوام الناس اب تک اپنے اندوختوں کو معاشی ضروریات کے لئے پیش کرنے میں پس پیش کرتے ہیں، اور یہ انکی لامعلیٰ اور بوقوتی نہیں بلکہ تلخ تجربوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی معاشی زندگی کے کسی شعبہ پر نظر دوڑائے۔ آپ ہمیشہ یہی پائیں گے کہ بد نظمی اور بد انتظامی کی وجہ سے قدرتی دولت بیکار ضائع جا رہی ہے۔

جن لوگوں کو مالک محروسہ سرکار کا نظام کے معاشی جغرافیہ سے واقفیت ہے، وہ

جانتے ہیں کہ ضلع محبوب نگر میں لکھو کھا خود روشریغہ کے درخت موجود ہیں، جن کا پھل نہایت شیریں ہوتا ہے اگر منظمین ہوتے تو وہ تحقیقات کروا کر خود اطمینان حاصل کر سکتے تھے۔ کہ ان پھلوں سے شکر کیوں نہ نکالی جائے، اور وہ کس طرح نکالی جاسکتی ہے چند ماہرین کو بلا کر شکر سازی کا کارخانہ قائم کر کے۔ ملکی صنعت کو فائدہ پہنچانا، عمدہ قسم کی شکر تیار کرنا، ماہرین کے لئے پیشہ، مزدوری کے لئے محنت کے مواقع، حصہ داروں کے لئے منافع اور اپنے لئے وسیلہ آمدنی دنیا کرنا، یعنی ذاتی منفعت کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کرنے کا بہترین موقع حاصل ہے، کیا حیدر آباد میں اس قدر دولت نہیں جو بطور سرمایہ کے مستعمل ہو سکے؟ کیا یہاں ماہرین و فردور موجود نہیں؟ ضرورت ہے تو صرف منظمین کی جو ان سب کو یکجا فراہم کر سکتے ہیں۔ اگر بالفرض تصور کر لیا جائے کہ فی الحال شکر سازی کے ماہرین دستیاب نہیں ہو سکتے تو کیا لوگوں کو آبائی شکر سازی کی تعلیم نہیں دلوائی جاسکتی؟ یا یہ کہ باہر سے دو تین ماہرین زیادہ تنخواہ پر نہیں بلائے جاسکتے؟ اب رہا یہی دقتوں مجبوریوں کا سوال تو یہ بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ برخلاف برطانیہ ہند کے دیسی ریاستیں اپنے یہاں صنعت و حرفت کو زیادہ فروغ دے سکتی ہیں برطانوی ہند میں لوگ براہ راست انگریزوں کے دست نگر ہیں اور بغیر سرکاری اجازت و ہمدردی و سرپرستی کے قومی صنعت کو فروغ نہیں دے سکتے، برعکس اس کے دیسی ریاستیں (کم از کم بڑی بڑی دیسی ریاستیں) اندرونی معاملات سلطنت میں آزاد ہیں اور جس طرح ہماری ریاست قومی ادبیات و اسلامی اداروں کی فیاضی سے امداد کرتی ہے اسی طرح وہ قومی صنعت و حرفت کو بھی مدد پہنچا سکتی ہے (اور شافو ناوہر مدد پہنچانے میں دیرینہ نہیں کرتی)

اسی طرح مالک محروسہ سرکار عالی میں سرکاری بینک کی سخت ضرورت ہو ریاست کے مالی کاروبار قریب قریب سب غیر نیکوں کے توسط سے کئے جاتے ہیں اور غیر لوگ لکھو کھا روپیہ بہتافع صرف ریاست کے اندرونی کاروبار سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اپنی دولت کو دفن کئے ہوئے ہیں یا یہ کہ لکھو کھا روپیہ کا زیور بنا کر اپنے بیوی بچوں کے گئے اور ہاتھوں میں ڈالے ہوئے

ہیں۔ یہ معاشی غلامی کے طوق و سلاسل ہمارے غیر تربیت یافتہ ذل و دماغ کو حسن و خوبصورتی بڑھانے والی بیوی بچوں کو خوش کرنے والی اور لہجہ آنے والی چیزیں نظر آتی ہیں سرکاری بینک اور پھر رفتہ رفتہ اس کی شاخیں قائم ہونے سے ملک کے ہونہار ظالموں کو پیدا آور کام کرنے کا موقع ملے گا۔ سرکاری وظائف سے تعلیم یافتہ ماہرین بینک اور جامہ عثمانیہ کے طلبہ معاشیات و مالیات میں اسی بینک اور اس کی شاخوں میں کھائے جاسکتے ہیں اور پھر یہ نوکریاں ایسی ہوں گی جن سے سرکاری خزانہ پر مطلق بار نہیں پڑے گا کیونکہ چند سال کے وقفہ کے بعد سے رفتہ رفتہ تمام اصل مع سود کے دلیس ملجائے گا۔ اور پھر معدود مستقل آمدنی وصول ہوتی رہے گی جس سے سرکاری آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ لوگوں کو بیکار مضر اخلاق پر خطر بھدے زیورات اور دینیوں کے بجائے مستقل آمدنی حاصل ہوگی ہندوستانی علی فور ڈپنٹیوں کے طلبہ ہی سرکار کا نفع بخش کام کریں گے۔ بیسوں تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں ملیں گی اور باوجود ان تمام باتوں کے سرکار کو فائدہ حاصل ہوگا۔ اور اس طرح بیک کر شمع دو کار نہیں بلکہ دس کام انجام پائیگی۔

یہ کام امکان سے خارج نہیں مگر اس کی اولین و اہم ترین شرط اعلیٰ تنظیم ہے کیونکہ تنظیم اعلیٰ نہ ہوگی بینک کے ڈاکٹر و واقف کار دیا بتدار معاملہ فہم نہ ہونگے تو یہی ذریعہ جو ملکی مرزوالی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ قومی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جائے گا۔

بہر طور جدید ترین معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی غربت کا باعث ہندوستان کے سیاسی حالات ہی نہیں بلکہ خود ہندوستان کی ذہنیت عدم فعالیت اور لاپرواہی جو ہیں ہر وقت اگر بری حکومت کو اپنی تباہی کا باعث قرار دینا اور ہرناکامی کا حکومت وقت کو ذمہ دار ٹھیکرانا سراسر غلطی ہے ہم جب ہندوستان کی غربت کے مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی نصف غربت کے جوابدہ خود ہم ہیں اور ہم اپنی ذاتی کوشش سے اعلیٰ تنظیم کے ذریعہ اس غربت کو دور کر سکتے ہیں۔

بنگال سے لیکر سندھ و شمالی مغربی سرحد تک اور لنکا سے لیکر کوہ ہمالیہ تک آپ



جہاں جائیں گے اور ٹیٹ ہندوستانی کارخانوں اور دوکانوں کا انتظام دیکھیں گے تو آپ کو شغل سے ایک فیصدی کارخانوں اور دوکانوں میں اعلیٰ تنظیم نظر آئے گی۔ زیادہ تر آپ کو ایسے مالکان کارخانہ جات اور دوکانات ملیں گے جو پیٹ بھر روٹی کمانے کی خاطر اور برے پھلے طریق پر گزار کرنے کے لئے اوچاٹ دل سے بے ضابطہ اور بے قاعدہ طور پر کاروبار چلاتے ہیں انکے دلوں میں معاشی ترقی کی انگ نہیں اور اگر معاشی ترقی مطلوب بھی ہو تو اس کے لئے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر کوشش کرنا نہیں جانتے اور اگر کوشش کرتے بھی ہیں تو دوچار مرتبہ کے بعد اپنی پست ہمتی کے بدولت مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہ جاتے ہیں ہم میں جفاکشی، مستقل مزاجی، اور صبر و استقلال نہیں اور ہمارے ہی اس تصور کی بدولت ہندوستان میں اس قدر غربت پائی جاتی ہے۔

ہندوستان کے مسئلہ افلاس کے حل کرنے کی جو کچھ تدبیر ہو اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہماری اہم ترین اور اولین ضرورت اعلیٰ تنظیم ہے اور اعلیٰ تنظیم کی شدید کمی افلاس چند کی بدترین وجہ ہے۔

اسراف اور مسئلہ افلاس | جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ نقصان خورچی و قسم کی ہوتی ہے جن کو ہم مطلق اسراف اور اضافی اسراف کہہ سکتے ہیں اور جن کی نوعیت یہ ہے کہ اول الذکر کو کہ آخر الذکر حقیقی معنوں میں اسراف ہو مطلق اور اضافی اسراف کے معنی ایک مثال سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک نواب زادہ ہے جس کی ماہانہ آمدنی دو ہزار روپیہ ہے اور جس کی کل جائداد ایک لاکھ کے قریب ہے اگر یہ شخص محض شان و شوکت کے انہار کی خاطر اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر کسی عالیشان کوٹھی میں کرایہ پر رہے دو دو موٹرس وٹن پنڈرہ خد جگا رکھے سیر و تفریح اور اناشنی چیزوں کی خرید و فروخت میں بے دریغ ٹاسے تو کوئی نہیں کہے گا کہ اس طرح گھر بھونک کر تاشہ دیکھنا اور اپنی حیثیت و آمدنی سے کہیں زیادہ فخر کرنا اعلیٰ معیار زندگی کا تقاضہ اور دانشمندی کی دلیل ہے یہ سراسر نقصان خورچی ہے انسان کو چاہئے

کہ اپنے سرمایہ کو محض پیداوار اغراض کے لئے استعمال میں لائے اور صرف آمدنی کو صرف کیا کرے، اگرچہ یہ علم مرفذ الحالی کا سلم الثبوت نظریہ ہے مگر اسکا انطباق افراد تک محدود ہے۔ اقوام پر لازمی نہیں اس قسم کی فضول خرچی کو اصطلاحی زبان میں اضافی اسراف کہتے ہیں کیونکہ اس طرح سے ایک کو نقصان ہے تو اسی نسبت سے دوسرے کو فائدہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی مثال بالائیں کو ٹھی والے کو کرایہ کار دالے کی بکری سیر و تغیر سے ہونٹ والوں ریلوں وغیرہ کو فائدہ اسانسی ساماں بنانے اور بیچنے والوں کو منافع حاصل ہوتا ہے، گویا ایک کے نقصان کی تلافی دوسروں کے نفع سے ہو جاتی ہے اور قومی معاشیاتی نقطہ نظر سے مجموعی دولت کم نہیں ہوتی اس حقیقت کو معاشیات کے سب سے پہلے محقق آدم اسٹیم نے ہی کچھ پہچانا تھا وہ اپنی مشہور و معروف کتاب رابیت و اسباب (دولت اقوام) میں کہتا ہے کہ، کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں نفسردی اسراف و مینش پرستی سے مغلس نہیں ہوتیں، مگر اسراف کی دوسری قسم وہ ہر جس سے ایک کو تو نقصان پہنچتا ہے، مگر دوسرے کو یا تو فائدہ ہی نہیں ہوتا یا اسی نسبت سے فائدہ نہیں ہوتا قدرتی اور قومی دولت بلا وجہ بیکار جاتی ہے مثلاً محبوب نگر کے شریفیہ ہالیہ کے آبشار (جن سے اگر جدید طریق سانس کے مطابق قوت برقی پیدا کی جائے تو دولت کے دریا بہہ نکلیں لاکھوں بلکہ کروڑ ہاروپہ کی آمدنی ہو) وطنی ہند میں۔ اور ہالیہ کی وادیوں میں تو سیح کاشت کی اب بھی بہت گنجائش باقی ہے جنوبی ہند اور وکن مین اگر آبپاشی کا انتظام کر دیا جائے تو لکھو کھا ایکڑ زرخیز زمین جواب بیکار پڑی ہوئی ہے زیر کاشت آتی ہے اسی طرح شہروں کے قرب و جوار میں بہت سی زمینیں بیکار پڑی رہتی ہیں حالانکہ وہاں ترکاری کی کاشت اور میووں کے باغ لگانے سے ملکی معاشی دولت میں معتد بہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

محض معاشی زندگی میں ابتری ہونے کے باعث ان قدرتی ذرائع دولت کی پرواہ نہیں

کی جاتی اور قوم کی دولت بیکار لگا لگائی جاتی ہے۔ پھل سڑ سڑ کے کھجاتے ہیں۔ آئرشا روں کا پانی بہہ جاتا ہے، زرخیز زمینیں بیکار پڑتی ہیں شہروں کے قرب و جوار میں تجارتی پیمانہ پر ترکاری و میوہ جات اور پھولوں وغیرہ کی باغبانی نہیں کی جاتی۔

مطلق اسراف زراعت ہی تک محدود نہیں بلکہ مخصوص متوسط گھرانوں، اعلیٰ طبقوں اور

اسیر خاندانوں کا یہ حال ہے کہ بے توجہی اور لاپرواہی، بدسلیقگی و بھڑپن کی وجہ سے بہت سی قیمتی و نادر چیزیں برباد جایا کرتی ہیں۔ عمدہ تصاویر اور نادر کتب بسا اوقات کیرلوں کی غذا بن جاتی ہیں مگر غیر ضروری بوسیدہ اور اذکار رفتہ سامان جوں کا توں پڑا رہتا ہے اور شاذ و نادر ہی گھرانے ایسے ہوں گے جہاں سلیقہ مندی سے کام کا جھوٹا ہے، لاکھوں میں دو چار ہی گھرانے ایسے پائے جاتے ہیں جہاں وجدان کا نہیں بلکہ عقل کا تسلط ہوا ورنہ کامیاب زندگی اصلی معنوں میں اعلیٰ ہو یعنی جو کسی قدر چین و آرام سے زندگی بسر کرتے ہوں۔

غرض کہ مطلق اسراف بھی افلاس ہند کی ایک اہم وجہ ہے جو بیچ پوچھے تو ہماری بد نظمی اور بد انتظامی کا نتیجہ ہے کیونکہ جن لوگوں میں تنظیمی قابلیت ہوتی ہے وہ مطلق اسراف تو کجا اضافی اسراف کو بھی واقع نہیں ہونے دیتے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افلاس ہند کا سبب الاسباب یہاں کی غربت کی وجہ وجوہ ہندوستان کی فلاکت و ناداری مفلسی و محتاجی کا حقیقی ماخذ وہ بد نظمی و بدسلیقگی ہے جو ہمارے خاندانی، عمرانی، کاروباری، تجارتی اور سیاسی معاملات غرض کہ ہمارے زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے۔

(باقی)

# تعلیم، اس کی ماہیت اور اس کا اثر

ناظرین جامعہ کے لئے مشہور فرانسیسی حکیم امیل ڈورکیم کے ان کچھوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو ”تعلیم اور اجتماعیات“ کے نام سے رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ امید ہے کہ ہم یہ سلسلہ برابر قسط وار جاری رکھ سکیں گے۔

(یوسف)

تعلیم کا لفظ بعض دفعہ بہت ہی پیسلے ہوئے مفہوم میں ان مجموعی اثروں کو بتلانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو فطرت یا دوسرے انسان ہمارے ذہن یا ہمارے ارادے پر ڈالتے ہیں۔ بقول اسٹورٹ مل تعلیم کا مطلب ”وہ سب کچھ ہے جو ہم خود کرتے ہیں اور وہ سب کچھ جو دوسرے ہیں اپنی فطرت کی تکمیل سے نزدیک کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ اپنے بہت وسیع معنوں میں تعلیم سے مراد وہ بلا، اسلئے اثرات بھی ہیں جو انسانی سیرت اور قابلیتوں پر ان چیزوں سے پڑتے ہیں جن کا مقصد بالکل مختلف ہوتا ہے، مثلاً قانون سے، حکومت کی مشکلوں سے، حرفتی مصنوعات سے اور ان قدرتی واقعات سے جو انسانی ارادے سے آزاد ہیں، جیسے آب و ہوا، زمین اور جائے وقوع۔“ اس تعریف میں وہ واقعات شامل ہیں جن میں کوئی باہمی تعلق نہیں اور جنہیں کوئی آدمی بھی بغیر اپنے آپ کو البھن میں ڈالے ہوئے ایک لفظ کے تحت میں نہیں اکٹھا کر سکتا۔ چیزوں کا اثر انسان پر اپنے طریق عمل اور نتائج کے اعتبار سے، اس سے بالکل جدا گانہ ہوتا ہے جو خود انسان ڈالتے ہیں۔ ہم مصروفوں کا اثر اپنے ہم عصروں پر اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کبھی عمر والے نابالغوں پر ڈالتے ہیں۔ یہاں ہیں بس اسی آخر الذکر اثر سے دلچسپی ہے اس لئے اسی کے لئے ہمیں چاہئے کہ لفظ تعلیم کو مخصوص کریں۔ لیکن یہ مخصوص عمل کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس سوال کے بہت سارے جواب دئے

گئے ہیں۔ ان جوابوں کی وقفیں کجا سکتی ہیں۔

بقول کاٹھ ”تعلیم کا مقصد ہر فرد کی اس تکمیل کی پوری ترقی ہے جس کا کہ وہ اہل ہر“ لیکن ”تکمیل“ کا کیا مطلب سمجھا جائے؟ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب انسان کی ساری قابلیتوں کی ہم آہنگ ترقی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ساری طاقتوں کو جو ہم میں ودیت ہیں، سب سے اونچے نقطہ پر لیجائے جہاں تک کہ آپ کی پہنچ ہو سکے۔ جہاں تک ممکن ہو انہیں وقوع میں لائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ کیا یہ ایسا مطمح نہیں جس سے بڑھکر اور دوسرا نہیں ہو سکتا؟

لیکن اگر واقعی یہ ہم آہنگ ترقی، ایک حد تک ضروری اور پسندیدہ ہو تو ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ پوری طرح سے وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس میں اور ایک اور دوسرے انسانی طبقے کے طریقے میں جو اس سے کم حکمی نہیں، تضاد آن پڑتا ہے۔ یہ چلن وہ ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک محدود اور مخصوص کام کے لئے وقف کر دیں۔ ہم سب ایک ہی طرح کی زندگی کا عہد نہیں کر سکتے اور نہ ہی چاہئے۔ ہم اپنی اہلیتوں کے مطابق الگ الگ کارگزاریاں کرنا ہیں۔ ہمیں ان کارگزاریوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہئے جن کی ہمیں ضرورت ہو ہم سب سوچنے کے لئے نہیں بنے۔ احساس والوں اور عمل والوں دونوں کی ضرورت ہے۔

ایسوں کی بھی ضرورت ہو جن کا کام سوچنا ہے۔ خیال بغیر حرکت سے بے تعلقی کے بغیر خود پر پہنچ درپہنچ دئے اور بغیر خارجی عمل سے اس چیز کو جہاں اس کے لئے وہ اپنے کو پورا پورا وقف کر دیتا ہے، ترقی نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ پہلی تفریق پیدا ہوتی جو لازمی طور پر توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ اور عمل اپنی جانب، خیال کی طرح بہت سی مختلف اور مخصوص سکلیں اختیار کر سکتا ہے۔

بلاشبہ، ایک طرح کی مشترک بنیاد اس شخص کے باوجود باقی رہتی ہے اور بطور نتیجہ عضوی نفسی کارگزاریوں کا توازن قائم رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انفرادی صحت اور سماجی تعلق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ پھر بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ مکمل توازن، انسانی چلن اور تعلیم کے انتہائی مقصد

کے طور پر نہ پیش کئے جائیں۔

تعلیم کی استفادی تعریف اور بھی زیادہ ناقابل اطمینان ہے جس کے مطابق تعلیم کا مقصد ”فرد کو اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی خوش حالی کا آلہ بنانا“ ہے۔ کیونکہ خوشحالی تو دراصل موضوعی شے ہے جسے ہر آدمی اپنے طریقہ پر گن گیان کرتا ہے۔ اس قسم کے ضابطہ سے تعلیم کا مقصد غیر متعین رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود تعلیم غیر متعین چیز رہتی ہے کیونکہ وہ انفرادی فیصلہ پر چھوڑی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسپنسر نے خوشحالی کی سرورینی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک خوشحالی کی شرطیں وہی ہیں جو زندگی کی مکمل خوشحالی مکمل زندگی ہے۔ لیکن زندگی کیا ہے؟ اگر اس سے مراد طبی زندگی ہے تو آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ کن چیزوں کے بغیر وہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ طبی زندگی عضویات اور اس کے ماحول میں ایک طرح کا توازن ہے۔ اور چونکہ یہ دونوں متعلقہ الفاظ ”عضویات“ اور اس کے ”ماحول“ ایسے مقدمات ہیں جن کی تعریف کی جاسکتی ہے تو ضرور ہے کہ ان دونوں کے تعلق کی تعریف بھی ممکن ہو۔ لیکن اس طرح محض قریبی حیاتی ضرورتوں کا اظہار ہو سکتا ہے۔ آدمی کے لئے اور خصوصاً اسی زمانہ کے آدمی کے لئے، ایسی زندگی زندگی نہیں۔ ہم زندگی سے اپنے عضویات کی ٹھیک کارگزاری کے علاوہ اور کچھ بھی مراد لیتے ہیں۔ ایک شایستہ روح یہ پسند کرے گی کہ وہ زندہ نہ رہے بقابلہ اس کے کہ اپنے ذہن کی خوشیوں کو چھوڑ دے۔ صرف واحد مادی نقطہ نظر سے وہ سب کچھ جو سخت ضرورت سے پرے ہے تعین سے بچ نکلتا ہے۔ زندگی کا معیار (Standard of life) بقول انگریزوں کے وہ کم سے کم جس سے نیچے اترنے کو کوئی رضا مند نہیں ہوتا، ماحولوں اور وقتوں کے لحاظ سے بید جدا گانہ ہوتا ہے۔ کل جو ہیں کافی معلوم ہوتا ہے آج، جیسا کہ ہم ابھی محسوس کرتے

ہیں، انسانی وقار سے نیچے نظر آتا ہے۔ اور ہر بات سے یقین ہوتا ہے کہ ہماری ضرورتیں بڑھتی ہی چلی جائیں گی۔

یہاں اب ہم اس نزدیکی سے لگ بھگ ہیں جو ان سب تعریفوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب تعریفیں اس مفروضہ سے شروع ہوتی ہیں کہ ایک تعلیمی عین ہے، مکمل، جو بلا لحاظ سب انسانوں کے لئے ایک ہی قدر رکھتا ہے۔ یہ عالمگیر اور یکساں تعلیم ہے جس کی اہل اصول زبردستی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن اولاً اگر ہم تاریخ کو دیکھیں تو ہمیں کچھ نہیں ملتا جو اس قسم کے نظریوں کی تصدیق کرے۔ تعلیم، عہد اور ملک کے لحاظ سے بے حد مختلف رہی ہے۔ یونانی اور لاطینی شہر لوگوں میں تعلیم فرد کو اس بات کے لئے تیار کرتی تھی کہ وہ خود کو اندھا دھند سماج کے ماتحت کرے اور سماج کی ایک چیز بن جائے۔ آج تعلیم فرد کو زبردستی آزاد شخصیت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ امتحان میں یہ کوشش تھی کہ ذہنوں کو نازک، واقف کار، نفیس، وزن و تناسب کا گردیدہ، حسن سے لطف اندوز ہونے والا اور خالص تخیل کی خوشیوں کا مزہ لینے والا بنایا جائے۔ روم میں یہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے بچے علی انسان نہیں، شکوہ لشکری سے مجذوب، آؤ اور نون لطیفہ کے متعلق سب باتوں سے بے توجہ۔ ازمنہ وسطیٰ میں تعلیم سب سے پہلے سبھی تعلیم تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت تعلیم کی سیرت زیادہ دنیاوی اور زیادہ ادبی ہوئی۔ آج سائنس وہ جگہ لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کچھ عرصہ پہلے آرٹ کی تھی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ واقعہ عین نہیں ہو سکتا اگر تعلیم ادنیٰ بدلتی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمیوں نے ہمیشہ اس امر میں شبہ کیا ہے کہ وہ کیسی ہونی چاہئے؟ لیکن اگر ردِ ماکہ تعلیم انفرادیت سے ویسی ہی ملوث ہوتی جیسی کہ ہمارے عہد کی ہے۔ تو روم کا شہر نہ قائم رہتا۔ لاطینی تہذیب نہ بن پاتی اور نہ ہماری موجودہ تہذیب ہوتی۔ جس کا ایک حصہ اسی سے نکلا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے سبھی سماج نہ زندہ رہ سکتے اگر انہوں نے آزاں تحقیق کو وہی جگہ دی ہوتی جو ہم آج دیتے ہیں۔ پس ایسی ضروریات کا تسلیم کرنا لازمی ہے جو ناگزیر ہیں اور جنکی تجربہ نامکن ہے۔ ایسی تعلیم کے خیال کرنے سے کیا فائدہ جو اس علاج کیلئے جو اس پر عمل پیرا ہو ہلاکت کا حکم دیتی ہے۔

یہ اس قدر مختلف فیہ مفروضہ خود ایک عام غلطی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اس بات سے شروع کرتا ہے کہ تعلیمی سطح کیا ہونا چاہئے، زمانہ اور مقام کے سب حالات کی تجرید کے بعد، تو وہ اس بات کو بے کہے مانتا ہے کہ نظام تعلیمی میں بجائے خود کوئی اہلیت نہیں۔ اس نظام میں ان مجموعی دستوروں اور اداروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے جو روزانہ سے آہستہ آہستہ خبریں اور جو دوسرے سماجی اداروں سے زیادہ مستحکم ہی نہیں ہوتے بلکہ انکا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں رادے سے اس طرح تبدیلی نہیں ہو سکتی جس طرح خود سماج کے ڈھانچے میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعیت پذیر تصورات کا نظام ہے۔ اس وجہ سے ایک ہی منطق سے ان پر بحث ہو سکتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر عہد کے لوگ اس نظام کو جان بوجھ کر بناتے ہیں تاکہ ایک متعین مقصد کو حاصل کیا جائے۔ اور یہ نظام ہر جگہ ایک سا نہیں رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس کی ماہیت کے ایساں مقصد کے پیچھے اسے جانا چاہئے، یا اس طریقہ کے جس سے وہ مقصد حاصل ہوا، سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اس نقطہ نظر سے گذشتہ زمانہ کے تعلیمی نظام کلی یا جزئی حیثیت سے غلطیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان سے قطع نظر کرنی چاہئے اور ہمیں اپنا استحکام اپنے پیشروں کے مشاہدہ اور منطق کی غلطیوں پر نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ہم اس مسئلہ کے حلوں میں اپنے آپ کو نہ ڈالیں۔ یعنی وہ سب الگ چھوڑ کر جو ”ہوا ہے“ خود سے یہ سوال کریں کہ کیا ”ہونا چاہئے“ تاریخ کی تعلیم ہمیں ان غلطیوں کی تکرار سے بچا سکتی ہے جو کی گئی ہیں۔

لیکن واقعی ہر سماج کا اپنی ترقی کے ایک متعین وقت میں، ایک نظام تعلیم ہوتا ہے جو ایک ناقابل مدافعت قوت کے ساتھ افراد پر چھا جاتا ہے۔ یہ یقین کرنا بیکار ہے کہ ہم انہیں بچوں کی ویسی تربیت کر سکتے ہیں جیسے کہ ہم چاہتے ہیں۔ ایسی بہت سی رسمیں ہیں جن سے ہمیں مطالبہ کرنا پڑتی ہے۔ اگر ہم سنجیدگی سے انکی مخالفت کریں تو وہ ہمارے بچوں سے اپنا بدلہ لیں گے۔ جب یہ بچے بالغ ہوں گے تو انہیں اپنے ہم عصروں کے ساتھ جن سے وہ ہم آہنگ ہیں۔



زندگی بسر کرنا دشوار ہوگا۔ یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ آیا ان کی تربیت و تیار نوی خیال کے مطابق ہوئی یا ان خیالوں کے مطابق جو قبل از وقت ہیں۔ دونوں حالتوں میں یہ بچے اپنے وقت کے نہیں اور بطور نتیجہ، انکی زندگی کے حالات صوب معمول نہیں اس لئے وقت کے ہر لمحہ میں تعلیم کا ایک درست کن نمونہ ہوتا ہے جس سے بغیر اپنے آپ کو سخت مخالفت سے محفوظ کئے ہوئے، ہم دو نہیں جاسکتے۔ اس میں ٹکریں پوشیدہ ہوتی ہیں۔

ان رواجوں اور خیالوں کو جن سے یہ تعین معیار بنتا ہے، ہم تنہا انفرادی حیثیت سے نہیں بناتے۔ یہ آپس کی شرکت کی زندگی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس شرکت کی زندگی کی ضرورتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑی حد تک تو یہ ہم سے پہلے والی نسل کا کام ہوتا ہے۔ آج کی تعلیم کے جتنے مجموعی اصول ہیں، انکے بنانے میں انسانیت کے سارے ماضی نے کچھ نہ کچھ ضرور عطا کیا ہے۔ ان میں نہ صرف ہماری تاریخ نے بلکہ ان لوگوں کی تاریخ نے جو ہم سے پہلے ہوئے ہیں اپنے نشان چھوڑے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اعلیٰ عضویات اپنے اندر علم الحیات کا پورا ارتقاء نہیں رکھتی ہے جس کی کہ وہ انتہا ہے۔ جب ہم اس طریقہ کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں جس سے تعلیمی نظام بنتے اور ترقی کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان نظاموں کا انحصار مذہب پر، سیاسی نظام پر، علوم کی ترقی پر اور حرفت کی حالت پر ہوتا ہے۔ اگر انہیں ان کے تاریخی اسباب سے علیحدہ کر دیا جائے تو وہ جیتان بن جاتے ہیں۔ پھر بھلا تنہا فرد کس طرح اپنے ذاتی سوچ کی کوشش سے اس چیز کو بنانے کا دعویٰ کر سکتا ہے جس کی تعمیر انفرادی فکر کا کام نہیں؟۔ اس کے سامنے ایک کوئی میز نہیں جس پر وہ جو چاہے بنا کر کھڑا کرے۔ اس کے سامنے واقعی حقائق ہیں جنہیں نہ وہ پیدا کر سکتا ہے، نہ مٹا سکتا ہے اور نہ ارادے سے بدل سکتا ہے۔ ان واقعات پر اسکا عمل اسی قدر ہوگا جتنا کہ وہ انہیں سمجھے گا اور ان کی مابیت کو اور ان حالات کو جن پر اسکا انحصار ہے، جانے گا۔ وہ انہیں اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ وہ انکے (ان واقعات کے)

مدرسہ میں داخل ہو کر اسی طرح مشاہدہ نہ کرے جس طرح کہ طبعی بے جان مادہ کا اور علم الحیات کا ماہر زندہ جسموں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے؟ اگر صرف منطقی طریقہ سے یہ بات متعین کرنا ہے کہ تعلیم کیا ہونی چاہئے تو شروع اس سوال سے کرنا چاہئے کہ تعلیم کی کیا اغراض ہیں؟۔ بھلا وہ کیا ہو جو ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ تعلیم کی اغراض یہ ہیں۔ نہ کہ یہ؟۔ ہم قیاساً یہ نہیں جانتے کہ سانس یا دوران خون کی زندہ انسان میں کیا کارگزاری ہے؟ کس حق کی بنا پر ہمیں تعلیمی کارگزاری کے متعلق زیادہ بہتر معلومات مل سکتی ہو؟ کوئی جواب دے گا کہ بظاہر تعلیم کا مقصد بچوں کی تربیت ہو۔ لیکن یہ کہنا بس مسئلہ کو بے شکل دوسری طرح بیان کرنا ہے۔ یہ اسکا حل نہیں ہوا۔ یہ بتلانا پڑے گا کہ یہ تربیت کیا ہے؟۔ اسکا کیا رجحان ہے؟ اور وہ کن انسانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے؟۔ ان سوالوں کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ شروع ہی سے اس امر کا مشاہدہ نہ کیا جائے کہ یہ تربیت (ماضی میں) کیا تھی اور کن ضرورتوں کو اس نے پورا کیا؟ اس طرح تعلیم کا ابتدائی خیال قائم کیا جاسکتا ہے اور اس کے متعین کرنے کے لئے تاریخی مشاہدہ ناگزیر ہے۔

## تعلیم کی تعریف

تعلیم کی تعریف کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان تعلیمی نظاموں پر جو رائج ہیں یا رائج رہ چکے ہیں، غور کیا جائے۔ ان میں ملاپ پیدا کیا جائے اور ان خصوصیتوں کو جو ان میں مشترک ہیں الگ الگ نکالا جائے۔ ان خصوصیتوں کے آپس میں ملانے سے تعلیم کی تعریف ہو جائے گی جس کی ہمیں تلاش ہے۔

برسر راہ ہم نے تعلیم کے دو عناصر مقرر کر لئے ہیں۔ اس کے لئے بالعموم اور نوجوانوں کی نسلوں کا وجود، اور اس عمل کا وجود جو اول الذکر آخر الذکر پر برتتے ہیں، ضروری

ہے۔ اب ہمیں اس عمل کی مابیت کی تعریف کرنا باقی ہے۔

یوں سمجھئے کہ ایسا کوئی سماج نہیں جہاں تعلیمی نظام کے دو رخ ہوں۔ بیک وقت یہ نظام ایک ہوتا ہے اور متفرق۔ یہ متفرق ہوتا ہے اس معنی کر کے کہ سماج میں جتنے مختلف ماحول ہوتے ہیں اتنی ہی مختلف قسم کی تعلیمیں ہوتی ہیں۔ اگر سماج میں مختلف ذاتیں ہیں تو ایک ذات کی تعلیم دوسری ذات کی تعلیم سے جدا ہوگی۔ رومانی شرفار کی تعلیم وہ نہ تھی جو غربا کی۔ برہمن کی تعلیم وہ نہیں جو شدر کی۔ اس طرح ازمنہ وسط میں ایک نوابی خواص کی شائستگی میں جسے مارے فنون حرب سکھائے جاتے تھے، اور ایک کسان کی تعلیم میں، جسے موسموں کے زبانی حساب لگانے کی ابتدائی باتیں، چند گیت اور زبان کے قواعد گاؤں کے مدرسہ میں بتاؤ جاتے تھے۔ بڑا فرق تھا۔ آج بھی کیا ہم نہیں دیکھتے کہ سماجی طبقوں اور مقام بود و باش کے لحاظ سے تعلیم میں فرق ہوتا ہے۔ شہر کی تعلیم وہ نہیں ہوتی جو گاؤں کی۔ متوسط طبقے کی تعلیم وہ نہیں ہوتی جو مزدور کی۔ آپ کہیں گے کہ ایسا نظام اخلاقاً روا نہیں۔ یہ صرف پرانی یاد دگا رہے اور عنقریب تنے والی ہے۔ اس مقالہ کی حمایت آسان ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے بچوں کی تعلیم اس اتفاق پر نہ مبنی ہونی چاہئے جو انہیں یہاں یا وہاں، ان ماں باپ کے ہاں نہ کہ ان ماں باپ کے ہاں پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کہ ہمارے عہد کے اخلاقی ضمیر کو وہ اطمینان مل جائے جس کا اسے انتظار ہے تو بھی تعلیم میں یکسانیت نہیں پیدا ہو سکے گی۔ اس حالت میں بھی جب کہ بچہ کی زندگی کے چلن کو اندھا تو اثر پہلے سے متعین نہ کر سکے گا تو بھی پیشوں کے اخلاقی اختلاف کے باعث تعلیمی اختلاف لازمی طور پر پیدا ہو جائے گا۔ ہر پیشہ ذاتی اپنے ساتھ ایک مخصوص ماحول کی تعمیر کرتا ہے جس کے لئے خاص قسم کی قابلیتوں اور مخصوص معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ماحول میں ایک خاص طرح کے خیالات، ایک خاص طرح کے رویے اور ایک خاص طرح سے چیزوں کو دیکھنے کا طریقہ رائج ہوتا ہے اور چونکہ بچہ کو اس کا رگزاری کے لئے، جسے وہ (بڑا ہو کر) پورا کرے گا۔ تیار کرنا ہوتا ہے اس لئے عمر کے ایک خاص وقت میں

سب بچوں کی تعلیم ایک سی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مذہب ملکوں میں تعلیمی اختلاف و انحصار کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ اختصاص ہر روز قبل از وقت شروع ہو رہا ہے۔ اسی طرح جو غیر مناسبت پیدا ہوتی ہے اس کی بنیاد، اس اختلاف کی طرح جس کی ہم نے ابھی تصدیق کی ہے، غیر منصفانہ عدم مساوات پر نہیں۔ لیکن اس سے وہ کچھ کم بھی نہیں۔ اصل یکساں اور مساواتی تعلیم ڈھونڈنے کے لئے تاریخ سے پہلے کے ساجوں تک ہمیں جانا چاہئے جن میں کسی قسم کی تفریق کا وجود نہ تھا۔ اور پھر اس قسم کے سانچے میں انسانی تاریخ کے ایک منطقی لمحہ کو ظاہر کرتا ہے۔

ان مخصوص تعلیموں کی اہمیت کچھ سہی لیکن ان سب کو تعلیم نہیں کہہ سکتے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کافی نہیں تھیں۔ ہر کہیں جہاں ہم انہیں دیکھتے ہیں وہ ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں اور پھر اس نقطہ سے گزر کے وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ وہ سب ایک مشترک بنیاد پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسی کوئی قوم نہیں جس میں ایک خاص قسم کے بعض تصورات، جذبات اور رسمیں نہ ہوں جنہیں تعلیم کے ذریعے تمام بچوں میں بلا کسی تفریق کے جذب کیا جاتا ہو۔ ان بچوں کا تعلق سانچے کے کسی طبقہ سے سہی۔ وہاں بھی جہاں سانچے ایک دوسرے سے الگ ذاتوں میں منقسم ہے۔ سب کا ایک مشترک مذہب ہوتا ہے اور بطور مذہب، مذہبی شائستگی کے اصول، جواب بنیادی حیثیت رکھتی ہے، تمام آبادی کے پھیلاؤ میں ایک ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہر ذات اور ہر خاندان کے اپنے مخصوص دیوتا ہوتے ہیں تو ساتھ ہی عمومی دیوتا بھی ہوتے ہیں جنہیں سب تسلیم کرتے ہیں اور جن کی پوجا سب بچوں کو سکھائی جاتی ہے اور چونکہ یہ دیوتا بعض جذبات کا جنم اور تشخص ہوتا ہے اور زندگی کے ایک مخصوص اسلوب تصور کا اظہار کرتا ہے اس لئے ہر کوئی ان فرقوں میں داخل ہونے کے ساتھ ہی وہ ساری دماغی عادتیں حاصل کر لیتا ہے جو خالص مذہبی زندگی کے کرہ سے پرے ہوتی ہیں۔

بعینہ از منہ وسطیٰ میں غلام زرعی، کسان، طبقہ متوسط کا آدمی اور شرفاء سب کے سب

کو سچی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگر ان سماجوں میں یہ حالت ہو جہاں ذہنی اور اخلاقی تباہی اس بڑی حد تک ہو تو ترقی یافتہ لوگوں میں ایسا ہونا اور بھی زیادہ قرین عقل ہے جن میں طبقے، باوجود ایک دوسرے سے الگ ہونے کے، ایک کم گہری خندق سے جدا ہیں۔ وہاں جہاں ہر تعلیم کے مشترک عناصر کا اظہار مذہبی علامتوں سے نہیں ہوتا وہاں انکا وجود نہیں باقی رہ سکتا۔ ہماری تاریخ کے دوران میں انسانی فطرت، ہماری مختلف قایمیتوں کی جداگانہ اہمیت، حتیٰ اور فرض، سماج، فرد، ترقی، علم، فن وغیرہ کی بابت جو ہماری قومی زندگی کی بنیادیں ہیں۔ بہت سارے مجموعی تصورات قائم کئے جا چکے ہیں۔ ہماری ساری تعلیم، امیر کی اور غریب کی، انکی جواز دہانی پر تہہ ہیں اور ان کی جو حرفتی کارگزاری کی تیاری کرتے ہیں، کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان سب تصوروں کو بچوں کے شعوروں میں متعین کر دے۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سماج انسان کا ایک خاص سطح بنا تا ہے کہ وہ دماغی جہانی اور اخلاقی حیثیت سے کیا ہو؟۔ یہ سطح، ایک خاص حد تک، سارے شہریوں کا ایک سا ہوتا ہے۔ ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر اس میں مخصوص ماحولوں کے مطابق جو ہر سماج میں ہوتے ہیں، فرق آنا شروع ہوتا ہے۔ یہ سطح ہی ہے جو یک وقت ایک اور مختلف ہو، اور یہی تعلیم کا مقصد ہے۔ تعلیم کی کارگزاری یہ ہے کہ بچہ میں اولاً، خاص جہانی اور دماغی کیفیتوں کو ابھارے جنہیں وہ سماج جس سے اس بچہ کا تعلق ہے اپنے ہر فرد میں لازمی سمجھتا ہے۔ دوئم، ان خاص جہانی اور دماغی کیفیتوں کا پیدا کرنا جو مخصوص سماجی طبقہ (ذات، طبقہ، خاندان، پیشہ) اپنے ہر فرد میں ضروری خیال کرتا ہے۔ اس طرح، سماج اپنی مجموعی حیثیت میں اور ہر مخصوص سماجی ماحول اس سطح کو بناتے ہیں اور تعلیم اسے واقعیت دیتی ہے۔ سماج اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں کافی یکسانیت نہ ہو۔ تعلیم، پہلے ہی سے بچہ کی روح میں وہ جوہری مشابہتیں مقرر کر کے جو سماجی زندگی کے لئے لازمی ہوتی ہیں، یکسانیت کو ابدیت دیتی ہے اور انہیں زبردستی پیدا کرتی ہے۔ لیکن دوسرے پہلوؤں کو دیکھئے تو معلوم ہو کہ بغیر ایک شخص

اختلاف کے سماج میں تعاون ناممکن ہو جائے تعلیم اس ضروری فرق کے قیام کی اس طرح ضمانت کرتی ہے کہ خود میں اختلاف اور اختصاص پیدا کر لیتی ہے۔ اگر سماج ترقی کے اس نقطہ پر آ گیا ہے کہ ذات اور طبقہ کی پرانی تقسیم نہیں باقی رہ سکتی تو وہ اپنی بنیاد میں ایک اور تعلیم کا اضافہ کر لیتا ہے۔ اگر محنت زیادہ منقسم ہو گئی ہے تو وہ (سماج) بچوں میں مشترک تصورات اور جذبات کی پہلی بنیاد پر پیشوں کی قابلیتوں کے مالا مال اختلاف کو ابھارے گا۔

اگر وہ سماج دوسرے سماجوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہے تو وہ زبردستی سے ایک قومی نمونہ پر و مانگوں کی ساخت ڈھالتا ہے۔ اگر بین الاقوامی سمجھوتہ صلیح جو شکل اختیار کرتا ہے تو وہ ایسا ڈھنگ تلاش کرتا ہے جو زیادہ عمومی اور زیادہ انسانی ہو۔ سماج کے لئے تعلیم محض ایک ذریعہ ہو جن سے وہ بچوں کے دلوں میں اپنے وجود کی جوہری شرطوں کی تیاری کرتا ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ خود فرد کا ان سب پابندیوں کو تسلیم کرنے میں کونسا مفاد مضمر ہے۔

ہم اب اس سنا بلطہ پر پہنچے کہ تعلیم وہ عمل ہے جو بالغ نفیس ان نسلوں پر برتی ہیں جو ابھی سماجی زندگی کے لئے پختہ نہیں ہوئیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ اپنی گئی گئی خاص جسمانی، ذہنی اور اخلاقی کیفیتیں ابھارے اور انہیں ترقی دے جس کا سیاسی سماج اپنی مجموعی حیثیت میں، اور وہ مخصوص ماحول جس سے اسی فرد کا خاص طور پر تعلق ہے۔ دعوے دار ہے۔

تعلیم کی جو تعریف اوپر کی گئی ہے اس سے لازمی طور پر یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ تعلیم نابالغ نسل کو باقاعدہ سماجی رنگ دینے کا نام

ذکورہ تعریف کے نتائج  
تعلیم کی سماجی خصوصیت

ہے۔ ہم میں سے ہر ایک میں دو ہستیاں ہیں جو سولے تجرید کے اور کسی طرح جدا نہیں کیا جاسکتیں ایک وہ ہستی ہے جو ان تمام دماغی کیفیتوں سے بنی ہے جس کا تعلق سولے ہمارے اور ہماری شخصی زندگی کے واقعات کے، کسی اور سے نہیں۔ اسے انفرادی ہستی کہہ سکتے ہیں۔ دوسری ہستی تصوروں، جذبول اور عادتوں کا ایک نظام ہے جو ہم میں، ہماری شخصیت کی نہیں بلکہ

ان گرد ہوں کی ترجمانی کرتا ہے جن میں ہم شریک ہیں۔ اس مد میں مذہبی عقیدے، اخلاقی عقیدے اور رسمیں، قومی یا پیشے کی روایتیں اور ہر قسم کی اجتماعی رائیں شامل ہیں۔ ان سب کے مجموعے سماجی ہستی بنتی ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس ہستی کی ہم میں سے ہر ایک میں تعمیر کرے۔

اس سے تعلیم کے حصہ کی اہمیت اور اس کے عمل کی زرخیزی ظاہر ہوتی ہے نئی الواقعہ نہ صرف یہ کہ یہ سماجی ہستی بنی بنانی، ابتدائی انسان کی ساخت میں نہیں رکھی گئی بلکہ یہ کہ وہ کسی ان خود ترقی کا نتیجہ بھی نہیں۔ فطرتاً انسان کی طبیعت ایک سیاسی حکم کی ماتحتی، اخلاقی قاعدوں کی تنظیم اور خلوص و اثبات کی طرف مائل نہ تھی۔ ہماری تعلقی فطرت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ہمیں دیوتاؤں کی غلامی کی طرف، جو سماج کے مذہبی ملاقات تھے، راغب کرتی۔ انکی طرف ایک مسلک منسوب کرانی اور انکے احترام کے لئے خود کو محدود کرانی۔ یہ خود سماج ہے جس نے وہاں تک جہاں تک اس کی تشکیل اور استحکام ہو سکا، اپنی چھاتی سے یہ بڑی اخلاقی قوتیں نکالی ہیں جن کے سانچے فروئے اپنے چھوٹے پن کو محسوس کر لیا۔ اب اگر ان لہروں اور غیر یعنی رجحانوں کی تجرید کیا جائے جو دراشت میں ملتے ہیں، تو پھر زندگی میں داخل ہوتے وقت سوائے اپنی نفس لہری فطرت کے اور کچھ نہیں رکھتا۔ غرض کہ ہر نئی نسل سماج کے لئے ایک کوری میز ہوتی ہے جس پر اسے نئے سرے سے تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ سماج کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تیز راستہ سے ایک خود غرض اور غیر سماجی ہستی میں جو پیدا ہوتی ہے، پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایک اور دوسری ہستی اضافہ کرے جو سماجی اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کی اہمیت رکھتی ہو۔ یہ ہے تعلیم کا کام اور اسی کام میں اس کی ساری بڑائی نظر آتی ہے۔ تعلیم کی حد یہاں نہیں رکھتی کہ بس انفرادی اعصاب کی ترقی کرائے، جس کے نفع خود فطرت نے مقرر کر دیے ہیں، اور ان کی چھپی ہوئی قوتوں کو ظاہر کرائے جنہیں ابھارنے کی ضرورت ہی ہوتی ہے بلکہ تعلیم انسان میں ایک اور نئی ہستی پیدا کرتی ہے۔

یہ تخلیقی خیر، ازبس، انسانی تعلیم کا ایک استحقاق ہے۔ وہ تعلیم جو جانوروں کو ملتی ہے، اگر یہ لفظ اسی مائل بہ ترقی تربیت کے لئے استعمال کیا جاسکے جو انکے والدین کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ تربیت بعض جبلتوں کو جو جانوروں میں سوئی ہوئی ہوتی ہیں، ترقی دے سکتی ہے لیکن ان سے نئی زندگی کی ابتدا نہیں ہوتی۔ فطری کارگزاری کے کھیل میں اس سے آسانی ہوتی ہے لیکن وہ پیدا کچھ نہیں کر سکتی۔ اپنی ماں کے سکھانے سے ننھا نانا یا گھونسلانا بہت جلد سیکھ لیتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ کچھ نہیں سیکھتا جسے وہ خود اپنے ذاتی تجربہ سے نہ معلوم کر لیتا۔ اسی وجہ سے یا تو جانور سماجی حالت سے علیحدہ زندگی بسر کرتے ہیں یا بالکل سیدھا سادہ سماج بنالیتے ہیں۔ اس سماج کی کارگزاری آلات جبلتی کی بدولت پوری ہوتی ہے جو ان میں سے ہر فرد اپنے اندر رکھتا ہے اور جو پیدائش کے وقت ہی سر بنے بنائے ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم کسی قسم کا، فطرت میں جو ہری اضافہ نہیں کرتی کیونکہ فطرت گروہی زندگی اور انفرادی زندگی دونوں کے لئے خود کافی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کی وہ ساری قابلیتیں جو سماجی زندگی کے لئے ضروری ہیں بہت پیچیدہ ہیں۔ وہ کسی حالت میں بھی خود بخود ہمارے جسموں میں جسم نہیں لے سکتیں اور عضلاتی رجحان کی مادی صورت نہیں اختیار کر سکتیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وراثت کے توسل سے، ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل نہیں ہو سکتیں بلکہ تعلیم کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہیں۔



# دُنیا کیا سے کیا ہو جاگی؟

شخصیت اور ماحول کے باہمی اثر اور متاثر کا مسئلہ عرصہ سے مباحث تاریخی میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ اور اگرچہ مورخین کا بہت بڑا گروہ اب بھی تاریخ کی رشتہ کو با اثر شخصیتوں کی پر اسرار کار فرمائی سے تعبیر کرتا ہے اور جس طرح مصری نقاش اپنی تاریخ کے واقعات کو نقش و نگار میں محفوظ کرتے وقت کسی بادشاہ، یا بطل عظیم کی بڑی سی تصویر کے پیش پا چھوٹے چھوٹے سپاہیوں کے لشکروں اور مزدوروں کے گروہوں کی تصویر بنا دیتے تھے اب بھی بڑی شخصیتوں کے ذکر مفصل کے ساتھ بقیہ نوع انسانی کا بھی محل ذکر آجاتا ہے۔ تاہم اب کچھ عرصہ سے مورخین کا ایک گروہ اس خیال کی طرف آ رہا ہے کہ اگر تاریخ ایک مرتب علم کا نام ہے تو اس کا کام صرف واقعات کا گنوا دینا اور بیان کر دینا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا فرض ہے انکی تحلیل اور انکی تنقید۔ اور اس تحلیل و تنقید میں اشخاص کی اہمیت گھٹتی اور جماعتوں کی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ تاریخ کو انسانی جماعتوں کے ترقی و تہذیب کی داستان اور اس ترقی و تہذیب کے قوانین کی تلاش سے تعبیر کرتے ہیں جس میں شخصیتیں محض ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ جو پہلے بے ربط واقعات کا ایک مجموعہ تھی اب سلسلہ عمل ارتقاء کی تفسیر بن جاتی ہے۔ اور مورخ اگر اس ارتقاء کے اصول صحیح طور پر معلوم کر لے تو یہی نہیں کہ گذشتہ واقعات کے فہم میں مدد ملے سکتا ہے بلکہ آئندہ کے متعلق پیش گوئی بھی کر سکتا ہے۔

دور جدید کے مشہور اہل تاریخ جی۔ ویلزن نے تاریخ کے اس جدید تصور کو بہت رائج کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ ”مستقبل کے واقعات کے عام رجحان کے متعلق نیچر کی کرنا۔ یہی نہیں کہ مورخ کے لئے جائز ہے بلکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا علم تاریخ کے عبث و

لا یعنی ہوئے کا قسار کرنا ہے۔ چنانچہ خود ایچ۔ جی۔ ویلزن نے بھی دنیا کی آبیروالی تاریخ کے متعلق کچھ خیالات ظاہر کئے ہیں جن کا تہہ ساس ذیل میں ہم یہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

”دنیا کی موجودہ حالت دو متضاد قوتوں کی نہایت پیچیدہ کشمکش سے عبارت ہے۔

ایک طرف تو بہت قوی جماعتی اور سیاسی روایات ہیں، دوسری طرف نئے علم کی امنڈتی ہوئی موجیں اور جدید اختراعات کا عظیم المثال طوفان۔ یہ نیا علم اور نئی اختراعات ان جماعتی اور سیاسی روایات سے باطل مطابقت نہیں رکھتا جو اس وقت ذہن انسانی پر طاری ہیں۔ ان روایتوں کا سرخ ماضی کی طرف ہوا اور اسکو بڑھا چڑھا کر اور خوب سراہ کر یہ اپنی بند لیتی ہیں۔ اور ہر جو نئی قوتیں ان پر حملہ آور ہیں وہ انسانی جماعت کو ایک عالمی نظام میں ترتیب دینے کے درپے ہیں۔ یہ نئی قوتیں اپنے اس مقصد کے حصول پر سختی سے مصر ہیں اور جب تک مقصد حاصل نہیں ہوتا ڈر ہے کہ یہ نئی قوتیں نہایت بے رحمی سے انسانی فلاح و بہبود کو برباد و تباہ کرتی رہیں گی۔ . . . . . نئی ایجادات ہمارے حلقہ اثر کو وسیع کر دیا ہے اور جماعت انسانی

میں حصول مسرت کے ذریعوں اور طریقوں کو بہت ترقی دیدی ہے لیکن ساتھ ہی تباہی و بربادی کی قوتوں کو بھی اس قدر بے پناہ کر دیا ہے کہ ہم سے پہلے کی نسلیں اس کا تحمل بھی نہ کر سکتی تھیں۔ یہ اچھی بری دونوں قسم کی قوتیں انسانی عقل اور انسانی ارادہ کو اس بات کا پیام دیتی ہیں کہ وہ دنیا کے جماعتی معاملات میں ایک وسیع تر تعمیر نو کی طرف متوجہ ہو۔ اگر اس نے اس کا کیا تو انعام میں قوت، فلاح، مرزا الحالی، آزادی اور سعی مشکور کے وہ دروازے ہماری نوع کے لئے کھل جائیں گے جو آج سے پہلے کسی کے خواب میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

لیکن ان امکانات کا وجود اس پر دلالت نہیں کرتا کہ ان مواقع سے فائدہ بھی اٹھایا جائے گا۔ . . . . . ممکن ہے کہ اس کی خوبیوں سے منتفع ہونے سے قبل ان پہلے اس کی سب بُرائیوں سے دوچار ہو بلکہ ممکن ہے کہ ارادہ اور عقل کی کمی اسے کبھی بھلائیوں تک پہنچنے ہی

نہ دے!

انسان کی اس حرمان نصیبی کی مثالیں ہماری پچھلی تاریخ میں موجود ہیں تعلقات انسانی کو محنت دینے والی نئی ایجادات پند رہیں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں لیکن اب کا نتیجہ تعاون نہیں ہوا بلکہ انہوں نے انسانیت کو اور بھی منقسم کر دیا۔ کچھ آثار چڑھاؤ کے بعد سیاست عالم کا اصول کار فرما "قومیت" کا تصور ہو گیا۔ اور ذہن انسانی پر اس نے وہ تسلط حاصل کر لیا جس کا اندازہ بھی شکل ہو۔ جنگ عظیم اسی اصول کا نتیجہ تھی، اور اسی کو اس نے اور قوی کر دیا۔ جرمن، اسٹریڈی اور ترکی سلطنتیں ختم ہو گئیں اور انکی جگہ بہت سی چھوٹی چھوٹی قوموں نے لے لی۔ اور یہ سب تفریق و تقسیم ایسے وقت ہوئی جب نئے ایجادات، نئے اختراعات نئے طریقے، نئی دریافتیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ قومی حدود دے نکل کر دنیا کے سیاسی اور معاشی نظام کو عالمی طریق پر ترتیب دیا جائے۔ دنیا کی تاریخ ہر عرصہ تک ان متضاد قوتوں کی کشمکش پر رہے گی۔ دیکھیں قومیت کا غلبہ رہتا ہے یا ان فاصلہ شکنی اختراعات کا؟

قومیت کا جذبہ فطرت انسانی کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں رکھتا ہے۔ . . . آدمی ہمیشہ کسی نہ کسی کی طرف ہوتا ہے، کسی فرقہ یا ٹولی سے تعلق رکھنا چاہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کتا یا بھیڑ۔ بغیر اس تعلق کے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جس جماعت یا ٹولی سے اس کا تعلق ہو وہ اس کی سمجھ میں بھی آ سکے۔ اس کے لئے حقیقی ہمنوا خیالی نہ ہو بلکہ تعلیم کے وہ "انسانیت" کو اپنا فرقہ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایسی جھوٹی مٹی میں کیسے جا کر پناہ لے لے جس میں آپ باتے ہیں کہ ساری دنیا سما سکتی ہے؟

فرقہ بندی کے اس فطری جذبہ کے خلاف مختلف مذاہب نے، سیاسی نظاموں نے، زمانہ موجودہ میں اشتراکیت نے صلابت کی ہے اور اس کے زور کو دبانا چاہا ہے لیکن یہ سب کچھ اس فطری جذبہ کے سامنے مصنوعی چیزیں ہیں۔ اگر آدمی کبھی بھی ایک نیا نظام زندگی بنائے گا تو اسے ان فطری چیزوں کو ان مصنوعی چیزوں سے دباننا پڑے گا۔

زمانہ موجودہ میں ان مصنوعی تصورات کا اثر تھوڑے سے ملکرین تک محدود ہے۔

جمعیت اقوام سے جو عام دلچسپی شروع ہوئی تھی وہ اس کی فریبہ حقیقت کے سامنے ہوا ہو گئی جس سانس نے اپنی جدید ایجادوں سے زمان و مکان کی قید کو تفسیر کیا مٹا دیا ہر اسی نے عیسائیت اور اسلام کے ان جامع تصورات کو بھی کھوکھلا کر دیا ہے اور ان میں اس نئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں چھوڑی . . . ہمارے خواہشات اور آرزوئیاں اور ہمارے دوسرے کچھ بھی ہوں ہیں اس نتیجہ پر مجبور آنا پڑتا ہے کہ ابھی بہت نسلوں تک مقابل و جنگ آزما قومی ریاستوں کا دور جاری رہے گا۔

ان قومی خاصیتوں کو رفع کرنے کے لئے جو جمعیت اقوام بنائی گئی ہے اسکی مثال ایک اندھی گلی کی سی ہے جس سے پھر کہیں کو راستہ نہیں جاتا۔ اس راستے پر چل کر انسان کی تیسری قوتیں بیکار جا رہی ہیں۔ اس کے موافقین کی امید ہے کہ یہ وفردوں کا مجموعہ، دفاتر خارجہ کے کارندوں کا جھگمگ، یہ گھٹیا دوسرے درجے کے سیاست دانوں کا دارالمباحثہ، شاید زیادہ طاقتور اور بالکل نئی قسم کی چیزیں بن جائے۔ میں اس امید میں انکا شریک نہیں ہوں۔ میرے نزدیک اس کی بنیاد کی نشت اول ہی کج ہے۔ اس کے نیک نیت بانیوں میں غالباً مسیح مار بخنی حس ہی نہ تھا۔ انہوں نے قوموں کو معاملات انسانی کی سب سے بڑی مصیبت تسلیم کرنے کے بجائے انہیں ایک مقدس چیز سمجھا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کی قوت جو حقیقی امن اور اتحاد عالم کے کام میں صرف ہوتی آج اس اندھی گلی میں بیکار جا رہی ہے۔ اور جمعیت اقوام دراصل اس اچھے کام میں حائل ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ انسانی میں انقلابات کا دور ختم نہیں ہو چکا ہے۔ اور ممکن ہے کہ مشرق سے اور ان مفلس و مغلوب فرد دروہوں کے تنگ و تاریک جھونپڑیوں سے جن کی محنت و مشقت پر ہمارا آرام و آسائش اور ہمارا سارا امن و چین منحصر ہے تھوڑے ہی عرصہ میں کوئی نیا انقلابی تصور رونما ہو جو ایسا ہی قوی ہو جیسا کہ اپنے شروع ایام میں اسلام اور جس کی دست تمام دنیا کو اپنے حلقہ میں لے لے۔ ایسے انقلابی طوفان کی یقینی پیش گوئی تو کوئی نہیں

کر سکتا لیکن مستقبل کے ہر خاکہ میں اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس انقلابی طوفان سے دنیا کو حیات تازہ ملے لیکن اس میں مجھے یہ بات ضرور دکھائی دیتی ہے کہ بہت سے قرض، بہت سے دعوے، بہت سے ادارے بہت سے حقوق ملکیت جنہیں قلمزد کرنے کی ہمت موجودہ دنیا میں نہیں ہے وہ اس کے طفیل میں صاف ہو جائیں گے اور اس طرح ایک نئے نظام دنیا دی کی بے روک و بے خطر راہ کھل جائے گی اگرچہ یہ راہ بہت بے روغن ویران ہوگی !

ایک طرف اگر عالمگیر انقلاب کی توقع کیجا سکتی ہے تو اس کے قرائن بھی موجودہ ہیں کہ مستقبل قریب میں دنیا کا تمدن رو بہ انحطاط ہو جائے گا۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ قومیت اور سامراج کے تخیلات میں اگر ترقی ہو کر ایک عالمی نظام نہ بنا تو کم سے کم یہ ادارے خود تو اسی حالت میں برقرار رہ سکیں گے۔ خیالات اور ادارے زندہ اور نامی چیزیں ہیں جن میں ہر لحظہ تغیر ہونا ضروری ہے اور اگر یہ تغیر ترقی کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا تو منزل کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ تمدن میں بہت سی چیزیں ہیں جو انحطاط اور تنزل کی خبر دے رہی ہیں۔

متمدن دنیا میں تقریباً ہر جگہ خصوصاً اٹلی، جنوبی جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ، میں قانون کا احترام کم ہو رہا ہے۔ نیابتی اداروں اور پچھلی نسلوں کے سیاسی تصورات کی وقعت گھٹ رہی ہے۔ موجودہ دنیا میں یہ تصورات اب بے موقع اور بے محل ہو گئے ہیں۔ اور نئے حالات کے مطابق وسیع تر تصورات اور زیادہ ہمہ گیر ادارے نہ مرتب ہوئے تو انسانیت پھر پہلے کی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ . . . گمان ہے کہ آنے والی صدیوں میں تاریخ عالم جاعتوں کے صعودی سلسلہ کے بجائے نزولی سلسلہ کی داستان ہو جس کے آخر میں بس راہزنی ہے اور فزاقی !

دنیا کے جن حصوں میں یہ انحطاط جہاں بالکل عیاں نہیں ہوا بھی ہے ادبی اور بازنویسی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہماری مادی ترقیوں کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشورہ اور غور و خوض کی جگہ

کے مقابلہ میں اخبارات کا اثر بہت بڑھ گیا ہے۔ . . . . اخبارات جو کبھی پارلیمنٹ کی سیاسی جماعتوں کے خادم ہوتے تھے اب ان پارلیمنٹوں کو اپنی پیسج پکار سے باہل دبا سکتے ہیں۔ . . . . میکائلی ایجادوں نے یہ بھی ممکن کر دیا ہے کہ اخباروں کی ملکیت چند ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مالک اخبار کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو نہ کسی سیاسی روایت کا پابند ہے نہ کسی خاص ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے اور جماعتی کارروائیوں میں خواہ مخواہ دخل دیتا ہے اور تشریباتی بلاستنی سختی اور عدم رواداری کی راہ کا حامی ہوتا ہے۔

آج کل خصوصاً برطانیہ میں مالک اخبار مدبر سیاسی کا شخصی رقیب اور معلم کا بلند آہنگ دشمن بن گیا ہے۔ اخباروں کے عنوانات جلی فکر و خیال کے راہزن ہیں۔

اب ذرا موجودہ دنیا کی خاص خاص دول پر نظر ڈالئے۔ آج مغربی ڈراما میں مرکزی حصہ فرانس کا ہے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ہے فرانس کا کیا مطلب ہے، فرانس کا کیا قصد ہے۔ فرانس کیا کہے گا؟ فرانس کو آج دیہی مرکزیت حاصل ہے جو دس برس پہلے جرمنی کو حاصل تھی، اور بالکل اسی وجہ سے، یعنی اس لئے اسکی قومی کارروائیاں اور سب دول کے مقابلہ میں نہایت مرتبہ و نظم میں فرانس کے ارادے اب سب پر ظاہر ہیں۔ وہ ہر دوا مول جرمنی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس غرض کے لئے جہاں مناسب ہوتا ہے عہد نامہ و رسائی کی قراردادوں پر اصرار کرتا ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے ان سے بالکل قطع نظر کر لیتا ہے۔ جرمنی کے چاروں طرف اس نے اپنے مددگار بنا رکھے ہیں، جن کی بڑی بڑی فوجوں کو فرانسیسی افسر تعلیم دے رہے ہیں اور جن کا خرچ اس روپیہ سے ادا ہو رہا جو کوئی دوسری قوم اپنے انگریز اور امریکن قرض خواہوں کا تشریف اتارنے میں صرف کرتی!

فرانس جرمنی کو تباہ کرنے میں کہا شک کا میاب ہو سکتا ہے؟ تاریخ میں شاذ ہی مثالیں ہوں گی کہ ایک زبان بولنے والی جماعت کو منتشر کر کے مٹا دیا گیا ہو۔ ارمنی، بلغاری

چمک، آئرلینڈ اور ویز کے لوگ طویل محکومیت بلکہ قتل عام کے باوجود بھی اپنی مخصوص روایات کو قائم رکھ سکے۔ بیشک فرانس نے آج جرمنی کو دبایا ہے لیکن اسے ہر لحاظ و ہر دم اسے دباے رکھنا پڑے گا اور اس میں جو مدد بھی اپنے پوشش، چمک، اور دوسرے حلیفوں سے مل سکتی ہے یعنی ہوگی۔ ایک آرام دوست اور دولت پسند قوم کے لئے یہ کوئی خوش آئند توقع نہیں ہے۔

فرانس کی سیاسی نظر تضحی تیز ہے اتنی ہی محدود بھی ہے۔ . . . فرانس سمجھتا ہے کہ کم سو کم ۲۵ برس تک روس بین الاقوامی معاملات پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکتا۔ شاید یہ غلطی ہے۔ . . . فرانس کی کچھ خصوصیت ہی جو کہ روس کے متعلق غلطی کرتا ہے، والٹر نے غلطی کی، نپولین نے غلطی کی، سٹالین سے ۱۹۱۷ء تک فرانس کے سرمایہ داروں نے روس میں روپیہ لگا لگا کر کی۔ کیا عجب ہے کہ مشرقی یورپ میں فرانس نے جو سیاسی جال پھیلایا ہے اس میں خود چسپاں جائے اور جو فوجیں اس نے دہاں بنائی ہیں وہ اسی پر آ پڑیں اور جو سامان جنگ اس نے فراہم کیا ہے وہ خود اسی پر صرف کیا جائے۔

فرانس کے پر دوس میں جو اطمینانی مالک ہیں وہ بھی اس کے مستقبل پر بڑا اثر ڈالیں گے۔ شمالی افریقہ میں فرانس کے پیر پھیلانے کو نہ اسپین اطمینان سے دیکھ سکتا ہے نہ اٹلی۔ . . . فرانس مغرب میں اپنے ارادوں کے پورا کرنے کے لئے افریقیوں سے کام لینا چاہتا ہے موسیو پونچکارے فرماتے ہیں کہ فرانس ۴ کروڑ آدمیوں کا ملک نہیں اس کی آبادی دس کروڑ ہے اس میں ۶ کروڑ عرب، برابر اور حبشی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ شمالی افریقہ کی اس رنگین آبادی کو فرانس فوجی قواعد کے گر سکھا رہا ہے۔ فوجی ریلیں بن رہی ہیں تاکہ یہ مسلح افریقی لاکھوں کی تعداد میں یورپ میں پہنچائے جا سکیں۔ لیکن فرانس نہیں سمجھتا کہ مخالف برطانیہ اور مخالف اٹلی اس سپاہ ملک کے یورپ پہنچنے میں بہت کچھ حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی فرانسیسی اپنے کو ایسے خطروں میں ڈال رہے ہیں جہاں انہیں خود امداد نہیں

اٹلی کی آبادی بڑھ رہی ہے اور وہ بھی رومن سلطنت کے قدیم حصوں کو اپنی اولاد سے آباد کرنا چاہتا ہے۔ شمال میں اسکی مرفہ الحالی مرکزی یورپ سے وابستہ ہے جسے فرانس تباہ کرنے کے ورپے ہے۔ . . . . ہم سمجھتے ہیں کہ جب فرانس کو اپنی کالی ملک کے یورپ لانے کی سخت ضرورت پڑے گی اس وقت اٹلی اس کی سرحدوں پر، سمندر کے نیچے اور ہوا میں ہر جگہ اس پر کاری ضرب لگائے گا۔ یا پھر خود فرانس کا باجگزار بن کر رہے گا۔ اس یورپ کے مقابلہ میں جس میں فرانس غالب ہے برطانیہ کھڑا ہے۔ جنگ کے طریقوں میں بے حساب تغیر ہو گیا ہے۔ اور دنیا کے متزلزل سیاسی نظاموں میں کسی کا توازن اس قدر نازک نہیں جتنا کہ سلطنت برطانوی کا۔ یہ بحری جہازوں خصوصاً دفاعی جہازوں کی بنائی ہوئی سلطنت ہے، اسکی قوت پہلے ہمیشہ بحری قوت رہی ہے جو اب جنگ میں فیصلہ کن چیز نہیں رہی۔ ہوائی جہازوں نے لندن کو فرانس کی زد میں پہنچا دیا ہے۔ . . . فرانس اور برطانیہ میں جنگ ہوئی تو دونوں کے دارالسلطنتوں کو ہوائی حملوں سے بے شمار نقصانات برداشت کرنے ہونگے اور اس میں غالباً پلہ پیرس ہی کا بھاری رہے گا مگر انگلستان کی معاشی زندگی، اس کے صنعتی اور کان کنی کے مرکز اتنی زد میں نہیں جتنا کہ شمالی فرانس کے صنعتی علاقے۔ سمندر میں غالباً فرانسیسی تحت البحر کشتیوں کا حملہ بومن حملہ سے کہیں سخت ہوگا۔ اس وقت برٹش چینل کو محفوظ رکھنا مشکل ہوگا اور ممکن ہے فرانس انگلستان کو بھوکوں مارے۔ لیکن شاید استقلال کے مقابلہ میں برطانوی آبادی پھر بھی فرانس کو ہارے گی۔ اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اٹلی اور اسپین فرانس کے خلاف ہونگے۔ اور غالباً امریکہ بھی فرانس کی کالی فوج کے مقابلہ میں برطانیہ کی مدد کو دوڑ پڑے گا۔

فرانس اور برطانیہ کی جنگ یورپ میں فرانس کے تفوق اور سازشوں کا خاتمہ کر دے گی۔ لیکن ساتھ ہی لندن کو بھی انگریزی بولنے والی دنیا میں اب کی سی حیثیت حاصل نہ رہے گی۔ بلکہ کچھ ہو۔ انگلستان اور فرانس میں جنگ ہو یا نہ ہو یہ تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اگلے ۵۰ سال



میں سلطنت برطانوی کے نظام پر بڑے بڑے بوجھ پڑیں گے۔ اور ممکن ہو یہ ان کی تاب نہ لاسکے۔

سلطنت برطانیہ کو دو اہم مسئلے اب بھی ستارہ ہیں جنہیں ٹالنے کی کوشش ہوتی ہے پر وہ ملتے نہیں۔ ایک تو بے کاری اور ضرورت سے زیادہ آبادی کا مسئلہ ہے۔ فرانس نے برطانیہ کی یورپی تجارت کو جو مستقل نقصان پہنچایا یہ اسکا نتیجہ ہے۔ برطانیہ کی روزی تجارت خارجہ سے تھی اور وہ اپنی کثیر آبادی اور کسی طرح نہیں پال سکتا۔ یہ مسئلہ بالآخر برطانیہ کے جسم سیاسی میں ایک مستقل سرطان بن کر رہے گا اور برطانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس باب میں کیا کرے۔

برطانیہ کے سامنے دوسرا مسئلہ ہندوستانی آبادی کی ترقی ہے۔ یہ آبادی اب پرانے عرصے کے طریقوں سے روکے نہیں رہتی۔ وہ اوپر اُدھر نظر کر سکتی ہے۔ سوال کرتی ہے، اخبار پڑھتی ہے، مقابلہ کرتی ہے اور پریشانیاں پیدا کرتی ہے، ہندوستانی تہذیب کی تجدید، ایک نئے ہندوستان کی تعمیر، برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں کا عظیم اثاثہ اور دلفریب کام ہے۔ لیکن انگریزی حکمران طبقہ کی قدامت پسندی، تعلیم میں طبقہ دارانہ رقابت، اور آکسفورڈ اور کیمبرج کی تنگ نظر اور مصنوعی روایات اور انگلستان میں جماعتی اور سیاسی تعلیم کو ایسا روک رکھا ہے کہ خود اپنے ملک کے مسائل کو حل کرنے کے لئے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہے چہ جائیکہ یہ ہندوستان کے پیچیدہ اور صبر آزمات مسائل کا حل کر سکیں۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی جو ہندوستان میں روز افزوں بغاوتی حیلوں کو روکنے کی ضامن ہو سکے۔ ممکن ہے یہ بغاوتیں خود ہندوستان کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوں۔ لیکن ہمارا کام اس وقت یہ تباہ نہیں کہ جو کچھ ہوگا وہ اچھا ہوگا یا برا بلکہ یہ بتانا ہے کہ آیا ایسا ہونا قرین قیاس ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسکا وقوع قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ فرانس اس سے چھپکر یا علانیہ طور سے فائدہ نہ اٹھائے گا۔

ان مایوس کن ملاحظات کے بعد نئی دنیا میں ذرا بہتر توقعات نظر آتی ہیں۔ امریکہ کی نئی آبادیوں کے سامنے بھی بیشک سخت جماعتی اور معاشی کشمکش ہے لیکن یہاں میں غظیم الشان نو جس تقریباً ختم دولت، زوال آماؤ تعلیم، اور بیکاروں کے امڈتے ہوئے مڈی دل نہیں دکھائی دیتے۔ یہاں ملک کے وسیع علاقے دکھائی دیتے ہیں جہاں وسائل دولت کو ترقی دیکھا ہے، عرصہ تک کے لئے بافراط کھانا ملنے کی امید ہے، زندگی کے خاصے محفوظ رہنے کی توقع ہے، اور شو و نما اور سعی تعمیری کا حوصلہ ہے۔ فنی اور علمی محرکات روز بروز قوی ہو رہے ہیں خصوصاً ریاستہائے متحدہ میں۔ ممکن ہے کہ پچاس سال کے اندر اندر امریکہ علوم فنون اور ادب میں دنیا کی سب سے اول قوم ہو جائے۔ اس کے پچاس سال کے اندر اندر شاید شمالی اور جنوبی امریکہ بالترتیب دنیا میں انگریزی اور ہسپانی بولنے والی آبادی والوں کے مرکز بن جائیں۔ اور اگر پان۔ امریکی خوابوں کی تعبیر ہو گئی تو یہ آپس میں مستقل ان کا انتظام بھی ممکن ہے کر لیں۔ غالباً ہمارے سامنے تمدن انسانی کے رد بہ مغرب سفر کی ایک نئی منزل ملے ہوئے والی ہے۔ جیسے پہلے ایشیا مصر اور یونان سے چل کر عہد عیسیٰ کے آغاز میں تمدن اٹلی اور گال میں پہنچا اور نشاۃ الثانیہ میں دباں سے پھر شمال اور مغرب کی طرف چل کر یورپ کے ممالک میں آیا۔

امریکہ سے چل کر کبسلر لکابل کو پار کیجئے تو جاپان آتا ہے۔ نہایت ذہین اور آباد ملک جس پر ایک سخت حادثہ قدرتی کا اثر ہے اور عنقریب ہی جس کو جماعتی دشواریوں سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہے لیکن جنگ عظیم ان سب ایشیائی قوموں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے ایشیا پر یورپ کے تسلط کا خاتمہ کر دیا ہے اب غالباً مغربی ریشہ دوانیوں سے محفوظ جاپان اور چین اپنے مسائل کا حل سوچ سکیں گے ریاستہائے امریکہ نے ہمیشہ یہ رویہ رکھا ہے کہ جاپان کے معاملات سیاسی میں مداخلت نہ کی جائے لیکن ساتھ ساتھ نہایت قوی تعلیمی اور صنعتی پروپیگنڈا سے کام لیا ہے۔ ظن غالب

ہے کہ اگر جاپان چین میں یورپ کی نقل کرنا چاہے تو اسے امریکہ کا اثر روک سکے گا چین کی تاریخ میں پہلی صدی بدیقتیوں اور بے حرمتیوں کی صدی رہی ہے، کیا عجیب ہے کہ اگلی صدی خوفزدگی کی صدی ہو۔۔۔۔

اگر یورپ کا تفوق باقی رہتا تو غالباً ہم اپنے مخصوص طریقوں کا تکلیف دہ لباس سسٹم ایشیا کو پہنا دیتے۔ لیکن ہمارا تفوق ختم ہو چکا۔ ہماری نیابتی حکومت، ہماری شخصی سربراہی ہمارے تعلیمی طریقوں کا بھرم بھی ساتھ ہی اٹھ جائے گا اور ریل تار، ٹیلیفون کے ساتھ طاقت کرنے کے لئے ایشیائی قوانین غالباً اپنے مخصوص طریقہ پر جماعتی تبدیلیوں کی کوشش کر لگی۔۔۔۔۔ چین، جاپان اور ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر جماعتی اور معاشی تجربے ہوں گے جن کا مقصد ایک نئی اور وسیع ترجاعت بندی کی مخصوص شکلیں پیدا کرنا ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی چونکہ بہت سی زبان بولنے والوں میں تقسیم ہے اور اس میں تعلیم کی مساوات بھی نہیں اس لئے یہ شاید جلد ایسا اتحاد پیدا کر سکے جیسے کہ چین۔ دنیا کا ایک بڑا حصہ جس میں ایشیا کے شمالی حصے شامل ہیں یعنی روس اسی قسم کا تجربہ اس وقت کر رہا ہے اور اگرچہ ہم اشتراکیت کی پہلی بھونڈی اور سخت کوشش کی ناکامی کا ذکر بہت شتے سے کرتے ہیں تاہم یہ سمجھنا نہایت درجہ حاققت ہوگی کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ روس پھر ۱۹۱۷ء کے معاشی سیاسی اور جماعتی طریقے اختیار کرے۔ تجربہ کرنے والی حکومت ابھی موجود ہے، تجربہ کا جذبہ موجود ہے، تجربہ کی شدید ضرورت موجود ہے۔۔۔۔ اور فرانس کی بند بزم قوم کے بڑے حصہ کو وہی بات یاد کر رہی ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس کو یاد کرانی گئی تھی یعنی یہ کہ انکے لئے ہمارا موجودہ جماعتی اور معاشی نظام سرابا برابہ اور بہتر ہے کہ جب ختم ہی ہوتا ہے تو تجربہ کرنے میں جان دیکھائے۔ بجائے اس کے کہ کچھ کئے بن جان جائے بیشک اشتراک کی پہلی کوشش ناکام ہو چکی۔ لیکن دریائے ربان اور سواحل بحر الکاہل کے درمیان ایک نئی اشتراکی کوشش کا امکان ہی نہیں ظن غالب باقی ہے جس نے پچھلی

کوششوں سے بہت سے سبق سیکھ لئے ہوں گے، جس نے شدید تعلیمی کوشش کی ضرورت جان لی ہوگی اور تعمیر میں غور و فکر، رایوں میں سمجھوتہ، اور اختلاف کرنے والوں سے رواداری کے لزوم کو خوب پہچان لیا ہوگا۔ اور اگر روس جیسے تیسے حرپڑ کر ایک تعلیمی جمہوریہ بن گیا جو اور سب حکومتوں سے زیادہ اشتراکی ہوگی تو اس کے محض چل جانے سے اور اس کی کامیابی سے جسمانی پر بہت افزا ہوئے گا اور جاپان اور چین بھی اس مثال سے غیر متاثر نہیں گئے۔

## غزل

(از حضرت بگل)

بر باد می پارس ازاں سینہ دکاے	در عین بہاے کہ جدا شد ز بہارے
دیدم بہ در دیر عجب شعبده کاے	مینخانہ بدوشے و گشتاں بکتارے
چیزے منکر بر تن لاغر ز بہارے	افسانہ پارس ز نوک سرخارے
آنکھ سر مرزا گشت کہ شنیم بہ سرشاخ	شنیم سر شاخست کہ منصور بدارے
بیل مہن تن خوں شد و گل شد بہ تن چا	لے ولے بہاے اگر نیست بہاے
صد بار گزشتیم زہر مرعلہ عشق	حیرت بہاں طرز واد آئینہ داکے
اغیار بدل شدہ زبان دل ہو مشغول	فلکے پس دیوانہ دیوانہ بکاے

لے سر د خوبان نظرے کن ز سر مہر

افتادہ بکویت جگر سینہ دکاے

# خطابِ بہلم

(از حضرت اصغر)

کہاں لے سلم گزشتہ تو محو تماشا ہے  
 مجھ کو کفر بھٹی جنبش ہو تیری زلف برہم کی  
 جہاں آب و گل میں ہر شرار زندگی تجھ کو  
 تجھی کو اس جہاں میں جو بنا آئینِ نکلت کی  
 نہ روابطِ دینِ کامل کے لئے ہیں تیری تانیں  
 تجھی کو دیکھتا ہوں روحِ اقوام و مذاہب میں  
 فرشتوں نے وہاں پر حرزِ جاں اسکو بنایا ہو  
 جو ہو للہیت تو دینِ نبیاتی ہے یہ دنیا  
 فرائض کا رہے احساسِ عالم کے مظاہر میں  
 نو اسنج غزل کو کیا غرض ہو دینِ حکمت کی

جب اس آئینہ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہو  
 فضاے حسنِ یاں۔ انکاسِ رو کیا ہو  
 تری ذاتِ گرامی ارتقا کا اک ہیوا ہو  
 کہ سب سے کی بدولت اصطلاحِ جامِ دنیا ہو  
 تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام پسنا ہو  
 یہ رازِ زندگی سن لے کہ ہر قطرہ میں دیا ہو  
 فرازِ عرش پر تیرا ہی کچھ نقشِ کف پا ہو  
 اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر دنیا ہو  
 یہی عارف کا مقصد ہو ہی شاع کا ایما ہو  
 یہاں تو نہ نفس سرشارِ گلیاں گئے معلّٰی ہو

# کنیڈا سے سبق

کنیڈا کی حکومت خود اختیاری کی جدوجہد کی تاریخ ہندوستان کے لئے بہت کچھ سبق آموز ہے۔ جس طرح یہاں مذہب کے 'قوموں کے' اور زبان کے اختلافات ہیں اسی طرح کنیڈا میں بھی یہی اختلافات موجود تھے اور ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں کنیڈا کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کسی طرح کی روک نہ ثابت ہو سکیں۔ باہمی عداوتوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے ایک وقت یہ خیال بہت کچھ یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کنیڈا ضرور دو حصوں میں منقسم ہو جائیگا اور کوئی ایسا آئین سیاسی نہیں بنایا جاسکیگا جس سے کہ جنوبی اور شمالی حصے جہاں دو مختلف قومی آبادیتیں متحد ہو کر ایک ہی نظام سیاسی کے ماتحت کام کر سکیں۔ مگر واقعات نے بتایا کہ جب اہل کنیڈا کو حکومت خود اختیاری کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس پر مجبور ہوئے کہ اپنے باہمی مذہبی اور قومی اختلافات کو رواداری کے ساتھ طے کریں اور اپنے بانوؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے وہ اس مرتبہ سے ظاہر ہے جو کنیڈا کو آج نہ صرف برٹش ایمپائر بلکہ دنیا کی سیاسیات میں حاصل ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جمعیتہ الاقوام کی مستقل انتظامی کمیٹی میں کنیڈا کے نمائندے کو مثل دیگر بڑی بڑی سلطنتوں کے نمائندوں کے جگہ دی گئی ہے۔

کنیڈا میں پہلے جو یورپین قوم جا کر آباد ہوئی وہ فرانسیسی تھی۔ سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں فرانس کے تباہ شدہ امرا و افسران اور دیگر انخاص کو گورنمنٹ فرانس نے کنیڈا میں زمین دیکر ترک وطن پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے جو اپنی مملوک الحالی اور اپنے وطن میں ٹپکس کی زیادتی کی وجہ سے تنگ آئے ہوئے تھے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور جنوبی کنیڈا میں جا کر سکونت اختیار کرنا شروع کی۔ ابتدا میں وہاں کے اصلی جنگجو باشندوں کے خوف سے یہ لوگ زیادہ تر

ساحل سمندر کے قریب رہے لیکن رفتہ رفتہ اندرون ملک میں پھیلتے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ فرانس سے کچھ پادری بھی گئے جنہوں نے حسب معمول دسواں حصہ آمدنی کا ان نوآبادی لوگوں سے وصول کرنا شروع کیا اور کچھ گرجا وغیرہ قائم کئے۔ جو لوگ فرانس سے آئے تھے اُن کا مذہب رومن کیتھولک تھا اور یہاں آکر انہوں نے فرانسیسی قانون رائج رکھا اور زمین کی تقسیم بھی فیوڈل (نصیب داری) طریقہ پر۔ فرانسیسیوں کے جنوبی کنیڈا میں آباد ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد انگریز شمالی کنیڈا میں جو غیر آباد تھا آکر بسنا شروع ہوئے اور کچھ جنوبی کنیڈا میں بھی آکر آباد ہوئے۔ ان کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوئی۔ ان میں سے اکثر پیورٹن (Puritan)، فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جو رومن کیتھولک سے سخت تعصب رکھتا تھا۔ باقی پرتھینٹ تھے۔ یہ انگریز اس قانون کے جو انگلستان میں رائج تھا پائید ہوئے اور انہوں نے اپنا نظام سیاسی انگلستان کے نمونہ پر قائم کیا۔ اس طرح پر جنوبی اور شمالی کنیڈا میں دو مختلف قومیں آکر آباد ہو کر شروع ہوئیں جو مذہب میں نہ صرف جدا تھیں بلکہ جن میں سخت تعصب کی وجہ سے آپس میں بے حد کینہ تھی۔ ان کی زبان تاریخی روایات، قانون اور تمدن ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں فرانس اور انگلستان میں باہمی رقابت تھی اور جنگ چھڑی ہوئی تھی اس وجہ سے کنیڈا کے دونوں حصوں میں جہاں یہ قومیں آباد تھیں لڑائی رہی۔ ایک عرصہ کی لڑائی کے بعد فرانس نے ۱۷۶۳ء میں پیرس کے صلحنامہ کے مطابق جنوبی کنیڈا کو انگلستان کے حوالہ کر دیا۔ باشندگان جنوبی کنیڈا کو مذہبی آزادی ”جسٹک کہ قانون انگریزی اجازت دے“ دی گئی لیکن اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ کونسا قانون رائج کیا جائے گا یا فرانسیسی قانون جو اس وقت تک رائج تھا مروج رہے گا یا فاتح قوم کا قانون یعنی قانون انگریزی رائج کیا جائیگا۔ چنانچہ ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۱ء تک جس وقت پہلا آئین سیاسی کنیڈا کے لئے پاس ہوا گورنرانہ صوبجات اعلان شاہی کے مطابق حکومت کرتے رہے جس میں عدالتیں اور نظام عدالت کو انگلستان کے طرز پر ترتیب دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مگر یہ زمانہ حکومت زیادہ تر مطلق العنانی کا تھا اور اس سے

فرانسیسوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ بالآخر ۱۷۹۱ء میں انگریزی پارلیمنٹ نے پہلا آئین سیاسی پاس کیا جس میں فرانسیسیوں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی اور ان کو *Teal Act* یعنی رومن کیتھولک مذہب سے بیزاری اور بے تعلقی کے اظہار سے مستثنیٰ کیا گیا اور فرانسیسی سول قانون مردع کیا گیا۔ اس سے انگریزوں میں بے چینی پھیل گئی کیونکہ انگریزی قانون کو بدل دیا گیا تھا۔ یہ زمانہ وہی تھا جب امریکہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ ۱۷۷۶ء میں جب امریکہ کو آزادی ملی تو جو لوگ امریکہ کے خلاف لڑ رہے تھے ان کو دباں رہنا مشکل ہو گیا۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد جس میں گورنر اور دیگر افسران حکومت شامل تھے کنیڈا میں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ ان لوگوں نے جن کو ”متحدہ حکومت کے وفادار“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ان ہی حقوق کا مطالبہ شروع کیا جو ان کو بحیثیت انگریز ہونے کے حاصل تھے۔ جیسے جیسے ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ان کا پیمائش بڑھتا گیا۔ بالآخر ۱۷۹۱ء میں ایک اور آئین سیاسی پاس کیا گیا جس میں گورنریالٹنٹ گورنر کو آئینہ پمپلیٹو کونسل اور اسمبلی کی رکن کے مطابق قانون بنانے کی ہدایت کی گئی۔ لیکن گورنر کو ایسے قانون کی منظوری یا نامنظوری یا نا اطلاع موم گورنمنٹ محفوظ رکھنے کا پورا اختیار دیا گیا۔ کنیڈا کو دھڑوں میں منقسم کیا گیا اور ہر ایک کی کونسل اور اسمبلی جدا قائم کی گئی۔ شمالی کنیڈا کے لئے کم از کم سات اور جنوبی کنیڈا کی کم از کم پندرہ کی تعداد کونسل کے لئے مقرر کی گئی اور اسمبلی کے ممبران کی تعداد کم از کم سولہ شمالی کنیڈا کے لئے اور پچاس جنوبی کنیڈا کے لئے مقرر ہوئی۔ کونسل کے ممبران کا تقرر گورنر کی نامزدگی پر رکھا گیا اور اسمبلی کے ممبران کا تقرر بذریعہ انتخاب کے رکھا گیا۔

اس ایکٹ کا مقابلہ بہت کچھ ہندوستان کے ان اصلاحات سے ہو سکتا ہے جن کا نفاذ نمٹارے اسکیم کے مطابق ہوا جس طرح یہاں اسی طرح کنیڈا میں نیابتی حکومت بغیر دستار حکومت کے قائم کی گئی۔

اس خطرہ کا احساس کہ آئینہ پمپلر فرانسیسی جو جنوبی کنیڈا میں اکثریت میں تھے اپنی تعداد



سے فائدہ اٹھانے کو گورنمنٹ کو مشکلات میں ڈالیں گے گو رز کرکٹر کو ہوا اور اس نے ششہ میں لارڈ کینٹن ریک پر جو وزیر نوآبادیات تھے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا "لیڈران کنیڈا اس بات کا یقین رکھتے ہیں یا یقین رکھنا چاہتے ہیں کہ میاں جی ایک وزارت ہے اور انگلستان کے دستور عمل کی نظیر پر وہ وزارت اسمبلی کو جواب دہ ہے۔ یہ میرے لئے ضروری نہیں کہ میں یور لارڈ شپ کو ان نتائج سے آگاہ کروں جو ان خیالات سے پیدا ہوں گے۔"

اس قسم کی نیابتی مگر غیر ذمہ دارانہ حکومت کا نتیجہ ہمیشہ بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ کنیڈا میں اس بے چینی نے ایک کشمکش کی صورت درمیان گورنمنٹ اور فرانسیسیوں کے اختیار کی۔ کئی ایک گورنران کو اسمبلی کو متعدد بار برخواست کر دینا پڑا لیکن ہر ایک انتخاب کا نتیجہ ایک ہی ہوا یعنی اسمبلی میں مخالفین گورنمنٹ کی تعداد غالب رہی۔ ایک طرف ہو جب اسمبلی کا قیام ضروری دوسری طرف اسمبلی کے ممبران کی مخالفانہ روش سے گورنمنٹ کا جلال نامخت مشکل کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ انگریز جو جنوبی کنیڈا میں آباد ہوئے تھے وہ گو تعداد میں کم تھے لیکن با اثر اور خوشحال تھے۔ ان کو ہمہ ردی اپنے اہل وطن سے تھی اور اسمبلی اور گورنمنٹ کی کشمکش میں قدرتی طور پر وہ گورنمنٹ کے ساتھ تھے۔ اس وجہ سے فرانسیسی اور انگریزوں میں بھی مخالفت اور دشمنی شروع ہو گئی۔

اس کشمکش کے دوران میں بعض گورنران نے رواداری اور دلجوئی کی پالیسی بھی اختیار کی اور فرانسیسیوں کی مخالفت کو مختلف طریقہ سے مٹا، چاہا۔ اس پالیسی کا اثر فوری ضرور ہوا اور مخالفت کچھ مدت کے لئے ٹل گئی لیکن جیسے ہی ایسے گورنران کا دور حکومت ختم ہوا ویسے ہی مخالفت پھر شروع ہو گئی۔

اس کا اندازہ کہ جوش اور مخالفت میں ایک پارٹی جاویداً مطالبہ کرنے لگتی تھی اور اس کی کوشش کرتی تھی کہ اپنی بات کو منوائے سندھ جہ ذیل واقعہ سے ہو گا۔

۱۸۲۷ء میں اسمبلی نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کے ہر ایک ممبر کو یہ حق رہے کہ وہ جس معارف کے لئے چاہے روپیہ کا مطالبہ کرے اور جو کچھ تمام آمدنی و خرچ پر اسمبلی کا پورا اختیار ہو گا۔ ظاہر ہے

کہ قانونی طور پر ایسی کامیابی کا پہلا مرحلہ ہر اس سربراہ کا ہے جو کسی نیابتی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ روپیہ کے صرف کرنے کا طریقہ ہر ایک ممبر کی رائے پر منحصر ہو۔ ہر ممبر پر جو کہ انتظامی ذمہ داری نہیں ہوتی اس لئے وہ اس بات کا اندازہ نہیں رکھا سکتا کہ اس کا مطالبہ کہاں تک جائز ہو گا کیونکہ ہر ایک یہی خیال کر چکا کہ اس کی تجویز بہت ضروری ہے اور اسی پر روپیہ صرف ہونا چاہئے اسی لئے تمام ذمہ دار نیابتی جماعتوں میں روپیہ کی آمد و صرف کا اختیار انتظامی جماعت یا گورنمنٹ کو بشمول منظور کی کل جماعت کے دیا جاتا ہے۔ جزوی ترسیم البتہ ہو سکتی ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بیٹھ ہر ایک ممبر کی مرضی سے بنایا جائے۔ اگر اس اصول سے دیکھا جائے تو کنفیڈرل اسمبلی کا پہلا مطالبہ بالکل بجا تھا اور گورنمنٹ اس کو کسی صورت میں منظور نہیں کر سکتی تھی۔ برخلاف اس کے اس کا دوسرا مطالبہ بالکل بجا تھا لیکن چونکہ گورنمنٹ اور اسمبلی میں ٹکڑ ٹکڑی تھی اس لئے کوئی فریق بھی دوسرے کی بات کو چاہے وہ کتنی منقول کیوں نہ ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے اسمبلی کو برخاست کیا۔

اس وقت چونکہ جوش بہت بڑھا ہوا تھا اس لئے اس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر کے موافقین چھ ماہ سے زیادہ منتخب نہ ہو سکے۔ اس الیکشن کے بعد فرینسیس لیڈر پائینو کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا لیکن گورنر نے اس کو نامنظور کیا جب اسمبلی نے اسی کے صدر بنائے جانے کے متعلق ایڈریس پیش کیا تو اسمبلی کو پھر برخاست کر دیا۔ اس پر گورنر کے خلاف ایک زبردستی پیش اخبارات میں اور پلیٹ فارم پر برپا ہوا اور ایک درخواست گورنر کے خلاف جس برہت سے باشندگان کے دستخط کرائے گئے انگلستان بھیجنے کے لئے تیار کی گئی۔ اس کے برخلاف انگریز باشندوں کی طرف سے اسمبلی کی زیادتیوں کی شکایت کی درخواست مرتب کی گئی۔ چنانچہ انگریزی گورنمنٹ نے ایک کمیٹی تحقیقات کے لئے مقرر کر دی۔ گورنر ڈیلوزی نے چاہا کہ انگلستان کے دارالام میں جا کر اپنی صفائی پیش کرے لیکن ان کو ہندوستان کا لمانڈرائیجٹ بنا کر بھیج دیا گیا۔ ڈیلوزی کے بعد جو گورنر آئے ان میں سے اکثر نے فرینسیسیوں کی دہلوی کی کوشش کی۔

فرانسیسی لیڈر پائینو کو صدر منظور کیا گیا اور کچھ اور مراعات بھی دی گئیں لیکن پہلی کی کوشش برابر یہی رہی کہ اس کی مالیات پر پورا اختیار دیا جائے۔ اور اس کی یہ جدوجہد برابر جاری رہی کبھی اس میں زیادتی ہو جاتی تھی اور کبھی کمی جو زیادہ تر گورنر کے طرز عمل پر منحصر تھا۔

الغرض یہ کشمکش حاکم و محکوم کے درمیان ایک عرصہ تک رہی اور اس میں اکثر فرانسیسی لیڈر حلاوطن اور قید ہوئے۔ مگر بالآخر ان کی منتقل مزاجی رنگ لائی اور وہ اپنا مقصد پانے میں کامیاب ہوئے۔

کنیڈا کی حکومت خود اختیاری کی جدوجہد کی تاریخ سے ہندوستان بہت کچھ سبق حاصل کر سکتا ہے۔ کنیڈا کا دستور اصل جس سے وہاں حکومت خود اختیاری قائم ہوئی انگریزی پارلیمنٹ کا تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ اُس کا خاکہ خود کنیڈا کے تمام صوبوں نے ملکر طے کیا تھا اور اپنی اسکیم کو یکسر نمایندگان کنیڈا الڈن گئے تھے اور انگریزی پارلیمنٹ نے جزوی ترمیموں کے ساتھ اسکو منظور کیا۔ اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو حکومت خود اختیاری اگر وہ قوم خود تیار نہ ہو تو نہیں دے سکتی۔ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے اپنے میں قابلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہندوستانیوں کے سامنے اہل کنیڈا کی مثال موجود ہے۔ جس طرح یہاں قومیت زبان اور مذاہب کے اختلافات ہیں اسی طرح کنیڈا میں بھی یہ سب چیزیں موجود تھیں اور ہیں۔ لیکن یہ اختلافات کنیڈا کو حکومت خود اختیاری حاصل کرنے سے زیادہ عرصہ تک روک نہ سکے۔ کاش ہم لوگ بھی اس سے سبق حاصل کریں اور بجائے ایک دوسرے کو بُرا کہنے کے اپنے اختلافات کو باہم رواداری سے مٹانے کی کوشش اور متحد ہو کر اپنے ملک کی بہتری اور مسعودی کی سعی کریں۔

# ریل کی سڑک اور قبرستان

بیانسن، ناروے کی تاریخ ادبیات میں وہ پہلا صاحبِ قلم ہے جس نے امر کے طبقہ کو اپنے زور بازو سے ترقی کرنے کی یقین کی۔ اس کا سال ولادت ۱۸۵۷ء ہے۔

میں اُس کی شہرہ آفاق تصنیف ”آرنے“ منظر عام پر آئی، یہ افسانہ دنیا سے ادب میں ایک دفن شدہ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، قصہ کا موضوع قتل و غارتگری ہے۔ وہ اپنے وطن کی جمہوری پارٹی کا قائد اعظم تھا۔ اور وہی ناروے اور سویڈن کی متحدگی کی سیاسی تحریک کا علمبردار بنا۔ نقادوں نے کہا ہے کہ ”اپنے اہل ملک کے مجمع کے اندر محض اُس کے نام کا تذکرہ گویا علم قومی کو بلند کر دینے کے ہم معنی ہے!“

اُس کی ادبی زندگی دو جدا جدا دوروں میں تقسیم ہے: پہلے دور کی تحریریں مذہبیت اور عشق پر ہیں، انہی کے ذیل میں اُس نے ناروے کا ترانہ ملی بھی لکھا۔ دوسرے دور کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جبکہ اُس کے تنہا میں زیادہ وقت اور تقادیم پیدا ہو گئی تھی اور طرزِ عمل میں زمین و آسمان اور مبارک و ظلمی انکی تھی۔ زبردتِ تخیل، عشقِ صداقت، مغرور مگر مخلصانہ جوش سے اُس کی علمی نگارشات مایہ دار ہیں۔ بیانسن کو ”ادبیات ناروے میں قومی ڈرامے کا خالق“ کہا گیا ہے، اُس کے دیگر ادبی خطابات و القاب یہ ہیں :-

”ابسن ثانی“

”ناروے کا دیکھ رہو گو“

(۱)

نڈا کرے کلبانی حلقے کے ایک قدیم خاندان کا فرد تھا جو رفاہ عام کے کاموں میں

اپنی قابلیت اور انہماک کے لئے مشہور تھا۔ اُس کے باپ نے بہت جلد وجد کر کے اور مشکلات و شدائد کی بہت سی منزلیں طے کر کے پادری کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ شخص ابھی حال میں مرچکا تھا اور چونکہ بیوہ ایک دستہ فانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لئے بچوں کی پرورش اسی قسم کی آپے ہوئی ہوئی تھی، چنانچہ ننڈ کو بھی اُس تعلیم سے زیادہ کوئی تعلیم میسر نہ آئی جو عام طور پر سرکاری مدرسوں کا مبلغ علم ہوتا ہے۔ لیکن ننڈ کے باپ کے نانگی کتب خانہ نے اس بچے کے اندر اُس عطیہ ہی میں علم کا ذوق پیدا کروا دیا تھا۔ اس اشتیاق علمی کو مزید تحریک دیرجلینڈ کی طرف سر ہوئی، چونکہ دوست تھا اور اکثر اُس کے ہاں اُس کی آمد و رفت تھی۔ یہ شخص اس نوجوان کو زراعتی نظم کے علاوہ کتابیں بھی بھیجتا اور عام طور پر انکے معاملات میں اپنے مشورہ سے قابل قدر امداد بھی پہنچاتا۔ چنانچہ دیرجلینڈ ہی کی اثر آفرینی سے ننڈ نے ابتدائی میں ایک کلب قائم کر دیا۔ جس کے اغراض و مقاصد آغاز افتتاح کے بعد ایک عرصہ تک بہت ہی ہمہ گیر اور گونا گوں قسم کے رہے، چنانچہ بطور مثال کے یہ واقعہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”خطابت و مناظرہ کی مشق سے لیکر دستور حکومت کا مطالعہ تک اُس کے حلقہ کاریں داخل تھا! لیکن جو بعد کے دور میں ایک عملی قسم کی ”مجلس فلاسین“ کی شکل میں تبدیل ہو گیا جو گرد و پیش کے تمام زرعی علاقہ کے لئے ایک استفادہ گاہ تھی۔ دیرجلینڈ ہی کے قریب ارشاد میں اُس نے ایک کتب خانہ کی بھی گرجا کے اندر بنوایا ڈال دی، اور اپنے باپ کا ذخیرہ کتب اس نو بنیاد دارالمطالعہ کو اس کے ”ایون عطیہ“ کے طور پر نذر کر دیا! اسی دائرہ علمی کی ایک دوسری تجویز کو لیبیک کہتے ہوئے اُس نے اپنی ملوکہ آراضی پر ایک ”سنڈے اسکول“ (اتوار کا مدرسہ) بھی قائم کر دیا تاکہ جو لوگ نوشت خواند، حساب کتاب، اور تاریخ وغیرہ مضامین پڑھنا چاہیں انکی ضروریات کو یہ درس گاہ پورا کرے۔ ان بچے درپے خدمات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ ننڈ کی ذات کی طرف منطف ہوئی چنانچہ اس رسوخ ہرولڈ غریزی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ گرجا کی جامعیت نگران کار کا ممبر منتخب ہو گیا اور پھر بہت جلد اُس کی صدارت کے منصب پر فائز ہو گیا! ان اختیارات و حقوق کے ساتھ وہ

مدارس و کتاب کے معاملے میں بہت عین دلچسپی لینے لگا۔ نڈ کی نگرانی و رہنمائی میں ان تعلیم کاہلوں نے بہت نمایاں ترقی کی اور وہ بہت فروغ و اوج پا گئیں !

نڈ اگرے ایک بہت قامت، چست و چابکدست، اپنی حرکات و سکنات میں بہت تیز و شباب کا شغص تھا۔ اس کی آنکھیں بچپنی کا آئینہ تھیں اور کاروبار میں غیر معمولی انہماک و عہدیم الغرض کی وجہ سے اس کے بال ہمیشہ پریشان اور نا آشنائے شانہ رہا کرتے تھے۔ اس کے ہونٹ بڑے بڑے تھے۔ جو دائمی حرکت و ارتعاش میں رہتے تھے خواہ بصورت اور مضبوط دانتوں کی قطاریں پیچھے سے نظر آتی تھیں، اور جس وقت نڈ کے منہ سے صاف اور واضح لب و لہجہ میں الفاظ نکلتے تھے تو براق اور جلا دار دانت ایک برق و شس انداز میں اس طرح چمک جاتے تھے جس طرح جلتی ہوئی لکڑی میں سے شرارے چمک چمک کر اڑتے ہیں !

اس کے حلقہ تربیت میں جو شخص سفادول میں تھا اور جو اس کی تعلیم و فیضان سے سب سے زیادہ متفید ہوا تھا وہ اسکا ہمسایہ لارنس ہگسٹڈ تھا۔ لارنس کی عمر نڈ سے کچھ ہی کم ہوگی لیکن اس کی رفتار آخر الذکر کی طرح؛ دو برق کی طرح نہ تھی۔ نڈ کے مطالعہ میں جو جو چیزیں آتی تھیں یا جو جو خیالات اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے تھے ان پر وہ لارنس کے سامنے گفتگو کرنے میں ایک خاص ذوق محسوس کرتا تھا کیونکہ یہ شخص جو ایک خاموش ذہین اور صبا فکرا آدمی تھا نڈ کے خطبات کو ہمہ تن گوش ہو کے سنا کرتا تھا۔ اس استفادہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارنس ایک صائب الرائے شخص بن گیا۔ دونوں کے تعلقات اس قدر بڑھے کہ جب تک نڈ لارنس سے پہلے استمراج نہ کر لیتا تھا کسی اہم کام کا اقدام نہ کرتا تھا۔ باہمی صلاح و مشورہ کے بعد نڈ کی ابتدائی تجویز میں اکثر بہت کچھ ترنیم و تنسیخ اور قطع و برید ہو جایا کرتی تھی ! اب نڈ نے اپنے اس محرم راز اور بار خاں کو کلیسا کی جمعیت نگران کار میں بھی داخل کر لیا، اور رفتہ رفتہ ایک عرصہ کے بعد لارنس ہر اس کام میں شریک و شہیم ہو گیا۔ جس میں نڈ کا کوئی حصہ ہوا وہ ہمیشہ

ساتھ ساتھ جمعیت کے جلسوں میں شرکت کے لئے جایا کرتے تھے۔ جلسوں کی ہنگامہ آرائیوں لائرس بھی تحریر کرتا تھا، لیکن گھر سے جلسہ تک کے راستہ میں دونوں طرف ہڈاؤں کے آرا، خیالات معا زیر بحث کے متعلق معلوم کیا کرتا تھا۔ دونوں ہمزاد دوست ”ایک جان دو قالب“ سمجھے جاتے تھے!

موسم خزاں میں ایک دن جمعیت کلیسا کا جلسہ طلب کیا گیا جس کا موضوع فکر و بحث دیگر مسائل کے علاوہ ایک تجویز تھی جو ناظر کی طرف سے موصول ہوئی تھی اور جس کا منشا یہ تھا کہ اگر جا کے اناج کے ذخیرہ کو فروخت کر ڈالا جائے اور اُس سے جو رقم حاصل ہو اُس سے ایک چھوٹا سا سیونگ بنک (خزینہ پس انداز) قائم کیا جائے۔ ہڈا کرے جو سیر مجلس تھا بلاشبہ اس تجویز کو قبول کر لیتا بشرطیکہ اس کو صاحب تجویز کی اصابت رائے اور خلوص نیت پر اعتماد ہوتا، لیکن وہ اس معاملہ میں بہت غیر مطمئن تھا، کچھ تو اسی وجہ سے کہ تجویز کی تحریک ناظر کی طرف سے ہوئی تھی جس کو وہ جیلینڈ اچھا آدمی نہ سمجھتا تھا اور جو لامی لائنڈ کا بھی کبھی منظور نظر نہ ہو سکتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ غلہ کا یہ ذخیرہ خانہ ہڈے کے دادا کا قائم کیا ہوا تھا اور اُسی نے اُس کو اگر جلے کا نام وقف کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہڈا کچھ اس خیال کی طرف مائل ہو رہا تھا کہ ناظر کی اس تجویز میں ایک شرارت مضمر ہے اور اُس کا مقصود ہڈے کی توہین کرنا ہے!

بہی وجہ تھی کہ ہڈے نے اپنے خدشات کا ذکر کسی سے کرنا مناسب نہ سمجھا، خود لائرس سے بھی اس نے ان خیالات کو صیغہ راز میں رکھا! اور جیسا کہ معلوم ہے لائرس کی یہ عادت تھی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر لب کشائی کرے جس کی سلسلہ ضیائی پہلے کسی اور نے نہ کر دی ہو!

خیر جلسہ منعقد ہوا اور صدر مجلس ہڈا کرے نے تجویز ہڈے کو کسی ذاتی رائے نہ دینی! اضافہ کے پڑھا، لیکن حسب معمول اُس کی آنکھیں لائرس کو ڈھونڈ رہی تھیں، جو وہیں کہیں بیٹھا یا کھڑا ہوا ہوتا تھا۔ لائرس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ وہ ایک فنکار اپنے دانتوں میں کپڑے

رہتا تھا، جب کبھی وہ ٹٹکھو کرتا ہوتا تھا تو اُس کا منہ کبھی اس تنکے سے خالی نہ ہوتا تھا! اس تنکے کے دو مصرف تھے: یا تو وہ معمولی ”دندان کن“ کا کام دیتا تھا یا یونہی لارس کے منہ کے کسی گوشہ میں پڑا رہتا تھا اور جس وقت وہ تیزی سے گرم قفسیر ہوتا تھا تو یہ شکا اسی کی مناسب تیزی سے گردش کرتا تھا اور جس موضوع گفتگو میں وہ کسی جوش و جذبہ کو محسوس نہ کرتا تھا تو اس میں تنکے کی حرکت بھی آہستہ ہوجاتی تھی! بڑے آج جیلے میں جو لارس پر نظر ڈالی تو وہ یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ رہ گیا کہ تنکے کا آلہ معیاس الحارث بڑی تیز گزریں کر رہا ہے! اور یہ دائمی تلاطم کی علامت تھی!

”تمہارا کیا خیال ہے؟ ہیں اس تجویز کو منظور کر لینا چاہئے؟“ بڑے نے آخر پوچھا۔

لارس نے جڑی بنے فکری ادربے اقتنائی سے جواب دیا: ”بیشک“۔

سارا جلسہ جو اس راز سے آشنا تھا کہ بڑے کے اس معاملہ میں کیا خیالات ہیں۔ لارس کی اس رائے پر مبہوت و حیران رہ گیا! لیکن لارس نے اس کے سوا کچھ اور نہ کہا اور نہ اُس سے پھر اس پر کوئی مزید توجیہ طلب کی گئی۔ بڑے نے حفا ایک دوسری بحث پیشر دی گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں! اور پھر اُس نے اُس وقت تک اس معاملہ کو زیر بحث لانے کے لئے دوبارہ پیش نہ کیا جب تک جلسہ کا وقت باطل ختم ہونے کے قریب نہ آگیا، اور پھر نظر ہر بلا کسی تعلق خاطر کے ایک تباہل عارفانہ کے ساتھ حاضرین جلسہ کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا یہ قرین مصلحت نہ ہوگا کہ اس تجویز کو خاطر کے پاس واپس بھیجا جائے تاکہ وہ اُس پر مزید غور اور نظر ثانی کر لیں اس لئے کہ یہ تجویز عام طور لوگوں کے لئے پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ وہ غلہ کے گودام کو اپنی ایک قیمتی متاع سمجھے ہیں کسی شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسپر بڑے نے سوال کیا کہ آیا میں اس ریزولوشن کو دھل دینا کر دوں؟ بہتر ہے کہ اُس کی نسبت مجلس یہی فتوے صادر کر دے کہ یہ کوئی دانشمندانہ تجویز نہیں ہے۔

”مگر ایک اختلافی رائے کو بھی درج کر لیجئے“ لارس نے کہا۔



”نہیں دورایوں کو“ ایک دوسرا شخص فوراً بولا۔

”نہیں تین کو“ ایک تیسری آواز آئی !

اد قبل اس کے کہ صدر جلسہ اس ناگہانی انقلاب کو محسوس کر سکے مجلس کی اکثریت نے تجویز

کے حق میں رائے دیدی !

نڈ بالکل سرا سیمہ ہو گیا ! اُس کے حوا اس ایسے بانٹے ہوئے کہ وہ مخالفت وغیرہ کرنا سب بھول گیا ! اُس نے جلسہ کی روداد کو قلمبند کر لیا اور آہستہ آواز میں اس فیصلہ کا اعلان کیا :  
”تجویز ملتوی کیجاتی ہے“

اس کا پہرہ سرخ ہو گیا اور اسپر شمنائی کے آثار طاری ہو گئے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور مجلس کی ”کتاب روداد“ میز پر پٹکی دی ! وہ مجلس نمائندگان کے ایک دوسرے جلسہ میں اس سوال کا ایک مرتبہ پھر اٹھا اچاٹا تھا۔ باہر صحن میں جا کر اس نے گھوٹے کو گاڑی میں جوڑا اور لار اس کے پہلو میں اپنی معلومہ نشست پر آکر بیٹھ گیا باگھر جاتے ہوئے مختلف مسائل پر ان کی گفتگو ہوتی رہی لیکن اس بحث کو جو ہر لمحہ دونوں کے پیش نظر تھا ذرا بھی مس نہ کیا گیا !

دوسرے دن ٹڈ کی بیوی لار اس کی بیوی کی تلاش میں نکلی تاکہ معلوم کرے کہ آیا ان دونوں کے درمیان کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے اس لئے کہ اُس نے محسوس کیا تھا کہ گھر آکر آج نڈ نے کچھ عجیب حرکتیں کیں ! تھوڑا راستہ طے کرنے پر اس کو لار اس کی بیوی مل گئی جو خود بھی اُسی کے پاس آ رہی تھی اور اُس کی ملاقات کا مقصود بھی اسی سے حاصل کرنا تھا، اس لئے کہ اُس نے بھی اپنے شوہر پر اُس روز خلاف معمول بعض کمفیات و واردات دیکھی تھیں !

لار اس کی بیوی ایک خاموش، شرمیلی عورت تھی۔ وہ کسی قدر ڈرنے والا مزاج بھی رکھتی تھی اور اس خوف کا احساس وہ سخت الفاظ کو سن کر اس قدر نہ کرتی تھی جس قدر کہ لوگوں کی خاموشی اُس کے لئے مرعوب کن ہوتی تھی ! لار اس کے اصول و راسخائی کا اُس کے ساتھ ہر گز تھا ! بخلاف اس کے ٹڈ کی بیوی اُس کے ساتھ نسبتاً زیادہ مانوس تھی۔ وہ آزاد دی سے ہنس

کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی، اور اپنے شوہر کے ساتھ اس کی بات چیت کا موضوع اکثر یہ مجلس  
 نائین ہی ہوتی تھی کیونکہ ابھی چند روز سے نڈا اُس کی کارروائیوں میں زیادہ ہنہک نظر آتا تھا اور  
 اُس کی مصروفیتوں کا بیشتر حصہ انہیں سرگرمیوں کی نذر ہوتا تھا؛ نڈی کی بیوی اپنے شوہر کی ان  
 عظیم الغرضتوں میں اپنی محبت کے لئے ایک گونہ بے اعتنائی مشاہدہ کر رہی تھی اور یہ بھی دیکھ  
 رہی تھی کہ وہ بچوں کی فکر سے بھی غافل نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ اس انجمن کے ساتھ ایسی ہی رشتہ  
 رکھتی تھی جیسی کہ کسی عورت کو کسی عورت کے خلاف ہوا کرتی ہے! وہ راتوں کو اس ”سومنی“  
 انجمن کا خیال کر کر کے رو یا کرتی اور انہیں اپنے شوہر سے اُس کا ذکر کر کے جھگڑا کیا کرتی! اسی وجہ  
 سے آج کہ پہلی مرتبہ نڈا اپنی اس محبوب مجلس سے کبیدہ خاطر لوٹا تھا، اُس نے خود اُس سے اس  
 کی بابت کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس واقعہ سے بڑے بھی زیادہ  
 خلیان و خلش محسوس کرنے لگی اور جب تک وہ اس تمام ماجرے کو معلوم نہ کر لے وہ چین سے بیٹھو  
 والی عورت نہ تھی؛ چنانچہ جیب لارس کی بیوی نے بھی اپنی لاعلمی ظاہر کی اور مطلوبہ معلومات اُس کو  
 حاصل نہ ہوئیں تو وہ گرجا کو دوڑی ہوئی گئی تاکہ وہاں کچھ اس کا پتہ لگا سکے۔ خیر یہاں اگر اُس کو  
 یہ حقیقت معلوم ہو گئی۔ قصہ کی نوعیت سے خبردار ہو کر وہ فوراً اپنے خاوند کی رائے کی ہمت  
 ہو گئی اور اُس نے اپنے دل میں کہا کہ لارس اگر شرارت نہیں کر رہا ہے تو کم از کم اُس کا طرز عمل  
 ناقابل فہم تو ضرور ہے! لیکن جب اُس نے نڈا کے سامنے اُسکی وکالت کی تو اُس پر یہ حقیقت  
 بے نقاب ہوئی کہ دونوں کے دلوں میں اب بھی کوئی سیل نہیں ہے اور نڈا اب بھی اُسی گرجا  
 کے ساتھ لارس سے وابستہ محبت ہے!!

آخر کار مجلس نائین کا اجلاس ہوا۔ اُسی دن صبح کو لارس ہاسٹیل گارڈی میں سوار ہو کر  
 آکر سڑک کے ہاں پہنچ گیا، نڈ بھی ہر آگیا اور لارس کے بازو میں گارڈی میں بیٹھ گیا۔ دونوں کے  
 درمیاں روزمرہ کی معمولی صاحب سلامت ہوئی۔ لیکن اور دونوں کے مقابلہ میں وہ آپس میں  
 کم بھلاؤ ہوئے، اور مسئلہ معلومہ کے متعلق تو ایک حرف بھی زبان پر نہ آیا مجلس کے سارے ارکان

آج حاضر تھے، بعض دوسرے لوگ تماشائی کی حیثیت سے بھی آئے تھے؛ لیکن نڈے غیر خوشگوار  
سے اس بات کو دیکھا کہ نگہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ شہر میں مام طور سے اس معاملہ کے متعلق  
اشتقاق و کچپی کا اظہار کیا جا رہا ہے! اور اُس کی کافی تشہیر ہو چکی ہے!

لارنس حسب معمول اپنے ”تکے“ سے مسلح تھا، وہ آتش دان کے قریب کھڑا ہوا تھا اس لئے  
کہ اب سردی زیادہ پڑنے لگی تھی۔ صدر نے تجویز کو پڑھا، مگر ایک دبی ہوئی آواز اور مختلط الجھنیں!  
اور ساتھ ہی ساتھ اس ریارک کا بھی اضافہ کیا کہ ”یہ امر ایسا دیکھنے کے قابل ہے کہ اس تجویز کے  
مصنف ناظر صاحب ہیں جن کی طرف سے کچھ زیادہ احصاء رائے کی توقع نہیں کیا جاسکتی۔ حاضرین  
کو خوب معلوم ہے کہ یہ عمارت بطور ”عطیہ“ کے گر جا کو ملی تھی اور گر جا کی روایات میں اس قسم  
کے عطایا کا بیع و اتعال کی کوئی سابقہ نظیر نہیں، بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس غیر معمولی کارروائی  
کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو!“

لارنس جس نے اس سے پہلے کبھی کسی جلسہ میں تقریر نہ کی تھی اب پیٹ فارم (نمبر) پر  
آیا! سب لوگ تصویر حیرت تھے! اُس کی آواز کانپ رہی تھی، لیکن یہ بات کہ آواز کا یہ زلزلہ جڑ کے  
نیال کی وجہ سے تھا یا اس تشویش کی بنا پہ کہ اُس کی مخالفانہ سرکارانی کہیں ناکام نہ ثابت ہو، ہمیشہ  
ایک راز سرسبز رہے گی، لیکن اُس نے جو دلائل پیش کیں وہ معقول اور واضح تھیں اور اُن میں  
خوب ہی داد و منطقیت دی گئی تھی! مزید براں اُن سے ایک وثوق اور اعتماد نکلتا تھا جو اس سے  
قبل جمعیت کے کسی جلسہ میں پیشکل مشاہدہ کیا گیا تھا! اور جب اس نے بحث کے سارے مراتب کو  
طے کر لیا تو غامض سخن میں یہ الفاظ کہے:

”اس سے ہم کو کیا بحث ہونی چاہئے کہ تجویز کا! انسانی فطرت کے ایک اور؟ اس باطل  
خارج از بحث بات کا اصل بحث سے اتنا ہی تعلق جو جتنی کہ اس بات کا کہ عمارت کو فلاں شخص نے  
بنایا یا فلاں طریقے سے وہ پہلک (عامۃ الناس) کے قبضہ میں آئی!“

تھوڑا کرے کا چہرہ شرم و خجالت سے سرخ ہو گیا، وہ اس معاملہ میں بہت ذکی الحس مدافع

ہوا تھا۔ وہ بچہ کی حالت میں پہلو بدل رہا تھا۔ اضطراب کے عالم میں اس کی یہ کیفیت ہو جاتی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ ڈرنے اور رب کی بات کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اب بھی کافی دلائل اس کی تائید میں موجود ہیں، چنانچہ ایک اصولی استدلال یہی ہے کہ ملک میں سیزنگ بینک کافی تعداد میں ہیں، اور بعض انہیں سے بالکل قرب و جوار میں واقع ہیں۔ کہنا چاہئے کہ بالکل ہمارے گرد و پیش! لیکن اگر پھر بھی یہ ضروری اور قرین مصلحت سمجھا گیا ہے کہ ہمارا اپنا بھی ایک بینک ہو، تو یہ مقصد یقیناً دوسرے وسائل سے بھی حاصل ہو سکتا تھا اور اس کے لئے مرے ہوئے لوگوں کے اوقات کو بے مال کرنے اور زندوں کے حیات کو مجروح کرنے کی ضرورت نہ تھی! ”

چنانچہ اپنی تقریر میں جب وہ ان الفاظ پر آیا تو اس کی آواز میں ایک ارتعاش اور رقت پیدا ہوئی! لیکن وہ جلدی سنبھل گیا اور غلہ کے گودام کے اسل محور بحث سے ہم ربط ہو گیا اور اس کو قائم رکھنے کے فوائد و مصالح بیان کرنے لگا۔

لارنس نے اسی آخری امرِ زامی کو اپنے جواب الجواب کا آماجگاہ بنایا اور پھر کہا:

”بہر حال ایک بات ایسی ہے جس کی وجہ سے مجھ پر یہ امر شبہ ہو گیا ہے کہ اگر جا اور اس کی جائداد کا نظم و نسق زندوں کے فائدے کے لئے کیا جاتا ہے یا اس کی رہنمائی مردوں کے مصالح کرتے ہیں؟! نیز یہ کہ کسی ایک خاندان کی محبت یا نفرت کے جذبات معاملات کا انصرام کرتے ہیں یا عامۃ الناس کا سود و بہبود اس میں مد نظر ہوتا ہے؟!

اس پر بڑے فوراً بولا کہ: ”میں نہیں جانتا کہ جس شخص نے ابھی تقریر کی ہے وہ اس خاندان سے کچھ کم استفادہ ہوا ہے، اور اس خاندان کے مردوں اور زندوں کی طرف سے!“

ترکش کے اس پہلو تیر کا نشانہ یہ حقیقت تھی کہ بڑے دادا کے طفیل میں لارنس کے دادا کی آرامی غائی گئی تھی اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ آخر الذکر ایک کلیسائی توبہ گاہ کی زیارت کو گیا ہوا تھا۔

جو بڑا لارنس کے منہ میں تیزی سے متحرک تھا، یکبارگی ساکن ہو گیا!

”میرا یہ طریق نہیں کہ اپنی ذات اور اپنے خاندان کے قصیدے ہر جگہ پڑھتا پھردں!“ لارس نے کہا اور اُس کے بعد سکون اور وقار کے ساتھ نفسِ مضمون کی طرف رجوع ہو گیا اور اہل ہونوئے سخن کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام نقاطِ بحث پر از سر نو تبصرہ کیا۔

نڈنے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ اُس نے اس معاملہ پر اتنی وسیع المشربی سے کبھی نظر نہ ڈالی تھی۔ بے اختیار اُس کی آنکھیں اٹھیں۔ اور لارس سے دو چار ہو گئیں! لارس اس کے سامنے ہی اپنے بلند و بالا قد اور بھاری بھرکم جسم کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اُس کی چشمِ دابروے ایک قوتِ ایمانی ہوید اُٹھی! ہونٹِ منتی سے بھیجے ہوئے تھے اور نکابِ ابھی منہ کے ایک گوشے میں مصروفِ گردش تھا! چہرے کے ان تمام آثار و علامات سے عزم و وثوق ظاہر تھا۔ اُس کے ہاتھ نپٹ کی طرف تھے اور سر پوری طرح بند تھا! اُس کی آوازیں اس درجہ گہرائی تھی کہ وہ ”اعلاقِ قلب“ کو کیا ”قلبِ زمین“ سے نکلتی معلوم ہوتی تھی! نڈنے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس کو اس ”شانِ جلال“ میں دیکھا اور اس پر ہیبتِ منظر سے سچ سج اُس کی روح لرز گئی! اس نے محسوس کیا کہ واقعی اس شخص کی فطرت مجھ سے بہت بلند ہے! جتنی جو کہ جانا تھا اور اس کو سکھا سکتا تھا وہ سب اُس نے جذب کر لیا تھا، اُس نے اس علم و تعلیم کے سارے فضلے کو چھانٹ دیا تھا اور اُس منہ کو لے لیا تھا جس نے پوشیدہ روح کی یہ زبردست نشوونما کی تھی! نڈنے واقعی محبت سے اُس کی پرورش اور تربیت کی تھی لیکن اب لارس کے سینہ میں ایسا زبردست اور پر جلال دل تھا جو نڈ کی کوئی ہستی نہ سمجھتا تھا اور اس کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا! نڈ اس راز کی کوئی شفنی بخش تشریح نہ کر سکتا تھا لیکن جب وہ لارس پر نظر ڈالتا تھا تو وہ اس حقیقتِ نفسِ الامری کا شاہدہ ضرور کرتا تھا! اس وقت وہ انہی خیالات میں بالکل غرق ہو گیا اور پھر یکبارگی چونک کر بولا:

”لیکن لارس! اولاً اُس! خدا راجا! کہ تم کو کیا ہو گیا؟“ اُس کی تقریر اُس کے اضطرابِ قلب سے متلو بہو گئی، وہ متعلق جیسے اس طرح کہہ کر رہ گیا، ”تم جس کو میں نے — تم جو —“

اُس کی زبان گزشتہ ہو گئی اور وہ ایک لفظ بھی درآمد کرنے سے قاصر ہو گیا! لیکن اپنے غیض و غضب پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں اُس نے اپنی مصنوعی زبان حال سے لارس کو ناقابلِ اتفات ظاہر کیا۔ اُس نے زور سے اپنی مٹھی میز پر ماری اور اُس کی گھنی ابرو والی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے!

لارس نے اس خطاب و عتاب کو باطل نذر تغافل کروا دیا اور اپنے انداز سے کسی تشویش کا اظہار نہ کیا اور پھر حاضرینِ جلسہ کی طرف رخ کر کے پوچھا کہ ”کیا میرے دوست کی یہ آخری زور آزمائی ہے؟ اور اگر انکے دلائل و براہین کی یہی کل کائنات ہے تو مجھ کو اس کے ردِ الرد میں کچھ کہنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی!

دقار و اطمینان کا یہ مظاہرہ بند کے لئے ناقابلِ برداشت تھا!

”میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہم کو آخر یہ ہو کیا گیا ہے؟“ نڈ نے آخر کار کہا، ”کیا راز ہے کہ ہم جو اب تک آپس میں ایسے دلولہ محبت سے سرشار رہے۔ اب ایک دوسرے سے اس طرح دست و گریباں ہو رہے ہیں، گویا کوئی بھوت ہم پر سوار ہو گیا ہے!“ یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک تیش بنگاہ غلط انداز لارس پر ڈالی!

لارس نے اُس پر کہا:

اس بھوت کے تمہیں مرکب بنے ہو، جیو! کیونکہ تم نے دیکھا کہ میں سختی سے معاملہ زنجیت سے وابستہ رہا اور اُسی کے عیب و صواب اور نشیب و فراز پر نظر ڈالی، لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ جس چیز کو تم پسند نہ کرو اُس کے فوائد کو کسی طرح تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اچھا اب اگر یہ معاملہ ہم ب کے حسبِ صواب دیکھو ہو جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہماری سابقہ محبت و خلوص اب بھی کیسے قائم نہیں رہتا ہے!“

اچھا تو کیا میں نے گرجا کے مصالح کے خلاف کوئی بات کی ہے؟“ نڈ نے کہا۔

لارس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نڈ اس سکوت پر طبل ہوا اور اُس نے کہا کہ:

”میں سچ ہی اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ میں نے بہت سے کام نئے انجام دے دیے ہیں۔ بہت سے ایسے کام جو گرہا کے اغراض و مقاصد کے لئے فیض سے خالی نہ تھے، لیکن شاید میرے نفس نے جھکودھوکہ دیا!“

اتنا کہہ کر وہ اپنے جذبات سے پھر مغلوب ہو گیا۔ وہ بہت حساس اور محروم المزاج آدمی تھا، ساتھ ہی اُس کی طبیعت میں تلون بھی بہت تھا۔ لارنس کے ساتھ جو غیر متوقع بد مزگی ہوئی تھی وہ اُس پر اس قدر شاق گذری تھی کہ وہ از خود زخمی سا ہو رہا تھا! آخر لارنس نے اُس کے جواب میں کہا: ”اے، یہاں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا سہرا آپ اپنے ہی سر پر باندھا کرتے ہیں، اور اگر مجلس کے جلسوں میں آپ کی تقریروں اور خطبوں اور آپ کے سارے زبانی جمع صحیح کا حساب لگایا جائے تو بیشک یہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آپ کی کارگزاریاں اپنی نظیر نہیں رکھتیں!“

”لیکن وہ جو حقیقی خدمات ہیں ان کے بجالانے کا بھی کیا یہی طریقہ ہے جو آپ اختیار کر رہے ہیں؟“

”مٹلے پر غور کرو اور ازمیں لارنس پر تیز نگاہیں ڈالکر پوچھا“ کیا پھر آپ ہی گر جا کے مومن عظیم ہیں؟“

”خیر، ذاتیات کی یہ بحثیں بعد میں ہوتی رہیں گی“ لارنس نے کہا، ”سر دست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس مجلس میں پیش ہونے سے پہلے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں پر فریقین نے پورے طور پر غور و خوض کر لیا تھا، اور صدر کی اس مطلق العنان مداخلت کا کوئی موقع نہ تھا!“

یہاں مشاق بند آکر سے کو اپنی دنیا دارانہ طرز گفتگو کا ہر رشتہ پھراتا گیا اور اُس نے کہا: ”میں آپ کو خدا کا واسطہ دیکر کہتا ہوں کہ یہ اغراض و صدارت آپ خود سنبھال لیں! میں بغیر اُس کے بھی زندہ رہ سکتا ہوں، وہ کوئی ایسی سعادت نہیں جس سے میں دست بردار ہو سکوں!“

تبدلے یہ کہتے ہوئے لارنس کی طرف دیکھا لیکن دونوں کی نگاہوں کا قصداً نہ ہو سکا لارنس کے منہ کا چمکا۔ یکبارگی پھر خنیش میں آیا اور اُس نے کہا:

”میری رائے ناقص تو یہ ہے کہ مجلس کے درباب مل و مقدمے بشکل کوئی خدمات جلیلہ کی

انجام دی ہیں جن پر ان کو ناز ہو! بلاشبہ گرجا کا امام اور مجمعہ مدارس کے اساتذہ اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن اس محدود طبقے کے باہر رائے عامیہ یہ جو کہ ٹیکوں کی گرانباری میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ان الفاظ پر مجمع میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور لوگ پہلو بدلتے گئے، لارنس نے اپنے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

”لیکن آخر کار آج مجلس کے سامنے ایک ایسا مسئلہ آگیا ہے جس کا اصولی اور صحیح حل شاید کسی قدر ملانی فائز کر دے گا۔ یہی غالباً وجہ ہے کہ اس کی بحث تمہیں میں مستبدانہ طریقوں کی ایسی سخت مزاحمت کی گئی جو یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تاثر تعلق گرجا کے حلقے ہی سے ہو، اس کے پیش کرنے میں عوام کی بہبودی ہی منظور ہے، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ایک خالص پبلک مسئلہ کو محض ایک خاندان کا نجی معاملہ بننے سے باز رکھیں!“

سامعین میں سنی خیر سمجھا ہوں کا تبادلہ ہوا! زریب لہجہ میں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگا۔ ایک شخص نے جب کہ وہ اٹھکر جارجا تھا کہا کہ: ”یہ سب سے زیادہ جی پرستانہ کلمات ہیں جو ساہما سال کے بعد اس مجلس کے اجلاس میں سننے میں آئے ہیں! اب سب لوگ اپنی نشست چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور گنگو عام مخلوط ہونے لگی۔ نڈا کرے اکیلا بیچارہ گیا! اس نے محسوس کیا کہ ”معاذ اللہ! تمہارے گل گیا، سارا طلسم ٹوٹ گیا اور صورت حالات بالکل لاعلاج ہو گئی! اور اب کوئی مزید کوشش وقار رفتہ کو واپس لانے کی بے سود ہے!“ حقیقت یہ جو کہ اس کا نراں کچھ اُس قسم کا واقع ہوا تھا جو اہل فرانس کی فطرت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ مملو خوب کرنا جانتا تھا اور پیہم ملے ایک سے ایک پرزور کر سکتا تھا، لیکن مدافعت کارروائیوں کے وقت وہ بہت کمزور ثابت ہوتا تھا کیونکہ اُس کے خیالات اُس کے جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے۔

یہ سارا انقلاب قبیل کی سمجھ میں آتا تھا! اُس میں نیا وہ بیٹھے رہنے کی بھی تاب نہ ملی، چنانچہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اُڑا اور اُسے نائب صدر کے حوالہ کر کے خود چل دیا لوگوں کے لئے یہ منظر دیکھ کر اپنی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل تھا!



مذہبہ میں لائرس کی معیت میں آیا تھا لیکن جلسہ سے رخصت ہوا تو تنہا تھا۔ اگرچہ ”یوسف بے کارواں“ بنکر اس کو یہ دور دراز راستہ طے کرنا اور بھی مشکل تھا!

یہ موسم خزاں کا ایک سرد خشک اور ویران و بد منظر وطن تھا۔ جنگل جنگلے اور اُجڑے ہوتے تھے، سبزہ زار اور چراگا ہیں زرد ہو رہی تھیں، کھراڑا شروع ہو گیا تھا اور راستہ پر دونوں طرف جا بجا منجمد اور سب سے بکریاں جمع ہو گیا تھا۔ گویا ساری کائنات نے ماتمی لباس پہن لیا تھا! خدا یا سحران کو بھی کسی کا شریک حال نہ بنائے! اتنا سارے ارض و سما کے اس موقوف یا س منظر میں اپنے کو کتنا غموم و طول حقیر و ذلیل، اور تباہ و برباد محسوس کر رہا ہے! وہ تنہا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی لائرس اُس کے یمن و یسا معلوم ہوتا ہے! لائرس اپنے پورے بلند قد و قامت کے ساتھ ایک آسیب کی طرح شام کے جھپٹے میں آسمان تک اپنے سر کو دراز کئے ہوئے نظر آ رہا ہے!

اس بات کے تصور سے اس کو بہت کوفت ہو رہی تھی کہ اس نے لائرس سے خود یہ لڑائی مول لی اور اس سبازِ طلبی کو ایسی اہمیت دی کہ وہ ایک فیصلہ کن محرکہ ثابت ہوئی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر وہ ایک غیر متعلق ضمنی نقطہ پر اس قدر زور دیتا تو نتائج اتنے تباہ کن نہ ہوتے اور اُس کے سارے وقار و اقتدار پر اس طرح ایک ضرب کاری نہ لگتی! یہ حیرانی، غم و غصہ، اور اذیت روحانی اُس پر کمال استیلا حاصل کئے ہوئے تھی اور یہ آتشیں جذبات برابر سوزاں تھے اور اُن کی سوزش و گزیدگی اور اُن کی شور و پورش اُس کو ایک طوفانِ غم کے گرداب میں تھیرے کھلا رہی تھی! یکبارگی اُس نے گاڑی کے پیروں کی آواز اپنے پیچھے سے سنی: یہ لائرس تھا جو اپنے گھوڑے کو اڑانے ہوئے لئے جا رہا تھا! بادِ پا گاڑی بڑے کے پہلو میں سے گزری، اور گھوڑے کی ٹاپوں سے سڑک کی زمیں عرصہٴ معشر کی طرح ہل گئی! اکرے نے اس چوڑے چکے برد و دوش دالے نوجوان کو کچھ اگڑی میں سیدھا سیدھا ہوا ہے، گھوڑا اشتوقِ راحت منزل ”سے از خود اڑا چلا جا رہا ہے اور لائرس کو کسی بھی چیز مانا یا نہ کی ضرورت نہیں پڑ رہی ہے! کچھ اس نے بغیر ڈھیلی کر دی ہیں۔ جانور کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ گویا لائرس کی تصویر نہ تھی بلکہ اُس کی

معنوی طاقت اور اس کے مجلسی اقتدار کی ایک تعبیر تھی! تیز رفتار گھوڑے کو دیکھ کر بڑا کوہ عالم مثال میں ایسا نظر آ رہا ہے کہ اس کا حریف بلا مرامت اپنی منزل مقصود کا عازم ہے! بڑے کے توہمات میں سے ایک دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے پایادہ نہیں چلی رہا ہے بلکہ لارنس نے اپنی فائتھانہ رتھ سے اس کو ڈھکیل دیا ہے اور وہ سرا و خزاں کی ایک تاریک رات میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہے!!

بندر کی بیوی گھر پر اس کی منتظر تھی، وہ پہلے سے جانتی تھی کہ بندہ اور لارنس میں آج کے طوفانی اجلاس میں تصادم کا ہونا ایک ناگزیر خطرہ ہے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی میں لارنس کی ذات پر کبھی اعتماد نہ کیا تھا اور اب تو وہ مثبت طور سے اس کو خدا اور ایک خوفناک دشمن سمجھ رہی تھی! اُس کے لئے یہ بات کچھ موجب تسکین نہ تھی کہ یہ دونوں ایک ہی گاڑی میں سوار ہو کر گئے تھے، اور اگر وہ ایک دوسرے کی سمیت و رفاقت میں اسی طرح گھر کو واپس بھی آتے تب بھی اُس کے لئے یہ کوئی امید افزا علامت نہ ہوتی!۔

لیکن اب تو پوری تاریکی ہو گئی ہے اور ہمنوز دونوں میں سے ایک بھی نہیں لوٹا ہے! وہ اپنے دروازے میں کھڑی ہوئی سانسے کو جانیوالی سڑک پر راہ گیروں کو دیکھ رہی ہے۔ وہ دروازے سے نکل کر تھوڑی دور تک باہر جاتی ہے اور پھر واپس آ جاتی ہے لیکن انیسویں صدی کی گاڑی نظر نہیں آتی!

بالآخر سڑک پر بیسیوں کی گھڑ گھڑا ہٹ گوش زد ہوئی۔ عورت کا دل سینہ میں دھڑکنے لگا بیسیوں کی گردش کے ساتھ اس کی بھنٹاں و خیزاں ہونے لگی! وہ ایک ستون سے جھٹ گئی اور رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی! گاڑی نزدیک آتی ہے! مگر اُس کے اندر صرف ایک آدمی ہے! وہ دیکھ کر پہچانتی ہے کہ لارنس ہے! لارنس بھی اُس کو دیکھتا ہے اور شناخت کر لے! مگر بغیر گاڑی کو ہٹائے ہوئے سیدھا نکلتا ہے! اب وہ سچ جج ڈری! اُس کے اعصاب جواب دینے لگے، وہ لڑکھڑاتی ہے اور کھڑکی میں رکھی ہوئی غنچ پر گر پڑتی ہے!

بچے گھبرا کر اس کے پاس آجاتے ہیں اور ماں کے گرد حلقہ کر لیتے ہیں سب سے ننھے بچے نے کہا: ”اگاہاں ہے؟“ بچوں کے ساتھ انکی ماں کا موضوع گفتگو صرف اُسکا باپ ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑا محبت پرست دل رکھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اپنی بیوی اور بچوں کے دل پر اُسکا پورا قبضہ تھا۔ لیکن آج ننڈ کے خاندان میں ننڈ کے اہل و عیال کا خیال نہیں ہے اس کو دل و دماغ پر ایک ایسی مصیبت کبرے کا جوم ہے کہ وہ سرتاپا اُسی میں غرق ہے اور اس کی محبوب بیوی اور پیارے بچوں پر بھی ایک نام ہے!

اگر اس پر کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے تو پھر یہ کیا بات ہے؟ ایہ بھی معلوم ہے کہ وہ ایک گرم مزاج آدمی ہے! ماں لا رس کا آج تنہا انا خالی از علت نہیں ہے! اور پھر اس کا یہاں ننڈ اور بھی سختی خیز ہے! کیا وہ اُس کی گاڑی کے پیچھے دوڑ کر حال دریافت کرے یا پھر اپنے قیمت شوہر کے خرق میں سڑک پر پاپیادہ چل کھڑی ہو؟ اُس کی روح ایک عذاب میں مبتلا تھی اور اور بچے تھے کہ اُس سے چمٹ جاتے تھے اور بیاباں ہو ہو کر پوچھتے تھے کہ کیا بات ہے! لیکن یہ مخدوش راز وہ انکو کیونکر بتاتی؟ خیر وہ لکڑی ہوئی اور بچوں سے کہا کہ اچھا تم کھانا تو کھا لو آج اکیلے ہی تھی! یہ کہہ کر اس نے دسترخوان کی ترتیب و تیاری شروع کی۔

بچے کھانا کھا رہے ہیں اور وہ اُنکے پاس بیٹھی ہوئی بار بار اضطرابی طور سے باہر دیکھ دیکھ لیتی ہے، لیکن:

نہ قاصدے نہ پیائے نہ مرغ نامہ برس!

اس نے بچوں کے کپڑے اتارے اور انکو بستر پر لٹایا۔ سلاتے وقت جب وہ ایک ایک کے منہ پر چھکی تو ننھے نے ”شام کا ترانہ حمد“ پڑھا! آج وہ خود بھی اس دعائے معصومانہ میں شریک ہو گئی اور اس درد و سوز اور ایسے خصوع و خشوع سے بارگاہ الہی میں فریاد کی کہ اس شگامہ مناجات میں اس نے باہر کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنی!

ننڈ دہلیز میں ساکت و صامت کھڑا ہوا اپنی ننھی سی امت کی نماز جماعت کا نظارہ کر رہا تھا

بچوں کی ماں یکبارگی سٹ کر کھڑی ہو گئی اور سارے لڑکے لڑکیاں ہم آواز ہو کر چلا اُٹھے :  
 ”پاپا! پاپا!“

”آہستہ! آہستہ!“ نڈنے کہا اور مٹا ایک نشست پر بیٹھ گیا، ”ہاں ننھے کو یہی کلمے پھر کہنے دو! ہاں بھائی کیسے؟“

ماں اس اثناء میں بستر کی طرف متوجہ ہوئی اور اُس کے درست کرنے میں مشغول ہو گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نڈا اسکا بد حال چہرہ دیکھ لے قبل اس کے کہ وہ اس کام سے فارغ ہوتی اس کے حیلہ میں اتنا تغیر ہو جاتا کہ زیادہ مزاج پر سی کا موقع نہ رہتا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر آثار ہوم و نوم کے علاوہ متفسر انہ علامات بھی تھیں، لیکن وہ اس بات کو مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ وہ خود اپنی طرف سے آج کی غیر معمولی تاخیر اور دیگر خلاف معمول واقعات کے اباب بتانے کا تقاضا کرے۔ بخلاف اس کے وہ اس کو بہتر سمجھتی تھی کہ نڈا خود ہی اس ماجرے پر روشنی ڈالے۔

ننھے نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سینہ پر باندھے اور سب بھائی بہن اُس کی امامت میں اقتدار کے لئے اسی وضع سے کھڑے ہو گئے! ننھا امام نغمہ حمد و شکر شروع کرتا ہے۔  
 ”میں ایک چھوٹا بچہ خدا سے عرش و کرسی سے التجا کرتا ہوں، کہ میری خطائیں معاف کی جائیں۔“

رفتہ رفتہ میں بڑا ہوتا جاؤں گا، اور میری دین و دانش بڑھتی جائے گی، اور اپنے باپ اور ماں کی سرت کا سامان بنوں گا بشرطیکہ اسے میرے پروردگار! تیری توفیق میری رفیق ہو اور تیرے مقدس پیمانِ عبودیت پر ثبات قدم رہنے کی مجھکو ہدایت نصیب ہو!

اب جبکہ عنقریب ہم سوجائیں گے، ہم اپنی روجوں کو ”آسانی باپ“ کی برکت و ہمت کی امان میں دیتے ہیں!“

کمرے میں ایک سکون و امن کی فضا طاری ہو گئی! اس آسودگی پر درآب دہوانے ایک ہی منٹ کے اندر سارے بچوں کو اس طسج تھپک تھپک کر سلا دیا گویا کہ وہ خود خدا کے قدوس کی کنا رحمت میں مصروف خواب ہو گئے ہوں! ماں اس بچے میں آہستہ سے محکم گئی اور شوہر کے سامنے کھانا رکھا۔ بیڈ نے کھانے سے انکار کیا، اس لئے کہ وہاں

نعت دل کھانے کو اور خون جگر پینے کو!

بہت تھا! وہ بستر پر جا کر لیٹ گیا، اور تھوڑی سی کیسوفی کے بعد اُس نے کہا:

”آئندہ سے میں خانہ نشین ہو جائیگا ارادہ رکھتا ہوں“

قریب تھا کہ اس مژدہ جاں فزا کو سنکر بیڈ کی بیوی کو شادی مرگ جاتی! وہ شوہر کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی، اور اس ناقابل برداشت خوشی کے احساس سے اس کے بدن کے ریشہ ریشہ میں ایک لرزش خفی، تھی جس کو وہ ایک سرمہ راز ہی رکھنا چاہتی تھی! اس نے اپنے دل سے کہا: ”خدا یا! کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں! میرے لئے کیا ہی نعمت غیر مترقبہ تو نے نازل فرمائی!

ہزار شکر خدا، صد ہزار شکر خدا!

خیر، اس طول طویل مصیبت کے درمیانی منازل میں جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن انجام یقیناً

بخیر ہوا، اور

سفینہ جبکہ کنارے پہنچا اپنا خدا سے کیا قسم و جور نا خدا کہئے“

# شذرات

اس مہینے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو دو ایسے بزرگوں کا ماتم کرنا پڑا جو حقیقی معنوں میں قوم کے خادم اور مخدوم تھے اور جن کا وجود اس وقت حیات ملی کے لئے بے حد ضروری تھا۔ پہلے مولانا مظہر الحق کے انتقال کی جانفرسا خبر گئی۔ اس کے چند ہی دن بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی وفات کی دلگداز اطلاع پہنچی، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ہر شخص جس کے دل میں ملک و قوم کا درد ہے ان دونوں سانحوں سے متاثر اور ملول نظر آتا ہے خصوصاً ان کے عزیزوں اور دوستوں کے رنج کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ خداوند تعالیٰ مرحومین کی مغفرت کرے اور انکے سوگواروں کو صبر جمیل عطا کرے۔

مولانا مظہر الحق ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی اور انکے دل میں آزادی کے ولولے کو ابھارا۔ کانپور کی مسجد کے واقعے سے لے کر نرک موات کے زمانے تک مرحوم نے ملت اسلامی کی جو خدمات انجام دیں وہ سب پر روشن ہیں۔ مرحوم بہت عرصے سے کانگریس کے ممبر تھے اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں دل و جان سے کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ آخر عمر میں بعض جھگڑا صدمات نے مرحوم کا دل توڑ دیا تھا اور وہ علی جد جہد سے ملحدہ ہو کر گوشہ تنہائی میں زندگی کے دن گزار رہے تھے، ان کا جذبہ قومی اور جوش آزادی ذرا کمی نہیں ہوا تھا اور ضرورت کے وقت وہ اپنے وسیع تجربے اور اپنے شخصی اثر کو کام میں لا کر قومی تحریک کی گتھیوں کو سلجھا دیا کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے مدد مع نے اپنے دوستوں کی درخواست پر یہ ارادہ کیا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں جو امتیاز پیدا ہو گیا ہے اسے دور کریں اور سب

پارٹیوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کا ایک متحدہ پروگرام ترتیب دیں۔ ظاہر ہے کہ مرحوم سے بڑھ کر اس کام کا اہل کوئی شخص نہ تھا۔ انوس ہے کہ موت نے انہیں یہ ارادہ پورا نہ کرے دیا۔ اب مرحوم کے دوستوں اور قدردانوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی اس آخری خواہش کو پورا کرنے میں اسکا فی کوشش کریں۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب کا میدان عمل سیاست نہ تھی بلکہ تعلیم تھی۔ مرحوم علیگڑھ کالج کے مایہ ناز فرزندوں میں سے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ایک عرصہ تک انہوں نے نہایت خلوص اور محنت سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکرٹری کے فرائض انجام دئے اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو ہر طرز پر بنانے میں ان کی خدمات بہت قابل قدر ہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد مرحوم نے بحیثیت وائس چانسلر کے مسلم یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کی انتہائی کوشش کی اور جب بعض خود غرض اور نفع لوگوں کے سبب اس میں ناکامی ہوئی تو انہیں اسکا تسخیر صدمہ ہوا کہ انکی صحت بالکل برباد ہو گئی اور دو سال کی مسلسل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کا خلوص اور جوش ہمارے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید مثال ہے۔ خدا کرے علیگڑھ سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس کام کو پورا کریں جسے مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔

مسلمانان ہند کی جماعتی زندگی میں یہ عجیب حسرتناک بات ہر کرانے بڑے لوگ بہت کم اپنے بعد کوئی ایسا کام چھوڑتے ہیں جسے خود انکے تربیت دادہ لوگ انجام دیتے ہیں۔ جس قوم کی کوئی باندہ خدمت ہوتی رہے۔ اول تو بہت کم اپنے ذمہ کوئی ایسا کام لیتے ہیں جس میں ایک سے زیادہ نسلیں کام کر سکیں۔ اور جو کوئی ایسا کام شروع بھی کرتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کی مدت حیات بہت محدود ہے اور بڑے اور دائمی مفید کام صبر و استقامت سے ہی اور دیر طلب تعلیمی کاموں میں پچھلے سو سال کے

اندر پیدا احمد خاں، مولوی محمد قاسم صاحب، مولانا شبلی اور حکیم اہل خاں کے ناموں پر نظر پڑتی ہے۔ ان چاروں بزرگوں کو اپنے اپنے حالات کے مطابق اپنے جانشینوں کی تربیت کا موقع بھی ملا اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ بھی اٹھایا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے انکے کام آج بھی چل رہے ہیں۔ اگرچہ ممکن ہے بعض جگہ جانشینوں کی تربیت کی خامی کے باعث یا اپنے رہنما کے مقاصد کی غلط یا تنگ تعبیر کی وجہ سے وہ مقاصد اچھی طرح حاصل ہوئے ہوں جو ان بزرگوں کے پیش نظر تھے لیکن سانچے قائم ہیں۔ ان میں اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور جوں جوں ان اداروں کی عمر بڑھتی جاتی ہے ان کی روایات مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور حیات ملی میں انکا اثر ترقی کرتا جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت کو انکار خود فریبی کے مرادف ہوگا کہ ان اداروں کا اثر بہت محدود ہے اور انکا میدان عمل بہت تنگ۔ ملی زندگی کے بے شمار شعبے سوائے خفیف و بالواسطہ اثر کے انکے دائرہ عمل سے اس وقت بھی باہر ہیں۔ تنگ مثنوں میں تعلیمی اور علمی کام ہی کو لے لیجئے تو یہ ادارے ہماری حیات قومی کی بساط کے حواشی تک پر عادی نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مسئلہ انکی مخصوص ضرورت کے لحاظ سے ہماری قوم نے کیا انتظام کیا ہے۔ انتظام کرنا تو بڑی بات ہے کہتے آدمی ہیں جنہوں نے دیانت کو کچھ وقت اس پر صرف کیا ہے کہ مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کس قسم کی ابتدائی تعلیم کی متقاضی ہیں۔ ثانوی تعلیم کے مسائل ہمہ اور پیشہ کی تعلیم سے اس کے تعلق پر کہتے مسلمان ”ماہرین تعلیم“ دو فقرے بھی مقبولیت سے بول سکتے ہیں۔ ”اعلیٰ“ تعلیم کے سراب سے اس مفلس نادار قوم کو بچانے میں کہنے ساعی ہیں، اور پھر کہتے ہیں جو اسکی تدابیر سوچ رہے ہیں کہ اہلیت و صلاحیت رکھنے والے اسی سراب سے قوم کے لئے آب حیات کے چشمے نکال دیں۔ ذہنی تعلیم کے مسئلہ پر کتنوں نے چند مدت بھی ٹھنڈے ذل سے غور کیا ہے اور کہتے ہیں جو دین کی تعلیم کو قانون اور غلط فہم سے ناقص و اقیقت کا ذریعہ نہیں (کہ یہی ہمارے موجودہ دینی مدارس کا کام معلوم ہوتا ہے) بلکہ سچی مذہبیت پیدا کرنے کا وسیلہ بنانے کی فکر کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہم ان لوگوں کے وجود سے خیر ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کچھ ٹھکانے ہیں۔ اور اگرچہ آج ان سے بھی یہ سب نہیں بن پڑتا مگر کل ان سے اسکی توقع کیا جاسکتی ہے علی گڑھ اور دیوبند، اعظم گڑھ، لکھنؤ اور دہلی اس وقت نہ سہی امید ہے کہ کچھ



دن بعد ان اہم کاموں کو سلیقہ سے کریں گے۔ یہاں آدمی موجود ہیں، اپنی قوم کی مصیبت کا احساس بھی غالباً ہو گا۔ کچھ کر سکیگا، دلوں کو بھی شاید موجود ہو؟ اگر کوئی سیدھا راستہ دکھائے والا، اور اس پر چلنے کے لئے دل کو مضبوط کر دینے والا مل جائے تو کیا عجب ہو کہ یہ ادا سے کچھ کر سکیں اور اپنے بانیوں کی آرزوؤں کے محض مرقبہ بن کر نہ رہ جائیں۔

البتہ ہماری قومی زندگی کی ایک خصوصیت اس وقت اس کا عدم تسلسل ہو جس سے اسے مفید اور پائدار کام خرچہ میں ہیں، ہمارا حال جہاز کا سا ہے جو طوفانی سمندر میں اپنی راہ سے ہٹ گیا ہو، جس کا انجن باد مخالف اور موج دریا پر غالب آئیے بجائے بند ہو گیا ہو اور جہاز منزل کی سمت چلنے کے بجائے اوہ اوہ اور ہر ہچکولے کھاتا ہو۔ ہماری اس حالت کا تکلیف دہ نظر ہماری سیاسی زندگی میں نظر آ رہا ہے۔ اور چونکہ سیاست والے سب سے زیادہ زور سے چلا سکتے ہیں اس لئے زندگی کے دوسرے شعبوں کے حامل ہم جاتے ہیں اور خود اپنے کام کے تسلسل کو قائم نہیں کھ سکتے اس طرح مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی دھوپ بھاؤں اور اس کے روز کے آٹا چڑھاؤ ہماری ساری حیات قومی کا آئینہ بن گئے ہیں۔ اب اگر اس سیاسی زندگی کو دیکھئے۔ ایک دن مسلمان کانگریس سے الگ رہ کر تادم توبہ پنی تعلیم پر صرف کرنا چاہتے ہیں، دوسرے دن سیاست میں اس نہماک سے کوئی تہ نہیں کہ تعلیم و علم کا نام نہیں سننا چاہتے! ایک دن انگریزوں کو اپنی بقا اور ترقی کا تہا وید ملکر اہل کتاب کے ساتھ سلوک دلیل کے ساتھ لڑنا دریافت کر نیکیے لئے کتابیں کھنگالی جاتی ہیں تو دوسرے دن نصائے سے مولات کے خلاف فتویٰ جاری نکلتا ہے؟ ایک دن فرنگی تہذیب مظہر شان ربانی ہوتی ہے دوسرے دن سراسر فزب طاعونی، ایک دن ہندو بھائی ہوتا ہے، دوسرے دن دشمن۔ اور لطف یہ کہ سب طاقتوں میں ایک سا انہماک، ایک ساشغف، ایک ساعلو بہی سبب ہے کہ پچھلے پچاس سال کی جدوجہد میں مسلمانان ہند اپنے لئے کوئی سیاسی روایات نہ قائم کر سکے کسی ایک مسئلہ پر اصولی ہوا فروری یہ چند دن کی زیادہ جم کر کام نہیں کر سکتے۔ سالہا سال میں ٹیکل سے کہیں خود کوئی بات کی ابتدا کرتے ہوں تو کرتے ہوں۔ ورنہ ہمیشہ کوئی دوسرا جب کہہ کر رہا ہے تو یہ اس کے حامی یا مخالف

ہو جاتے ہیں۔ اور عموماً مخالف ایکسی نے ذرا چھٹیر دیا اور یہ بھر گئے۔ ذرا پکھارا اور یہ رام ہو گئے! جس سے ذرا خفا ہوئے سسکے لئے دشمن سے کم درجہ کا کوئی لفظ اٹکنے پاس نہیں جس سے خوش ہوئے وہ جھلکی بھائی کو کم مرتبہ پر کیسے رہ سکتا ہو؟ جس تحریک کی موافقت یا مخالفت کی تو امیں یہ خیال رکھنا کہ تجویز کی اہمیت کتنی توجہ کی محتاج اور مستحق ہر انکی لغت میں کمزوری کہلاتا ہے۔ آزادی ملک کا مطالبہ اپنی قوم کی تعلیم و تربیت کا انتظام، عقائد اسلامی کی اس طوفان الحاد و بے دینی میں حفاظت، اور ابن سعود، فطیس، شاردا ایکٹ، راج پال، اور علم دین سب بالکل مساوی اہمیت رکھتے ہیں سب بالکل ایک طرح مسلمانوں کے ”حیات و موات“ کے مسئلے ہیں، اور سب ایک ہی سی توجہ اور ایک ہی سے صرف قوت کے مستحق۔ جب کسی مسئلہ کی طرف یہ جوشیلی قوم اپنی توجہ منقطع کر دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی اور مسئلہ ہی نہیں۔ اگر کوئی اس وقت دوسرے گوشوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کرے تو غدار کہلائے، کافر قرار دیا جائے اور مسلمانوں کا ”دشمن“۔ اس انتظار ذہنی میں یہ گمان رکھنا کہ کوئی بھی مفید اور پابدار کام ہو سیکے گا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہو کہ ان میں زندگی کے مختلف شعبوں پر توجہ کرنے والوں کے کچھ گروہ پیدا ہوں۔ ظاہر ہے یہ چھوٹے چھوٹے ہی گروہ ہو سکتے ہیں لیکن ایسا ایک چھوٹا سا گروہ چو اپنی عمر کی ایک شعبہ حیات ملی کے سمجھے اور اس کے مسائل کے حل کرنے میں صرف کرے گا۔ ان تمام بڑی بڑی انجمنوں، اور کامیاب جلسوں، اور شاندار جلوسوں سے زیادہ دیر پائنا سچ پیدا کر سیکے گا، جن سے اور صرف جن سے انفسوس کہ اس وقت ہماری حیات ملی عبارت ہو۔ کاش مسلمان نوجوانوں کے دل جلد اس نظر فریب مگر روح کش انتشار ذہنی سے اکٹا جائیں اور وہ بجائے اسکے کہ کچھ لوگوں کو برا کہنے، اور کچھ سراہنے میں اپنی زندگیاں کاٹیں ان زندگियों کو ایک قومی امانت سمجھیں اور زندگی کے جس شعبے میں وہ سب سے بہتر اور مفید کام کر سکتے ہوں۔ اس کے لئے اپنے کو وقف کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انکی کوشش ہر چند شروع میں کتنی ہی حقیر ہو وہ اس بے نصیب قوم کے دن پھر نے کی علامت ہونگے اور اس کا سبب۔ ورنہ اپنی مشکلوں کو دوسروں سے حل کرانے کی کوشش، اپنی کمزوریوں کا اعتراف

کر کے دوسروں سے خواہش کہ وہ ہمیں تقویت دیں، اپنی تعلیمی کمی، معاشی بے ماگی، اخلاقی پستی کا واسطہ دے دیکر اپنی سیاسی اہمیت کا اقرار کرنا، غیور اور خود دار مسلمان نوجوانوں کے لئے باعث شرم ہونا چاہئے۔ اپنی تعداد کی کمی سے پر اگندہ خاطر اور مایوس ہونا اس قوم کا شعار کیوں ہے جس کے مٹھی بھر آدمیوں نے تہذیب کہن کی بساط پارینہ کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارا شعار تو کسی رو رو کر یارو ٹھوڑو ٹھکر حقوق طلب کرنا نہ تھا، بلکہ اپنی مردانگی سے، اپنے کام سے، اپنے پرانے کی خدمت سے، اپنی محنت و مہمت حقوق پیدا کرنا تھا۔ کیا یہ توقع بیجا ہوگی کہ مسلمان نوجوان اپنی حیثیت ملی کو تسلیم کرانے کے لئے روٹھنے، یا خوشامد کرنے، یا اگالیاں دینے سے بلد شرمانے لگیں گے اور اپنے بے نفس خلوص اور مخالفت سوز اثار سے اپنی ملی زندگی کی کیفیت کو ایسا بنانے کی کوشش کریں گے کہ اس کے سامنے ”کیت“ کے سب فریب ٹوٹ جائیں اور ابھکا وجود کسی مشترکہ قومیت کے لئے بار نہ ہو بلکہ باعث فخر۔ اگر یہ توقع بھی باقی رہے تو غیرت مند مسلمان کے لئے زندگی واقعی عذاب ہو جائے

## انتباہ

”جامعہ“ جلد ۳۱ کی فہرست مضامین انشا اللہ  
ماہ فروری میں شائع ہوگی



# **The Cultural Side of Islam**

## **Madras Lectures on Islam**

**(NO. 2.)**

BY

**MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL**

**DELIVERED AT MADRAS IN JANUARY 1927.**



### **CONTENTS.**

1. First Lecture—Islamic Culture.
2. Second Lecture—Causes of Decline.
3. Third Lecture—Brotherhood.
4. Fourth Lecture—Science, Art and Letters.
5. Fifth Lecture—Tolerance.
6. Sixth Lecture—The Charge of Fatalism.
7. Seventh Lecture—The Relation of the Sexes.
8. Eight Lecture—The City of Islam.

Price 1/8/-

Bound 2/-

**TO BE HAD OF:—**

**NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY  
BOOK DEPOT,**

**KAROL BAGH,**

**DELHI.**

۱۸۸۲

رجسٹرڈ



۲  
۱۶

# جمعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۲

ہفت ماہ فروری سنہ ۱۳۹۰ ع

جلد ۱۳

”مجلد ملیہ“

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

۱۱۱۱  
Hittarup

1927



# فہرست مضامین سالہ "جامعہ" بابۃ جلد ۱۳

از جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء

## اسلامیات

- |     |   |                       |
|-----|---|-----------------------|
| ۴۴  | سید نذیر نیازی صاحب بی ایس (جامعہ)                | مذہب اسلامی کی ابتدا  |
| ۲۰۹ | خواجہ غلام الحسن صاحب فاضل پانی پتی               | اسلامی اور سیحی اخلاق |
| ۲۱۰ | سید جمال الدین افغانی ترجمہ مولانا محمد حسین صاحب | مسئلہ قضا و قدر       |
|     | مجموعی لکچر عثمانیہ کالج اورنگ آباد               |                       |

## تاریخ

- |     |   |                             |
|-----|---|-----------------------------|
| ۴۲  | مولوی عبد الباقی صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ | قلعہ دہلی کے میوزیم ایک نظر |
| ۹۹  | خالدہ ادیب خانم مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب | ترکی اور جنگ عظیم           |
|     | ایم ایس پی اینج ڈی                          |                             |
| ۲۵۰ | سید حسن ربی صاحب ایم ایس ایل ایل بی         | عرب شمالی وسطی کی حکومتیں   |
|     | وکیل بلند شہر                               | عہد نبوی سے پیشتر           |
| ۲۹۳ | مولوی سعید انصاری صاحب بی ایس (جامعہ)       | ہندوستان فن طبع کا اصل مولد |
| ۳۳۰ | مولانا محمد اسلم صاحب جیرا چوری             | تاریخ عثمانیہ پر ایک نظر    |

## ادب

- |     |  |                       |
|-----|--|-----------------------|
| ۱۲۱ | ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی پی ایچ ڈی           | رائٹرز ماریا ریکس (۲) |
| ۲۶۷ | سید وہاب الدین صاحب بی ایس بی ٹی اورنگ آباد کالج | من کی سوج             |



دلی کا انوکھاپن اور میر تقی میر مرحوم داستان گو ۲۸۵  
 طالعائے اوریکا نیلویج محمود حسین خان صاحب سابق متعلم جامعہ ملیہ ۲۳۹  
 کی خط و کتابت ارہنڈ برگ یونیورسٹی

## تاریخ ادب

ادبیات ایران کی ترقی میں مولوی حسین صاحب ندوی ۳۳، ۹، ۱۰، ۱۶، ۱۷  
 سلطان محمود غزنوی کا حصہ متعلم جامعہ ملیہ ۳۸۳ و ۲۲۶  
 امین کی یوسف زلیخا نصیر الدین ہاشمی صاحب ازپیرس ۱۲۶  
 ڈراما کیا چیز ہے؟ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۱  
 سلیم کی یادیں مولوی محمد یحییٰ تہا صاحب بی اے ایل ایل بی ۳۰۵  
 وکیل غازی آباد  
 لندن وپیرس وغیرہ میں باتر آگاہ نصیر الدین ہاشمی صاحب ازپیرس ۳۵۸  
 کی تصنیفات

## آرٹ

ہندوستان میں فن کا دور جدید ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی پی ایچ۔ ڈی ۱۹۳

## افسانہ

مینک فروش ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی ۶۹  
 بغی سلما لاگراف مترجمہ مولوی اسرائیل احمد خان صاحب ۱۲۶، ۱۲۳، ۱۲۲  
 گرفتاری پروفیسر محمد حبیب بی اے (آکسن) ۳۱۵  
 دو عینکیں ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی ۳۹۸  
 بنیادی اصلاح انجم روزلیا (ترجمہ از روسی)

۲۴ لالہ اجیت رائے آبجہانی

مترجمہ مولوی اسرائیل احمد خاں

۱۳۵ پیدت حبیب الرحمن صاحب مسلم یونیورسٹی علیگرہ

۹۰۲ د برٹرنڈ رسل

مترجمہ حامد علی خاں نصابی لے (جامعہ) ۱۴۰

۷۹ ابو محمد ناقت صاحب کانپوری

۱۶۱ و ۱۶۲ حضرت جگر مراد آبادی

۲۴۰ حضرت درد کا کوردی

۲۴۱ حضرت علیل قدوائی

۳۲۳ حضرت اقبال ہیل اعظم گڑھی

۴۰۰ حضرت علیل قدوائی

۴۸۱ حضرت اصغر گونڈوی

۴۸۲ حضرت جگر مراد آبادی

تعلیم  
ہندوستان اور مسئلہ تعلیم

فلسفہ انماط

اجتماعیات

آزادی کی راہیں

حصہ نظم

نمود سر

غزلیات

غزل

غزل

فتح مبین

غزل

غزل فارسی

غزل از رو

تنقید و تبصرہ

(رسائل و اخبارات)

نظام الشیخ (رسول نمبر)

پیشوا ( )

(کتب)

سیرۃ الرسول (تاریخ الامت حصہ اول)

۲۴۲

مترجات

زرگل

شذرات

۸۱ و ۱۶۵ و ۲۲۴ و ۳۲۴ و ۴۰۶ و ۴۸۳

## فہرست مضمون نگاران

ابو محمد شاقب صاحب کانپوری

احسان احمد صاحب وکیل انجم گڑھ

اسرائیل احمد خان صاحب

اسلم (مولنا) جیرا جپوری

اصغر صاحب گونڈوی

ایم زوزلیا (روسی)

اقبال احمد خان صاحب سہیل وکیل انجم گڑھ

باقر علی دیر صاحب داستان گو

برٹنڈرسل

جگر مراد آبادی

جلیل قدوائی صاحب

جمال الدین انصافی رحمۃ اللہ علیہ

حامد علی خاں (منشی) صاحب

حبیب الرحمن (پتہ ذت) صاحب

حسن برنی (سید) صاحب

حسین حسان صاحب ندوی  
 خالده ادیب خانم  
 درود کا کوردی  
 دل شاہجہا پوری  
 ذاکر حسین خاں (ڈاکٹر)  
 سعید انصاری صاحب  
 سلما لاگر لاف  
 سلیم الزمان (ڈاکٹر)  
 عابد حسین (ڈاکٹر سید)  
 عبد الباقیل صاحب ندوی (مولانا)  
 غلام الحسنین صاحب فاضل پانی پتی  
 لالہ لاجپت رائے آنجنانی  
 محمد مجیب پروفیسر  
 محمود حسین خان صاحب جامعہ ازہار لبرگ  
 محمد یحییٰ تنہا صاحب وکیل غازی آباد  
 محمد حسین (مولانا) محوی صاحب ازاد رنگ آباد  
 نذیر (سید نیازی صاحب  
 نصیر الدین ہاشمی صاحب از پیرس  
 و ہاج الدین صاحب



# دنیا، علم و ادب

کا

بہترین شاہکار  
یعنی رسالہ خضر کا شبلی نمبر منظرِ جہاں

جس میں

ہندوستان کے بانیہ نازم صنف علامہ شبلی نعمانی کی حیات طیبہ اور آپ کی علمی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا اور ———— عمد حاضرہ کے مشہور ترین اہل علم اور فاضل ترین ائمہ علم و ادب کے گرانقدر اور بلند پایہ مضامین زیب صفحات ہوں گے۔

امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد

فخرت علامہ سید سلیمان صاحب مددی

صدر الصدور مولانا ابوالحسین علی خان غفرانی

سراقبال

خواجہ حسن نظامی

مولانا عبدالماعجد بی۔ اے۔ دریابادی

مولانا ظفر علی خان صاحب

مولانا عبد اللہ صاحب عادی

سید جالب، دہلوی، لاہوری

وغیرہ کے اسرار گرامی اسکی عظمت و فضیلت کی کافی ضمانت ہیں

غرض کہ یہ تمام دہریہ و فاسق اور بلند پایہ علمی ادبی مضامین پر کرمِ دنیا نظروں اور تجویز و پسند پائندوں کا بہترین مجموعہ جسکا حجم تقریباً دو سو صفحات پر گھرا ہوا ہے جس میں آپ کے پیش نظر کیا جاوے گا وہ عام سے علمی طبع کے مستقل قاریوں و مستند اداکاروں و لائبریریوں کو بالکل مستحق و مستحق خضر راہ دنیا کا دس لکھ روپے

مرزا فرحت اللہ بیگ رجسٹرار

شوکت تھانوی، جگر مراد آبادی

سیاب اکبر آبادی

حامد شاہ جہاں پوری

لسان الحسن حضرت عزیز لکھنوی

لسان القوم حضرت صفی لکھنوی

ظفر الملک صاحب علوی

حضرت ریاض خیر آبادی

شمس العلما رباب علی حسن خان صاحب

بہترین شاہکار  
یعنی رسالہ خضر کا شبلی نمبر منظرِ جہاں

# اعلان

امید ہے کہ قوم تہ بہ دُخو شالی مقام دی چہ سرے دست پښتو ایکیم می مندرجہ ذیل کتابو پہ ډیر خوب صورت اوښپن چاپ کښ کړل موثر ته د خپل قوم د علم دوستی نه پوره یقین لے۔ چه هغوی به ایکیم می د کوشش استقبال هوکړی او زتر تر زتره به خپل حسب المنشا کتابو نو آرد هر را کړی فقط

نام کتاب	قیمت
پښتو فارسی لغات	۱۰۰ روپے
" عربی لغات	۱۰۰ "
" انجیری لغات	۱۰۰ "
" جرمن د کشنری	۱۰۰ "
" صرف نحو	۱۰۰ "
حقیقت الافغانی	۱۰۰ "
Pashto - English Grammar	۱۰۰ لرو

ملنے کا پتہ

پاسان پښتو ایکیم می کردی سکنه وڈا کنا نہ گردی ضلع پشاور  
(صوبہ سرحدی)

بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# مجلہ

زیر ادارت

مولانا ام جیو رحیموی ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۴۲ بابۃ ماہ فروری ۱۹۳۰ء نمبر ۲

فہرست مضامین

- |     |  |                                      |
|-----|--|--------------------------------------|
| ۸۲  | ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بی اے (جامعہ)               | ۱۔ ازمنہ و سنی کے بعض ہندو شاعروں پر |
|     | ڈی لٹ (پریس)   | ۲۔ اسلامی اثر                        |
| ۱۰۲ | ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی اتاذ جامعہ عثمانیہ     | ۳۔ مسئلہ افلاس ہند                   |
| ۱۱۸ | عبدالواحد صاحب شعلہ جامعہ ملیہ                       | ۴۔ بہائیت                            |
| ۱۳۹ | ترجمہ از اسرار نبیل مدد خان صاحب انشٹیشنل سکول رنگون | ۵۔ ریل کی شرک اور قبرستان            |
| ۱۴۶ | احسان الدین صاحب ایم اے دہلوی ملحقہ جامعہ            | ۶۔ واقعی کون تھا سچا شاعر؟           |
| ۱۴۹ | حضرت اصغر  | ۷۔ غزل                               |
| ۱۵۰ |  | ۸۔ جگنی بیڑے                         |
| ۱۵۳ |  | ۹۔ مشذرات                            |



## ازمنہ وسطیٰ کے بعض ہندو شاعروں پر اسلامی اثر

دور سے اور وسطی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور ہندو دھرم نے باوجود تقریباً آٹھ سو برس پہلو پہلو رہنے کے ایک دوسرے کا کوئی گہرا اثر نہیں قبول کیا۔ دنیا ان دونوں مذہبوں کے اختلاف کو جانتی ہے۔ دنیا یہ نہیں جانتی کہ ان دونوں مذہبوں کے رسم و خیال کی تاریخ میں ایسی کوششیں بھی ہوئی ہیں، دانستہ اور کبھی غیر دانستہ بن کا نشا ر ہندو اور مسلمانوں کے خیال و عمل کی زندگی میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ ہندوستان کی ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں ان اعتقادی تصوروں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے جو باہمی ہندو و اسلامی اثر سے پیدا ہوئے اور جنہوں نے بعد میں تحریکوں اور مستقل اداروں کی شکل اختیار کر لی۔ بیشتر اس قسم کے مذہبی رواداری کے خیال شہری زندگی کی خود غرضیوں سے دور گھاؤں کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پیدا ہوئے جو آپس میں مل جل کر سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور جن کا خیل تصنع سے اسی قدر پاک تھا جس طرح کہ اُبکا خلوص بے لاگ تھا۔ شمالی ہند میں اسلام اور ہندو دھرم کی پہلی ٹھمبیز کے وقت ہمیں بہت سے ایسے ہندو بھگت شاعر ملتے ہیں جن کے خیال اور زندگی کو دیکھنے کے انداز پر اسلامی رنگ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ شاعر محض شہری نہیں کہتے تھے بلکہ اپنی تعلیم اور زندگی سے ہندو دھرم کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی تحریک بھگتی انہیں شاعروں کی تعلیمات سے عبارت ہے۔ ہم ذیل میں ان شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک نام دیو ہوئے ہیں۔ ان کے بچن گرنتم صاحب میں ملتے ہیں۔ جگکالا

کے بیان کے مطابق نامدیو پندھار پور صنم شولا پور میں پیدا ہوئے۔ انکے متعلق پیشہور ہے کہ وہ چھپی (کپڑا چھاپنے کا کام کرنے والے) تھے اور بعض دوسرے بیانون کے مطابق وہ درزی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انکی پیدائش اور موت کی کوئی قطعی تاریخ ہمیں معلوم۔ وہ خود ایک مجتہدوں کی بٹ فکمی کا ذکر کرتے ہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں کسی وقت دکن میں تھے۔ ممکن ہے کہ وہ کبیر داس کے ہمصر ہوں یا یہ کہ انکے پیروں میں سے ہوں۔ اس لئے کہ انکی تعلیمات بیشتر وہی ہیں جو کبیر داس کی۔ انکا سماجی زندگی اور روح کے متعلق جی وہی نقطہ نظر ہے جو کبیر کا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نامدیو کی اندرونی زندگی کی فیصلہ کن تبدیلی او نہا گنن تھ کے مندر میں واقع ہوئی۔ وہ مندر میں جہاشیو اتری کے دن بیٹھے اپنے بھجن گار رہے تھے۔ چاروں طرف مخلوق جمع تھی۔ ہر کوئی بھجنوں کے غلوں سے متاثر تھا۔ ایک طرف سے کہیں چند برہمن آرہے تھے۔ مندر کے مجاور نے انکے لئے راستہ صاف کرنے کو لوگوں کو مجبوراً تتر بتر کر دیا تاکہ یہ مقدس ہستیاں عوام الناس کی چھوت سے دور رہیں۔ نامدیو پر ان پنج ذات والوں کی بے بسی کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے دل میں ٹھانی کہ کسی نہ کسی طرح برہمنوں کے غرور کو نیچا دکھائیں گے۔ سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنی زندگی تحریک بنگتی (خلوص و عقیدت) کو عام لوگوں میں پھیلانے کے لئے وقف کر دی وہ اپنے شخصی خدا کو وٹھو بایا ٹھیل کے نام سے پکارتے ہیں اور برہمنی ذہنی علوم کے خلاف عقیدہ کو نجات کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ کبیر کی طرح انہوں نے بھی ذات پات کی امتیازات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ نہایت بلند آہنگی سے بت پرستی کی ان لفظوں میں برائی کرتے ہیں۔

آنیلے کبھ بھرے لے اوک ٹھا کر کو اشنان کراؤں  
 بایلس کبھی جل ہی ہوتے ٹھلو میلہ کا سے کراؤں  
 آنیلے پھول پردی لے لاٹھا کر کی ہوں پونج کراؤں

پہلے باسولے ہے بھورا ٹیٹھلا بھیلہ کا فی کراؤں  
 آئیے دودھ مری دیں لے کھیر ٹھاکر کو نیوید کراؤں  
 پہلے دودھ جو بنا ریو بھرے بھٹکوکائے کراؤں  
 ایسے بیٹھل او بے بیٹھل بنو سنارو ناہیں

(میں بت کو ا نشان کرانے کے لئے ایک برتن میں پانی بھر کے لاتا ہوں۔ پانی میں یاہیں لاکھ  
 جانیں ہیں۔ اے بھائی! میں ٹھل (خدا) کے لئے کیا کروں؟ میں بت کے لئے بھول لاتا ہوں اور  
 بار پروتا ہوں تاکہ پوجا کے وقت اسے چڑھاؤں۔ بھوزے لے پہلے ہی بھولوں کی خوشبو اڑالی۔  
 اے بھائی! میں ٹھل کے لئے کیا کروں؟ میں دودھ لاتا ہوں۔ کھیر بنا تا ہوں تاکہ بت کے سامنے  
 پیش کروں۔ بھٹکے نے پہلے ہی دودھ کو بچا ڈر دیا۔ اے بھائی! میں ٹھل کے لئے کیا کروں؟۔  
 خدا یہاں بھی ہے خدا وہاں بھی ہے یعنی خدا کے دنیا نہیں قائم رہ سکتی)

دوسرے موقع پر نام دیوت پرستی کے متعلق یوں کہتے ہیں :

ایکے پتھر کی بجائے دوسرے پتھر کے پاؤ

جو اہود دیوتو او ہو بھی دیو ا

(ایک پتھر کو لوگ پوجتے ہیں اور دوسرے پر پاؤں دھرتے ہیں۔ اگر ایک ہے تو دوسرا بھی

خدا ہوا۔ نام دیوتو کہتا ہے کہ میں توہری کی سیوا کرتا ہوں)

اسلام اور ہندو مذہم کے امتزاج کا خیال بھی کبیر کی طبع نام دیوت کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔  
 وہ نہایت بے تکلفی سے عربی فارسی الفاظ ہندی تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

میں گریب میں سکین تیرا نام ہے ادھارا

کر یا حسیما اللہ تو گنی

دریاؤ تو دھنہ تو بسیار تو مینی

دی ہی ایک تو دیگر کوئی نہیں

تم دانا توں مینا میں بچارا کیا لکھی

ہندواندھا تر کو کا نا

دوہن تے گیانی سیانا

ہندو پوہے دھرم سلطان مہٹا<sup>(۱)</sup>

نمے سوئی سیویا جہان دھرم اندرست

ذات پات کی نیز اس کے نزدیک بیکار ہے۔ زندگی کی نجات وہ اعتقاد میں سمجھتے ہیں۔

کہا کرو جانی کہا کرو پانی

رام کو نام جیو دن راتی

تیرتھ کی بے معنی رسوم کے متعلق نامدیو کی رائے سنئے:

گنگا جاؤ گوداوری جاؤ تے

کبھی جاؤ کیس دار ناہیو

گو متی کہس گودا نو کیجے

کوڑی جو تیرتھ کرے

تو جو ہوا لے گارے

(رام نام سری تو نہ پوہے)

(تم گنگا اور گوداوری کو تیرتھ کرنے جاتے ہو۔ کیدار ناتھ ہر بار ہویں سال نہانے جاتے ہو)

گو متی کے لئے ہزار گاہیں مذکور کرتے ہو۔ چاہے تم ایک کروڑ تیرتھ کرو، چاہے تم اپنے جسم کو ہالیہ میں

(برف میں) گاڑ دو۔ لیکن یہ سب کچھ رام کے نام کی پرستش کے لئے ناکافی ہے)

نامدیو کی فکر کی طرح انسان دوست (humanist) ہیں وہ انسانی غلوں

(۱) سجد

(۲) ملاحظہ ہو ہمارا مضمون ”کبیر واس“ اور انکی شاعری“ رسالہ آندو۔ جنوری ۱۹۳۷ء

گہرائیوں کو رسم و آئین کے سیارے نہیں جانچنا چاہئے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا میں تمام جگہ انسان دوستی کے مشربے بشریت کے احترام کو مذہبوں اور عقائدوں سے بالاتر سمجھا ہے اور انسانی شخصیت کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے رسوم کی سخت گیر یوں کے خلاف حدائے استعجاب بلند کی ہے اس قسم کے انسان دوستی کے مشرب اکثر و مختلف شائستگیوں کے آپس میں ملنے سے وجود میں آتے ہیں۔ شائستگیوں کے ملاپ سے افراد جو مدتوں کے جماعتی رویہ اور چلن سے اپنی ذاتی شخصیت کھو بیٹھے ہیں، اذ سر نو بیدار ہوتے ہیں اور پھر سے اپنا کھویا ہوا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ انسان دوستی (humanism) کی تحریک ہندوستان کی اذ نہ وسطیٰ کی تاریخ میں مسلمانوں کی رہن منت ہے۔

نامدیو کا خطاب کبیر کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں سے ہے۔ وہ ایک جگہ کس سادگی سے اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ مسجد کا جو عبادت کے لئے ضروری نہیں۔ انسانی خلوص درد دیوار اور اینٹ گارے کا شرمندہ احسان کیوں ہو؟

دیہی مہدی سن مولانا  
سنج نیاج گجارسے

(جسم مسجد ہے۔ دل مولا ہے۔ جب یوں ہو تو نیا گزارا کیا آسان ہے)  
نامدیو کے خیال کی گہرائیوں میں ہندو دیہہ اوستی تصوف کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک خدا کو پوجتے ہیں لیکن انکا خدا متصوفانہ داخل و ساری (immanent) خدا ہے۔

آپن دیو دھرا آپن آپ گادے پوجا  
جل تے ترنگ تے جی جل کہن سنن کو دوجا  
آپہی گادے آپہی ناچے آپ بجائے تورا  
کہت نامدیو تو میر و تھا کر جن اورا تو پورا

(وہ خود بت ہے خود مند ہے۔ خود اپنی پوجا آپ کرتا ہے۔ پانی سے لہر بنتی ہے اور لہر خود

پانی ہے۔ یہ بس کہنے سننے کو دو الگ چیزیں ہیں۔ وہ خود ہی گا آج، اپنا تھا ہے اور آپ ہی مجھے بجاتا ہے۔ نامہ لکھتا ہے کہ تو میرا آقا ہے۔ آدمی میں کچھ بھی نہیں۔ تو مکمل ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں ایک ہندو صوفی دھرم داس ہوئے ہیں۔ انکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبیر کے شاگرد دل میں ہیں۔ یہ بھی اہلی ذات کے آدمی نہیں۔ انکے خاندان ریوا کے کسودن بیوں میں تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ پندرہویں سوہویں صدی کے بیشتر ہندی صوفی دھمکتا پرچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایسی اور شاہیں اس کثرت اور تواتر سے کسی اور عہد میں نہیں ملتیں۔ اس کی وجہ سوائے اسلامی اثر کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسلام کا وجود بجائے خود ہندوستان میں ذات پات کے خلاف ایک مستقل پروگنڈے کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے اس بات پر کوئی تعجب نہیں کہ اسلام کے ہندوستان میں آنے کے فوراً ہی بعد اس ملک کے تمام حصوں میں اور خصوصاً شمال میں جہاں اسلامی قوت سیاسی اور معاشرتی، زیادہ زور دار تھی، ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی خیال اور شائستگی کا اثر جذب کرنے کے بعد ہندو دھرم کی برائیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ دھرم داس بھی اور دھمکتا مصلوں کی طرح اپنے پیام کو شائع کی زبان سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ہم انکی شاعری کے بعض نمونے یہاں پیش کرتے ہیں:-

اگر تارکو سیئے جن نر شستی اُپجائے  
کوئن برہا دید پڑمی پڑمی جہا گنو اے  
کوئن دشنو ہوئی گئے کوئی پار نہ پائے

(اس خدا کی پرستش کرنی چاہئے جس نے دنیا پیدا کی۔ کروڑوں برہمن و پڑوسی پڑوسی اپنی جان کو مٹاتے ہیں۔ کروڑوں دشمن کو مانتے ہیں لیکن کوئی بھی پار نہیں ہوتا۔

تیر تو اور دوسری مذہبی رسموں کے متعلق بھی دھرم داس کی رائے سنئے و  
تیر تو گئے کوئی اتیرے چلی چلی مر جائے

ہیں یہی اُس لگائی کے مگر تن پائے۔

جھوٹے پنڈت دید پڑمی پڑمی جگ بھڑاتے

لنکے پر کھامری گئے ان کو ہا جیای

نکھ کبیر دھرم داس سے نہا سبھای

جو تیرے لئے سچے چلتے مر جاتے ہیں وہ تیرے نہیں۔ انکی امیدوں کی بنی پانی ہے۔

یہ مگر چھو کا دوسرا جہم میں لگے۔ جھوٹے پنڈتوں نے دید پڑ پڑ کر دنیا کو دھوکے میں ڈالا ہے۔ انکے

جو بزرگ مر گئے انہیں (مفتروں) سے زندہ کیوں نہیں کر لیتے؟ کبیر نے دھرم داس کو ان کیوں بھجایا ہے۔

دھرم داس کو اپنے گرو کبیر کے متعلق ان لفظوں میں ذکر کرتے ہیں :

میرے من بسی گئے صاحب کبیر

ہندو کے تم گرد کرادو مسلمان کے پیر

دودھین سے جھگڑا مانڈیو پو نہیں سریر

شبل سنٹوش دیا کے ساگر پریم پریت تہی ویر

وید کتب میٹھ کے اگر دودھین کے پیر

بڑے شنتن شکر کی اکثر امر سریر

دھرم داس کی نوگوسائیں ناؤ لگا تیر

میرے دل میں کبیر صاحب سنا گئے ہیں۔ تم (کبیر) ہندوؤں کے گرد ہوا اور مسلمانوں

کے پیر ہو۔ دونوں مذہب ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور انہیں تمہارا جہنم نہیں ملا۔ تم

(۱) بھگت شافروں کے ہاں "دھرم" کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کبیر جب رنج کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں

کی تعظیم استعمال کرتے ہیں۔

(۲) اشارہ ہے کبیر کی موت کی طرف۔ ہندو بھلا نا اور مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر ہندو مسلم فساد

ہوا کہتے ہیں کہ لاش غائب ہو گئی۔ کچھ بھولے جنہیں ہندوؤں نے جلایا اور مسلمانوں نے دفن کیا۔ یہ ویسے

مناس، لطف و کرم، مہر و محبت، علم و عقل کے سمندر ہو۔ تم دیدِ قرآن پر حاوی ہو اور دونوں نذیبوں کے پیر ہو۔ تم بڑے بڑے اولیاء کے دوست ہو۔ تمہارا جہم ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اے میرے آقا! دھرم داس کو پاک کر دو اور اس کی کشتی کو پار لگا دو)

ایک اور بھگت شاعر چار تھے۔ انکا نام رائے داس ہے۔ یہ راما نند کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور اس لئے کبیر کے پیر بھائی ہوئے۔ یہ اپنی عوامی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ انکے ہاں اسلامی رنگ کی جھلک ذرا اور زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ یہ بھی ہندوؤں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور اس لئے بے معنی رسوم کی تنقید میں یہ ذرا سابی جھکتے نہیں۔ کہتے ہیں:

کہا بھیسو جے چرن پکھارے جو لوتوانہ چینیے

کہا بھیسو جو مونڈ منڈائے کہا تیر تھہر تا کیسنے

(پیر دھونے سے کیا فائدہ جب تک کہ اس ذات کا نیال نہ کیا جائے۔ سر منڈانے سے کیا فائدہ اور تیر تھہ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟)

دیگر

تمو قہی کا یا تمو قہی مایا تمو قہی ہری بن بسم گنویا

تمو قہی پنڈت تمو قہی بانی تمو قہی ہری بن سے کہا نی

تمو قہی مندر بھوگ بلا سا تمو قہی آن دیوا کی آس

(جسم خالی (بیکار) ہے، مایا (دینا) خالی ہے۔ زندگی بغیر ہری کے خالی ہے اور گم ہر پنڈت اور اسکے وعظ خالی ہیں۔ بغیر ہری کے سب کہانیاں خالی ہیں۔ مندر خالی ہے اور عیش و طرب خالی ہے۔ کسی دوسرے خدا میں (سوائے خدا کے) امید رکھنا خالی ہے)

تو ایک عوامی اور ناقابل یقین روایت ہے لیکن اسکی گہرائیوں میں ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا اہم سلسلہ پوشیدہ ہے جس کا کوئی مل اپ تک نہ مل سکا۔ عوامی فضیل بڑی بڑی حقیقتوں کو یوں ہی سیدھی سادی روایتوں میں بیان کرنے کا عادی ہے۔



اپنی نچی ذات کا وہ ایک بگدیوں ذکر کرتے ہیں:

ناگر جسم میری جاتی بکھیات چارن

رے رام گو سب دگن سارن

سر سری سل کرت بارونی

لے سنت جن کرت نہیں پانن

سورا پاوترنا اور اجل

لے سر سری بت نہیں ہوئے کن

اے شہر کے رہنے والو! میری ذات پات مشہور ہے۔ میں چار ہوں۔ میرے دل میں رام اور گووند تمام صفات کی روح بکھر رہے ہیں۔ اگر شراب لگنے کے پانی سے لاکر بنائی جائے تو بھی نیک لوگ اسے نہیں پیتے۔ شراب ناپاک ہے۔ اور دوسرا پانی مٹنے سے بھی ناپاک ہستی ہے لیکن یہی لگنے کے پانی میں اگر شراب ڈال دی جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا، دوسری جگہ کہتے ہیں:

برہمن ویشیش شدرارہ کھتری

ڈوم چندارنچ من سونی

ہوئی پنیت بھگونت بھجن تے

آپوتاری تارے گل دونی

(برہمن، ویشیش، شدر، کھتری، ڈوم، چندال اور نچ سب کی ایک روح ہے۔ اعتقاد و عبادت سے جو پاک ہو جائے پس وہی خود کو اور اپنے خاندان کو پار لگا سکتا ہے)

(۱) مدتوں تک برہمن مسلمانوں کو بڑا یعنی ”ناپاک اجنبی“ کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ مسلمانوں کی تخصیص نہیں۔ یونانی اور سسٹین قبائل بھی اس وقت تک قدیم ہندی کتابوں میں اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں جب تک کہ وہ ہندویت میں بالکل جذب نہ ہو گئے۔

ماتے داس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسے رانی میرا بانی جیسا سنگرد ملا۔ میرا بانی والی مار وار دودھیا راؤ کی پوتی تھیں۔ سید دیا کے شاہی خاندان میں سنگھما جی کے بیٹے بھونجراج سے انکی شادی ہوئی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرا بانی کی تمسی داس اور بادشاہ اکبر سے بھی خط و کتابت تھی اور ایک مرتبہ خود اکبر سرخ ان میں میرا بانی سے ملنے کے لئے مار وار آیا تھا۔ اگرچہ تاریخی ثبوت اس واقع کی تصدیق میں موجود نہیں لیکن ممکن ہے کہ اس عوامی روایت میں تھوڑی بہت صحت ہو۔ اکبر کے لئے جو خود ایک ایسا مذہب بنا نا چاہتا تھا کہ جو اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے عناصر پر مبنی ہو قیسنامیرا بانی سے ملنے میں ایک خاص دلچسپی ہوگی۔

میرا بانی بھی دوسرے بھگت شاعروں کی طرح انسان دوستی کے مشرب کو بطور اپنہ مذہب اور روحانی ہدایت کے سمجھتی تھی۔ اس کی بھگتی کا قبلہ مقصود، بخلاف کبیر، دھرم داس اور راسے داس کے جو رام پر اعتقاد رکھتے تھے، سری کرشنن تھے۔ وہ سری کرشنن کو گرد و مرگوپال کے لقب سے پکارتی ہے۔ اس کے ہاں خدا کے واحد کا تخیل یزی نایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عہد پران کی روایتوں اور بھگتی کی جذباتی اعتقادی تحریک سے مل کر اپنا ایک الگ خدا کا تصور پیدا کر لیا تھا۔ اس کی شاعری میں ایک ایسا اعتقادی جوش ہے جو اس عہد سے پہلے ہندوستانی خیال اور شاعری میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ میرا بانی تھوڑی بہت فارسی جانتی ہو کیونکہ ازمنہ وسطیٰ میں فارسی ہندوستانی شائستگی کی زبان تھی اور ہندو امرا کے یہاں بھی اسی زبان میں کارروائی ہوتی تھی۔ وہ فارسی کے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتی ہے۔ مثلاً

سب میں ہیا تیری دیکھی کدر لست کے کربان  
مچھ پر تو پر بھو کر پاس کیے بسندی اپنی جان

(ہر چیز میں تیری شان دیکھی۔ میں تیری قدرت کے قربان ہاؤں۔ اے میرے پرہیزگار پرکرم  
 کرو اور اپنی لونڈی سمجھو)

ہندو دھرم کی رسوم کے خلاف وہ کہتی ہے:

اس دیہی کا گرب نہ کرنا مٹی میں بلجاسی  
 کہا بے یقین تو بہت کہنے کھائے کرٹ کا سی  
 کہا بیوہ بے بھگوا پھریاں گھر تاج بے سنیا سی  
 جوگی ہو یا جگتی نہیں جانی الٹی جسم پھرا سی

(تیرہ اور روزوں میں کیا رکھا ہے؟ بھلا بنا رس (کاشی) کی طرف کرٹ لیکر سونے سے  
 کیا حاصل؟ اس جسم پر ستر بیکار ہے۔ یہ تو مٹی میں مغرب مل جائے گا۔ رنگے ہوتے کپڑے  
 پہننے اور گھربار چھوڑ کے سنیا سی بننے کا کیا نتیجہ؟ لوگ جوگی ہو جاتے ہیں لیکن صبح بکثرت (غیری)  
 سے ناواقف ہیں اور اپنی زندگی کو اتار استر چلاتے ہیں)

میرا بانی کی شاعری میں ایک خاص زور اور جوش ہے۔ وہ اپنے عشق کا اظہار اس  
 زبان میں کرتی ہے جے یا تو عورتیں جانتی ہیں یا صوفیا۔ مثال کے طور پر ہم چند شعر نقل کرتے  
 ہیں :-

میرے تو گرد مرگواں دوسرا نہ کوئی  
 دوسرا نہ کوئی سادھو دوسرا نہ کوئی  
 پریم کا تھنیاں سامی بھگتی سے بوئی  
 گھڑت گھڑت کاڑی سینھو چھانچ پڑی کوئی  
 آنسو ابل سینی سینی پریم بلی بوئی  
 اب تو بیل بیل گئی آندھ بیل ہوئی  
 نشتن دگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی

چھانڑ دی کل کی ریت کیا کری ہے کوئی  
 آئی میں بنگیتی کا تہ بگت دیکھ موہی  
 داسی میرا گردھر پر بھوتار و اب موخی

(میرے تو گردہرگو پال ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔ اور کوئی دوسرا نہیں، ارے  
 بھلے لوگو! اور کوئی دوسرا میرا نہیں۔ محبت کی تنہائی سے میں متستی ہوں اور اس تنہائی کو اعتقاد  
 خلوص گھماتے ہیں۔ گمی گمی سارا میں نے لے لیا اب باقی مٹھا جو بچا تو جو چاہے پی لے۔ آنسوؤں  
 کے پانی سے محبت کی پیل کو میں نے جایا ہے۔ اب پیل پر دان پڑھی اور اسکا پھل اصلی خوشی  
 (آئندہ) ہے نیوں کی صحبت میں بیٹھ بیٹھ کر میں نے دنیا کی شرم و حیا کھو دی۔ ذات بات کی ساری  
 رسمیں چھوڑ دیں۔ بھلا دیکھوں کوئی میرا کیا کرے؟ میں یہاں اپنا خلوص تدریج چڑھانے آئی ہوں اور  
 ساری دنیا مجھے دیکھتی ہے۔ اے میرے مالک اپنی لونڈی میرا کو پارا تار دو)  
 دیگر

ہری میں تو پریم دوانی میرا درد نہ جانو کوئی  
 سولی اوپر سیج ہماری کس بدھی سونا ہوئی  
 درد کی ماری بن بن ڈولوں دیدی ملا نہیں کوئی  
 میرا کے پر بھوپیر نٹے گی جب ددی سا تو لیا ہوئی  
 (اے ہری! میں تو محبت کی دیوانی ہوں۔ میرے درد کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ میرا بچپنا  
 سولی پر ہے، بھلا میں کیسے سو سکتی ہوں؟ درد کے مائے بنوں میں ماری ماری پھرتی ہوں۔  
 کوئی اس درد کو دور کرنے والا طبیب نہیں ملا۔ اے میرا کے مالک! میرا کا دکھ تو اسی وقت دور

(۱) گردھر بمعنی پہاڑ کو تھانے والا اور گوپال گذرے کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ سری کرشن جی  
 کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہوگا جب سانو سے رنگ والا اسکا طبیب ہوگا )

انہیں جگت شاعروں کے سلسلہ میں ایک داد دیال ہوئے ہیں کبیر کے بعد  
اککا اثر سب سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیمات کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ انہوں نے اسلام  
اور ہندو حرم کے بہترین روحانی عناصر کو ملا کر ایک اعتقادی نصب العین اپنے دیس والوں کے  
لئے پیش کیا۔ انکے ماننے والے آج تک راجپوتانے اور وسط ہند میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ دادو  
پنتھی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دادو دیال نے، گجراتی، ملاواڑی، ہندی اور فارسی  
میں شعر کہے ہیں۔ دادو دیال کے مذہبی اصول میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ انسان اور خدا کے  
متعلق اسکے خیالات باطل وہی ہیں جو کبیر کے تھے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں ازمنہ وسط  
کی پوری اعتقادی تحریک کا مبداء کبیر اور اسکی تعلیمات ہیں۔ کبیر کا وجود اس عہد کے خیال اور  
مذہب کی تاریخ میں مرکزی صورت رکھتا ہے۔

دادو دیال کی تعلیمات کا خلاصہ اپنی اپنی وسن نے ان لفظوں میں دیا ہے :  
”اُس کو قبلہ تو جسہ بناؤ جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ جنّت اور قاضی پاگل ہیں۔ انہوں  
نے جو کتابوں کا ڈمیر جمع کیا ہے اس سے کیا حاصل ؟ دیدوں کو پڑھنے میں اپنی زندگی مست  
برباد کر دو“<sup>(۱)</sup>

دادو دیال بلا واسطہ طور پر اپنے مشن کا روحانی تعلق کبیر سے یوں بتاتے ہیں :-  
کبیر بچارہ کہی گیا بہت بھانتی سمجھائے  
دادو دینا باوری تاکے سنگ نہ جاتے  
کبیر بچارہ نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اے دادو! دنیا

بولی ہے اس کے ساتھ نہیں جلتی)

معلوم ہوتا ہے دادو نے مسلمان صوفیوں کے ساتھ اچھا خاصہ وقت گزارا۔ وہ صوفیوں کے اصطلاحی نقطہ نظر تکلفی سے استعمال کرتے ہیں :

اللہ تیرا ذکر فکر کرتے ہیں

ماٹک شتاک تیرے ترس ترس مرتے ہیں

ملک سیش دگر نیس بیٹھے دن بھرتے ہیں

دایم دربار تیرے گیر محل ڈرتے ہیں

تن شہید من شہید نات دن روتے ہیں

گیان تیرا دھیان تیرا عشق آگ جلتے ہیں

جان تیرا جنت تیرا پاؤں سرد مرتے ہیں

دادو دیوان تیرا زرشہر یہ گھر کے ہیں

دیگر

دادو میں ہی میرا عرس میں ہی میرا تھان

میں ہوں میرا دھور میں آپ کے رحمن

دیگر

نور ہی کا دم نور ہی کا گھر

نور ہی کا بارو سیرا

نور ہی کا میلا نور ہی کا شیدا

نور اکیلا

نور ہی نبھی بسیرا

نور ہی کا آنگ

نور ہی کا سنگ

نور ہی کا رنگ میرا<sup>(۱)</sup>

نور ہی راتا نور ہی ماما

نور ہی شاتا دادو تیرا

دیگر

دادو اگھ اللہ کا کہو کیا ہے نور

بے حد دادو کو حد نہیں سکل رہا بھر پور

(اے دادو! ان دیکھے اللہ کا ذکر کرو۔ اسکا نور کیا ہے؟ وہ بے حد ہے۔ اسکی کوئی

حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بھر پور قائم رہتا ہے)

دادو کے ہاں کبیر کی طرح خدا کی وحدانیت کا خیال بالکل متعین ہے: مثلاً

انتر جامی ایک تو آتم کے آدھار

جو تم چھوڑو ہاتھ تے کون سنو رھار

داندرونی (یعنی روحانی) زندگی کو بس تو ہی اکیلا درست کرنے والا ہے۔ تو ہی روح کی ڈھارس

ہے۔ اگر تو اپنا مدد کا ہاتھ چھڑالے تو مجھے اور کون سہارا دے سکے گا؟)

دیگر

راکھن ہارا ایک تو مارن ہارا انیک

دادو کو دیا نہیں تون ہی آپ ہی دیکھ

(تو ایک اکیلا ہی حفاظت کرنے والا ہے۔ مارتے داتے بے گنتی ہیں۔ دادو کے لئے اور

کوئی دوسرا نہیں ہے۔ تو خود دیکھ)

(۱) صیغۃ اللہ - بالکل اسلامی اور سامی خیال ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہی خیال اس سے نا آشنا تھا۔

دیگر

دادو یاہ تن پنجسرا ماہیں من سودا  
ایک ناؤں اللہ کا پڑھی جا بگی ہوا  
(اے دادو! یہ تن ایک پنجر ہے جس میں دل ایک طوطے کی طرح قید ہے۔ یہ دل ایک  
اللہ کا نام پڑھ پڑھ کے اسکا حافظ ہو گیا ہے)

دیگر

صاحب میرا پڑا صاحب میرا کھان  
سو صاحب سرتاج ہے صاحب پنڈ پیران  
(صاحب (اللہ) ہی میرا لباس ہے۔ صاحب ہی میری خوراک ہے۔ وہی صاحب میرا  
سرتاج ہے اور میرا بدن اور روح بھی وہی ہے)

دیگر

سوئی گئیانی سوئی جنگلی سوئی صوفی سوئی سیش  
سوئی سنیا سی سے بڑے دادو ایک ایش  
سوئی کاجی سوئی ملا سوئی مومن سلمان  
سوئی یانے ست بھلے جے جاتے رملن  
رام نام کو بانجیا بیٹھے آپے مڈیا ہاٹ  
سائیں سوہوا کرے دادو شولی کپاٹ

(وہی عالم ہے۔ وہی امی سادھو ہے۔ وہی صوفی اور شیخ ہے۔ وہی سنیا سی سے  
بڑا ہے جو اے دادو ایک خدا کی تشریح کرے۔ وہی قاضی اور ملا ہے، وہی مومن اور سلمان ہے۔  
وہی عاقل اور سچا ہے جو رملن سے محبت رکھے۔ میں نے رام کے نام کی تجارت کر رکھی ہے اور  
ایک بات جا رکھا ہے۔ سائیں سے سودا کر کے وہ لوگوں نے (دل کے بادکان کے) دروازہ



کے پات کھول دے ہیں۔

دادو دیدار الہی کو صوفیوں کی طرح اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہیں :-

دین دنی صد کے کروں دیکھن دے دیدار

تن من چمن کروں بہشت دو جگ بھی وار

(میں دین اور دنیا دونوں صدقہ کرتا ہوں۔ مجھے اپنا دیدار دیکھنے دے۔ تن من اور

جنت دونوں سب (اس دیدار کی خاطر قربان)

ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی رسموں کے اختلاف پر اور اس اہمیت پر جو اس

اختلاف کو دیکھا جاتی ہے۔ دادو بہت افسردہ خاطر ہو کر یوں کہتے ہیں :

ہندو ترک نہ جانو دوئی

سائیں سبئی کا سوئی ہوئی

اور نہ دو جا دیکھوں کوئی

کوئی رام کوئی اللہ سناوی

پنی اللہ رام کا بھید نہ پاوی

کوئی ہندو کوئی ترک کری مانی

پنی ہندو ترک کی کھیری نہ جانی

دادو دیکھی آتم ایک

کھیدا سینا انت انیک<sup>(۱)</sup>

(ہندو اور ترک (مسلمان) دونوں ناواقف ہیں۔ خدا سب کا ایک ہی ہے مجھے دوسرا

(۱) ”دادو دیال کا شبد“ صفحہ ۱۳۷ - ہم نے دادو کے سب دو ہے اور شبد اس کتاب یا ”دادو دیال کی

بانی“ ہر دو مطبوعہ انگریز پچاڑی سبھا سے لئے ہیں۔

خدا نہیں دکھائی دیتا۔ کوئی اللہ کہتا ہے اور کوئی رام کہتا ہے لیکن رام کا اہلی بھید انہیں نہیں معلوم۔ کوئی اپنے کو ہندو کہتا ہے اور کوئی ترک لیکن یہ سب ہندو اور ترک بننے کے راز سے بے خبر ہیں۔ دادو کو تو ہر جگہ بس ایک روح مطلق نظر آتی ہے اور وہ اسی ابدی ایک کا ذکر کرتا سستا ہے۔

اُسے ہندو کے بت سے بھی اتنی ہی کم دلچسپی ہے جتنی کہ مسلمان کی مسجد سے اس لئے کہ وہ بقول غالب دونوں کو راہ شوق میں تھکے ہوؤں اور پست ہمتوں کی پناہیں سمجھتا ہے۔<sup>(۱)</sup> کہتا ہے :-

ہندو لاگے دیو ہر مسلمان جہتی  
ہم لاگے ایک اکھ سون سدا زنت پر تہی  
(ہندو بت پوجتا ہے۔ مسلمان مسجد میں عبادت کرتا ہے۔ ہم ایک ان دیکھے کو تعلق رکھتے ہیں جس کی محبت میں ابدیت ہے)  
وعدائیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی ؟

ادھر کے صفوں میں ازمنہ وسطیٰ کی عوامی مذہبی تحریک کے صلیب شاعروں کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ ان شاعروں کی تاریخ پیدائش و وفات کی صحیح تعیین اس قدر مشکل ہے جتنی کہ ان کے کلام کی لسانیاتی تنقید۔ بعض دفعہ ایک ہی شاعر کی طرف مختلف عہدوں کی زبان منسوب کی گئی ہے۔ ہوا اصل میں یہ ہے، جیسا کہ اور دوسری جگہ بھی ہوا ہے، کہ بعد کی آلے والی

دیر جسم آئینہ تہذیب

وامانگنی شوق تراشے ہو پائیں

(نصفہ حمیدہ)

نسلوں نے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اور خود اپنی باتوں کو موثر بنانے کے لئے اپنے متفدین کی طرف اشارہ فرمایا کہ اسے مکفی کہتے ہیں۔ خصوصاً کبیر کے ہاں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ یہ عہد ہمارے موع اور ادیب دونوں کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس قدر اہمیت زیادہ ہے اتنا ہی کم کام اس عہد کی تاریخ و ادب میں کیا گیا ہے۔ اس مذہبی تحریک کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اسلامی تہذیب و تعلیم کا وہ گہرا اثر ہے جو ہندو خیال اور تمدنی نظاموں پر پڑا۔ سوائے اسلامی اثر کے اور دو کیا تھا جس کے باعث چودھویں پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کا کونا کونا و حدائیت سے بھرے ہوئے گیتوں اور ذات بات کے نظام کے خلاف صدائے احتجاج کے شور سے گونج اٹھا۔ ہم نے بن بگت شاعر دل کا اوپر ذکر کیا انہیں کا روحانی سلسلہ برابر اٹھارہویں صدی عیسوی تک قائم رہا۔ ملوک داس، ہری چند، یاری صاحب (مسلمان بگت شاعر ہوئے ہیں) دھرنی داس، دریا صاحب بہاری (مسلمان) سب کے سب ایک ہی راگ لاپنے والے تھے۔ ان سب کی تعلیمات وہی ہیں جو کبیر کی اور ان سب کے مخاطب گاؤں کے لوگ تھے۔

یہ سب بگت شاعر صوفی تھے۔ اور تصوف ایک گہرا نفسی اور نفسی تجربہ ہے۔ جو رسم و آئین سے بے نیاز ہے۔ جب وہ ادارہ بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے تشکیلات لازمی ہے۔ اور تشکیلات بغیر رسم و آئین کے ممکن نہیں۔ یہ دیکھ کر کچھ تعجب نہیں ہوتا کہ جنہوں نے ذات بات کو مٹانا اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا تھا انہیں کے پیروؤں نے خود اپنے آپ کو ذات بات کے تنگ دائرہ میں محدود کر دیا اور امتداد زمانے سے ان کے ہاں بھی سخت گیر یوں اور رسوم کی پابندی کو وہی جگہ حاصل ہو گئی جو ہندوؤں کے دوسرے طبقوں میں پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ کبیر اور اس کے ہیکل

کے دوسرے صوفی مصلوں کا یہ ہرگز نشار نہ تھا کہ ان کی تعلیم کو سننے اور ماننے والوں کے الگ گروہ بن جائیں۔ یہ سب لوگ انسان دوست تھے اور انسان دوستی کی ذہنی اور روحانی آزادیوں کو ہندو سماج میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلام مان کے خیال ذہن کے لئے محرک بنا۔ لیکن انکے بس کی بات نہ تھی کہ اپنے پیروؤں کو الگ ذات بننے سے روک سکے۔ دنیا میں ہر جگہ یہ ہوا ہے کہ خیال اپنی موثری کے لئے تشکیل چاہتا ہے۔ یہی تشکیل ادارہ بن جاتی ہے۔ اداروں کا اصلی خیال سے قریب تر ہونا ان کے عاملوں کے روحانی اور ذہنی توازن پر مبنی ہے۔ انسانی غرضوں نے اس توازن کو نایاب بنا دیا ہے۔

---

# مسئلہ افلاس ہند

اور

## جدید معاشیاتی تحقیقات

(گزشتہ سے پوستہ)

مسئلہ توازن تجارت | ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہندوستانی زرعی پیداوار پر دو صحیح اعتراضات کئے جاتے ہیں اول تو یہ کہ ہندوستانی باوجود استطاعت کے اس قدر دولت ہی پیدا نہیں کرتے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں کی معاشی دولت زیادہ متوسط اور ادنیٰ درجہ کی ہوتی ہے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں دیکھنا ہے کہ مسئلہ توازن تجارت کا تعلق افلاس ہند سے کیا ہے۔

توازن تجارت سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ کسی ملک کی درآمد و برآمد میں توازن رہے یعنی یہ کہ جس قدر قیمت کا مال کسی ملک میں داخل ہو اسی قیمت کا مال ملک کے باہر جائے ، فرض کیجئے کہ ایران سے ہر سال بیس کروڑ کا مال جاتا ہے اور تنوکر وڑ کا مال آتا ہے۔ یہ چار کروڑ کی زائد برآمد مروجہ اصول کے مطابق ایران کے لئے ”بچت ہے“ اس کے حق میں ”مغید“ ہے لہذا معاشین اس قسم کی تجارت کو تجارت موافقہ (Favourable Trade) کہتے ہیں۔ اگر ایران سو کروڑ کا مال دوسرے ممالک کے بیچے اور دوسرے ممالک کے بنیں کروڑ کا مال ایران میں داخل ہو تو یہ تجارت اس کے لئے مضر ہے اور معاشین اس کو ”ناموافق تجارت“ سے تعبیر کرتے ہیں ثبوت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ملکی درآمد و برآمد شخصی آمدنی و اخراجات کے مائل ہر جس طرح کسی شخص کی آمدنی سے اس کے اخراجات کا زائد ہونا معاشی پسماندگی کی علامت ہے اور آمدنی کا اخراجات سے زائد ہونا ترقی کی نشانی ہے ایسا ہی حال اقوام و ممالک کی درآمد

برآمد کا ہے کیونکہ درآمد برآمد سے بڑھی رہی تو دوسروں سے رقم واجب الوصول ہوتی ہے جو معاشی ترقی کی نشانی ہے لیکن اگر درآمد برآمد سے بڑھی رہے تو ملک کو رقم ادا کرنی پڑتی ہے جو معاشی منزل کی علامت ہو لہذا زیادہ درآمد فلاس سے اور زیادہ برآمد دوسروں سے تعبیر کی جاتی ہے۔ اسی غرض سے کم سے کم مجموعی درآمد اور مجموعی برآمد کی قیمتوں میں توازن مطلوب ہوتا ہے۔

معاشین سمجھتے رہے ہیں کہ درحقیقت توازن تجارت کا نظریہ صحیح و مکمل ہے لیکن جدید معاشیاتی تحقیقات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ نظریہ توازن تجارت صرف محدود معنی میں صحیح ہو اور وہ عام طور پر منطبق نہیں کیا جاسکتا لہذا درآمد سے بڑھی رہے تو یہ ہمیشہ اند نہیں کیا جاسکتا کہ ملک خسار رہا ہے اور برآمد سے بڑھی رہے تو ملک معاشی ترقی کر رہا ہے کیونکہ بلا وقت درآمد کا برآمد سے کم رہنا زوال کی نشانی ہو اور یہی ہندوستان کا حال ہے۔

ہندوستانی درآمد و برآمد کے اعداد شمار کا جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو ساف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی تجارت کا رجحان تدریجی اضافہ برآمد کی طرف ہو جو حسب ذیل اعداد سے عیاں ہوگا۔

سنہ	خالص زیادہ برآمد	سنہ	خالص زیادہ برآمد
۱۸۶۰	۸ کروڑ	۱۹۱۶	۲۶ کروڑ
۱۸۸۰	۱۴	۱۹۱۹	۴۹
۱۹۰۰	۶	۱۹۲۳	۷۲
۱۹۱۰	۴۳	۱۹۲۴	۵۳
۱۹۱۳	۲۱	۱۹۲۵	۹۹

انگریزی حکمران برہمن سیاسیات اور عام اخبار نویس اس سے (خیالی نظریہ موافق ناموافق توازن تجارت کے بموجب) نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہندوستان امیر تر ہو جا رہا ہے اور

اُسے زائد برآمد کی وجہ سے یہ مفید اور قابلِ ربح موقع مل رہا جو کہ دوسروں سے کام کرانے پہی وجہ ہے کہ برطانوی عہدہ دار و سپاہی ہندوستان میں کام انجام دے سکتے ہیں اگر اس کی برآمد اکی در آمد سے بڑھی نہ ہوتی تو اسے سخت مشکل کا سامنا ہوتا بہر طور ہندوستان کی مثال اس امیر کی سی ہے جس کی آمدنی بدبج بڑھ رہی ہے اور جیسے جیسے اُس کی دولت و آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے وہ زیادہ نوکر رکھتا ہے، زیادہ کھیل تماشہ دیکھتا ہے، زیادہ خدمات لیتا ہے، غرض کہ بحیثیت مجموعی بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔

عام تعلیم بہت حضرات کا یہ خیال صحیح ہوتا اگر توازن تجارت کا نظریہ بھی صحیح ہوتا مگر جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرنے کی کوشش کرینگے یہ نظریہ قطعی طور پر صحیح نہیں، اور موافق و ناموافق توازن تجارت اور معاشی ترقی و منزل میں کوئی ربط و تناسب نہیں، لہذا کسی ملک کی مادی بہبودی کا اندازہ کرنے کے لئے توازن تجارت پر کلی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

نظریہ توازن تجارت کی قطعیت کے خلاف لائل

فرض کیجئے کہ ہندوستان کا ایک تاجر و سٹل ہزار روپیہ کا مراد آبادی سامان فروخت کی غرض سے جاوا بھیجتا ہے اور ہندوستان کے برآمد کے جبر میں ۱۰۰۰ روپیہ رقم درج کجائی ہے، اور یہی تاجر اپنے نمائندہ مقیم جاوا کو لگتا ہے کہ کچھ رقم مراد آبادی سامان کے فروخت کرنے سے حاصل ہو اسکی شکرت ہندوستان بھجواد اس مثال میں بین الاقوامی تجارت کی سہل ترین ضرورت و پیش ہوتی ہے۔ صرف سہولت تفہیم کی خاطر ہم نے اس سہل ترین صورت کو پیش نظر رکھا ہے۔ حالانکہ درحقیقت تجارت میں بالعموم دو فریق اور اقسام دولت ہی نہیں ہوتے بلکہ مختلف خریدار و فروختدے اور مختلف اقسام دولت ہو کرتے ہیں۔ بہر طور دنیا کا کاروبار اسی بیج پر چل رہا ہے۔

یہی مراد آبادی سامان جاوا پہنچا کر ۱۲۰۰۰ روپیہ کا ہو جاتا ہے کیونکہ تاجر کو سامان کے پیکنگ اور حمل و نقل کے اخراجات اور جاوا کا درآمدی محصول اور اگر ناظر اسے، ان حالات میں دو صورتیں ممکن ہیں :-

اول یہ کہ مراد آبادی سامان کی قسم عمدہ نہ ہونے کے باعث اور سامان خوش وضع اور جاد والوں کے احتیاجات کے لئے ناموزوں ہونے کے باعث اس کی مانگ جاد میں زیادہ نہ ہو، اور اس سبب سے مال کسی طرح ۵۰۰۰ سے زیادہ پر نہ بک سکے۔ پس جاد کے نمائندے نے مجبوراً ۵۰۰۰ کی شکر ہندوستان روانہ کی جو اخراجات محل نقل کو ملا کر مراد آباد پہنچنے پر ۶۰۰۰ کی ہوئی اور یہی رقم ہندوستان کے درآمد کے رجسٹر میں داخل کر دی گئی۔

موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۰۰ کا مال بھیجا گیا اور ۶۰۰۰ کا مال خسر ہوا گیا جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ توازن تجارت ہندوستان کے لئے موافق ہو اور نظریہ توازن کے مطابق ہندوستان کو ۴۰۰۰ کی رقم واجب الوصول ہے (کس طرح؟ کس سے؟) اس نظریہ کے حامی کہتے ہیں کہ ہندوستان نے ۱۰۰۰۰ کا مال بچا اور ۶۰۰۰ کا خریدا، لہذا وہ منافع میں رہا مگر ہم کہتے ہیں کہ ہندوستان کو ۱۲۰۰۰ کے مال کے معاوضہ میں صرف ۶۰۰۰ کا مال ملا لہذا ہندوستان کو ۶۰۰۰ کا نقصان ہوا۔

اس تباہ و دولت کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسی قدر مراد آبادی سامان عمدہ قسم کا ہونے، خوش وضع اور خوش نما ہونے، اور جاد والوں کے احتیاجات کے مناسب بننے جانے کے باعث ۲۰۰۰۰ روپیہ میں بچا اور جاد والے نمائندے نے مراد آبادی تاجر کو ۲۰۰۰۰ کی شکر بھجوا دی اور ہندوستان کے درآمدی رجسٹر میں ۲۰۰۰۰ کی رقم داخل کر دی گئی۔ نتیجہ موازنہ یہ کہ ہندوستان کے حق میں یہ ناموافق تجارت ہے۔ کیونکہ اس مرتبہ ہندوستان نے ۲۰۰۰۰ کا مال منگوایا حالانکہ اُس نے صرف ۱۰۰۰۰ کا مال بھیجا تھا یہ زائد درآمد توازن تجارت کے "زریں" اصول کے مطابق ہندوستان کا نقصان ہے مگر جدید معاشیاتی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس صورت میں ہندوستان کا سراسر نفع ہے کیونکہ ہندوستانی تاجر کو ۱۰۰۰۰ کا سامان بھیجتے وقت ۲۰۰۰ محل نقل کے لئے دینے پڑے اور شکر منگانے کے لئے ۳۰۰۰ اس طرح کل ۵۰۰۰ کا مزید خرچ ہوا مگر ۲۰۰۰۰ کی شکر حاصل ہوئی یعنی ۵۰۰۰ کا منافع ہوا۔ مگر اس نظریہ کے خلاف رہے



رکھنے والے، جو اس گہری نظر سے معاشی تفریق کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہیں، اور حقیقت معاشیات سے واقف نہیں، یہی گمان کرتے ہیں در آمد زیادہ برآمد کم نتیجہ معاشی منزل!!  
 گویا موافقین نظریہ توازن تجارت کی نظریہ کے مطابق اعلیٰ تنظیم، اعلیٰ کارکردگی، عمدہ مذاق اور عمدہ قسم سامان ہو تو نتیجہ معاشی منزل ہوتا ہے اور تعلیمی، ادنیٰ کارکردگی، پھوڑپن، بد مذاقی سے معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے!!

نظریہ توازن تجارت کے سراسر ناقابل اعتماد ہونیکے ثبوت میں بہترین مثال پیش کیجا سکتی ہے:- فرض کیجئے کہ وہ جہاز جو مراد آباد ہی سامان جاوا لہجاریا تھا کسی وجہ سے غرق ہو جائے تھا ہرے کہ جاوا والا نمائندہ اس مرتبہ ایک روپیہ کا بھی سامان اپنے مراد آبادی مالک کو نہ بھیج سکیگا۔ نظریہ توازن تجارت کے قائل فوراً اعداد شمار سے یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ برآمد ۱۰۰۰۰۰ اور آمد ۱۰۰۰۰۰ ہندوستان کی موافق تجارت بقدر دس ہزار ہے جو دوسروں سے وصول طلب ہیں (جہاز کے ساتھ سامان بھی غرق ہو گیا تو ہر رقم کس سے اور کیونکر وصول ہوا؟)

جن لوگوں میں فہم عامہ اور شیعہ ذہنیت موجود ہے، جن لوگوں کا دماغ سطحی معاشی نظریات سے مرعوب نہیں ہوتا، اور اصول معاشیات کے جاننے کے باوجود حقیقی حالات کے پہچانے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس سے نظریاتی معاشیات پڑھتے پڑھتے ذاتی غور و فکر کی طاقت سلب نہیں ہوگئی ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ طرز استدلال صحیح نہیں، اور نظریہ توازن تجارت کسی طرح قطعیت کا دعویٰ کر نہیں ہو سکتا اور موافق و ناموافق توازن تجارت سے کسی ملک کی مراد الحالی یا معاشی منزل کا پتہ نہیں چل سکتا۔

توازن تجارت کی موافقت و ناموافقیت کے منطقی تصورات اس قدر عام ہیں کہ وہ ماہرین سیاسیات، مصلحان قوم و معاشرت، رہبران سیاسیات، مقالہ نویسوں، رسالہ نگاروں اور عام پڑھے لکھے اشخاص کے علاوہ خود گرد و معاشین میں پائے جاتے ہیں چنانچہ معاشیات کی اکثر "مستند" اور جامع کتب میں بھی توازن تجارت کی محدود صلاحیت انطباق (Limited range of)

Practical Application پر مطلق بحث نہیں ہوتی۔

اس غلطی و غلط فہمی کے اسباب کا پتہ چلانا آسان نہیں اس کے لئے نظریات قدر و قیمت کا بیان کرنا ضروری ہوگا، اور مسئلہ توازن تجارت و مسئلہ زر (توازن داد و ستد) کے باہمی تعلقات ظاہر کرنے پڑیں گے۔ اگر مجھ سے یہ کام انجام پائے تو بھی یہاں اس کے تذکرہ کا کوئی موقع نہیں۔ مجبوراً اس اجمال پر اکتفا کرتا ہوں کہ توازن تجارت کا مسئلہ اس وجہ سے بھی غلط ہے کہ دار و مدار قیمت اشیا (بوقت درآمد و برآمد) پر رکھا گیا ہے اور زیادہ تر مقدار زر کا لحاظ کیا جاتا ہے توازن تجارت کے اعداد و شمار سے بندرگاہوں پر چیزوں کی جو قیمت ہوتی ہے اُسکا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کا کیا بشر ہوتا ہے، آیا وہ کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، یا زیادہ داموں بکتی ہیں۔ وہ صرف میں آتی بھی ہیں یا یونہی اکارت جاتی ہیں، ان واقعات کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال سے توازن تجارت کا نظریہ اس وقت تک قابل اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی بنیاد دولت اور اُس کی اضافی و مطلق قدر پر نہ رکھی جائے۔ اسی طرح درآمد و برآمد کے اعداد و ارقام قابل استناد ہیں اور اس پر نظر کرتے ہوئے علم و عمل میں بین اختلافات رہیں گے۔

یہ تو ثابت ہو گیا کہ موافق توازن تجارت بھی ملک کی معاشی تنزل کا سبب ہو سکتا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی تجارت کی حالت کچھ ایسی ہی ہے جو مال ہندوستان سے برآمد ہوتا ہے وہ زیادہ تر متوسط اور ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے، یعنی ہماری تنظیم و کارکردگی ادنیٰ ہونے کے باعث ہمارے مال کی قدر غیر ملک میں زیادہ نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہم بہت سامان کم قیمت میں بیچتے ہیں، اور تھوڑا مال زیادہ قیمت پر خریدتے ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کی تنظیم و کارکردگی اعلیٰ اور ہماری ادنیٰ ہوتی ہے چونکہ ہم بفصل زر خریدتے کم ہیں اور بیچتے زیادہ ہیں (حالانکہ اشیا کی حقیقی قدر کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے بیڑیں متقابل بہتر ہوتی ہیں) میں حقیقی

۱۔ یہاں یہ اصولی اعتراض ممکن ہے کہ جس چیز کی قدر زیادہ ہے اس کی قیمت کیونکر کم ہو سکتی ہے اور اسی طرح کم قدر

نقصان ظاہر منافع کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اور ہم اپنی نادانی و لاعلمی میں خوش و غرم ہیں اور ”موافق توازن تجارت“ کے حقیقی راز سے واقف نہیں۔ شکایت اگر کرتے ہیں تو صرف اس کی کہ ہندوستان میں توازن تجارت قائم نہ ہونے کے باوجود توازن داد و ستد قائم ہو اور مالی کاروبار میں کوئی اتری نہیں ہونے پاتی، وہ زیادہ تر مطالبات وطن کی وجہ سے جس سے ہندوستان پر بہت بڑا بار پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تجارت کی درآمد سے برآمدات کا وسطاً بقدر ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کو یہ رقم دوسرے ممالک سے وصول بھی ہوتی ہے کچھ حصہ کم کا تو قدر و قیمت میں تفاوت کے باعث بلاشبہ خود بخود غائب ہو جاتا ہے، اور بقیہ رقم جو واجب الوصول ہوتی ہے، اس کی ادائیغہ رقم کی شکل میں نہیں ہوتی۔ نہ اس قیمت کا مال ہندوستان بیجا جاتا ہے اور نہ اس کے ذمہ قرض رہتا ہے بلکہ اس رقم کی ادائیغہ خدمات کے ذریعہ کر دیا جاتا ہے۔

ہندوستان ہر سال تقریباً ۴۰ کروڑ کا سامان بیچتا ہے اور ۱۰۰ کروڑ کے قریب کا سامان درآمد ہوتا ہے جو رقم ہندوستان کو واجب الوصول ہوتی ہے وہ حقیقتاً اور انہیں کیجائی بلکہ زیادہ تر ”مطالبات وطن“ کی مد میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان پر بیجا بار ہیں۔ اس معرکہ الاراسلہ کی بحث کا یہاں کوئی موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے جدید معاشیاتی تحقیقات سے جو کچھ روشنی اس مسئلہ پر ڈالی جا سکتی ہے یہیں صرف اسی کے متعلق تذکرہ کرنا ہے۔

کی چیزیں کیونکر زیادہ قیمت میں بک سکتی ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے مگر عملی تجارتی واقعات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح ہندوستانی مال کم قیمتوں پر پیدا جاتا ہے اور وہاں کا مال زیادہ قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ زیادہ تر تو ”تجارتی چالاکوں کا نتیجہ ہے مگر ہندوستانیوں کی لاعلمی، عدم واقفیت، اتفاقی وغیرہ بھی اہم اسباب ہیں۔“ ملے کسی قدر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے (Indian Economics) از جاتر دیو سیر

مطالبات وطن	مطالبات وطن کا مسئلہ یعنی یہ کہ وہ جائز ہیں یا مجاز، مفید ہیں یا مضر اور اگر مفید یا مضر ہیں تو کس حد تک، اسی وقت بخوبی حل ہو سیکے گا جبکہ ہم اتمام
مسلک اخلاص ہند اور	دولت و محنت سے بخوبی واقف ہو جائیں۔
اقسام محنت و دولت	

اقسام دولت و محنت	عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب دولت کی تقسیم اس اعتبار سے کہ انسانی
	احتیاجات یکساں اہمیت نہیں رکھتے یوں کیا سکتی ہے کہ اس قسم کی دولت جو انسانی لازمی احتیاجات (مثلاً بھوک، پیاس، پناہ) کے پورا کرنے کے لئے مستعمل ہو ہم ٹھیک معاشی دولت سے تعبیر کریں
	مثلاً صحت بخش غذا، توانائی پیدا کرنے اور بڑھانے والی غذا، رہنے سہنے کے لئے صاف سترے مکان، تن کو دھوپ اور سردی کی تکالیف سے بچانے کے لئے کپڑا، یہ سب چیزیں بقائے حیات
	و خلائق نسل کے لئے ضروری ہیں لہذا ہم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لایہی ضروریات پورا کرتی ہے ٹھیک دولت اور جس محنت سے یہ اشیا تیار ہوتی ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مادی ہوں یا غیر مادی محنت قسم اعلیٰ کہتے ہیں مثلاً عام طوطیبیب کی محنت، انسان کی محنت، جلابے کی محنت، معارف کی محنت، دوم اس قسم کی دولت کو جو انسان کی لایہی قطعی احتیاجات کو نہیں

مطبوعہ Karaponevala بمبئی مسئلہ جلد دوم صفحہ ۳۰۰ تا ۳۱۲ سنت تعجب کی بات ہے کہ اس اہم موضوع پر ایک انگریزی زبان میں بھی کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ نظریہ Drain کو کسی نے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے خصوصاً جبکہ مطالبات وطن معاشیات ہند کے سب سے زیادہ بحث طلب مسئلہ Drain، ہنگ بیا دہے نظریہ ڈرین ایک مکمل طور پر کسی بھی پیش نہیں کیا گیا۔ وہ کس درجہ نامکمل صورت میں ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شامیہ محنت معاشیات ہند نے اس کا اندازہ ۲۱۸ (دو سو اٹھارہ) کروڑ لاکھ ہے ملاحظہ ہو

Shah and Khambata "The wealth & Taxable

Capacity of India. والا ۹۲۴ صفحہ ۳۰۳ اور ۲۲۲

بلکہ تمدنی احتیاجات کو پورا کرنے، یعنی بقائے حیات و نسل انسانی کے علاوہ کسی قدر چین و آراہم، ترقی و خوش حالی کے لئے ضروری ہوں ہم تمدنی دولت سے تعبیر کرتے ہیں، مثلاً میز کرسی، بچنگ، سائیکل، سینے کی مشین، ادبی کتابیں، سبق آموز اور مہذب دلچسپ ناولیں، شائستہ اخبار، مفید رسالے وغیرہ۔ تمدنی دولت کو پیدا کرنیوالی محنت کو محنت قسم اوسط کہہ سکتے ہیں سوم۔ دولت کی تیسری قسم وہ ہے جو انسان کی حقیقی یا تمدنی احتیاجات و ضروریات کو نہیں بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتی ہو۔ یعنی وہ دولت جو عیش و عشرت، نمود و نمائش اور نفس پستی کے لئے کام آتی ہو۔ مثلاً تمام مشروبات، تمباکو، سگریٹ، زیورات، سونے چاندی کے برتن، محض جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والے ناول، مضمر اخلاق، فضول، لغو خبریں شائع کرنیوالے اخبار اور رسالے، اس قسم کی دولت آسائشی دولت ہے، اور وہ محنت جس سے عیش و عشرت میں کام آنے والی دولت پیدا کی جاتی ہے اسے ہم محنت قسم ادنیٰ کہتے ہیں۔

چھٹ۔ دولت کے متعلق تو کسی کو زیادہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی چیزیں داخل کی جاتی جا رہیں مگر تمدنی دولت اور شاید آسائشی دولت کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، ساتھ ہی فہم عامہ سے مدد لے کر انسان تیز و تفریق ضرور کر سکتا ہے مثلاً کسی شخص کے برتن مٹی یا تاجپنبی کے اور کانٹے چمچے برتن سلور کے ہوں تو ہم باسانی اسکو تمدنی دولت تصور کر سکتے ہیں، اور اگر کسی کے ہاں سونے کے برتن، چاندی کی رکابیاں اور نہایت نفیس چھشما گلاس اور چمچے ہوں تو اس دولت کو بلاشبہ آسائشی دولت میں شمار کریں گے۔

ٹھٹ۔ دولت، تمدنی دولت، آسائشی دولت اور محنت قسم اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ کا مطلب سمجھ جانیکے بعد ہم اس کے چند کیلئے بیان کرتے ہیں جن کا جاننا بھی ضروری ہے، تاکہ مثلاً افلاس منہد کا ان سے تعلق بھی ظاہر ہو جائے۔

فرض کیجئے کہ اگر فیقہ کے دو گادوں میں جو ایک دو سکرے اور باقی دنیا سے بالکل علیحدہ معاشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پہلے گاؤں میں اگر فرض کیجئے کہ ۱۰۰ میں سے نصف بیکار پڑے

رہتے ہیں اور بقیہ نصف میں سے ۲۰ محنت قسم اولیٰ کرنیوالے ضلّا کا لے جانے، دھول پیٹنے ہنوز بچا کرنے والے، بھانڈ وغیرہ ہیں اور صرف ۲۰ آدمی ملکر کمیتی باڑی اور ضروری کام کا کج کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس گاؤں کی مادی بہبودی زیادہ نہیں ہو سکے گی کیونکہ تقسیم کا راقام محنت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ دوسرے گاؤں میں فرض کیجئے کہ کنوئیں سے صرف پانچ بیکار رہتے ہیں، پانچ مکمل تماشے، تقالی وغیرہ کرتے ہیں، ۱۰ فیصدی آسائشی دولت ضلّا شراب وغیرہ تیار کرتے ہیں اور پندرہ فیصدی تمدنی دولت پیدا کرنے میں مصروف ہیں، اور بقیہ ۶۵ ٹھیٹ دولت پیدا کرتے ہیں، تو ہم یہ توقع کر سینگے کہ اس گاؤں کی مزید الحالی زیادہ ہوگی۔

مثال بالا سے حسب ذیل کچھ افذہ کئے جاسکتے ہیں اور انکی تشریح بھی آسان ہے۔

اقام دولت و محنت اور (۱) جس قدر جس ملک میں تقسیم کا رکا عمل اقسام محنت کے اعتبار سے صحیح  
مزید الحالی کے اصول ہوگا اسی قدر اس ملک کی مادی بہبودی مستحکم اور دیر پا ہوگی۔

(۲) جس قدر جس ملک میں محنت قسم اعلیٰ کرنیوالے یعنی ٹھیٹ دولت پیدا کرنے والے زیادہ ہوں گے اسی قدر اس ملک کی مزید الحالی زیادہ ہوگی۔

(۳) کسی ملک میں اگر اوانے محنت کرنیوالے حد سے زیادہ ہوں گے تو اس ملک کی معاشی زندگی دشوار ہو جائیگی۔

تبادلہ مختلف اقسام دولت کا افلاس ہند کی تحلیل کے لئے مبادلہ دولت کا سوال نہایت  
کا افلاس ہند پر اثر ضروری ہے فرض کیجئے کہ دو گاؤں ملکر معاشی زندگی بسر کرتے ہیں اور  
بقیہ عالم سے انکے کوئی تعلقات نہیں۔ ایک گاؤں کے لوگ باقاعدہ محنت و مشقت کر کے ضروری سامان پیدا کرتے ہیں، اور دن دن بھر محنت کر کے دولت پیدا کرتے ہیں، اور دوسرے گاؤں سے ہر روز چار چار پانچ پانچ آدمی آکر مکمل تماشے دکھاتے ہیں چہند لوگ آکر گانا گاتے ہیں غرضیکہ گھنٹہ ڈیزم گھنٹہ خوش کر کے بہت سافلہ وغیرہ بجاتے ہیں پہلے گاؤں والے اس طرح نذر کھیل تماشے اور گانے بجانے کو پسند تو کرتے نہیں مگر مرکز طبیعت ہونے کی وجہ سے مستقل مزاج

نہیں ہوتے، اور دوسرے گاؤں ولے انکی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، گویا اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کر نیکے لئے انہیں گودی بھر بھر کے چاول آنا گئیوں وغیرہ دینا پڑتے ہیں۔

چند روز ناوہ اگر یہی لیل و نہار رہا تو دونوں گاؤں کی معاشی بہبودی میں کیا فرق واقع ہوگا؟ اول الذکر گاؤں کی دولت میں تخفیف ہوگی اور دوسرے گاؤں کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ محنت قسم ادنیٰ سے ہوا۔ ایک نے دوسرے کی نفسانی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر علی الاطلاق استحصال کیا۔

اسی طرح زمین کیجئے کہ دو گاؤں ہیں، اور دونوں میں کاشت بھی ہوتی ہے، مصنوعات بھی تیار کیجاتی ہیں، ایک گاؤں دوسرے گاؤں کو چاول بھیجتا ہے اور اسی قدر قیمت کا گئیوں ملگاتا ہے، اسی طرح مصنوعات میں بھی تبادلہ ہوتا ہے اور ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں جا کر اپنے کمیل تائے اور سرسک کر تب دکھاتے ہیں تو دوسرے گاؤں کے لوگ پہلے گاؤں جا کر شعیبہ دیکھانی ہیں گانا سناتے ہیں، اس طرح محنت قسم اعلیٰ کا تبادلہ قسم اعلیٰ سے، محنت قسم ادنیٰ کا قسم ادنیٰ سے، محنت قسم کم کا قسم اونے سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس تبادلہ سے دونوں گاؤں میں کسی کی دولت کم نہیں ہوتی، بلکہ دونوں کو اس اعتبار سے کہ موافق مبادلہ مل میں آیا۔ فائدہ ہوا۔

جس طرح ہم نے ”دو گاؤں اور دو تین چیزیں فرض کر لی تھیں، اسی طرح ہم کئی فرق اور کسی قسم کی دولت فرض کر لیں تو ہمارے پیش نظر بین الاقوانی کاروبار کا ایک خاکہ ہو جائے گا۔ نتیجہ ہمیشہ وہی نکلے گا کہ اقوام دولت کے اعتبار سے تبادلہ اس طرح ہونا چاہئے کہ ٹھیک دولت کے معاوضہ میں ٹھیک دولت دی جائے، اگر کمتر قسم کی دولت کے معاوضہ میں ٹھیک دی جائیگی تو ٹھیک دولت دینے والے کو نقصان ہوگا۔

اقوام دولت و محنت کا مفہوم سمجھ لینے اور انکے تبادلہ کے اثرات سے بخوبی واقف ہو جانے کے بعد میں ان اصول و قوانین کو حالات پر منطبق کر کے دیکھنا ہے کہ افلاس مند پر اچھا کیا اثر پڑتا ہے۔

ہندوستان ہر سال کثیر رقم کی ایسی مدنی و آسائشی چیزیں بھی منگاتا جس کے معاوضہ میں ظاہر ہے یہاں سے روپیہ بیسہ یا سرکاری نوٹ توجاتے نہیں بلکہ ٹھیک دولت بھی جاتی ہے مثلاً ہر سال لکھو کھا روپیہ کی شراب، سگریٹ وغیرہ ہندوستان آتے ہیں، اور ہر سال ہندوستان لکھو کھا روپیہ کا اناج بیرون ہند بھیجے پرنچو رہے ہمارے چند گھنٹے تو لطف و سحر میں گزر جاتے ہیں مگر اسکا خمیازہ ہم ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی لوگ قلت غذا کی وجہ سے فاقہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو فی نقطہ نظر سے اس تبادلہ سے ہمیں نقصان ہوتا ہے۔ بعض اس وجہ سے کہ اقوام دولت میں فرق تھا۔ اگر یورپی مشروبات کے معاوضہ میں یہاں سے ویسی شراب جاتی تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی بازار اناج پر اس تبادلہ کا مطلق اثر نہ پڑتا، نہ تو چیزیں گراں ہو جاتیں اور نہ آبادی پر گرائی کے مضر اثرات پڑتے۔

اسی طرح جب ہندوستانی نواب، راجہ، سیٹھ، ساہوکار، نمود و نمائش اور عیش و عشرت کے لئے Rolls Royce موٹریں خریدتے ہیں اور جب ہندوستانیوں کو "خوش" کرنے کے لئے کروڑہا فیٹ کی سینما فیس آتی ہیں اور ہزار ہا روپیہ کے ٹائٹے آتے ہیں تو ہندوستان سے اسی قدر قیمت کا آسائشی سامان نہیں جاتا بلکہ ہزاروں کپاس کے گتھے بیرونی ممالک کو روانہ کئے جاتے ہیں۔ دوسروں نے تو کھیل تماشے کر کے نسبتہ تھوڑی محنت و مشقت سے فلیس تیار کر دیں مگر ہندوستان کو اس کے معاوضے میں قریب قریب اسی قیمت کی خام پیداوار بھجوانی پڑی، جس کے لئے زیادہ محنت اور دوسری کرفنی پڑتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوا کہ اقوام دولت میں اہم فرق ہونے کے باعث جو مبادلہ ہوتا ہے وہ ہندوستان کے حق میں سراسر ضرر ہے۔

یہاں تک تو درآمدی و برآمدی سامان کے تبادلہ سے ہندوستان کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ذکر تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ "مطالبات وطن" کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

مطالبات وطن کے ہندوستانی افلاس پر اثرات | مطالبات وطن سے مراد اس معاوضہ سے ہے جو ہندوستان



انگلستان کو انگریزی اہل اور انگریزوں کے مالیہ یا گزشتہ خدمات کے صلہ میں پیش کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہر کہ سب کا سب حق بجانب ہے یا نہیں ہمارا نظریہ جس کو میں امید کرتا ہوں کہ میں نے ثابت کر دیا ہے، سب قایل ہے:-

اگر ٹھیکہ دولت کا تبادلہ ٹھیکہ دولت سے، تمدنی دولت کا تمدنی دولت سے یا سائنسی دولت کا سائنسی دولت سے ہوتا رہے تو طرفین کو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوگا۔ مگر جب دولت قسم اعلیٰ کا تبادلہ دولت قسم اوسط یا ادنیٰ سے ہو تو آخر الذکر کو فائدہ اور اول الذکر کو نقصان ہوگا، اور جس قدر زیادہ تبادلہ ٹھیکہ دولت کا سائنسی دولت سے ہوگا اسی قدر نقصان ٹھیکہ دولت دینے والے کو ہوگا۔

ان برہمات کو تسلیم کر لینے کے بعد غور کر کے دیکھئے کہ افلاس ہند میں کس طرح اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر افواج ہند کو لیجئے:- معاشی نقطہ نظر سے چونکہ امن و امان کا ہونا لازمی ہے اور سرشت بشری کچھ ایسی ہے کہ بغیر فوج و پولیس کے کام نہیں چلتا تو ماننا پڑے گا کہ وہ افواج اور پولیس جو برہمنی اور اندرونی دشمنوں اور بد معاشوں سے ملک کو محفوظ رکھتے ہیں، ہمارے لئے قطعی ضروری ہیں یعنی یہ کہ وہ لوگ محنت قسم اعلیٰ کرتے ہیں اور اگر ہندوستانی محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹھیکہ دولت معاوضہ میں دیں تو کوئی مضائقہ نہیں چونکہ محنت قسم اعلیٰ کے لئے محنت قسم اعلیٰ کی گئی سہا دلہ جائز اور فریقین کے لئے مفید ہے۔

برکس اس کے افواج کا وہ حصہ جو دوسروں کو ڈرانے و مگانے یا محض شان و شوکت یا رعب و ابھار قائم رکھنے کے لئے، یعنی نفسی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے، معاشی نقطہ نظر سے غیر ضروری ہے۔ پس افواج کا یہ غیر ضروری یا بد حصہ (جدید عمرانیاتی حقیقات کے بموجب) محنت قسم ادنیٰ کرتا ہے۔ مگر ہندوستان اس کے بھی معاوضہ میں ٹھیکہ دولت دیتا ہے۔ پس یہ دولت ہندوستان کی رائیگاں جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ افلاس ہند میں اس فوجی پالیسی سے اضافہ ہوتا ہے۔

اب صرف یہ تحقیقات طلب ہو کہ ہندوستانی فوج صرف ہندوستان کی حفاظت کے لئے رکھی گئی ہے یا یہ کہ اس کا کچھ حصہ جبر و تشدد و نمود و نمائش یا کسی اور مصلحت سے رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر رائے دینے کا مجھے کوئی حق نہیں، لہذا میں دوسروں کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ نیم سرکاری طور پر جو برطانوی مالک کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا گیا ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ ”برطانوی حکومت ہند تقریباً ساڑھے چار لاکھ فوج رکھتی ہے، تاکہ وہ ملک کی حفاظت کرے اور وقت ضرورت برطانوی سلطنت کی فوجی امداد کر سکے۔“ اسی طرح انگلستان کے معروف متفق معاشیات سیرابرٹ گفن کہتے ہیں: ”ہندوستانی فوج سے برطانوی اغراض اور عام ضرورتوں کے لئے اکثر کام نکالا جاتا ہے اور صرف ملک کی حفاظت کے لئے اس سے کام نہیں لیا جاتا۔“ برطانیہ کے موجودہ وزیر اعظم ہیریز سے میکڈونلڈ اپنی کتاب ”حکومت ہند“ میں لکھتے ہیں کہ ”ہندوستانی افواج کا ایک بڑا حصہ (کم سے کم نصف) ایسا ہے جو ہم شہنشاہی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں، لہذا اس کے اسراجات کی ادائی برطانوی خزانے سے ہونی چاہئے۔“

ان مختلف بیانات سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستانی فوج کا کچھ حصہ بجا طور پر رکھا جا رہا ہے۔ اور یہ معاشی نقطہ نظر سے بلا سبب ہو نیکی وجہ سے معاصر ہے، اور قومی معاشی نقطہ نظر سے یہ

I "The Encyclopedia of the British Empire"  
Published by Rankin, Bristol 1923 vol II P. 734

II "Economic Inquiries and Studies."

مطبوعہ Bell لندن ۱۹۲۳ء جلد دوم صفحہ ۳۵

III The Swarthmore مطبوعہ The Government of India

Press لندن ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۵۴

سراسر فضول و بربادی ہے جو درہم اس سلسلہ میں ہندوستان کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ہندوستانیوں کے اخلاص میں بلاشبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ مطالبات وطن کے اس حصہ کو ضرور ہندوستانیوں کی غربت پر خراب اثر پڑتا ہے۔

انوانج کے علاوہ انگریزوں کی خدمات، انتظامی امور، سیاسی رہبری عدالتی معاملات اور تعلیمات کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔

ان خدمات کے متعلق رلے دہی گو کہ کسی قدر دشوار ہے اور شخصی رائے کو بہت دخل ہے مگر بجز چند استثنیات کے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دو تہائی کام جو عہدِ برطانیہ میں ہمارے ملک میں انجام پایا وہ اوسط قسم کا تھا، انہروں کے بنانے میں بعض ریلوں کے (قتل) کرنے میں اور بعض عمارتوں کے تعمیر کرنے میں جو محنت انگریزوں کی صرف ہوئی وہ بلاشبہ محنت قسم اعلیٰ تھی مگر جو انصاف انگریزی ججوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے حق میں کیا جاتا ہے جو معمولی کام۔ انگریز حکام۔ عہدہ دار۔ بڑے چھوٹے افسر مختلف یونیورسٹیوں کے علوم فطری و ذہنی کے پروفیسر انجام دیتے ہیں وہ اوسط قسم کا ہوتا ہے جن کی خدمات کا صلہ وہی ٹیسٹ دولت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کا حال دیکھئے۔ امریکہ باوجود اس قدر امیر ہونے کے دوسرے ممالک کو صحیح طور پر تبادلوں کرتا ہے۔ امریکہ سے دس بارہ پروفیسر جرمانہ جرمانہ یونیورسٹیوں میں *Anglo-Saxon* ادبیات و علوم کے متعلق لکچر دیتے جاتے ہیں تو ہر سال جرمانہ سے بھی دس بارہ پروفیسر جرمانہ علمی و فنون کے متعلق لکچر دیتے امریکہ جاتے ہیں۔ امریکن فیس جرمانہ اور جرمانوی لکھیں امریکہ جاتی ہیں۔ اسی طرح جرمن کتب امریکہ اور امریکی کتب جرمانہ بھی جاتی ہیں۔ غرضیکہ صحیح اصول پر عمل سہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے طرفین فائدہ میں رہتے ہیں نہ یہ کہ مثل ہندوستان کے ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہو۔

بہر طور عہدِ برطانیہ کی تحقیقات کو یہ بھی ثابت ہوا کہ ہم محنت قسم اعلیٰ کر کے ٹیسٹ دولت پیدا کرتے ہیں، مگر اپنی لاعلمی و نادانی سے اس کا تبادلہ تمدنی بلکہ اکثر صورتوں میں آسانشی دولت کو

کرتے ہیں جس سے ہم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور دوسرے ہماری نادانی سے استحصال کرتے ہیں  
 آخر میں اگر ہم اس مضمون کا لب لباب بیان کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید  
 معاشیاتی عمرانیاتی تحقیقات کے بموجب موافق توازن تجارت سے یہ لازمی طور پر نہیں اخذ  
 کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی دولت و مرفہ الحالی میں مطلقاً نسبتاً اضافہ ہو رہا ہو۔ ہندوستانیوں  
 کی غربت ویکسی کا باعث گوناگوں اسباب ہیں جن میں معصر طریق مبادلہ اور مطلق اضافاتی اسراف  
 بھی داخل ہیں۔ بیشتر اسباب غربت ہم ہی لوگوں کی بے خبری، لاعلمی و ناواقفیت اندیشی کا نتیجہ ہیں  
 یہ خصوصیات اعلیٰ تنظیم کی ضد ہیں لہذا اگر ہم ایک مختصر مبدلہ میں مسئلہ افلاس ہند اور جدید معاشیاتی  
 تحقیقات کا تعلق ظاہر کرنا چاہیں تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”ہندوستان کی غربت کا اصلی سبب  
 ناقص و نا کافی تنظیم ہے“ اور اس جلد میں ہندوستانیوں کی تمام سیاسی سماجی اور معاشی اتری  
 کا راز مضمر ہے۔

# بہائیت

## سید علی محمد باب

سید علی حسینی باب کے لقب سے مشہور ہیں جنہوں نے ایران کے مشہور شہر شیراز میں یکم محرم ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کو برٹش سلطنت میں پیدا ہوئے۔ باب "خاندان سادات میں سے تھے۔ بچپن ہی میں ان کے سر سے سایہ پدری اٹھ گیا۔ اس لئے بچپن میں انکی دیکھ بھال تعلیم و تربیت ان کے ماموں نے نہایت توجہ سے کی۔

قدیم رسم کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی جس میں قرآن شریف کا حفظ کرنا اور معمولی حساب و کتاب کا جانا تھا۔ ان کے ماموں بوشہر میں رہتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ اس لئے باب کو بھی تجارت ہی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ جوں جوں ان کا سن بڑھتا گیا ان کا توجہ دنیوی بھی روز بروز بڑھتا گیا۔ انکی شرافت، محبت، اخلاق اور خشیت اللہ زبان زد عوام تھی۔ باب کے مخالف جنہوں نے انہیں ہر قسم کی جانی مالی اور وطنی تکالیف پہنچائیں وہ بھی انکی شرافت طبع اور چال چلن پر حائل نہ کر سکے۔ ہاں البتہ انہوں نے یہ کہا کہ کثرت ریاست سے انکا دل غل گیا ہے۔

پچیس برس کی عمر میں یعنی ۱۲۸۷ھ (مطابق ۱۸۷۰ء) میں انہوں نے "بائیت" کا دعوہ کیا۔ اس وقت ایران کے مختلف حصوں سے بہت سے لوگوں نے انکے دعوے "بائیت" کی تصدیق کی اور باب کے پیرو کہلائے۔ ان لوگوں میں سے اٹھارہ لوگوں کو منتخب کیا اور ایران کے مختلف حصوں میں روحانی حقائق کی تعلیم کے لئے روانہ کیا باب نے ان مبلغین کی روانگی سے پیشتر انکی ممانعت "بائیت" کی مکمل تشریح کر دی اور کہا کہ اسکا مقصد یہ ہے کہ میں ایک آسانی سے اعظم کے ظہور کے لئے بطور باب یا مہتر کے ہوں۔ یعنی قدرت کی طرف سے ایک مہتر کی حیثیت سے

لوگوں کو شہید کرتے ادا کرنے والے اور وہابی مسلم کے ہستی و استقبال کے لئے لوگوں کو ہمارے گھر سے کٹے آیا ہوں تاکہ تمام لوگ اپنے آپ کو تمام آلائشوں سے پاک و صاف کر کے ”سمن نطہوہ اللہ“ کی آفت کے منتظر ہیں۔

باب نے اپنے ان شاگردوں کو جنہوں نے اس کے پیغام کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا۔ ”حروف جی“ کا لقب دیا۔ اس کے بعد باب حج بیت اللہ کے ارادے سے مع اپنے ایک مرید کے مکہ منظر کو روانہ ہوئے انہوں نے ایک لاکھ حاجیوں کے سامنے اپنا دعوے ہدیت پیش کیا اور لوگوں کو ایک آنے والے کی بشارت دی۔ حج کے بعد بوشہر واپس آئے۔ اس عرصہ میں ان کے پیروں نے ایران کے گوشہ گوشہ میں ان کی تعلیمات کو پھیلا دیا اور باب کا نام ہر قسم کی زبان پر جاری تھا۔ ایرانی مجتہدوں نے باب کی سخت مخالفت کی۔ اب یہاں سے باب کی مکالیف اور مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔

باب بوشہر سے شیراز گئے جہاں مجتہدین ان کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آنے اور حکومت کی طرف سے بھی نہایت سختی سے نگرانی کی جانے لگی اور اپنے گھر میں نظر بند کئے گئے یہاں تک کہ تمام بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات منقطع کئے گئے تاہم ان کے شیعائی ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ باب کی تعلیمات کا سلسلہ وسیع ہو گیا چنانچہ ان کے پیروں میں ہر قسم کے لوگ شامل ہو چکے تھے جن میں امیر، غریب، علما، فضلا اور شعرا سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ باوجود سخت مخالفت اور رکاوٹ کے لوگ باب کے پاس آتے اور انہیں عقیدت کرتے تھے۔ دنیا کی مخالفت ان کی ہمت اور استقلال کے سامنے پرکاوہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ صبر و استقلال اور ہمت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کے ارادے میں عامل نہیں ہو سکتی تھی۔

باب نے دوسرا سفر صغہان کی طرف کیا جہاں ان کے پیروں کی کافی تعداد ہو چکی تھی وہاں کے گورنر نے باب کا استقبال نہایت شاندار طریقہ پر کیا اور ان کی دعوت کو لبیک کہا مختلف

طریقوں سے انہما رحمت کی۔ اور اس نے باب کے قیام کے لئے ہر طرح کی آسانیاں ہم پہنچائیں۔ اور عوام ان اس کو آنکے پاس آئینکا موقع دیا۔

ان واقعات نے اصفہانی مجتہدین کے قصہ کو بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ وہ انکے قتل کے لئے تیار ہو گئے۔ مجبوراً گورنر نے باب کو حکومت ہی کے مکان میں پوشیدہ رکھا مگر چند دنوں کے بعد اس گورنر کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں کو باب کے قیام کا وہ کاظم ہو گیا۔ اور ایران کی مرکزی حکومت کی طرف سے انکی گرفتاری کا حکمنامہ صادر ہو چکا تھا کہ انکو طهران روانہ کیا جائے، باب نہایت سخت مگرانی میں دارالسلطنت کی طرف روانہ کئے گئے راستہ میں جو شہر اور گاؤں پڑتے تھے لوگ جوق در جوق جمع ہو جاتے تھے اور باب کا پیغام سنتے تھے۔ یہاں تک کہ پہرہ داروں نے بھی انکے دعوے بابت کی تصدیق کی۔ اور بانی بن گئے۔

حکومت بانی تحریک کی روزنہ سنہروں ترقی دیکھ کر ڈری اور خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ ملکا طهران برا فروختہ ہو کر لبوہ کر دیں چنانچہ باب کو ایران کے ایک قلعہ بکو نامی میں قید کر دیا اس سفر کی وجہ سے باب کی شہرت اور تعلیم لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔

باب کے متبعین میں ایک مشہور شاعرہ اور خطیبہ عورت قرۃ العین نامی بھی تھیں جو علمی فضیلت اور خدا وادقا میت، عزم و استقلال اور دین کی محبت میں شہرہ آفاق تھیں۔ اس خاتون نے دور ابتلا و فتن میں نہایت جوش سے اس نئے دین کو پھیلایا۔ آخر الامر انہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

جب حکومت نے دیکھا کہ تعلیمات تمام قلمرو میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں تو اس نے باب کو باکو سے منتقل کر کے چہرین میں مقید کر دیا اور مجتہدین ایران نے عوام اناس اور حکومت کو باب کے خلاف اکسایا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ مجمع عام میں تحقیق کیا جائے اس مقصد کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں باب کو چہرین سے بلا لایا گیا۔ بجائے بحث و مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کے باب کی تذلیل کی گئی

اور باب کو عوام الناس کے سامنے کوٹے لگواتے گئے اور پھر چہرہ پی میں دوبارہ تید کر دیا گیا باب وہ زمانہ شرمع ہوتا ہے جبکہ بابیوں کا قتل عام ہونے لگا۔ مجتہدین نے انکے مال اور خون کو عوام الناس کے لئے حلال کر دیا۔ بابی ہوا ہی جسم کے لئے کافی تھا۔ نہایت بے دردی اور شگدلی کے ساتھ بابی بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا گیا اور انکے مکانوں کو جلایا گیا۔ ان واقعات کی تفصیل نہایت درد انگیز ہے۔ جبکہ بابیوں پر ظلم ملے گئے اگرچہ بابیوں نے بھی کسی کسی جگہ مدافعت کا مقابلہ کیا لیکن بڑی دل کے مقابلہ میں قتل ہو گئے۔ مگر یہ ظالم بجائے رکاوٹ کے تحریکِ بابیت کی ترقی کا باعث ہوئے۔

آخر امام صدر اعظم ایران نے بابی تحریک کی روز افزوں ترقی دیکھ کر باب کے قتل کا حکم صادر کیا صدر اعظم کا یہ خیال تھا کہ یہ معاملہ اسی طرح ختم ہو جائے گا مگر اس کے برخلاف ہوا۔ باب چہرہ پی سے صوبہ کے صدر مقام تبریز میں لائے گئے۔ اور وہیں ۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں شہید کر دئے گئے۔ یہ واقعہ اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انکو مع انکے ایک فدائی کے قتل گاہ میں لایا گیا اور دونوں کو ایک دیوار کے ساتھ رسی سے جکڑا گیا۔ اور فوج کے ایک دستہ نے ان پر گولیاں چلائیں گولی چلی اور دونوں کے چھٹ جانے کے بعد حاضرین کو یہ دیکھ کر حیرت اور استعجاب ہوا کہ باب مع فدائی کے نہایت اطمینان اور تبسم کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اور تمام رسیاں حل چکی ہیں۔ گولی چلانے والے سپاہیوں نے دوبارہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تب افسر نے دوبارہ دوسرے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا چنانچہ اب گولیاں کاری قیس اور چہرہ کے سوا تمام جسم گولیوں سے پھینٹی ہو گیا۔ اور باب اور انکے فدائی نے ہمیشہ کے لئے دنیا کو خیر باد کہا۔

حکومت کی طرف سے باب کی نمش کی نہایت سختی سے نگرانی کی گئی مگر انکے شیدائی لاش کو نہایت جرات اور دلیری سے اٹھا کر لے گئے اور مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر منتقل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۰ء میں تمام دنیا کے بہائی زائرین کے سامنے باب کے جسم کو عید الہیہار نے کوہ کرمل (علاقہ شام میں) دفن کیا۔



جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ باب نے بالکل ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ان کی علمی قابلیت کے سامنے بڑے بڑے مجتہد نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ باب نہایت تیز سمجھنے والے تھے۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے بڑی سنجیدگی سے لکھ ڈالیں۔ باب نے اپنی قید و بند کے زمانہ میں چند الواح اور توثیقات تحریر کیں تھیں جن کا مضمون زیادہ تر ”من یظہرہ اللہ“ کی تفسیر ہے۔ ان الواح اور توثیقات میں باب نے اپنے پیروں کو نہایت تاکید اور تکرار کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جب ”من یظہرہ اللہ“ ظاہر ہو۔ تم لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بیان باب کی شہرت و تصنیفات میں سے جو جو قادی اور عربی دونوں میں الگ ہو اس میں قرآن مجید کے سربستہ اسرار کو ظاہر کیا گیا ہے۔ خاص کر قنات و حشر اور دیدار خدا کی نسبت مفصل بیانات ہیں۔ ایک کتاب قیوم الاسماء اور ”تفسیر سورہ یوسف“ بھی اسی سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

### بہار اللہ

میرزا حسین علی نوری جو بہار اللہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ مادہ نومبر ۱۲۸۷ھ طہران پایہ تخت ایران میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان تمام ایران میں شریف و نجیب اور متمول خیال کیا جاتا تھا۔ بہار اللہ کے والد اور دوسرے رشتہ دار حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ والد کے انتقال کے بعد بہار اللہ نے خاندان کی نگرانی اپنے ذمہ لی اور تمام جائیداد کی دیکھ بھال اور اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ بچپن ہی سے بہار اللہ اپنے حسن اخلاق اور ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے۔

بہار اللہ اگرچہ معمولی لکھے پڑے آدمی تھے مگر ان کی علمی قابلیت اور فضیلت شہرہ آفاق تھی۔ جس وقت باب نے ”بابیت“ کا اعلان کیا اور شیراز سے اپنے شاگردوں کو ملک کے اطراف و اکناف میں روانہ کیا اس وقت بہار اللہ کی عمر ۴۰ برس کی تھی اور طہران میں مقیم تھے۔ جون ہی باب کی

خبر طہران میں پہنچی بہار اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کی تصدیق کی اور نہ بایت کی شہادت کی اشاعت کے لئے ہمت و استقلال سے کھڑے ہو گئے اپنے قصبہ نور اور اس کے گرد و نواح میں بایت کی اشاعت کرتے رہے۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ باب اور بہار اللہ کا آپس میں کوئی خاندانی تعلق نہ تھا کیونکہ باب عربی النسل تھے اور بہار اللہ خالص ایرانی النسل۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دونوں کی کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ لیکن دونوں کا قلباً، روحاً اور خیالاً ایک زبردست تعلق تھا۔ باب کے قتل تک دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔

جب باب کو معلوم ہوا کہ تبریز کی طرف قتل کے جا رہے ہیں اور قتل کی سزا ملنے والی ہے تو اس وقت انہوں نے اپنے مخلص پیروں کے ذریعہ تمام نوشتجات، قلعہ ان اور مہر ایک صندوق میں بند کر کے بہار اللہ کو پہنچا دی۔ بہار اللہ اگرچہ باب کے زبردست حامیوں اور مددگاروں میں سے زیادہ مشہور تھے۔ مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہی شخص تھے والا معلوم روحانی ہے۔ باب کے قتل کے یسعیاہیوں پر مصائب و آلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جس کی تفصیل رہے کہ ایک نوجوان بابی جو باب کی تعلیمات سے بالکل بے خبر تھا اپنے اصحاب کے مصائب و کھچر متاثر ہوا اور جوش مذہبسی کی وجہ سے اس سے آپس میں نہ رہا گیا اور اپنے ہم مذہبوں کی بہتر حالت بنانے کے لئے اس نے شاہ ایران پر حملہ کیا۔ یہ شخص مجرم تھا گرفتار ہوا اور وہیں درباریوں کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ مگر ذرا سے حکومت نے بغیر تحقیق و تفتیش کے اس جرم کو تمام بانی جماعت کی طرف مقسوم کیا۔ کتنے بے گناہ بابی قتل کئے گئے کتنے بچے یتیم کئے گئے کتنی عورتیں بیوہ کی گئیں۔ صرف یہ خیال ہی ثبوت جرم کے لئے کافی تھا کہ اگر کوئی شخص یسعیہ کرے کہ فلاں شخص بابی ہے تو اسکی سزا دار کا تختہ تھی۔ اتنی بابی عوام الناس میں تقسیم کئے گئے جن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر قتل کیا گیا۔

نوٹہ کے طور پر چند واقعات ان بابیوں کے یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہفتے

ہوئے اپنی جانیں اپنے محبوب کے اشتیاق میں دیں اور ستانہ اداؤں سے اپنے جلا دہن اور قاتلوں کے لئے باعث عبرت اور تحیر بنے۔ ایک بانی کو جلا دہنے گردن مارنے کی ضرب لگائی۔ ہکاسبز عامہ سر سے گر گیا اس بوٹے بانی نے عامہ کو اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اپنے سر پر رکھ لیا۔

لے خوش آں عاشق ہرست کہ در پناہ حبیب  
سرود ستار ندانند کہ کدام اندازد  
ایک دوسرے بانی کو جلا دہن کا گاہ کی طرف بازنجیر لجا رہے تھے اور وہ جلا دہن کو مصری کی ڈلیاں بانٹا جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ تمہارے ذریعہ آج جھکوبڑی عزت ملنے والی ہے اس کی خوشی میں تمہارا منہ میٹھا کرنا چاہتا ہوں۔

ایک نوجوان بانی حاجی سلیمان نامی کے بدن میں لوگ زخم کر کے جلتی ہوئی موم بتیاں ٹھونسنے جاتے تھے اور شہر ہر گشت لگوار ہے تھے وہ ہٹا بولتا اور خوش ہوتا جلا جا رہا تھا اور گیت گکارہا تھا جس کا پہلا شعر یہ تھا

باز آدم باز آدم از راہ شیراز آدم  
بامشہ و ناز آدم ہذا جنون العاشق  
اگرچہ بابوں پر تمام دنیا کی مصائب و ابتلا ڈالی گئیں مگر وہ اس قدر ثابت قدم رہے کہ ایک انجی بھی نہ بٹے تمام بلیات اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا ایک یورپین سیاح ان واقعات کے مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ”جب مورخ ایران کی تاریخ لکھے گا تو ان واقعات کو نہایت جلی حروف میں لکھے گا۔“

اس مصائب و آلام کے زمانے میں بہار اللہ اپنی عجیب و غریب شجاعت کے ساتھ بڑے باظہاروں کی امداد کے لئے آگے بڑھے۔ حکومت نے چار سال تک بہار اللہ کو نہایت سخت قید دمن میں بند رکھا جب تحقیق ہوئی اور یہ بات ثابت ہوئی کہ بابیوں کا دامن سازش و باطل پاک ہے تو بہار اللہ حکومت ایران اور ترکی کی باہمی مغایرت سے ایشیائی ترکی کے شہر بغداد میں جلا وطن کئے گئے۔ اس کی وجہ یہ خیال کی گئی کہ بہار اللہ کا تعلق بابیوں سے منقطع رہے گا

اور یہ لوگ انکی رہنمائی سے محروم رہیں گے۔

چنانچہ بارہ برس کے قریب بہار اللہ بغداد میں نظر بند رہے اسی زمانہ میں ابھاک ایک رشتہ وار سفیر بغداد ہو کر آیا اور انکے خلاف ایک سازش میں ساتھ دیا اور حکومت ایران کو شکایت لکھی کہ ”بہار اللہ کا بغداد میں رہنا ایران کے مومنین کے لئے اچھا نہیں ہے کیونکہ بہت سے ایرانی باشندے عتبات عالیہ کی زیارت کو جاتے ہوئے بغداد سے گزرتے ہیں اور بعض بایوں سے ملکر باہی ہو جاتے ہیں، چنانچہ سفیر کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ حکومت ایران نے حکومت عثمانیہ کو درخواست کی کہ بہار اللہ کو بغداد سے ہٹائے۔ سلطان عبدالعزیز نے سب کو قسطنطنیہ بلایا اور پانچ ماہ تک وہاں نظر بند رکھا۔ اور اس کے بعد ادرنہ (ایڈریانوپل) بھیج دیا۔ جہاں وہ ایک عرصہ تک مصائب و آلام میں گرفتار رہے۔ ایڈریانوپل میں بہار اللہ نے اعلان کیا کہ جس شخص کی بشارت باب نے دی اور جس کی راہ میں انہوں نے اپنی جان قربان کی تھی وہ میں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو منظرِ بزرگ اللہ کہا۔ سب لوگوں نے انکے دعوے کو سچا مانا مگر ایک شخص جو صبح ازل کے نام سے مشہور تھا اس نے انکار کیا اور آخر وقت تک بہار اللہ کے دعوے کو نہ مانا۔

اس کے بعد بہار اللہ نے سب سے پہلے کام کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام خط لکھے۔ ان خطوط میں سے جو خط شاہ ایران کے نام تھا اور جس کو ایک شخص بدستِ نامی شاہ ایران کے پاس لے گیا اس خط کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

”خدا کی قسم! اگر دکھ درد کے صدمے مجھے کمزور بنا دیں بھوک اور پیاس کی تکلیفیں مجھے ہلاک کر دیں۔ سخت تپیر میرا بستر بنا دیا جائے اور بنگلے کے جانور اور زندے میرے مونس ہدم کر دے جائیں تو میں مطلق فرما دو زاری نہ کروں گا۔ خدا کی مدد سے جو ازل کا مالک اور قوموں کا پروردگار ہے دیباہی صبر کروں گا جیسا کہ دورِ انبیش اور اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے والوں نے کیا ہے۔ میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کروں گا۔۔۔۔۔“

آخر میں اس جملہ پر یہ خاتمہ ہوتا ہے ”کہ ہمیشہ بلا و مصائب کی موجودگی میں خدا کا حکم جاری

ہوا ہے۔ یہی خدا کی سنت ہے جو اگلے وقتوں سے اسی طرح جاری ہے۔“

خط لانے والا یعنی بدیع شاہ ایران کے حکم سے طرح کے دُکھ دینے کے بعد مار دیا گیا۔ تین سال تک بہار اللہ اپنے متبعین کے ساتھ ایڈریانوئل میں نظر بند رہے۔ تکالیف و مصائب میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہوا اب دشمنوں نے بہار اللہ کے خلاف مختلف الزام لگائے آخر میں سلطان تنگ آکر بہار اللہ اور اس کے ساتھیوں کو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگوں کو مدد نہ ہوا بہار اللہ کے بڑے بیٹے عبدالباہ عباس آفندی نے اس حکم کو منسوخ کرانیکا ارادہ کر لیا ایک ہفتہ کی محنت کے بعد عبدالباہ عباس آفندی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اس افتاء میں غلطی سے کسی نے بہار اللہ کے ایک فدائی کو خبر دی کہ حکم ابھی تک منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اس نے اپنا گلا کاٹ لیا اور کہا کہ اگر اس دنیا میں ہم اپنے محبوب کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں تو دوسری دنیا میں جا کر انتظار کریں گے لیکن زخم کاری نہ تھا خود بہار اللہ نے اس کو بچا لیا۔

اب حکومت ترکیہ نے بہار اللہ کو ایڈریانوئل سے جلا وطن کر کے مکہ (جو شام میں ہے) بھیجے حکم صادر کیا۔ بہار اللہ اور ان کے ساتھی سب اکٹھے روانہ ہوئے ابھی تک ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ مبادا حکومت انکو مختلف مقامات پر جدا جدا قید کر کے روانہ کرے۔ ہمراہی افسر عربی ان کے دلوں میں اس خیال کو تازہ کر رہے تھے۔ راستہ میں جہاں جہاں جہاز بدلتا تھا سب لوگ ایک ہی کشتی میں سوار ہوتے تھے اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرے سے جدا کئے جائیں چنانچہ ایک فدائی نے جسے دوسری کشتی میں بٹھا کر جدا کرنا چاہتے تھے اس نے سمندر میں کود کر اپنے آپ کو عقیق موجوں کے حوالہ کیا ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہار اللہ کے فدائی اس سے کس قدر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

مستندہ میں بہار اللہ شہر مکہ میں نظر بند کی حیثیت سے لائے گئے اور ان کے ساتھ ۳۰ فدائی تھے جو ایران اور مختلف ملکوں کے بڑے بڑے لوگ تھے جو اپنی عیش و عشرت کو خیر باد کہہ کر

ہمیشہ کے لئے بہار اللہ کے ساتھ رہنا اپنی خوش نصیبی خیال کرتے تھے۔

۱۸۶۷ء سے لیکر ۱۸۷۲ء تک بہار اللہ عکہ میں قیام پذیر رہے اور پچھتر سال کی عمر میں چار سال کی سخت قید اور چالیس سال کی ستوا تر نظر بندی کے بعد عکہ سے ایک میل کے فاصلہ پر باغ بھیجی میں رملت کی اور اپنا کام اپنے بیٹے عبدالباہا عباس آفندی کے سپرد کیا۔

بہار اللہ کی شخصیت کے متعلق مشہور مستشرق پروفیسر براؤن اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :-

”میرا بہنسا ایک پردہ کے قریب تھوڑی دیر بٹھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے بوٹ اتار اس کے بعد میں پردہ اٹھا کر ایک وسیع کمرہ میں داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک منہ تھا اور دروازہ کے قریب دو تین کرسیاں رکھی تھیں مجھے کچھ یونہی سانپاں پیدا ہو کر کہاں بیجا یا جا رہا ہوں اور کس سے ملاقات کرنے والوں۔

دو تین سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ رعب اور محبوب سے میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ وہ کمرہ خالی نہ تھا کمرہ میں مندر پر ایک صاحب وقار اور محترم بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ایک ٹوپی جو درویشوں کے تاج کی طرح تھی بلکہ اس سے ذرا اونچی اٹکی سر پر تھی اور اس تاج کے گرد ایک سفید جھوٹا سا عامہ لپٹا ہوا تھا۔ اس چہرہ کو جس پر سری نظر پڑ رہی تھی کبھی نہیں بھول سکتا ہوں اگرچہ اس کا بیان کرنا میری قوت سے باہر ہے چلتی ہوئی آنکھیں جو انسان کی روح کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں کٹا دہ پشانی جس سے جلال و بزرگی ہو جی رہی تھی۔ پشانی اور چہرہ کی بغیریاں جو کہ برسنی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بال اور سیاہ واڑھی اس کی تردید کر رہے تھے۔ بات بتلانے کی ضرورت نہیں کہ میں کس کے حضور میں کھڑا تھا۔ تقدیم مراسم تعظیم کے لئے اُس کے سامنے جھک گیا جس کی ایسی محبت کیجاتی ہے کہ اولعزم شہنشاہ رشک کرتے ہیں۔

ایک ملائم مگر بڑب آواز نے مجھے بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ ”الحمد للہ تم فائز ہوئے۔ تم ایک

قیدی، جلاوطن سے ملنے کے لئے آئے ہو۔ اس کے بعد یوں اپنے ارشاد کو جاری کیا ”ہم لوگ بجز اصلاحِ عالم کے کچھ نہیں چاہتے ہیں مگر ہم لوگوں سے مفیدوں کو اس سلوک کیا جاتا ہے ہم چاہتے ہیں کہ تمام قومیں متحد ہو جائیں۔ تمام انسان بھائی بھائی بن جائیں۔ انسانوں میں محبت و اخوت کا رشتہ مضبوط ہو جائے مذہبی اور قومی تنازعات انکے درمیان سے اٹھ جائیں۔ ان باتوں میں کیا عیب ہے؟ تمام بھگڑے اور تباہ کن لڑائیاں برطرف ہو جائیں گیں۔ انکے بجائے صلح اکبر قائم ہوگی۔“

## عبداللہ عباس آفندی

عبداللہ عباس آفندی علیہ السلام کی اسی جماعت کو پیدا ہوئے جس جماعت کو باب نے ”بابیت“ کا دعوے کیا تھا۔ عبداللہ عباس کی زندگی کا اٹھواں سال تھا کہ جہانی آرام کا زمانہ ختم ہو گیا انکے والد بہار اللہ طہران میں قید کر دئے گئے اور اس کے بعد تمام موروثی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہو گئی اور جو کچھ بچی کچی تھی وہ بھی لٹ گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ باب تازہ قتل کئے گئے تھے اور بابیوں کے مخالفان ایران میں ایک محشر پاتا تھا۔ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی بابی مشہور ہو جاتا تو جان کی خیر نہ تھی تمام بابی غمی طور پر زندگی گزارتے تھے۔ رات کو ترخانوں میں بغیر چراغ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔

غرض عبداللہ عباس بھی کسی میں ان مصائب میں گرفتار ہوئے اپنے باپ کے ساتھ بغداد میں جلاوطن اختیار کی مصائب و تکالیف میں باوجود کسی اپنے اپنے دست و بازو بنے۔ عبداللہ عباس نے کسی کالج یا مدرسہ میں بالکل تعلیم نہیں پائی تھی کیونکہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہاں البتہ کچھ ابتدائی تعلیم اپنے باپ یعنی بہار اللہ سے حاصل کی تھی۔ باوجود کسی تعلیم کے بغداد کے بڑے بڑے علماء انکے تبحر علمی سے متحیر تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی علی شوکت پاشا نامی نے بہار اللہ سے اس حدیث کا مطلب پوچھا ”کننت کنتاً مخفیاً“ بہار اللہ نے عباس آفندی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نکلنے

کا حکم دیا۔ عبدالبہا عباس آفندی اس وقت پندرہ سولہ برس کے تھے۔ ایک رسالہ مندرجہ بالا حدیث کی تفسیر میں لکھا۔ اس رسالہ نے صوفی مذکور کو درطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رسالہ علمی دنیا میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ اور اس کا نام ”شرح کنت کثر اغفیا“ ہے۔ عبدالبہا اپنی نوجوانی میں ایذا و اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ غربا کی خدمت، بیماروں کی تیمارداری اور جاہلوں کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ دوران نظر بندی ایڈریانوئل میں عبدالبہا کی ہر دستہ نیری مشہور تھی۔ عوام الناس ان کو ”سرکار آغا“ کے لقب سے پکارتے تھے۔ عکد میں جب عبدالبہا اپنے باپ کے ساتھ نظر بند تھے۔ اس وقت بیماروں اور ناداروں کی خدمت کرنا ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ بیماروں کو خود اپنی ہاتھوں سے نہلاتے اور خود کھانا تیار کر کے ضعیفوں اور ناداروں کو کھلاتے تھے۔ چنانچہ ہر شخص عبدالبہا سے محبت کرنے لگا۔ اور عکد میں ”حامی الغزاة والمساکین“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بہار اللہ کے انتقال کے بعد عبدالبہا نے تمام کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور بڑی شد و مد کے ساتھ ”پہا نیت“ کی نشر و اشاعت کی کوشش کی۔ عبدالبہا اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق کوہ کرمل کے ایک پہلو میں ایک عمارت بنوا رہے تھے۔ جس میں باب کا مقبرہ اور کچھ کمرے عبادات اور مجلس و حافی کے انعقاد کی غرض سے بنائے گئے تھے۔

دشمنوں نے عبدالبہا کے خلاف حکومت سے شکایت کی کہ شیخ اس ایک قلعہ اس مستعد تہمیر گزار رہا ہے کہ حکومت کے خلاف لڑے اور ملک شام پر قبضہ کرے۔

چنانچہ ترکی حکومت نے عبدالبہا اور اس کے متبعین کو عکد کی فیصل میں نظر بند کر دیا۔ صرف عکد کے ارد گرد چند میل تک آجا سکتے تھے۔ سات سال تک عبدالبہا اسی نظر بندی کی حالت میں رہے مگر مذہب بہائی کی اشاعت و وجود اس کا وٹ کے نہ رک سکی۔ امریکہ اور یورپ سے لوگ آتے تو اور ہدایات لیکر پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے

سن ۱۸۶۸ء اور سن ۱۸۶۹ء میں حکومت ترکیہ کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تاکہ وہ ان الزامات کی تحقیق کرے جو عبدالبہا کے خلاف لگائے گئے تھے۔ عبدالبہا نے نہایت خندہ پیشانی سے ان الزامات



کی نزدیک کرتے ہوئے ہر اس حکم کو جو کمیشن انپر لگانا چاہتا تھا قبول کیا۔  
 اسی اثنا میں اٹلی کے فضل نے متعدد بار عبداللہا سے درخواست کی کہ اگر آپ چاہیں  
 تو میں آپ کے لئے جہاز بہم پہنچا سکتا ہوں اور جہاں چاہیں وہاں پہنچا دوں۔  
 مگر عبداللہا نے کہا کہ میں صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب اور مشکلات کا مقابلہ  
 کروں گا جو مجھ پر ڈالی جائیں گی۔ اور بہاء اللہ کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بائیس  
 بھاگ بیٹا بھی نہیں بھاگے گا۔

مشغلہ میں کمیشن نے اپنا کام ختم کیا قسطنطنیہ واپس گیا۔ اور باب عالی کے سامنے کمیشن  
 نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ عبداللہا کو یا تو جلاوطن کیا جائے گا یا  
 سولی دیدی جائے گی۔ مگر عجیب اتفاق ہوا کہ ٹرکی میں انقلاب واقع ہو گیا اور نوجوان ترکوں نے  
 تمام مذہبی قیدیوں کو رہائی دیدی۔ مشغلہ میں عبداللہا کو جبکہ انکی عمر چوتھ سٹھ سال تھی قید و آزادی  
 ملی۔ چنانچہ فوراً انکو یورپ اور امریکہ سے دعوتیں آئیں۔

مشغلہ میں عبداللہا مغربی دنیا کے پہلے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں عبداللہا کو  
 بہر خیال کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اسی سال ستمبر میں عبداللہا لندن پہنچے ایک ماہ  
 تک وہاں قیام کیا۔ انگلستان کے پریس نے بہائی مذہب پر مضامین شائع کئے اور عبداللہا کی  
 تصویر شائع کی۔

اس عرصے میں عبداللہا نے بڑے بڑے مجموعوں کے سامنے لکچر دئے۔ جو بڑے زبردست  
 فصیح و بلیغ ہیں اور جدید فارسی لٹریچر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبداللہا فرانس  
 پہنچے وہاں بڑے بڑے مجموعوں کے سامنے موجودہ ضروریات و مسائل پر خطبے دئے جس سے  
 تمام فرینچ پریس گونج اٹھا۔ اس سفر کے بعد عبداللہا مصر واپس آئے کچھ دن مصر میں آرام  
 کیا۔ اس کے بعد لائپزگ کے متحدہ امریکہ سے پرزور دعوت نامے آئے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۹۱ء  
 میں عبداللہا امریکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک

سفر کیا۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے پروفیسروں، پادریوں اور لائبریریوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور تمام یونیورسٹیوں میں پکڑ دے اور سب لوگوں کو صلح اور آشتی کا پیغام دیا اور امتیازات نسلی کے مٹانے کے لئے اپیل کی۔ مرد اور عورت کو برابر حقوق دینے پر زور دیا۔ امریکہ سے واپسی میں عبدالبہا پھر انگلستان گئے جہاں چھ ماہ تک قیام رہا۔ اسی اثنا میں یورپول، لندن اور اڈنبرا میں شہرہ آفاق لکچر دے جو بہائی لٹریچر میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی، سٹریا ہوتے ہوئے مصر میں اپنے اس تبلیغی سفر کو ختم کیا۔

ستمبر ۱۳۱۲ء میں عبدالبہا حیفہ (ملاوہ شام) میں واپس آ گئے۔ یورپ اور امریکہ کے طویل سفر نے عبدالبہا کے جسمانی قوت کے کمزور بنا دیا چنانچہ اس زمانے میں عبدالبہا نے چند الواح لکھی ہیں جس میں اپنے متبعین کو بہائی ازم کے پھیلانے کی دعوت دیتے ہیں جن میں سے ایک لوح کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں وہو ہذا۔

”اے دوستو! وقت آ رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ ہوں گا جو کچھ مجھے ہو سکتا تھا میں کر چکا۔ امر بہائی کی میں نے استعداد و بھر پور خدمت کی۔ اپنی زندگی میں دن رات اس کی خدمت میں مشغول رہا ہوں۔“

عبدالبہا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن حیفہ میں گزارے۔ زیادہ وقت بہائیوں کی تنظیمی اور تعلیمی اسکیموں کے تیار کرنے پر صرف کیا چنانچہ تنظیمی ترتیب کا ایک خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ولی امر اللہ یعنی ایک واحد قومی سردار کا انتخاب۔

۲۔ ایادی امر اللہ یعنی مبلغین دین کا نظام مرتب کرنا۔

۳۔ محافل روحانی۔ مقامی اور بین الاقوامی کا قیام۔

۲۸ نومبر ۱۳۱۲ء کو عبدالبہا نے نہایت اطمینان و سکون کی حالت میں حیفہ میں انتقال کیا

اور اپنے پیچھے ایک کارکن باعزت چھوڑی۔

## شوقی آفندی ولی امر اللہ

عبداللہ بنے شوقی آفندی کو ولی امر اللہ مقرر کیا۔ شوقی آفندی عبداللہ کی سب سے بڑی بیٹی ضیا خانم کے بڑے بیٹے ہیں اور انکے والد کا نام میرزا ہادی شیرازی ہے۔ جو سید باب کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔

مسنو ولایت پر بیٹھے وقت شوقی آفندی کی عمر پچیس برس کی تھی اور اس وقت افسور ڈیونچکی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہاں سے بلائے گئے اور ولایت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ سب سے پہلے شوقی آفندی نے یہ کام کیا کہ محافل روحانی تمام بہائی آبادیوں میں قائم کرائیں اور باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت تبلیغ اصول بہائی کے لئے نظام قائم کیا۔ اور تمام بہائی مردوں، بچوں اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ شوقی آفندی نے بہائی نظام کو اس قدر منظم کیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتوں کے نظام بھی اس کے سامنے پیچ ہیں۔ اس وقت شوقی آفندی کی عمر ۳۲ سال کی ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ انکی علمی اور اخلاقی قابلیت کا سکہ تمام ملحدانوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ مدور بد منکر مزاج ہیں انہوں نے اپنے تمام متبعین کو ہدایت کر دی ہے کہ مراسلات میں انکے لئے بڑے بڑے القاب نہ استعمال کریں۔ ہر بات میں مساوات اور اخوت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

مختلف ممالک کے اخبارات اور رسائل شوقی آفندی کی تصویر اور انکے موجودہ نظام پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند ماہ ہوئے کہ ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار ایڈیشن نے انکا فوٹو شائع کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی مذہب پر ایک سلسلہ مضمون بھی شائع کیا تھا۔ جس کے کچھ حصہ کا ترجمہ بہت مختصر و مفید نظر چکا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر لفاظ میں بہائی اصول اور تحریک بہائی کی موجودہ رفتار ترقی کا ایک مجلس خاک پشیش کر کے اس مضمون کو ختم کروں۔

## تعلیمات بہانی

خدا :- غیب لایدرک ہو اسکی حقیقت کو کسی نے نہیں سمجھا مگر اس کی ہستی پر ہر ایک ضمیر و وجدان اور عقل فہم گواہ ہے۔ جس پر کافی سے زائد علمی دلائل موجود ہیں۔ خدا کی قدرت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔ اس کی کوئی قوت کم نہیں ہوئی ہے وہ اپنی صفات کمال میں یکساں ہے وہ اپنی کائنات میں اپنی قدرت کے نئے نئے ظہور دکھاتا رہتا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے نام اور اس کی نسبت مختلف بیانات ہیں لیکن سب کا مقصد ایک ہے۔ اس کی قدرت کی کوئی ابتداء انتہا نہیں وہ ہمیشہ سے خالق و مالک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی صفات میں کبھی حدود نہیں ہوا نہ کبھی تعطل ہوتا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ایک یا قاعدہ پر دگرگام کے اندر دنیا کو ہدایات دیتا رہتا ہے خاص خاص لوگوں کو اپنے کلام کا جلوہ گاہ مقرر کر کے اصلاح خلق کے لئے مبعوث کرتا رہتا ہے یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کی صفت ربوبیت کا تقاضا ہے اور خدا کی کوئی صفت کبھی بھی مفقود نہیں ہو سکتی ہے۔

پیغمبر :- اس کی شان ہدایت سے منظر ہوتے ہیں۔ سب پیغمبر ہوتے ہیں۔ انکی شریعتیں خدائی پر دگرگام کے مطابق اپنے اپنے وقت کے لئے نہایت پر حکمت اور ضروری تھیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی وہ انسانی دنیا کی بہبودی اور ترقی چاہتے تھے۔ سب پیغمبر واجب انتظام ہیں۔ پیغمبر ہر ملک میں آئے ہیں۔ ہر پیغمبر کی عزت کرنی چاہئے۔ سب پیغمبر دنیا کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتے ہیں۔

دین :- وہ حقیقت جس کا خدا کی طرف ظہور ہوا اور جو انسانوں کی بہبودی کا صحیح ذریعہ ہے حقیقت ایک ہے جو متحدہ نہیں ہوتی اس لئے دین بھی ایک ہے۔ ہاں وہی حقیقت لباس ہدید میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے لیکن ہے وہی ایک ہی حقیقت اس واسطے وحدت ادیان یا اتحاد مذاہب ایک زبر دست بنیاد ہے جس پر تمام قوموں کے

اتحاد کی تعمیر ہوگی۔ دین کے اصول کبھی نہیں بدلتے لیکن جزئیات ضرور بدلتے رہتے ہیں تاکہ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ نوع انسان کے لئے ترقی کی راہیں صاف ہوتی جائیں۔ دین ہمیشہ تجدید و حاصل کرتا رہتا ہے جیسا کہ حضرت آدم سے تائیدم ہوتا چلا آیا ہے۔ بہائیوں کے عقیدہ میں آج دین حقیقت ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

**الہامی کتابیں :-** سب ایک ہی سرچشمہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ انکے لانے والے اگرچہ مختلف الملوک میں ہوئے ہیں لیکن ان کا مدعا ایک ہی تھا۔ سب کتابیں حقیقت کی تعلیم دیتی ہیں۔ سب محبت سکھاتی ہیں وہ سب ایک ہی منزل پر لجاتی ہیں۔ ہر دور میں جو خدا کی طرف سے ایک مقررہ مقدار کا ہوتا ہے۔ ایک الہامی کتاب شریعت نازل ہوتی ہے۔ اس کا دور ختم ہونے پر اس کتاب کی روحانی تاثیر بہت ہی کم ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اس کے ماننے والے قرون اولیٰ کی طرح ایمان و ایقان میں جست و ادکال نہیں ہوتے۔ اس وقت پھر خدا اپنے فضل سے جدید کتاب نازل کرتا ہے جو زندگی کا تازہ جام پلاتی ہے۔ خدا کی کتاب ہی محبت کا علم ہوتی ہے، لوگوں کے تفسیری خیالات الہامی کتابوں کے برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ الہامی کتاب میں جو قدرتی طاقت ہوتی ہے وہ ایک نئی قوم بناتی ہے یا بالفاظ دیگر مردہ قوموں کو زندہ کرتی ہے۔ بکھری ہوئی جماعتوں کو ملاتی ہے۔

**ترک تعصبات :-** بہائی تعلیمات میں سے ایک تعلیم ترک تعصبات، یعنی جنسی، وطنی، مذہبی، نسلی، لسانی وغیرہ ہر قسم کے تعصبات کا چھوڑ دینا ایک بہائی کا فرض ہے۔ دنیا میں مختلف طاقتوں کا خیال بالکل باطل ہے۔ تمام عالم صرف ایک ہی یعنی ”انسان“ ہر طرح کی قومی تفریقیں منسوخ ہونے چاہئیں۔ تمام روئے زمین انسان کا وطن ہے۔ تمام زبانیں انسان کی ہیں جن کا مقصد افہام راضی الخیر ہے۔ کسی کو کسی زبان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن زبانوں کی کثرت کی وجہ سے انسانی تعلقات میں بہت کچھ مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اسلئے بہائی تحریکات میں سے ایک تحریک لسانی عمومی کی بھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

تمام دنیا میں ایک مشترکہ زبان قائم کی جائے چنانچہ ”اسپرنٹو“ زبان کی ترقی میں بہانی سب سے آگے آگے ہیں جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی عمومی زبان ہو سکیگی۔ مساوات مرد و زن: بہانی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہیں یعنی مالی اور تعلیمی حقوق میں مرد اور عورت کو یکساں ہونا چاہئے۔ عبدالبہا کہتے ہیں کہ عالم انسانی ایک پرند کے مانند ہے جس کے دو بازو ہیں ایک مرد اور دوسرا عورت جب پرند کے بازو یکساں صحیح اور تندرست اور برابر قوت کے ہوں گے تو پرند خوب پرواز کر سکتا ہے۔ لہذا مرد و عورت کی مساوات ضروری ہے ورنہ عالم انسانی کا پرند ہوا سے ترقی میں پرواز نہ کر سکے گا۔

**تحصیل علم:** بہانی تعلیمات میں سے ایک تعلیم فرضیت تحصیل علم ہے۔ نماز کی طرح ہر انسان پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے ابتدائی تعلیم جبری ہونی چاہئے

**کسب معاش:** ہر بہانی پر فرض ہے کوئی نہ کوئی کام کرے جس سے دولت و ثروت پیدا کرے اپنے خاندان اور ناداروں کی امداد کرے اس کے ساتھ ساتھ اگر گری بالکل قطعی حرام ہے۔ اگر ابا و امج لوگ میں تواضع کے لئے متمول اور با ثروت لوگوں کو چاہئے کہ ہر شہر میں محتاج خانے بنوائیں۔

**اسلام و غلامی:** بہانیوں کے نزدیک غلاموں کا خریدنا یا بیچنا قطعی حرام ہے۔ بہانیوں کے نزدیک ہر طرح کی غلامی یعنی ذہنی اقتصاد اور دماغی غلامی کو دنیا کے تختہ سے اڑا دینا چاہئے بہانی عقائد میں ہر ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پیر و مرشد، مذہبی طاقتیں حکومت اور سرمایہ داری غلامی کی دھماکے زنجیریں انہیں توڑ دینا چاہئے۔ مگر تشدد سے نہیں بلکہ قوت ضمیر اور تندرستی۔

**جمعیتہ الاقوام:** بہانی تعلیمات میں ہر ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ دنیا میں ایک جمیعت العدل قائم کیا جائے جس میں تمام اقوام کے مائندے متحد ہو کر عظیم عالم کی تملیہ مراعات را کریں جنگ کو دنیا سے انصافیں ہتھیاروں کو کم کر دیں۔ باہمی قیامت جذبات کو محبت کے جذبات سے بدل دیں۔

بہائیوں کے عقیدے میں یہ مندرجہ بالا احکامات خدائی احکام میں جو بہار اللہ کے ذریعہ نازل ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بہائی اسکوبی مانتے ہیں کہ یہ سب باتیں ایک دن دنیا میں قائم ہو کر رہیں گیں۔

## بہائی تحریک کی موجودہ رفتار ترقی

اس کے متعلق مختصر اعضاء ہے کہ اس وقت دنیا کا ایسا کوئی ملک نہیں ہے جہاں بہائی کافی تعداد میں موجود نہ ہوں۔ ہر ملک میں بہائیوں کے اپنے ادارے موجود ہیں جس کے تحت بہائی مذہب کی نشر و اشاعت کرتے ہیں۔ ہر ملک اپنی قوت سے کام کر رہا ہے۔ ہر ملک میں بہت سے عالم و فاضل مرد اور عورتیں بہائی تحریک کو پھیلانے میں مصروف ہیں لیکن دنیا میں سب سے زیادہ ترقی اس تحریک کو امریکہ میں ہے امریکہ کی ایک کروڑ چالیس لاکھ تین سو ستر لاکھ نفوس پر آبادی ہے اور اس کی زیادہ تر ترقی تحریک کے نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دی ہے مسز موصوفہ نے سفر ہندوستان کے وقت ہماری جامعہ میں بھی تشریف لاکر بہائی تعلیمات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اور اسی طرح اٹھارہ ملکہ روایتی بھی اسی تحریک کو ہر دوسرے پر جانے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

## بہائی پریس

تعلیمات بہائی کی اشاعت کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف ادارے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے نام تحریر کرنا ہوں۔

بہائی ایئر بک:- یہ ضخیم اور مصور جلد نیویارک امریکہ سے سال میں ایک مرتبہ نکلتا ہے۔ جس میں تمام بہائی دنیا کی سالانہ رپورٹیں ہوتی ہیں۔

لانووائیگوا:- یہ ماہانہ رسالہ اسپرٹوز بان کی ترجمان کے لئے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقام اعلیٰ برلن ہے۔

ہیرلڈ آف دی سنوٹھ :- یہ ہفتہ وار بہائی اصول کا آرگن ہے جو ملک لینڈ نیوزی لینڈ سے نکلتا ہے ۔

اسٹار آف دی ویسٹ :- یہ رسالہ ماہواری ہے انگریزی زبان میں چکاگو امریکہ سے شائع ہوتا ہے ۔

خورشید خاور :- یہ رسالہ بھی ماہواری ہے اور فارسی و ترکی زبان میں عشق آباد روس سے نکلتا ہے ۔

اسٹار آف دی ایسٹ :- یہ ماہانہ رسالہ انگریزی زبان میں ٹوکیو دار السلطنت جاپان سے شائع ہوتا ہے ۔

چلڈرنس نیوز :- یہ ماہوار رسالہ کلیفورنیا سے بہائی بچوں کے لئے شائع ہوتا ہے ۔  
یہ رسالہ ہر تیسویں دن بہائی مہینہ کی پہلی تاریخ کو دہلی سے اردو زبان میں شائع ہوتا ہے ۔ اور علاوہ ازیں یہ ادارہ بہائی اصول پر اردو کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتا ہے ۔

## کتاب الہدے

قرآن مجید کی مضمون وار ترتیب میں معرکہ الآراء تفسیر جس کو سیٹھ یعقوب حسن صاحب نے ایام قید میں بڑی کاوش و محنت کے ساتھ مرتب کیا اور جسے تمام علماء کرام نے متفقہ طور پر عیدیم التظیر اور نہایت ہی مفید قاموس قرآن قرار دیا ہے ۔ پہلا حصہ غنائی مخلوقات (جو بطور خود ایک مکمل کتاب ہے) ۔  
فیجھر مکتبہ جامعہ طبع دہلی  
قیمت مجلد پارچہ چار روپے آٹھ آنے (اللہ)



# ریل کی سڑک اور قبرستان

(۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ایک سال کے اندر اندر لارنس مجلس ناہین کا صدر ہو گیا۔ سیونگ بنک کا بھی پریزیڈنٹ ہو گیا اور عدالت ثالثی کا سب سے زیادہ ذی اثر رکن بن گیا۔ بالخصوص جس جس عہدے اور منصب کی امیدواری کا اس کو استحقاق ہو سکتا تھا، اُن سب پر وہ بذریعہ انتخاب عام فائز ہو گیا!

ضلع کی مجلس ناہنگان میں داخل ہونے کے ایک سال تک وہ ہرب رب رہا۔ لیکن دوسرے سال کرسیشن میں ایک خاص موقع کو منتخب کر کے اُس نے وہی پرہیزبان منظر پیدا کر دیا جس کی نظیر وہ گرجا کی مجلس ناہین میں نڈ کے خلاف کرچکا تھا! یہاں بھی جو شخص جزو دل کا مالک اور سیاہ و سفید کا مختار ہوا تھا اس کی مخالفت میں اچانک میدان میں آکر اُس نے ایسی اُس کی ہوا بجاڑی کہ اُس کو کامل شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور لارنس پوسے طور پر منظور ہو کر آئندہ اس نئے حلقہ حکومت میں فرمان فرما بن گیا! اور یہاں پہنچ کر اُس نے ملک کی پارلیمنٹ کی ممبری کی آخری معراج کی طرف پیش قدمی کی جہاں اُس کا شہرہ مقدمہ الجیش بن کر پہلے ہی پہنچ چکا تھا لیکن دارالعلوم کے اس زبردست سیاسی اکھاڑے میں مد مقابل حریفوں کی کچھ کمی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یہاں وہ کسی قدر دبا دبا رہتا تھا اگرچہ اپنی ذاتی پوزیشن کو سنبھالنے میں پورا مضبوط و مستقل تھا۔ وہ کسی ایسے حلقے میں صدارت و ریاست کے مرکز پر قبضہ کر نیکی کبھی نا عاقبت اندیش نہ ہو سکتا تھا۔ کو شش نڈ کا تھا جہاں لوگ اُس سے پوسے طور پر شناسا اور اسکی قابلیتوں کے پوسے مرتبہ وال نہ ہوں! اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ پارلیمنٹ میں کسی نمود و اقتدار کی جگہ پر گرفت حاصل کرنے کی ناکام جدوجہد میں وہ اپنے وطن اور ضلع کی مقامی مجالس کی علیبرداری بھی کھو بیٹھے!

اس لئے کہ اپنے گھر کی وہ حاکمانہ زندگی اُس کے لئے بہت ہی لذت انگیز تھی جس وقت اتوار کے دن وہ گرجے کی دیوار کے پاس کھڑا ہوتا اور ساری نماز گزار جماعت آہستہ آہستہ اور مودب انداز میں اُس کے بازو سے گذرتی ہوئی اس کو سلام نیاز، پیش کرتی اور گڑبہا سے چشم سے خفاق اور ذوق دیدہ نگاہوں کے ساتھ اُس کو دیکھتی جاتی اور ہاں اسی پر شوکت جلوس کے کسی فرد سے (اُس کو کھڑا کر کے) ازراہ التفات، دُعا چار باتیں کر لیتا، توجہ جمع ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ”تنکے“ کے بل پر گر جا کی ساری سلطنت پر ایک مطلق العنان شہنشاہ کی سی حکومت کر رہا ہو! واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس اعزاز و اقتدار کا بجا طور سے سخت تھا۔ گر جا کے لئے جو خدمات اُس نے انجام دی تھیں اُن کا اعتراف نہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اُس نے گر جا کو جانیوالی سڑک کو کھلوادیا تھا، وہ نیا گرجا جس میں لوگ اب جماعت یا اجلاس کیا کرتے تھے، اُسی نے تعمیر کرایا تھا، اور یہ سب باتیں۔ معاشے زائد کے۔ گر جا کے نئے قائم شدہ سیونگ بینک کے منافعوں کے اولین اٹھارے تھے! بینک کی یہ سرسبزی اور بار آور بی بی اُسی کی آبیاری کی رہیں منت تھی کیونکہ وہی اس کا نظم و ہتھم تھا۔ گر جا کی جائیداد و وسائل میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ وہ تمام دوسرے کلیساؤں اور مذہبی اوقاف کے لئے حکومت خود اختیاری اور عمدہ نظم و نسق کی ایک شاندار، قابل تقلید مثال بن گیا!

نڈا کرے پبلک سرگرمیوں کے میدان سے باطل ہٹ آیا تھا۔ شرع مشروع میں اس نے مجلس کی بعض نشستوں میں شرکت کی تھی کیونکہ اس نے بعض لوگوں سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہی اُسی مجلس کی مدہی مرکز کے لئے اپنی ناجیز خدمات پیش کرتا رہے گا۔ اگر یہ اس میں اس کو اپنی غیرت و خود داری کو تھوڑا مجروح ہی کرنا پڑے! مگر جب اُس نے اپنی نئی حیثیت سے پہلی تجویز پیش کی تو اس نے دیکھ لیا کہ اُس کے لئے میدان باطل تنگ ہو گیا ہو اور اس کے کامیاب رقیب نے اُس کے لئے گر جا کی پبلک خدمت کی زمین اس قدر گرم کر دی ہو کہ وہاں اب اُس کے قدم جنبنا مشکل ہے چنانچہ نڈا کی محولہ بالا قرارداد کی پیشی کے وقت مشاق لارنس نے پہلی اصطلاحی شکل یہ پیدا کی کہ صاحب تجویز

سے یہ درخواست کی کہ وہ ازراہ کرم اُس کی تمام تفصیلات و جزئیات پر ذرا روشنی ڈالیں۔ بڑکچہ ایسا سر اسیمہ ہوا کہ فرامات کے اس مطالبہ کو قیل از وقت قرار دینے کی کوشش میں اُس کی زبان سے نکل گیا کہ: ”جب مجلس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا تو اُس نے وہاں آباد کاری کے پہلے ہی قدم پر ملک کو کلیسا کی حلقوں میں تقسیم کیا تھا بلکہ یہ سب ارتقائی منازل رفتہ رفتہ از خود ظہور میں آگئی تھیں!“ لاس نے اس خطیہ نہ انداز بیان پر فوراً گرفت کی اور اپنے جواب میں کہا کہ ”تب ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے دوست نڈا کرے کی تحریک ایک ایسا ہی عظیم الشان اور مرکزہ آثار تاریخی کا رنامہ ہے جیسا کہ براعظم امریکہ کا اکتشاف!“

یہ مجموعہ ایک قیامت تھی! اُسی دن سے غریب نڈا کا نام ہی مجلس میں ”اکتشاف امریکہ“ پڑ گیا!!

بڑکچہ نے جان لیا کہ اپنا ”عہد قبہ سال“ ختم ہو چکا ہے! اب عوام اُس کو بجز مذاق سہانہ نہ بنانے کے کسی اور صرف کا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اُس نے پبلک خدمات کے تمام اخلاقی تقصیلات کی ذمہ داری سے اپنے کو بری سمجھ لیا، اور مجلس نگراں کار کے آئندہ انتخابات میں اپنے کو پیش کرنے سے انکار کر دیا!

لیکن اس نے اپنے بعض مشاغل کو ترک نہیں کیا اور انہیں پوری تہذیب سے انجام دیتا رہا اور اپنی قسمت سے یہ امید وابستہ رکھی کہ ممکن ہے میں آئندہ کبھی کسی کام کا اہل سمجھا جاؤں۔ چنانچہ اُس نے اپنے نڈے اسکول پر توجہ مرکوز کی، اُس کو کافی وسعت دی، اور مختلف قسم کے چھوٹے اور بڑے چرن دن اور مالی اعانتوں سے وہ اس کو اس حیثیت میں لے آیا اور اُس کے سارے سررشتہ کا خود ہی ”خود کو زورہ و خود کو زورہ“ کے مصداق بننا و سربراہکار قرار پایا اس مرکز کی شاخیں اور شعبے دور در درگرددنواح کے اضلاع میں بھی تھے۔ بڑکچہ کی اس جدوجہد پر لاس نے یہ معنی خیز فقرہ کہا کہ ”جب نڈا کرے کسی مقصد کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے تو وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ یہ رقم وطن سے ہزار ہا میل کے فاصلہ پر خلق اللہ کو فیضیاب کرے گی!“

لیکن دونوں کے حلقہ کار کے حدود اب اس قدر علحدہ تھے کہ آپس میں کسی تعادم کا موقع نہ رہا تھا، اور انکی دست و گریبان پانی بافضل خستم ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی نہ تھے، لیکن کوچہ و بازار میں جب کبھی اتفاقیہ ٹھٹھیر ہو جاتی تو رسمی علیک سلیک اور مزاج پر سی ہو جاتی! لارس کا خیال ہی آنے پر نڈ کے دل میں ایک ٹیس پیدا ہوتی لیکن وہ اس جذبہ کا دش و کا ہشش کو دبا تا اور اپنے دل کو سمجھا کہ تقدیر ہی میں یہ لکھا تھا کہ ایک بظاہر ادب نے حریف سے ایسی زک اٹھانی پڑی، شاید صورت معاملات ہی اس طرح آن پڑی تھی کہ اپنا یہ انجام ناگزیر تھا! الغرض اُس نے اپنے دل کو دھاکس سسے لی تھی اور لارس کی طرف سے شاید تمام شش و پر خاش کو نکال دیا تھا۔

اب یہ سالہا سال کے بعد ایک مغل شادی کا موقع تھا۔ نڈ اور لارس دونوں اس تقریب میں شریک تھے اور دونوں بہت خوش خوش تھے۔ نڈ ایک کرسی پر کھڑا ہوا اور لارس کے اعزاء میں ایک مداحانہ تقریر شروع کی! اُس نے ”گر جا کی مجلس ناہین کے صدر اور یکساٹی حلقے کے اولین نمائندہ پارلیمنٹ“ کے شاندار القاب سے لارس کی شخصیت کی طرف اشارہ کیا اور اپنے وطن کی اس مایہ ناز، سستی کا جام صحت تجویز کیا! اپنی تقریر سے خود متاثر ہونے لگا اور گویا اپنے سامعین میں وہ خود ہی سب سے زیادہ ہمتن گوش تھا! حسب معمول اس نے اپنے خیالات بڑی خوبصورتی و خوش اسلوبی سے بیان کئے۔ سب لوگ نڈ کی مالی نشی ”اور سینہ بے کینہ“ کے قائل ہو گئے۔ لارس بھی قدم بڑھا کر اُس کے پاس آیا اور کسی قدر حجاب اور زور و دیدہ نگاہی کے ساتھ اس نے مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ ”اس وقت کا طے نہ مل نڈ آکرے جیسی ممتاز شخصیت کے عین شایاں شان تھا! آج یہ ہے کہ مجھ کو جو کچھ آتا ہے وہ سب میرے اسی مومن و مربی کے فیض صحبت کا منیل ہے اور میری اس وقت جو کچھ بھی حیثیت ہے اُس کے لئے تمام و کمال میں اپنے اسی محترم دوست کا مہزون احسان ہوں!“

ان دیرینہ دوستوں میں خوشگوار تعلقات کی بجائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ انتخاب میں نڈ گر جا کی مجلس نگران کا رکا بھر پریزڈنٹ تھا!

لیکن لارنس کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اگر وہ ان غیر نیکوں کے ظہور کی پیش بینی کر لیتا تو اس وقت وہ ہندو کا کبھی حامی و مددگار نہ ہوتا اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کو ہرگز اس منصب پر نہ پہنچاتا!

جس وقت ہندو بارہ گرجا کی مانند مجلس میں داخل ہوا ہے تو وہاں ایک خاص نقشہ پیش تھا۔ لارنس کے زمانہ قیادت میں مجلس کے ارکان کے اندر ذاتی کاروبار کرنے کا ایک برا دستور قائم ہو گیا تھا اور یہ چکا اب اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ بالکل ایک جنون سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ تجربہ کار اور تمار بازارانہ طریق تجارت نے ایسے تابکین نتیجے پیدا کئے تھے کہ ہر شخص کی مالی حیثیت سخت موصض خطریں تھی اور یہ نا عاقبت اندیش نہ شوق اپنی قربانگاہ پر اب قربانیاں مانگ رہا تھا! عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اس اندوہناک صورت حالات کا بانی مہانی لارنس ہاگسٹیڈ ہے کیونکہ اسی نے بالارادہ تعلیم و تحقیق کر کے اپنا یہ غلط تاثر نہ مذاق ساری مجلس میں عام کر دیا تھا۔ خود مجلس نگران کا اپنی سرکاری حیثیت میں ایک سخت جوئے باز جماعت تھی اور وہی دوسرے متوسلین کلیسا کے لئے ایک گمراہ کن مثال بنی تھی۔ اب اس خبط کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا مزدور بھی سہ باز بننے کے لئے تیار تھا اور ایک ایک کے چھ پتہ کرنے کی دھن میں تھا! لوگ اس زر پرستی میں جیسے حریص بن گئے تھے دیے ہی فضول خرچ اور اپنی عادات میں بے اصول بھی ہو گئے تھے۔ اس جنگ زرگری کا ایک سب سے ناگوار نتیجہ یہ تھا کہ روپیہ کمانے کی جدوجہد اور کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کو حریف و رقیب ہو گئے تھے، آپس میں رشک و حسد کا مادہ پیدا ہو گیا تھا، جو نفرت و عداوت کی شکل میں تبدیل ہو رہا تھا! ”مسجد کے زیر سایہ خرابات“ کا یہ رنگ حد درجہ انسو سنک تھا! اب نوبت یہ تھی کہ باہمی بدنامیوں اور بد معاہلیوں کے نتیجہ میں عدالتوں میں ایک دوسرے پر مقدمے قائم ہوئے تھے۔ یہ سعادت بھی گر جا ہی سے منسوب کیجاتی تھی اس لئے کہ لارنس نے جیرمین بن کر جو پہلی اصلاحی و دینی کارروائی کی تھی وہ گرجا کے کہن سال اور محترم ام پر بعض مشتبہ اور خیانت آمیز کارروائیوں کے سلسلے میں مقدمہ چلا ہی تھا! اگرچہ اس موافقہ قانونی میں لارنس کو کامیابی ہوئی تھی لیکن گرجا کی ایک مقدس ہستی

کو عدالتی داروگیر میں جکڑنا اور اس طرح اس کو رسوا کرنا بجائے خود ایک نازیبا اور بیدروانہ بات تھی، چنانچہ اس مقدمہ پر اگر بعض لوگوں نے لارنس کے عمل کو حق بجانب اور قابل تعریف بتایا تو بعض نے اس کی مذمت بھی کی۔ اس لئے کہ غریب امام کو اس ثابت شدہ الزام کے سلسلے میں اپنے کلیائی منصب کو مستعفی بھی ہونا پڑا تھا۔

اب لارنس کی بے راہ رویوں اور مجتہدانہ کارروائیوں کے نتائج بد سامنے تھے۔ آپس کی حقپش اور اس کے سلسلہ میں نزاعوں اور مقدمہ بازیوں کا یہ انجام ہوا تھا کہ ہر شخص قلاتی اور تباہ ہو گیا تھا۔ لارنس کے عہد حکومت کے زیر سایہ گریجا اور نواح گرجا میں ان مصائب کا آخر رنگ لایا اور رائے عامہ میں گرجا کی مجلس نگراں کار کی اس رہنمائی کے اثر وہم و لغزیری کے بائے میں ایک بیکر انقلاب ہو گیا! اور ان باغیانہ خیالات کو سربراہی کے لئے بہت جلد ایک لیڈر بھی مل گیا۔ یہ نڈا کرے تھا جس کو لارنس ہی نے ”مارآستین“ بنا کر مجلس میں صدارت کے عہدے پر فائز کر دیا تھا!

مکر آرائی فوراً شروع ہو گئی۔ وہ سارے نوجوان جنہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں نڈے سامنے زانو سے ادب تو کیا تھا اب بڑے ہو گئے تھے۔ پبلک معاملات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور گرجا کی مجلس نائین کے بھی بڑے کامیاب اور صاحب اثر ممبر تھے۔ مجالس کی کاروائیوں میں وہ خوب طاق و مشاق ہو گئے تھے اور ان کے مال و ماعیلہ پر پورا عبور رکھتے تھے۔ یہی لوگ نڈا کرے کے علم کے نیچے جمع ہونے والے تھے اور لارنس کا انہی سے مقابلہ تھا۔ یہ ساری غمت بچپن ہی سے لارنس پر خا رکھائے ہوئے جیٹھی تھی اور اس سے انتقام لینے کے لئے موقع کی منتظر تھی۔ ایک دن شام کے وقت جبکہ مجلس نائین کا ایک طوفانی اجلاس ختم ہو چکا تھا لارنس اپنے مکان کے پیش دروازے پر کھڑا ہوا تھا اور سامنے نظر آنیوالے گرجاؤں کی راضیتا و متعلقات ایک خاص منظر پیش کر رہے تھے، ابراہام لود مطلع میں اس نے زبردست رعد و برق سنی۔ ان ساوی تہیہوں کو لارنس کے واہمہ نے سیاسی موسم کے خوشنک تئیر کی علامات سے تعبیر

کیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ ”جس دن ان لوگوں کی اقتصادی مصیبتیں اپنے عروج کو پہنچ چکی ہوں  
 حادثہ پیش لائیں اُسی دن سے گر جا کے سیونگ بنک کا بھی خاتمہ ہے، اور اُسی کے ساتھ میرے  
 اقتدار کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔“

اسی کشمکش و جھجھک اور یاس و ناامیدی کا وقت تھا کہ ریلوے کے کسٹرنوں کی ایک عجت  
 پسند تحقیقات اُدھر نکل آئی۔ یہ لوگ ایک نئی نمونہ ریلوے لائن کے پیمائش و معائنہ پر مامور  
 کئے گئے تھے۔ یہی گشت کرتے ہوئے ایک دن شام کو یہ انجنیر ہائیڈرولائرس ہائیڈرو پاور کاؤنسل  
 اور سکن) میں وارد ہوئے۔ گر جا کے متعلقہ حلقہ اراضی میں داخل ہوئے۔ ہائیڈرو پاور قطعہ تھا۔  
 ریلوے کسٹرنوں سے گفتگو کے دوران میں یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ صیغہ ریلوے کے ارکان  
 کے ہاں یہ تجویز زیر غور ہے کہ آیا جدید لائن اسی واوی سے نکالی جائے جس میں ہائیڈرو پاور کی  
 زمینیں پڑتی تھیں۔ یا اُسی کے متوازی ایک دوسری واوی سے۔

ایک برق مثال تیزی سے اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ ”اگر میں ریل کو اپنی زمین  
 میں سے گزرنے کی اسکیم کو حکام ریلوے ہاں مقبول کرانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو جاؤں تو اس  
 کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یکبارگی ان گرد و پیش کی اراضیات کی قیمتیں دو چندان ہو جائیں گی اور نہ صرف  
 میں اس آنے والی تباہی سے بچ جاؤں گا بلکہ میرا نام زندہ جاوید ہو کر پشتہا پشت تک شہر ہو جائے  
 گا۔ یہ اتنا دلچسپ اور امید پر درخشاں تھا کہ اُس کی دلچسپی کے تسویریں وہ ہمہ تن غرق ہو گیا اور خوشی  
 کی شدت میں ساری رات اس کو نیند نہ آئی، وہ ایک نظروں کو خیرہ کر نیوالی روشنی اپنے عالم  
 تخیل میں دیکھتا تھا اور انہماک و استغراق میں اس کو کبھی کبھی ریلوے ٹرین کی گھڑ گھڑا ہٹ تک  
 مسموع ہوتی تھی!

دوسرے دن صبح جب ریلوے والے زمین کو دیکھنے کے لئے نکلنے لگے تو اُس نے اپنا  
 گھوڑا گاڑی انکو لیجانے کے لئے پیش کی، چنانچہ گاڑی انکو لے بھی گئی اور واپس بھی لائی۔ لاہر  
 اس تمام ”گر د آدری“ میں اُنکے ہجر کا ب تھا۔ دوسرے دن جب وہ دوسری واوی کے

سحانہ کے لئے جانے لگے تو اس دن بھی اس کی سواری اُنکے لئے حاضر تھی اور وہ خود بھی حسب معمول اُنکی دھالہ روی میں تھا! کشر لوگ ہاگٹیڈ کے موقع کی خوبصورتی سے بیدار ہوئے۔ روانگی کے وقت ان لولوں کے اعزاز میں ایک عظیم الشان الوداعی جلسہ کا لارنس نے اہتمام کیا اور گوجا کی آبادی کے تمام سربز اور وہ لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جلسہ بہت کامیاب رہا اور اُنکی ہنگامہ خیزیاں شام صبح تک جاری رہیں! لیکن انوس کہ اہلی عرض و نہایت کے استسبار سے یہ ساری مصیبتیں پیدا ثابت ہوئیں کیونکہ ریلوے کے ہندو سین جتنا غور کرتے تھے اس فیصلہ کی معقولیت اُن پر ظاہر ہو جاتی تھی کہ زیر چائنس لائن کو ہاگٹیڈ والے خط سے لیجانا غیر ضروری۔ سارف کو برداشت کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس وادی کا دروازہ ایک تنگ اور دشوار گزار درہ میں سے ہو کر تھا اور چونکہ یہ اس میں بہتی تھی وہ برسات کے موسم میں اس نواح میں ایک سیلابی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔ پس اس طرح دھوپ چارہ کا رتنے: یا تو لائن پہاڑی کے پہلو پہلو معلومہ پیدل شاہراہ کے محاذ میں نکالی جائے اور اس طرح اُس کو بلاوجہ ایک غیر معمولی بلندی تک لیجا یا جائے اور ساتھ ہی نڈی کو دو جگہ سے عبور کرنے کے لئے دُہرے دُہرے پل تعمیر کئے جائیں، اور یا پھر یہ ریل کی ٹرک بظلمت تقیم چلے اور اس مستقیم قبرستان میں سے گزریے جو اب غیر مستعمل تھا۔ اگر جا کو اس موقع سے منتقل کئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا اور مانشی قریب ہی میں آخری سیت کی تجہیز و تین کے مراسم یہاں عمل میں آئے تھے۔



# واقعی کون تھا سچا شاعر؟

از جناب اعجاز الدین صاحب لیل

گزرے اردو کے ہر ایک عہد میں صد ہا شاعر  
مختلف قسم یہ ہر وہ بھی جسامت تقسیم  
چند اقسام پر اور ان کی ہے ممکن تقسیم  
ہیں جو انسان تو ہیں عیب زدہ بھی بے شل  
ذوق ہر ایک کا جدا طائر جدا رنگ جدا  
محل شعر میں غزل شعر اکیسا دیکھا  
بعض کی وضع سے ظاہر ہے پٹھچھر ہونا  
بعض فی ”حسن تعلیم“ کے پتلے یعنی  
خوشنوائی کا سر بزم یہ عالم دیکھا  
لحن داؤد بھی بعضوں کو دیا قدرت نے  
جس کے اشعار کہے جاسکیں اچھے ذرے  
جو قصیدہ و غزل ثنوی تینوں میں کسی  
بعض بحر میں طبیعت ہو رواں بعض میں  
صرف موزوں ہو کوئی بات نہ جس میں نکلے  
ورد اور الف سے اشعار ہوں غالی جس کے  
کر سکے جو نہ رجز اور رمل میں تمسیر  
جو سر بزم غزل اپنی ساتے شرم سے

شہر و قصبات میں دیہات میں ہر جا شاعر  
کوئی ادنیٰ کوئی اوسط کوئی اعلیٰ شاعر  
کوئی کورا کوئی کچا کوئی پچا شاعر  
کوئی اندھا کوئی کاناکوئی سنگد شاعر  
کوئی میٹھا کوئی پھیکا کوئی روکھا شاعر  
کوئی ٹیڑھا کوئی بانکا کوئی بوچھا شاعر  
کوئی گدڑا کوئی چترٹرا کوئی ادبڑا شاعر  
کوئی پھتیس کوئی لمبا کوئی پدڑا شاعر  
کوئی گونجا کوئی کرہ کا کوئی ریمکا شاعر  
کوئی لمبل کوئی طوطی کوئی میسن شاعر  
بے مزہ اُس کا کلام اور وہ پھیکا شاعر  
صنف میں چل نہ سکے ہے وہی لنگڑا شاعر  
ایک طرف سے اُسے کہہ سکتے ہیں کا نا شاعر  
اور کیا کہنے جو نہ کہنے اُسے کورا شاعر  
کیا کلام اس میں جو کہنے اُسے روکھا شاعر  
شاعروں میں وہ بلاشبہ ہے اندھا شاعر  
مرد و اہو کے وہ بنسٹا ہے زنا نہ شاعر

جو غزل اور کی سنکر نہ غزل اپنی سنائے  
 جو سنانے میں غزل شعر کی سورت بن جائے  
 گاکے محفل میں جو داد اپنے سخن کی چاہے  
 زہدا و تقویٰ سے بے بریز ہوں جس کے اشعار  
 جس کو تعقید و غلو اور اضافت کا مرض  
 شوق شاگردوں سے ہو جس کو اور اصلاح کا لڑ  
 جس کے مدح بکثرت ہوں قصیدے ازل  
 جس کے اشعار میں ہو حسن طلب کی کثرت  
 ہم بتائیں گے تو وہ رائے ہماری ہوگی  
 جرات و سوز کوئی مصحفی و مسیح کوئی  
 جتنے شاعر ہیں غرض اتنی ہی تیس اُن کی  
 غالب و میر و نظیر اکبر و آبادی تینوں  
 ہے مگر یہ بھی مسلم نہیں محتاج ثبوت  
 لیکے دیوان نہ خود دیکھ لو کیا پوچھتے ہو  
 گرچہ بچا تھا مگر کچا تھا انیسویں نسلیں  
 چیتاں طرز سخن، معنی و مطلب، مہول !  
 سیل و طوفان و غریو طبل جنگ کہو  
 درد و مصروف کامزالمات ہے  
 پختہ سودا تھا ہوا ذوق بھی کامل فن میں  
 جرات و مصحفی و سوز ہر ایک میں ایک بات !  
 انہی ایک ایک پہ انداز سے بولے رنگیں

گو جگہ سے نہ ملے ہے وہ بھگوڑا شاعر  
 نقل محفل پر وہ آپ اپنا تانا شاعر  
 کیا خبر ہے وہ سخنور کہ گویا شاعر  
 زیب و تیا ہے لقب اُسکا ہو ملا شاعر  
 نہیں شاعر وہ حقیقت میں ہوتا شاعر  
 ”کام شاعر“ پھرے آواز لگاتا شاعر  
 بھیک کیوں مانگے نہ وہ لیکے طہور انا مر  
 شعر کہتا ہے وہ یا پیٹ بجاتا شاعر  
 کیا خبر کون ہو مرغوب تمہارا شاعر  
 کوئی چرکین و زمل اور کوئی انشا شاعر  
 ایک سے ایک شاہ نہیں پورا شاعر  
 اگرے میں ہوئے یہ نام کو پیدا شاعر  
 ان کو دلی ہی کی گلیوں نے بنایا شاعر  
 کون اچھا تھا یہاں کون برا تھا شاعر  
 اور غالب وہ تصنع سے بھرا تھا شاعر  
 عرض مطلب میں جو قاصر ہو وہ گو بھکا شاعر  
 سیدنا تھا غرض من زور بلا کا شاعر  
 اور سوسن کو بھی سب کہتے ہیں اچھا شاعر  
 مانتے اس کو مخالف بھی ہیں پورا شاعر  
 کوئی تو اکوئی آوہا کوئی پونا شاعر  
 جان صاحب بھی تھا کیا کوئی نگوڑا شاعر؟

میر جعفر کی زل میں بھی ہے جدت موجود  
 سادگی لطفزدان طرز ادا کی شوخی  
 پختہ شاعر تھے امیر احمد مینائی بھی  
 جو دو غزل سے بھی بڑھ جائے نہ غزل لکھے  
 مرثیہ قوم کا حالی نے بھی اچھا لکھا یا  
 شاعر ہی چیز ہے دگر چیزے دگر استاد ہی  
 کم ہوئی جمع یہاں شاعری و استاد ہی  
 ہاں مگر میر کہ شاعر بھی ہے استاد بھی ہے  
 گو کہ چرکین بھی موجود تھا پگند اشاعر  
 ان سے تسلیم ہوا داغ بھی بکتا شاعر  
 کہ نہ شاق مگر قافیہ پیما شاعر  
 شعر کہتا نہیں ہے جان کو آتشااعر  
 بن گیا قوم کا مولوح وہ بگڑا شاعر  
 سخت شکل کسی استاد کا ہونا شاعر  
 شعر و فن دونوں میں کامل تو ہر عنقا شاعر  
 جس کو ہر عہد کے استاد نے مانا شاعر

آج بھی جس نے کلام اُسکا پڑھا بول اٹھا  
 میر تھا میر تقی میر تھا تنہا شاعر!

## انتخاب میر

حضرت میر تقی میر کے کلام کا دلکشی انتخاب مع حالات و مقدمہ جس میں آپ  
 کی خصوصیات و امتیازات شاعری پر دلچسپ بحث ہے از مولانا نور الرحمن صاحب  
 بی۔ اے (علیگ) خوبصورت و مضبوط جلد عمدہ طباعت و کتابت۔

قیمت صرف ایک روپیہ (ع)

# غزل

از حضرت آغوش

یہ راز ہے میسری زندگی کا  
پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں  
کونین پہ اک نگاہِ نفس میں  
پھر ڈھونڈ طور باہوں بخودی میں  
مجھ کو نہیں جسم و جاں کی پروا  
اولفظ و بیان میں چھپنے والے  
مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات  
عالم پہ ہے اک سکون بیتاب  
ہاں! سینہ گلوں کی طرح کر چاک  
یاس ایک جنون ہوشیاری  
پہنے ہوئے ہوں کفنِ خودی کا  
اک طرز ہے یہ بھی دلِ دہی کا  
اللہ رے دماغ بے دلی کا  
کھویا ہوا لطف آگہی کا  
سو دا ہے اک اور زندگی کا  
اب قصد ہے اور خامشی کا  
جینا ہے کمالِ منتہی کا  
یا عکس ہے میسری خامشی کا  
مے مر کے ثبوتِ زندگی کا  
امیدِ فریبِ زندگی کا

# جنگی بیسٹر

آج کل لندن میں مختلف دول کے نمائندوں کا جو اجتماع اس غرض سے ہوا ہے کہ جنگی بیڑوں کی روزانہ خسروں قوت کے لئے کوئی حد مقرر کرے۔ اس کی کارروائی ہر اس شخص کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہے جسے دنیا کے سیاسی مستقبل سے کچھ بھی تعلق ہے۔ ذیل میں ہم چند اعداد و بشرکات اس لئے درج کرتے ہیں کہ اس کانفرنس کی کارروائی کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملے۔ سلسلہ میں جرمن بیڑے کی بڑھتی ہوئی قوت نے انگلستان کو جنگ میں شریک کرایا۔ اور جبکہ اس مصیبت میں مبتلا کیا جو جنگ عظیم کے نام سے تاریخوں میں یاد رہے گی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جرمن بیڑے پر سالانہ جو خرچ ہوتا تھا اس سے سہ چودہ فیصد زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گزشتہ سال میں اپنے بیڑے پر خرچ کیا یعنی ایک ارب ۱۲ کروڑ ڈالرز اس لاکھ روپیہ کے قریب! انگلستان نے بھی اس سال میں کوئی ۸۲ کروڑ روپیہ اپنے بیڑے پر صرف کئے۔ جرمنی کے پاس سلسلہ میں بتنا بیڑا تھا آج امریکہ کے پاس اس سے ۲ لاکھ ٹن زیادہ وزن کا بیسٹر موجود ہے۔

دنیا کی سربراہ اور وہ دول کے بیڑوں کے وزن درج ذیل ہیں :-

ملک	تیسرا جہاز (ٹن)	چوہاڑ تیار ہو چکے ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
امریکہ	۱۲۶۹۳۵۳	۲۰۲۰۲۰	۱۵۳۳۲۷۳
برطانیہ	۱۵۸۷۰۳۷	۱۷۸۶۴۰	۱۷۶۵۶۷۷
جاپان	۹۱۵۵۴۷	۹۰۹۴۰	۱۰۰۶۴۸۷
فرانس	۵۴۸۵۶۳	۱۶۱۰۰۳	۷۰۹۵۰۶
اطلی	۴۰۷۴۰۵	۱۱۶۹۷۹	۵۲۴۳۸۴

ملک	تیار جہاز (ٹن)	جوہاز تیار ہو رہی ہیں (ٹن)	میزان (ٹن)
جرمنی	۱۲۳۲۹۰	۳۴۰۰۰	۱۵۷۲۹۰
روس	۱۳۳۰۲۶	۱۵۲۰۰	۱۴۸۲۲۶

ان ملکوں کے جنگی بیڑوں میں جو آدمی کام کر سکتے ہیں انکی تعداد یہ ہے :-

امریکہ	۹۳,۳۲۳
برطانیہ	۸۹,۰۰۷
جاپان	۸۱,۵۹۵
فرانس	۶۰,۸۳۴
آلمی	۴۵,۳۹۷
جرمنی	۱۴,۹۱۷
روس	۳۲,۰۰۰

پچھلے پچیس سال کے اندر جنگی بیڑوں پر سالانہ خرچ میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے (سوائے جرمنی اور روس کے جہاں کمی ہو رہی ہے) وہ اعداد ذیل سے ظاہر ہو جائے گا :-

ملک	۱۹۰۴ء	۱۹۲۹ء	اضافہ یا تخفیف
امریکہ	۱۰۹,۱۹۶,۱۲۳	۳۷۴,۶۰۸,۵۴۴	۲۶۵,۴۱۱,۹۳۱+
برطانیہ	۱۷۳,۵۴۸,۵۵۸	۲۷۸,۴۸۷,۰۰۰	۱۰۴,۹۳۸,۴۴۲+
جاپان	۱۷,۵۵۳,۲۷۹	۱۲۱,۲۲۲,۷۲۲	۱۰۳,۶۶۹,۴۴۳+
فرانس	۵۹,۷۰۰,۲۲۲	۹۹,۵۶۸,۰۰۰	۳۹,۸۶۷,۷۷۸+
آلمی	۲۳,۵۲۲,۴۰۰	۶۳,۶۲۲,۹۸۲	۴۰,۱۰۰,۵۸۲+
جرمنی	۵۰,۵۴۴,۰۰۰	۴۷,۰۶۴,۰۱۹	۳,۴۷۹,۹۸۱-
روس	۶۰۰,۱۸۸,۹۵۵	۴۲۳,۲۹۲,۸۹۹	۱۷۶,۸۹۶,۰۵۶-

کانفرنس میں جو جو تو میں شریک ہیں ان میں سے بعض چاہتی ہیں کہ بڑے جنگی جہاز  
بالکل بند یا کم کر دئے جائیں۔ کوئی آبدوزوں کے خلاف ہر کوئی کروڑوں کی تعداد گھٹانا چاہتا  
ہے۔ اس لئے یہ معلوم ہونا بھی مفید ہو گا کہ ان مختلف اقسام کے جہازوں کی تیاری پر کیا لاگت  
آتی ہے اور سال بھر میں ہر ایک پر کتنا خرچ پڑتا ہے :-

اوسط جنگی جہاز تقریباً ۵۰ کروڑ روپیہ میں تیار ہوتا ہے۔

اور ہر ایک آبدوز ۵ کروڑ میں

اوسط آبدوز ۲۰ پونے دو کروڑ میں

ایک جنگی جہاز پر کل سالانہ خرچ تقریباً ۶۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔

ایک کروڑ پر ۴۰ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

ایک آبدوز پر ۱۳ لاکھ روپیہ ہوتا ہے

## شذرات

”خود ہمارے ملک میں کیا کم کانفرنس ہوتی ہیں کہ ہم لوگ دنیا کے دوسرے سیاسی یادِ دیگر اجتماعوں کو بھی مستحق تو سمجھیں۔“ یہ وہ جواب ہے جو لندن بحری کانفرنس کا ذکر آنے پر ہمارے ملک کے ایک ممتاز سیاسی کی زبان سے سنا گیا۔ اگر اس کے معنی ان بے معنی کانفرنسوں سے بیزاری کے ہیں جو صرف دفع الوقتی یا شخصی اقتدار کی خاطر ہمارے ہاں آئے دن ہوتی ہیں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر دنیا سے بے تعلقی یا سیاسی قوتوں کے باہمی تاثرات سے بے خبری اس کی وجہ ہو تو افسوس ہے۔ شاید لندن کانفرنس ہم ہندوستانیوں کے لئے بڑی دلچسپی کی چیز بن جائے اگر ہم کو معلوم ہو کہ اس کے فیصلوں کی وجہ سے ممکن ہے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی سپاہی اسی فرانس کو فتح کرنے کے جائیں جس کو ”جرمن“ بربریت سے بچانے کے لئے انہوں نے نہ اسال قبل اپنا خون پانی کی طرح بہایا تھا۔ اور اسی جرمنی میں جہاں ہمارے سپاہی صرف جنگی قیدی کی طرح جاتے تھے۔ ہماری افواج کا خیر مقدم تہذیب و تمدن کے محافظوں کی میثیت سے ہو۔ اسی طرح ہم اس کانفرنس کی رونداد سے بے تعلق نہ رہیں اگر ہم بانیں کہ آٹلی اور فرانس کے باہمی تعلقات پر اثر ڈال کر یہ سائے شمالی افروختہ کے مستقبل پر کتنا گہرا اثر ڈالے گی اور بلا واسطہ ترکوں کے۔ انگلستان و آٹلی کے ساتھ یاروس و فرانس کے ساتھ جو جانے کا فیصلہ بھی شاید اسی کانفرنس کے نتائج پر مبنی ہو۔

ہم لندن کانفرنس کے ظاہری مقصد یعنی مختلف دول کی بحری قوت پر پابندیاں عائد کرکرنیکی کوشش کے متعلق کسی دوسری جگہ چند اعداد و دیتے ہیں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ دنیا کی یہ ممالک فزائاد قوتیں طاقت کے کس جنون میں مبتلا ہیں کانفرنس کے پوزیٹو سیاسی نتائج و امکانات پر کسی



آئندہ اشاعت میں کچھ لکھیں گے۔ اس وقت ہم ناظرین کی توجہ موجودہ یورپین سیاست کی ایک خصوصیت کی طرف منطقت کرانا چاہتے ہیں جو خود ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہو۔

جنگ عظیم سے قبل کا یورپ باوجود اپنی اندرونی رقابتوں کے جنہوں نے بالآخر اس ہلک جنگ کی شکل اختیار کی، ایک مشترک خیال رکھتا تھا یعنی مغربی تہذیب کے دوسرے تمدنوں اور تہذیبوں سے برتر و افضل ہونے کا یقین اور ان 'پست' اور نیم تمدن قوموں سے ہر قسم کی سیاسی اور معاشی فائدہ حاصل کرنے کا خدا واد حق۔ جنگ نے اس یقین کو متزلزل کر دیا اور اس حق کو تقریباً مٹا دیا۔ خود ساری مغربی دنیا دو ٹکڑے ہو گئی اور جنگ کے ختم ہونے کے ۴۰ سال بعد تک یہ ٹولیاں تقریباً اس سطح بندھی رہیں۔ لیکن یورپ نے محسوس کر لیا کہ معاملہ اس طرح زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ دشمن دوست کی پرانی تقسیم آخر تک قائم رکھی جائیں۔ دول یورپ نے پھر اپنے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۲۴ء میں یورپین سیاست نے ایک کردار لی۔ سیاسی فضا بدلی۔ ہر طرف اتفاق و اتحاد کے چرچے ہونے لگے۔ اور سب ملکوں کے سیاسی خطیبوں کی متحدہ کوشش نے وہ چیز پیدا کر دی جسے "لوکارنو کی ذہنیت" کہا جاتا ہے۔ لیکن خطیبوں کا پیدا کیا ہوا اتحاد بہت اٹھلا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں بھی تھوڑے دن تو اتحاد و اتفاق کی یہ غیر حقیقی فضا رہی۔ مگر جب ہر ملک کے مدبروں نے اس فضا میں اپنے حقیقی سائل کا حل نکالنا چاہا تو یہ اتفاق و اتحاد شکل نظر آیا اور ہر قوم نے سمجھ لیا کہ ایک متحدہ یورپ بنانے کے لئے پہلے اپنے مخصوص مقاصد کی نگہبانی کر لینی چاہئے تاکہ جب مغربی تہذیب کے متحدہ ایوان کی بنیادیں پڑیں تو ابھی مخصوص گوشہ نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی سب بااثر اور مقتدر قومیں آج یورپ اور دنیا کے مستقبل کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ ہر ایک کسی خیال، کسی تصور کا حامل اور حامی بنا ہوا ہے اور اس سے اپنی سیاست میں کام لے رہا ہے۔

انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اینگلو سیکسن نسل اور انگریزی زبان کے اتحاد کے تصور کے زیر اثر اپنی رقابتوں کو سٹے کرنے پر آمادہ ہیں۔ خود برطانیہ میں سلطنت کے تصور کو پھر بہت فروغ دیا جا رہا ہے۔ جوہر اور میکڈانلڈ کی گفتگوؤں میں امریکہ کے صدر نے اگرچہ باطل واضح کر دیا کہ ہمیں یورپ کے معاملات میں دخل دینے کی خواہش نہیں۔ یہ کام اینگلو سیکسن دنیا کی طرف سے انگلستان کو انجام دینا چاہئے، اور اس وقت سے یورپین سیاست میں انگریزی وزارت خارجہ کی بات کا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن موجودہ وزارت بظاہر بالذون کی کمزور وزارت سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہے اور یورپ کی سیاسی الجھنوں میں آلودہ ہونے کے بجائے پوری کوشش کر رہی ہے کہ سلطنت برطانوی کے تصور کو زیادہ قوی کیا جائے۔ لارڈ بیور بروک نے اپنے سارے اخبارات اس خیال کی حمایت و اشاعت کے لئے وقف کر دیے ہیں، لارڈ بلبت نے معاشی حلقوں کو اس کا ساتھی بنا دیا ہے۔ مصر سے معاملہ اور ہندوستان کو کانفرنس کا بلا والا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس سال سلطنت برطانیہ کی جو کانفرنس ہوگی اس سے بھی تصور اتحاد کو بہت کچھ تقویت و بجائے گی۔

اپنے مخصوص مقاصد اور جدانصب العین کا احساس اٹلی میں بھی بہت قوی ہے۔ اس نے فاشیزم کے نئے مسلک کو فروغ دے کر اپنی ساری قومی زندگی کو اس کے تحت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ نیز دیگر ممالک میں جہاں پارلیمنٹی حکومت کے تقاضے ظاہر ہو رہے ہیں اس تصور کو پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے وہ جنوب و مغربی یورپ میں بھی اپنا تسلط چاہتا ہے۔ اور شمالی افریقہ میں بھی۔ لیکن قوم میں ریاست کا ایک نیا تصور پیدا کر کے ایک نئے خیال کی تخلیق اور توسیعی قوت سے کام لے کر۔

فرانس کے جذبہ وطنیت اور اپنی تاریخی و تمدنی قوتوں پر اعتماد کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہ

یورپ ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی اپنی زندگی دھون کی کا سکھ جانے کے ورپے ہے۔ ۱۹۲۲ء میں یورپ کے اندر اسکا بنا ہوا نقشہ ذرا بگڑنے لگا تھا۔ لیکن شہ سے یہ برابر اس کو مضبوط کرنے میں ساعی ہے۔ اس کی ریادت میں اتلاف صغیر کی ریاستوں نے جو فوجی اور معاشی معاہدے کئے ہیں ان سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔ فرانس ہی یورپ میں اس وقت ایسی قوم ہے جس نے دس سال سے بھی زیادہ سے ریاستوں کا ایک جتھنا بنا رکھا ہے جس پر اس کے نزدیک یورپ کے آئندہ امن یقین کا بڑی حد تک دار و مدار ہے۔ یہی ایک ملک ہے جو اپنی مخصوص روایات، اپنی ملک پرستی کے باعث اپنے ماحول کے تغیرات و انتشارات سے سب کو کم متاثر ہے۔

جرمنی جو ابھی تک جنگ عظیم کے زخموں سے چور ہے وہ بھی جہاں یورپ کی دوسری قوموں کے اختلافات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے وہاں اس سے بھی بے خبر نہیں کہ بغیر اپنے کسی مخصوص قومی خیال اور مقصد کے اسکا آگے بڑھنا مشکل ہو۔ اس نے بھی جرمانی اللسان و طی یورپ کے اتحاد کو اپنا قومی مقصد بنایا ہے۔ اور اس کے لئے نہایت مستعدی اور بہت کچھ کامیابی کے ساتھ ساعی ہے۔

روس تو تہذیب حاضر کی بنیادوں ہی کو بدل دینے کے ورپے ہے اور اس نے اپنے نئے خیال کے ساتھ بے مایہ اور نادار طبقہ کی فحشی روحانی اور کرب قلبی کو ملا کر دنیا کی ریاست اور دنیا کی ذہنیت میں ایسے انقلاب کی طرح ڈالی ہے جس کی کامیابی یا ناکامی نتائج و عواقب کی اہمیت و ہمہ گیری کے لحاظ سے تاریخ عالم کی بڑی سے بڑی تحریک کی کامیابی یا ناکامی کے ہم پلہ ہوگی۔

ان سب باتوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ان سے ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصاً مسلمانان ہند کی سیاست کے لئے سبق ملتا ہے۔ یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی تقریریں اور خطبوں اور اخباری تحریروں کے زور پر جسم سیاسی کے دو اہم ترین حصول، ہندو اور مسلمانوں میں، اتحاد و تعاون کی سبیل نکالی گئی تھی۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن دہرپانہ ہو سکتی تھی نہ ہوئی۔ یورپ کی طرح ضرورت تھی کہ مقررہ کی جگہ مرتب ذہن اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ قومی مقاصد کا تعین کر کے معاملات میں مفاہمت کی کوشش کریں۔ مفاہمت نہ ہو سکے اور اختلافات اصولی ہوں تو ہاں لڑیں جھگڑیں بھی۔ لیکن یہ جانکر کہ کس چیز کے لئے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایسی چیز کے لئے جس پر لڑنا جھگڑنا کسی جماعت کے نمایاں نشان ہو ایسی چیزوں کے لئے جن میں علی انہماک اس بات کا زندہ ثبوت دیتا ہو کہ یہ جماعتی زندگی کے لئے اصولی چیزیں ہیں جنہیں پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔

ہندوؤں میں ہندو مذہب سبھانے مخصوص ہندو اغراض کی تنگ دلی اور کوتاہ بینی کے ساتھ ترجمانی کی لیکن ایک نہایت محدود قسم کی وطن پرستی کے علاوہ جو ایک مخصوص گروہ کی فلاح کی کوشش سے عبارت تھی اس نے خود ہندو قوم کے سامنے کوئی مثبت تصویر تعمیری پیش نہیں کیا۔ تنفرد پرینزاری کے منفی جذبوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھکر اس نے اس کام کی ناپائنداری اور بے وقعتی کا انتظام کر لیا ہے۔ مسلمانوں میں بھی کسی جماعت نے کوئی مثبت سطح نظر سیاسی اور تمدنی زندگی کا نہ اپنے لئے بنایا نہ دوسروں کے سامنے پیش کیا۔ انوس کہ قسطنطنیہ اور خطیبوں کے بعد جن مبروں کی ضرورت تھی وہ ہم میں نہ نکلے۔ اور ہم جب ملک کی دوسری جماعتوں سے ملے تو اس وقت بھی کوئی مخصوص اسلامی سطح نظر ہم نے پیش نہیں کیا۔ کوئی سطح نظر جو ہمارے مخصوص حقوق کو حق بجانب ہی نہ بنا آ بلکہ خود ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کو اپنے اثر سے بہتر اور جامع تر بنا سکتا۔ ہم جب بوٹھے تو اس وقت بھی ہم نے تمدنی

زندگی کے کسی خاص تشکیل، قومی زندگی کے کسی خاص ذہنی عنصر کی خاطر ایسا نہیں کیا یا اگر کیا تو بے جانے اور اور دل کو جتاے بغیر۔ ہر شخص مسلمانوں کے لئے مخصوص نیابت کا حق مانگتا ہے، ہر شخص انکے لئے جگہیں محفوظ کرنا چاہتا ہے، نیابتی جماعتوں ہی میں نہیں ملازمتوں میں، مدرسہ میں طالب علموں کی تعداد میں، وظائف میں، خطابوں میں، انعامات میں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں جانتا کہ حیات قومی میں مسلمان کن مفید چیزوں کے حامل ہیں، کن اچھے مقاصد کے حامی ہیں، زندگی اور اسکے مسائل کے حل کے لئے کیا خاص نقطہ نظر انکے اثر سے فروغ پا سکتا ہے، یہ خود اپنی کن چیزوں کی حفاظت کے لئے نمائندگی و نیابت میں تحفظ کے طالب ہیں، اب اس وقت اپنی کوشش اور عمل سے اپنی جماعتی زندگی کے لئے ان چیزوں کے ضروری ولا بدی ہونے کا کیا اور کتنا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ خود ہماری سیاسی زندگی میں آج جتنا انتشار ہے شاید پچھلے پچاس سال میں کبھی نہیں ہوا۔ کوئی مسلمانوں کے نام سے اپنی حیثیت کے سدھارنے یا برقرار رکھنے میں سامعی دکھائی دیتا ہے، کوئی اپنی لئے نوکری چاہتا ہے، کوئی اپنے عزیزوں کے لئے، کوئی خطاب کا طالب ہے، کوئی بس ایک مسلم لطف آمیز کا یہ سب چیزیں محدود ہیں اور کچھ کو مجبائیں تو لازماً کچھ کو محسوس رہنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کامیابوں کے ذمہ میں داخل ہونے کے لئے دوسروں کی ناکامی کا رادۂ یا بلا ارادہ سامان کرتا ہے۔

اگر مسلمانوں کا مطالبہ حقوق واقعی چند اشخاص کے شخصی فائدہ یا نقصان کا معاملہ ہوتا تو اس میں کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کی حیات اجتماعی میں مسلمانوں کے بعض مخصوص وظائف ہیں جن کا صحیح طور پر انجام پانا مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملک اور انسانیت کے لئے ضروری ہے۔ اگر مسلمان اکثر ہندوستان کی توہم پرستی میں آزادی خیال کے حامی رہے ہیں اور رہ سکتے ہیں، اگر جیسا جماعتی پابندیوں کی نفسائیں یہ شخصیت انفرادی کے حق کی اہمیت جتا کر ایک صحیح جماعتی توازن پیدا کرنے کے باعث ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ اگر تنگ نظر ملک پرستی کی غلطی نے انکی وسعت نظر سے اصلاح پائی ہے اور اب بھی پاسکتی ہے، اگر انکی بین الاقوامی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی سیاست کے لئے نہایت قیمتی خدمات انجام پاسکتی ہیں، اگر تمدن ہند

میں ایک حصہ، زبان میں، ادب میں، تعمیرات اور فنون لطیفہ میں، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں میں ایسا رہا ہے کہ اس حصہ کا تلف ہو جانا ہندوستان کے تمدن کو اپنی موجودہ حیثیت سے برباد پست کر سکتا اور جس کا ترقی پانا اس تمدنی زندگی کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ تو ان صفات کے حاملوں کو بحیثیت جماعت، قائم رکھنا، اور انکی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوؤں اور انسانیت کی خدمت ہی۔ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اپنے ان مخصوص وظائف کا احساس اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے عمل سے سب پر ثابت کریں کہ انکی جماعتی زندگی کی غایت انہیں مقاصد و خدمات کا پورا کرنا ہے۔ مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ایسی قیادت ہی جو انکے تخیل کی سطح کو شخصی اغراض کی پستی سے اٹھا کر مخصوص جماعتی صلاحیت خدمت کے احساس پر پہنچا دے۔ اور ایسی جماعتیں جو ان مخصوص وظائف کو اس وقت سے بلا لحاظ اس کے کوئی ہمارے حقوق کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ ہم کسی سے ملے ہوں یا روٹھے ہوں، استقلال و پامردی سے انجام دیتی رہیں کہ یہی مخصوص حقوق کے تسلیم کرنے کی تہنشات ہی۔ ان دونوں چیزوں کو افسوس کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں پر نہیں پاتیں۔ نہ ہم میں وہ فکر ہیں جو ہمارے سرمایہ ذہنی کو زندہ رکھیں اور ترقی دیں، نہ وہ خطیب و مبلغ ہیں جو اس سرمایہ کو ساری جماعت کی ذہنی ملک بنا دیں، نہ وہ اہل دل ہیں جو دوسرے کے دلوں میں ان اعلیٰ مقاصد کو عمل کا جامہ پہنانے کی لگن لگا دیں، نہ وہ مستقل فرائض کا رکن ہیں جو ناکامی و کامیابی کی دھوپ چھاؤں سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہیں۔

اپنی محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہی

کیا یہ توقع بجا ہوگی کہ مسلمانوں کی تعلیم لگا ہوں بہ حیثیت ذہنی مرکزوں کے اس صورت حال کے بدلنے میں کچھ مدد سے سکیں گی؟ اگر کچھ امید ہے تو انہیں سے ہے۔ باقی تو اللہ کا نام ہے اور بس۔

## مطبوعات

# ہندوستانی ایکادیمی صوبہ متحدہ

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوؤں کے معاشرتی اور اقتصادی حالات | از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل ایم

سی بی ای - مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے - غیر مجلد ایک روپیہ -

۲۔ اردو زبان اور ادب - از سید خاسن علی - قیمت ایک روپیہ

۳۔ مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات | از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

قیمت چار روپے (لغہ)

## زیر طبع

۱۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر - از مولانا محمد امین صاحب عباسی

۲۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن - از اسے بہادر مہا ہوبادھیہ پنڈت گوری شنکر

۳۔ ہندی شاعری - از ڈاکٹر عظیم کریمی - ہیرا چند ادب

۴۔ ناتن (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے - ایم آر اے ایس

۵۔ ترقی زراعت - از خاں صاحب مولوی محمد عبدالقیوم ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت الہ آباد

لے کاپتہ: جنرل سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی (یو۔ پی) الہ آباد





# **The Cultural Side of Islam**

## **Madras Lectures on Islam**

**(NO. 2.)**

BY

**MUHAMMAD MARMADUKE PICKTHALL**

**DELIVERED AT MADRAS IN JANUARY 1927.**



### **CONTENTS.**

1. First Lecture—Islamic Culture.
2. Second Lecture—Causes of Decline.
3. Third Lecture—Brotherhood.
4. Fourth Lecture—Science, Art and Letters.
5. Fifth Lecture—Tolerance.
6. Sixth Lecture—The Charge of Fatalism.
7. Seventh Lecture—The Relation of the Sexes.
8. Eight Lecture—The City of Islam.

Price 8/-  
Bound 12/-

TO BE HAD OF:—

**NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY  
BOOK DEPOT,**

KAROL BAGH,

**DELHI.**

۱۸۶۲

رجسٹرڈ



۳  
۱۶



# جمعہ

جامعہ ملیہ کاماہوار علی وادبی رسالہ

نمبر ۰۳

نارت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۰ع

جلد ۱۲

”مجاہدین“



مجمع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# معارف

نیرا دارت

مولانا اسلم جبر جیوی ڈاکٹر سعید حسین ایم اے پی ایچ - ڈی

جلد ۴	بابۃ ما یح ۱۹۳۰ء	نمبر ۳
-------	------------------	--------

## فہرست مضامین

- |     |  |                            |
|-----|--|----------------------------|
| ۱۶۲ | ڈاکٹر سعید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ - ڈی استاد بجا | ۱۔ جابج ہزار ڈشا           |
| ۱۷۹ | ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خان صاحب ایم اے پی ایچ - ڈی           | ۲۔ مذہب اشتراک کے بانی     |
|     | مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ             | ۳۔ روس کی ایک اسلامی جہویت |
| ۲۰۶ | ڈاکٹر محمد نسیم صاحب ایل ایل ڈی (لندن)                 | ۴۔ کبھ میلے کی سیر         |
| ۲۱۴ | ارجناب سجاد ظہیر صاحب شعلہ کسور ڈیونیر رشی             | ۵۔ گرمیوں کی ایک رات       |
| ۲۲۱ | ...  | ۶۔ نغمہ چین                |
| ۲۲۸ | ...  | ۷۔ تنقید و تبصرہ           |
| ۲۳۳ | ...  | ۸۔ شذرات                   |

# جانب برنارڈشا

## (ڈراما نگار کی حیثیت سے)

شا کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر نامک کے ساتھ ایک مفصل دیا چکھتا ہے جس میں وہ اپنے فنی و اخلاقی نقطہ نظر کی تشریح کرتا ہے، اور نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے اس حدت کو بہت سے لوگ سینہ زوری سمجھتے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو وجہوں سے بطرز عمل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ محض جالیاتی ذوق کی چٹس نہیں بلکہ سماج کی تنقید و اصلاح کی غرض سے لکھتا ہے۔ وہ اخلاق و معاشرت کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات لکھتا ہے اور انہیں رواج دینا چاہتا ہے۔ تاہم کے اشخاص کی گفتگو میں موقع بے موقع اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، مگر قصہ آخر قصہ ہی ہے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ کوئی نظریہ منطقی ترتیب سے پیش کیا جاسکے۔ اس لئے شا کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دیا چہ میں وہ مسائل جن کا تاہم میں سو سہری طور پر ذکر کیا ہے زیادہ مفصل اور مدلل طریقے پر بیان کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتدا میں انگلستان کے سارے نقاد شا کی مخالفت میں ایک زبان تھے اور اس کا طردار کوئی نہ تھا، اس لئے وہ اس پر مجبور ہوا کہ اپنی حمایت میں خود سلم اٹھائے۔ اس کی دیا ننداری اور صاف گوئی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کرتے نہیں شرماتا۔ اپنے نامکوں کے دیا چوں میں وہ طنز اور مضحکہ کی توار سے معترض پر وار کرتا ہے اور نظافت کی سپر سے اپنی شہرت کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں بھی دوسرے مصنفوں کی طرح شہرت پسندی اور دواطلبی کی کمزوری ہے، مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض اپنی تصانیف اور اپنے خیالات کی ترویج چاہتا ہے، پنج ہم عصروں کی طرح اپنی زندگی کی جزویات کو خجس روں میں شائع نہیں کرتا۔ اور اپنی خود ستائی

کو ظرافت کے پیرائے میں اس خوبی سے بنھاتا ہے کہ وہ بدنام نہیں معلوم ہوتی۔

بہر حال یہ دیا باپے اُس کے خیالات کی اشاعت اور اسکی شہرت کی حمایت کے لئے خواہ

کتنے ضروری کیوں نہ ہوں لیکن خالص آرٹ کے نقطہ نظر سے ضرور قابل اعتراض ہیں اس لئے کہ آرٹ کی دلکشی اور دلگیری کا راز یہ ہے کہ وہ علم کی طرح زندگی کو بے جان اور بے رنگ معانی میں تحلیل نہیں کرتا بلکہ اسکی نیرنگیوں کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا ہے۔ خصوصاً ڈراما کا تو کام ہی یہ ہے کہ ایک زندہ اور سالم موقع مشاہدے کے سامنے پیش کرے۔ ہزار ڈراما نے غضب کرتا ہوا اپنے ہانک میں ایسا موقع بنا کر اسے دیا باپے میں چھڑکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ اس کے اکثر نامکوں میں زندگی تانگی اور مرآت موجود ہے۔ اگر اُسکے دیا باپے پڑھ کر انہیں پڑھنے تو معلوم ہوتا ہے کہ محض سرود اور خشک علمی مقالے ہیں۔

بات یہ ہو کہ ہزار ڈراما جس طرح آرٹ کا کوئی عیندہ اور مستقل مقصد تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کے مخصوص قوانین کا بھی قائل نہیں۔ وہ صرف اپنے ہانک کے ساتھ دیا باپے لٹھکران قوانین کو پامال نہیں کرتا بلکہ خود ہانک کے انداز تحسیر، قصے کی ترتیب، اشخاص کی سیرت نگاری میں بھی اصول فن کی طرف سے بے پروائی کرتا ہے۔ اسکا اسلوب بیان سادہ بے تکلف اور پر زور ہے جیسا علمی مسائل پر عام فہم رسالے لکھنے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ عموماً اپنی عبارت میں ادبی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا البتہ کہیں کہیں (جیسے کینڈیڈا میں) نوجوان نثار کی گفتگو یا ”جان بیل کا دوسرا جزیرہ“ میں جنون پادری کی تقریر) خطیبانہ بلند پروازی سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن ظرافت اور طنز کی چاشنی اس کے یہاں ایسی ہے کہ خواہ وہ کیسے ہی خشک مسئلے پر بحث کرے۔ اسے بے حد دلچسپ بنا دیتا ہے۔ سیرت نگاری اس کے ڈراما کا کمزور پہلو ہے۔ اس کے اشخاص عموماً کوئی اپنی علیحدہ شخصیت نہیں رکھتے بلکہ مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں کے نامزدے ہوتے ہیں خصوصاً وہ جن کی زبان سے وہ اپنے خیالات ادا کرتا ہے۔ کت پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے سامنے نامکوں میں صرف دو اشخاص ایسے ہیں جن کی

خیالی تصویر میں جان ڈالنے میں وہ کامیاب ہو رہے: سینٹ جون اور جولیسی سیزر، اور یہ دونوں تاریخی شخصیتیں ہیں جنہیں اس نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اپنے ناموں میں کسبِ "سوانح" پیدا کرنے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا، لیکن ڈالا کی حقیقت کے خلقی احساس کی بدولت وہ محض گفتگو کی گرمی اور جوش سے نامک کے منظر کو موثر بنا دیتا ہے۔ اس کا سارا کمال گفتگو کے زور شور اور طنز و طرافت کی نوک بھونک میں ہے۔ خوش طبعی کی جن تین قسموں کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان میں سے دل لگی کا تو برنارڈشا کے یہاں کہیں نام ہی نہیں۔ البتہ طرافت اور طنز سے اس کی تصانیف کا ہر صفحہ مالا مال ہے بعض نامکوں مثلاً "والدہ اعلم بالصواب" اور شادی کی بات چیت "میں تو قصے اور واقعات کا جزو محض برائے نام ہے اول سے آخر تک سوائے طریفاً نہ طنز آمیز مکالمے کے کچھ نہیں۔ لیکن ان مکالموں ہی میں اس نے یہ کمال دکھا دیا ہے کہ دونوں نامک پڑھنے میں دلچسپی ہیں اور اسٹیج پر بھی کامیاب۔

اسلوب بیان اور زور کلام کے اعتبار سے برنارڈشا کے ابتدائی دور اور آخری دور کے نامکوں میں کچھ بڑا فرق نہیں ہے۔ وہ جوانی میں بڑھاپے کی بچتہ کاری رکھتا تھا اور بڑھاپے میں جوانی کی تازگی اور جوش رکھتا ہے۔ البتہ خیالات کے اعتبار سے اس کی تصانیف کا رنگ بہت کچھ بدلتا رہا ہے۔ ہم اس کے نظریہ زندگی کی ارتقار کے تین دور قرار دے سکتے ہیں۔

(۱) تخریبی تنقید

(۲) تعمیری تنقید

(۳) ایک مستقل فلسفہ حیات کی تشکیل

تخریبی تنقید | سب سے پہلے شا کے سات نامکوں کا سلسلہ "خوشگوار اور زنا خوشگوار" کے نام سے شائع ہوا جو سب ذیل تشبیہوں پر مشتمل تھا:-

(۱) "اسلمہ اور انسان"

(۲) "تقدیر کا بندہ"

(۳) ”کینڈیڈا“

(۴) ”عشقباڑ“

(۵) ”میزوارن کا پیشہ“

(۶) ”رند وڈوں کا گھر“

(۷) ”والد علم بالصواب“

- یہ ہمارے ڈراما نگار کے شباب کا زمانہ تھا۔ سب مخلص نوجوانوں کی طرح وہ بھی اپنے سینے میں ایسا دل رکھتا تھا جو انسانی ہمدردی اور اصلاحی جوش سے معمور تھا۔ مروجہ رسوم و اخلاق کی خرابیاں اس کی نظروں میں کانٹے کی طرح ٹھکنگتی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ قدیم طرز معاشرت کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو گئی ہیں اور جب تک اس عمارت کو گرا کر اور اس کی بنیادوں کو بدل کر دوسری بنیادیں قائم نہ کیا جائیں کسی جدید زندگی کا تعمیر کرنا ناممکن ہے۔ اسے قدیم سماج سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کائنات اور زندگی کے مشاہدے میں اپنی آنکھوں سے کام نہیں لیتی بلکہ ہر چیز کو عینیت یا رومانیت کی عینک سے دیکھتی ہے۔ عینیت سے تشاکل مراد ہے اخلاق و معاشرت کے ان اصولوں کو جو انسان کی ہدایت اور بہتری کے لئے بنائے جاتے ہیں مستقل مقاصد سمجھ لینا اور انسان کی راحت و مسرت یا اس کی زندگی کو ان اصنام خیالی پر قربان کر دینا۔ اور رومانیت اس کے نزدیک عقل کے بجائے جذبات کو عقیدے اور عمل کا معیار بنانے کا نام ہے۔

رومانیت کے رُوح و رواں عشق و شجاعت کے جذبات ہیں۔ اس کا نصب العین زندگی ہے کہ انسان محبت کو منزل مقصود اور ذلیل راہ سمجھے اور محبوب کی راہ میں جان بازی اور سرفروشی کے کارنامے دکھائے۔ شاید اس نصب العین پر سختی سے نکتہ چینی کرتا ہے اور رومانیزم کے نزدیک عشق اور شجاعت کا جو مفہوم تھا اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔



”اسلحا اور انسان“ اور ”تقدیر کا بندہ“ ان دونوں نامکوں میں شائستگی کی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ رومانی نقطہ نظر سے شجاعت اسے کہتے ہیں کہ انسان بڑے سے بڑے خطرے کی کوئی حقیقت نہ سمجھے اور ہرچہ با د اباد کرے تامل اپنی جان و رطلہ ہلاکت میں ڈال ڈالے۔ ”اسلحا اور انسان“ میں ایک لڑکی کا قصہ ہے جس کی ترتیب انہیں خیالات کی فضا میں ہوئی ہے۔ ایک بار جنگ کے زمانے میں اتفاقاً ایک سوئستانی سپاہی اس کے یہاں پناہ لیتا ہے۔ یہ آزمودہ جنگ آزمائے شجاعت کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں بے سمجھے بوجھے اپنی جان پر کھیل جانا حماقت ہے۔ اچھے سپاہی وہ ہیں جو بغیر اشد ضرورت کے خطرے کے پاس نہیں جاتے ہیں، جب جاتے ہیں تو اپنی بچانے کا پورا سامان کر لیتے ہیں۔

”تقدیر کا بندہ“ میں اُس نے عہد جدید کے سب سے بڑے فوجی ہیرو نیپولین کی تصویر کھینچی ہے اور اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ نیپولین غیر معمولی عرب اور بد بے کا آدمی تھا اور بڑے سے بڑے خطرے کو خاطر میں نہیں لے لیا تھا۔ شاکا نیپولین بہت سی باتوں کے لحاظ سے معمولی آدمی ہے، البتہ اُس میں ارادے کی پختگی، چالاکائی، مردم شناسی، دوسروں سے زیادہ ہے۔

عشق کے جس تصور نے رومانیت کی آب و ہوا میں پردریش پائی تھی وہ یہ تھا کہ یہ ایک مبارک جذبہ ہے جو یکایک انسان کے سینے میں بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے جسم و روح پر چھا جاتا ہے۔ سچے عشق میں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جادوین کر معشوق کے دل کو تسخیر کر لیتا ہے۔ یہ جذبہ زندگی کے مام قوانین کے تحت میں نہیں آتا بلکہ اپنا جدا گانہ قانون رکھتا ہے۔ اس کی بدولت انسان کی سعادت اور مسرت کی تکمیل ہوتی ہے اور اُسے اعلیٰ روحانی مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ شائے کینڈیڈا میں عشق کے اس تصور کو آماجگاہ بنایا ہے۔ عاشقوں کی بے چینی اور بے تسلی کو وہ جوانی کی جذبات پرستی کا نتیجہ سمجھتا ہے جو انسان کی شان خودداری کے خلاف ہے۔ اس نامک میں ایک نوجوان شاعر کے عشق مضطرب کا مقابلہ ایک پختہ کار خاتون کی یرسکون دوستی سے کیا گیا ہے۔ وہ ایک پادری کی بیوی ہے اور اپنے شوہر سے محبت رکھتی

ہے باوجود اس کے شاعر کے جوش محبت سحرہ متاثر ہوتی ہے اور اس سے بہت مانوس ہو جاتی ہے، لیکن وہ جانتی ہے کہ اپنے عاشق سے جو رابطہ ہے وہ جذبات کے مارضی بیجان پر مبنی ہو گا۔ اپنے شوہر سے جو تعلق ہے وہ مصالح زندگی کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ اس لئے وہ شاعر کے عرض نیاز کو خوش اسلوبی سے رد کر دیتی ہے۔

شاعی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نقادوں کی تنقید اور صلحوں کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ نئے زمانے دلے پرانے لوگوں کی جن کمزوریوں پر اعتراض کرتے ہیں، وہ ایک دوسری شکل میں خود ان میں موجود ہیں۔ مثلاً یہی عینیت اور رمانیت جو اس کے ہمصروں کی نظر میں قابل مضحکہ ہیں، ”غنتقا زہیں آس نے“ ”ابسن کلب“ کا نقشہ پیش کیا ہے جس کے ارکان آزا و خیال اور ترقی پسند ہونے کے مدعی ہیں۔ مگر ان میں سے سن رسیدہ جماعت (جس کا نمائندہ کرنل کریون ہے) عملان تعصبات میں مبتلا ہے۔ نوجوان ممبروں میں بھی جویا جذبات پرستی میں رومانی عہد کی عورتوں کو مات کرتی ہے۔ سب سے دلچسپ شخصیت، ایک نوجوان ڈاکٹر کی ہے جو کرنل کریون کا معالج ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کرنل کریون ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے جسے سب سے پہلے اس نے معلوم کیا ہے۔ ڈاکٹر کو اپنی اس تحقیق پر بڑا ناز ہے، مگر اس کی اشاعت سے پہلے وہ مزید اطمینان کر لینا چاہتا ہے۔ بعض فیصلہ کن تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا خیال غلط تھا اور کرنل کریون کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ڈاکٹر کو اپنے مریض کی سلامتی سے خوشی ہو اسے اپنے مریض کے ثابت نہ ہونے سے سخت صدمہ ہوتا ہے اور ہر کریون اس پر خفا ہے کہ ڈاکٹر کے اس خیالی خطرے کی بنا پر وہ عرصے تک گوشت اور شراب کے استعمال سے محروم رہا بلکہ انجمن مخالفین شراب نوشی کا صدر بھی بن گیا۔ یہاں بزم اژدہا کو جدید عین پرستی کی خبر لینا منظور ہے۔ اس کے خیال میں جس طرح پُرانے خیال کے لوگ، مجرد مذہبی اور اخلاقی تصورات کی پرستش کرتے تھے اسی طرح نئے زمانے کے لوگ سانس کی کرتے ہیں۔ اس زمانے کے پادریوں کو گنہگاروں کی نجات

سے زیادہ گناہ کی حقیقت سے دلچسپی تھی، اسی طرح آج کل ڈاکٹروں کو مریض کی صحت سے زیادہ مرض کی ماہیت سے ذوق ہے۔ جس طرح جیتے جاگتے انب نوں کو دینداری یا نیکی کے نام پر قربان کر دیتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ انہیں علمی تحقیقات کی دیوی پر بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

”میزوارن کا پیشہ“ اور ”رندوؤں کا گھر“ میں شائے دو بڑی اخلاقی خرابیوں کی پردہ

دہی کی ہے۔ جنہوں نے موجودہ مغربی تمدن کی بڑوں میں گمن نگا دیا ہے، عصمت فروشی کا باقاعدہ کاروبار کی بنیاد سے فرغ پا کر بے مایہ غریبوں کا سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لوٹا جانا۔ ان دونوں ناموں میں اُس نے یہ دکھایا ہے کہ ان خرابیوں کے ذمہ دار وہ خاص طبقے نہیں ہیں جو انہیں پیشے کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں جن میں سحر خیزوں کو اپنی اس آلودگی کی خبر بھی نہیں ہے۔ مثلاً میزوارن نے یورپ کے بہت سے شہروں میں قحبہ خانے قائم کر رکھے ہیں، مگر ان میں ایسے ایسے لوگوں کا سرمایہ اور مشورہ شریک ہے جو سوسائٹی میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی اولاد سے یہ خبر نہیں کہ والدین کی آمدنی کس شرمناک کاروبار پر موقوف ہے، اسی ناپاک روپے سے تعلیم پاتی ہے۔ میزوارن کی لڑکی کو جس نے نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت پاتی ہے، جب اس کی خبر ہوتی ہے تو وہ گھر کی ناز و نعمت کو لات مار کر چلی جاتی ہے اور اپنی قوت بازو سے روزی پیدا کر کے عزت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ مگر اتنی غیرت اور حمیت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ انکی آمدنی کا ذریعہ ناجائز ہے اور اس سے نفرت بھی رکھتے ہیں مگر ان میں اتنی بہت نہیں کہ اس سے ہاتھ اٹھائیں اور حلال کی روٹی لگا کر کھائیں۔

”رندوؤں کا گھر“ میں ایک نوجوان کا قصہ ہے جو اپنی مسو بہ کے باپ پر یہ الزام لگا تا جو

کہ وہ ناجائز ذرائع سے روپیہ لگا کر امیر ہو گیا ہے، وہ چند مکانوں کا مالک جو جن میں غریب مزدور کرایہ پر رہتے ہیں، مکان اس قدر تنگ و تاریک، بوسیدہ اور گندے ہیں کہ رہنے والوں کو سخت تکلیف ہے اور انکی صحت برباد ہو رہی ہے۔ وہ ان کی کبھی مرمت نہیں کرتا مگر یہ پچارے غریبوں

سے کرایہ خوب دبا کر وصول کرتا ہے۔ نوجوان کے طعنوں کے جواب میں بڑھاپہ ثابت کرتا ہے کہ نوجوان کی آمدنی بھی ایسے ذرائع سے ہوتی ہے جو غریبوں کو کونستے پر موقوف ہے۔ نوجوان کو سخت مذمت ہوتی ہے مگر بجائے اس کے وہ اپنے دامن کی آلودگی کو دور کرے وہ دوسرے کی ترداد منی سے چشم پوشی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

ان سب ناموں میں شانے سماج کی ریاکاری کی جھلک کی ہے ریاکاری کو بڑا اخلاقی گناہ سمجھتا ہے اس نے اس کی توضیح قریب سیر اس کے ہر نامک میں موجود ہے۔

اس کے بعد شا کے تین نامک ”پیورٹن لوگوں کے لئے تین نامک“ کے نام سے شائع ہوئے۔ ان سے شا کے تعمیری تنقید کا دور شروع ہوتا ہے۔ اب وہ مسلمہ عقائد اور مروجہ اخلاق پر نکتہ چینی کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے نظریہ زندگی کی ایک جھلک بھی دکھاتا ہے۔ اس کے اصول اخلاق کالب لباب یہ ہے کہ :- انسان بطبع نیک ہے، لیکن اس کے ماحول کی خرابیاں اس کی سیرت کو برباد کر دیتی ہیں، اس کی اصلاح و غلط نصیحت سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ رکاوٹیں دور کر دی جائیں جو اس کی فطرت کی آزاد نشوونما میں حائل ہیں۔ نیکی وہی ہے جو انسان اپنی فطرت کے تقاضے سے کرتا ہے رزک کسی خارجی مقصد کے لئے۔

”شیطان کا مرید“ میں ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو سماج کے نقطہ نظر سے مجرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک عورت کو جس سے وہ واقف تک نہیں، ہلاکت سے بچانے کے لئے اپنی جان دیدیتا ہے۔ اس کے پیش نظر عشق و محبت یا مہمردی یا اشار، غرض کوئی شعوری رٹانی یا اخلاقی مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مصیبت زدہ کو دیکھ کر اس کا جی بے اختیار جاتا ہے کہ اپنی جان بچائے اور وہ بے سوچے سمجھے یہ کر بھی گزرتا ہے۔

”کپتان براں باؤنڈ کا انتقام“ میں شانے انتقام کے جذبے کے رومانوی طبع کو دور کر کے اس کی بدنمانی اور مضرت دکھائی ہے۔ براں باؤنڈ اپنے خلیک رشتہ دارنچ کے خلاف جس نے اس کے خیال میں اس کی ماں کے ساتھ ظلم کیا تھا، انتقام کا جذبہ دل میں لئے

ہوئے ڈاکو بن گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ماں اپنی بدکرداری کے سبب اسی برتاؤ کی مستحق تھی۔ اتفاق سے وہ بیچ افریقہ کے صحرائیں براس باؤنڈ کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، مگر اس کی بہن لیڈی سسکی کی ہمت و اہمندی اور سبکدستی کی بدولت اس کی جان بچتی ہے وہ بہ لطائف الحیل براس باؤنڈ کو روکتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ اسے بچے و اطفال سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کا علم انتقام ٹوٹ جاتا ہے، آنکھیں کھول کر زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگتا ہے۔ تیسرا نامک جولیس سیرز اس دور کا سب سے اہم ڈراما ہے اور شاکی بہترین تصانیف میں اس کا شمار ہے۔ جولیس سیرز کا کیرکٹر گویا شا کے آئیڈیل ہیرو کی تصویر ہے۔ اس میں ذہانت، مکتہ سنجی، معاملہ فہمی، ظرافت وغیرہ ذہنی خوبیوں کے علاوہ وہ اخلاقی صفات بھی موجود ہیں جو شا کے نزدیک ایک قائد اور فاتح کے لئے ضروری ہیں۔ الوالعزمی، حوصلہ مندی، ہمت، استقلال انہیں صفات کی بدولت وہ دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کے مزاج میں اس کے طرز زندگی میں اس کی گفتگو میں انتہائی سادگی ہے، تکلف یا بناوٹ کا نام تک نہیں۔ اس کے رعب و داب اور اس کے اثر و نفوذ کا راز محض اس شخصیت میں نہیں ہے وہ اپنی طبیعت پر پورا قابو رکھتا ہے اور عارضی جذبات کے جوش میں اپنے مستقل مقاصد کو نہیں بھولتا۔ وہ ضرورت کے وقت حکمت عملی اور دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتا ہے لیکن بدعہدی یا بیوفانی کبھی نہیں کرتا۔ اپنوں اور غیروں کے بڑے سے بڑے قصور کو غفلت سے دیتا ہے لیکن اس کی وجہ رحم و مروت نہیں بلکہ تدبیر اور مصلحت اندیشی اپنے وفادار رفیقوں کی بڑی قدر کرتا ہے لیکن کسی سے اس کو اتنا تعلق خاطر نہیں ہے دوستی کہہ سکیں۔ اس کی زندگی مافوق الافراد مقاصد کے لئے وقف ہے۔ ذاتی محبت اور عداوت کی نہ وہ صلاحیت رکھتا ہے نہ فرصت۔

”یجر باربرا“ اور ”جان بل کا دوسرا جزیرہ“ میں یہ قیمری تنقید اور بھی صاف نظر آتی ہے۔ ”یجر باربرا“ میں شائے مذہبی احساس اور جذبہ خدمت کی قدر و قیمت سے بحث کی ہے۔ باربرا ایک لکھوتی انڈر شیفٹ کی بیٹی ہے جو دینداری اور انسانی ہمدردی کے

جوش میں مکتی فوج میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسکا باپ بہت سے کارخانوں کا مالک ہے اور اپنوں کا رو بار کو جدید ترین طریقے پر نہایت خوش اسلوبی سے چلاتا ہے اس کے یہاں مردوں کو معقول اجرت ملتی ہے انکے لئے حفظانِ صحت، تعلیم و تربیت، سیر و تفریح کا بہت معقول انتظام ہے۔

باربر اپنے باپ کو غاصب، جابر، بے دین اور اُس کے روپے کو ناپاک سمجھتی ہے۔ اسکا عقیدہ ہے کہ یہ دولت مند سرمایہ دار دنیا کو ہلاکت کی طرف لے جا رہے ہیں اور اس کی نجات صرف مکتی فوج کی تحریک ہو سکتی ہے۔ وہ اس تحریک میں نہایت خلوص اور سرگرمی سے کام کرتی ہے اور سچی ہمدردی، دلسوزی، پاک نفسی کی بدولت بہت سے بد نصیب لوگوں کی جو جرم و انطاس میں مبتلا ہیں بڑی حد تک اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن اسکی جماعت کو مالی امداد کے لئے اس کے باپ کے آگے ہاتھ پھیلا نا پڑتا ہے جس کے صدمے سے اسکا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ شا اس ڈرامے میں مذہبی تحریکوں کے خلوص کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کے خیال میں جدید زمانے میں دنیا کی نجات غریبوں کی بھولی بھالی دینداری اور ایثار سے نہیں ہو سکتی بلکہ فرض شناس امیروں کی تنظیم اور تدبیر سے۔

”جان بل کا دوسرا جزیرہ“ میں بھی شانے مغربی تمدن کے دور جدید کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ اس میں شانے ترقی پذیر انگلستان اور جمہور میں مبتلا آئرستان کا مقابلہ کر کے یہ دکھایا ہے کہ جو قوم زمانے کو نہیں پہچانتی اور اس کے ساتھ نہیں چلتی وہ ہمیشہ مغلوب رہے گی۔ شا کے نزدیک آئرستان والے انگریزوں سے زیادہ گہرا تحلیل رکھتی ہیں۔ ان سے زیادہ سمجھدار اور ذہین ہیں لیکن زمانے کی رفتار سے نا آشنا ہیں، اس لئے میدانِ عمل میں دست پاچہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ انگریز ان سے ذہنی اوصاف میں کم ہیں لیکن انہوں نے اپنے زمانے کی روح کو جذب کر لیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انکی یہ کم نظری اور کم فہمی انکے حق میں نعمت ہے کیونکہ اسی کی بدولت وہ بغیر کسی خاص کوشش کے اور بغیر محسوس کئے ہوئے روحِ زمانہ کے آکر کاربن ٹھکے ہیں۔ زمانے کا رجحان افادیت، صنعت و حرفت، شہری

زندگی، بشر کہ کار و بار کی طرف ہے۔ آری ستانیوں کو بھی تک ان چیزوں سے مناسبت نہیں پیدا ہوئی، اگر بڑے مدتوں پہلے اپنی طبیعت کو ان کے مطابق بنا چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ آرتھان پر حاوی ہیں۔

## مستقل فلسفہ حیات کی تشکیل

اب تک بزارڈ شا کے پیش نظر کوئی مکمل اور مربوط نظریہ زندگی نہیں تھا اسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی جسے وہ زندگی کی بنیاد اور اس کی کنجی قرار دے سکے مگر اس کا عقیدہ تھا کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ ہر دو پچھلے دور سے بہتر ہے جس کی بڑی علامت یہ ہے کہ زندگی سے جذبات و تخیلات کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور عقل کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ اصنام خیالی کی پرستش چھوڑنے سے انسان کی قوت مشاہدہ آزادی سے نشوونما پا رہی ہے اس کی آنکھوں سے محاباٹ اٹھ رہے ہیں اور وہ زندگی کی حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے لگا ہے لیکن جب اس نے یونانی ادب اور فلسفہ خصوصاً افلاطون کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں ڈھائی ہزار برس پہلے ایک قوم موجود تھی جو خیال آزادی اور نظر کی گہرائی اور وسعت میں آج کل لوگوں سے پیچھے نہ تھی اس سے وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوا کہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے دنیا نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے لیکن اس کے اس عقیدے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ انسانی زندگی میں ترقی کی صلاحیت اور قوت وجود ہے۔ اس قوت کے فعل میں نہ آنے کا سبب اس نے یہ قرار دیا کہ انسان اب تک زندگی کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور عقل ارتقار میں مدد دینے کے بجائے اس میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔ اس کا تصور کائنات ایک حد تک شوپن ہاؤیر کے فلسفے سے ماخوذ ہے۔

شوپن ہاؤیر کے نزدیک ہماری زندگی اور ہماری دنیا کی اصل "ارادہ للحمیات ہے" یہ ایک رند ہی قوت ہے جس نے اپنے اظہار کے لئے بے سنی گورکھ و مندانا بنا رکھا۔ انسان کی

نجات اس میں ہے کہ زندگی کو مٹا کر اس جابر قوت کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ نشانے اس عالمگیر قوت کا نام قوت حیات رکھا ہے۔ اس کے خیال میں یہ قوت شعور اور احساس سے خالی ہے مگر اندھی نہیں ہے کیونکہ اس کا رخ ایک اعلیٰ مقصد کی طرف ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسی نسل پیدا کرے جو نسل انسانی سے بہتر اور برتر ہو۔ یہی نیٹے کا مافوق البشر کا نصب العین ہے۔ شا کے نزدیک یہ قوت عورت میں ظاہر ہوتی ہے وہ اپنے لئے ایسا مرد ڈھونڈتی ہے جو اس سے جسمانی اور روحانی مناسبت رکھتا ہو۔ یہ انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی پر آئندہ نسل کی صورت اور سیرت کا انحصار ہے۔

”بشر اور مافوق البشر“ میں نشانے میٹر اور این کا قصہ سن کر اس نظرے کی تشریح کی ہے۔ یہ اس کا سب سے مشہور ڈرامہ اور بعض لوگوں کے نزدیک اس نے اس میں اپنا سارا کمال پیش کر دیا ہے۔

اپنے فلسفہ حیات کے بنیادی اصول کو معین کر لے کے بعد نشانے اس کے ماتحت زندگی کے جزوی مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کے اخلاقی نظریے میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی۔ پہلے وہ اخلاق کا مقصد اور معیار فرد کی شخصی فلاح کو تسلیم دیتا تھا مگر ایک مافوق الافراد قوت کا قائل ہو جانے کے بعد وہ ان مسائل کو بہت وسیع زاویہ نظر سے دیکھنے لگا۔ شادی کی بات چیت ”میں جو محض نام کے لئے ڈراما دور نہ اہل میں ایک بکا لہ ہے اس نے شادی کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ نکاح کے مروجہ طریقے کی مخالفت اور موافقت میں بہت سی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ عورت اور مرد کے تعلق کی متعدد صورتیں ہیں مگر کوئی بھی وسیع اجتماعی نقطہ نظر کو قابل قبول نہیں ٹھہرتی۔ آخر فیصلہ ہوتا ہے کہ پرانے طریقے میں تبدیلی کرنا سہل نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر سٹون کی حیرانی“ کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شا اس دور میں اپنے اخلاقی اصول میں افلاطون کی طرح بہت سخت گیر ہو گیا ہے۔ وہ سماج کی مجموعی فلاح کے گرو افراد کی زندگی قربان کرنے کو تیار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک یوٹیلن اور بہضال آرٹسٹ جو اپنے



فن میں کمال رکھا، ایک جہلک بیارہی میں مبتلا ہے اس کے جاں برہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ ڈاکٹر غیر معمولی توجہ اور ہستام سے علاج کریں لیکن ڈاکٹروں میں اس معاملے میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کے نزدیک مریض کو اچھا کرنے کی انتہائی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ اس کے کمال فن سے سماج کو فائدہ پہنچے گا۔ بعض کے نزدیک اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اسکی زندگی اخلاقی حیثیت سے دوسروں کیلئے مضر ہوگی۔ دونوں فریق فرد کی زندگی کی قدر قیمت محض سماج کی نسبت سے معین کرتے ہیں اور دونوں اس پر متفق ہیں کہ طبیب کا کام محض مریض کا علاج کرنا نہیں ہے بلکہ اس علاج کے اخلاقی نتائج کا بھی وہ ذمہ دار ہے۔ ان دونوں چیزوں میں اخلاطوں کا انحراف ظاہر ہے۔

”بشر اور مافوق البشر“ میں شائے ”ما فوق البشر“ کا جو تصور قائم کیا تھا اسکا پورا خاکہ اس نے ”رجوع بر میتوسلا“ میں کھینچا ہے۔ مافوق البشر کا تدریجی ارتقا اس طرح ہوتا ہے کہ قوت حیات بعض لوگوں کو منتخب کر کے ان کی عمر بڑھاتی ہے۔ پہلے لوگوں کی عمر تین سو سال کی ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ ہزاروں سال تک نوبت پہنچتی ہے۔ اسکا علم اور تجربہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی عقل اور تدبیر میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ان پر کائنات کے بھید جن کے سمجھنے سے ہمارے عقل عاجز ہے کھل جاتے ہیں انکے ہاتھوں سے زندگی کی گتھیاں جن کا سلجھانا ہمارے نزدیک ناممکن ہے سمجھتی جاتی ہیں۔

اس دور کا آخری ڈراما سینٹ جون ہے اس میں شائے مذہبیت کے جذبات اور الہام کی حقیقت سے بحث کی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ بچپن ہی میں نہ صرف مذہب عیسوی کا بلکہ مطلق مذہب کا مخالف ہو گیا تھا۔ اس میں کچھ تو اس کے ذاتی تلخ تجربات کو دخل تھا کچھ زمانے کی ہوا کو۔ صنعتی انقلاب سے تمدنی زندگی میں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں بہت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں اضطراب، بے چینی، غور اور شک کا مادہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ خاص ہے ایسی آہ ہو میں فلسفہ اور مذہب دونوں کا نپنا بہت مشکل تھا۔

بزرگداشت ان لوگوں میں سے ہے جو خیالات کے دریا میں دھارے کے ساتھ بہنے پر

تفانت نہیں کرتے بلکہ تیر کر کنا سے پر جانا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شک اور نفی میں الجھنے کے بعد اس نے زندگی اور کائنات کے بنیادی مسائل کا ایک عقلی حل تلاش کر لیا۔ لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محض عقل کی الجھن دور ہونے سے کام نہیں چلتا۔ انسان کی فطرت جس چیز کے لئے سب سے زیادہ تڑپتی ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت کائنات سے روحانی اتحاد کا رشتہ قائم کرے اور اپنی زندگی کو اس کے منشاء کا پابند بنا دے۔ اس معاملے میں اسے عقل سے کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ وہ تو کائنات کا محض ایک بیجان معنوی تصور قائم کرتی ہے جس سے انسان کو کسی گہرے روحانی اتحاد کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ جس کے قوانین کی پابندی پر کوئی اندرونی تحریک اسے نہیں ابھارتی۔ یہاں اس کی ضرورت ہے کہ انسان باطنی مشاہدے اور وجدان سے کام لے کر حیات و کائنات کا صرف علم نہیں بلکہ عرفان حاصل کرے۔ یعنی اس میں اس طرح ڈوب جائے کہ اسے سرخپہ حقیقت سے یگانگتی کا احساس ہونے لگے اور اس کے قوانین خود اپنی فطرت کے قوانین معلوم ہونے لگیں۔ یہ انسان کی ذہنی نشوونما کی آخری سیڑھی ہے اور اسی کو مذہبیت کہتے ہیں۔ یہ جہی ہو سکتا ہے کہ انسان کے خیال اور عمل اس کے ارادے اور جذبات میں ہم آہنگی ہو یعنی اسکی سیرت میں وحدت پیدا ہو چکی ہو۔ جب بڑا رڈ شاہد بے نفس کی اس منزل کو گذر چکا تو وہ خود بخود مذہبیت کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ نوعمری کی خامکاری میں اس نے مذہب کو بے حقیقت سمجھ کر دھک دیا تھا زندگی کے گہرے مشاہدے کے بعد سب سے بڑی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ سینٹ جون میں اسی کا اعتراف ہے لیکن مذہب کے متعلق دو نقطہ نظر ہو سکتے ہیں جو بظاہر بالکل متضاد ہیں ایک کی رو سے حقیقت اور قدرت کا سرخپہ جسے خدا کہتے ہیں، زمان و مکان کی سرحد سے باہر ہے۔ انسان خود اپنی مخصوص کوشش سے اسکا عرفان حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی طرف سے بعض مخصوص بندوں پر وحی آتی ہے اور بعض کو الہام ہوتا ہے جس سے انسانوں پر حیات و کائنات کے آخری پسیدہ کھلتے ہیں انہیں ان کی زندگی کا مقصد اور اس کے حاصل کرنے کے ذرائع بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے کی رو سے خدا اسی زمان و مکان میں موجود ہے اور انسان باطنی مشاہدے

اور وجدان کی بدولت بغیر کسی خارجی تحریک کے اس کی اور اسکے قوانین کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ پہلے کو لاہوتی مذہب کہتے ہیں وہ سکھ کو ناموتی۔ بزار و کشا و ائمہ مال کے اکثر پرنسٹنٹ لوگوں کی طرح اسی ناموتی مذہب کا قائل ہے اسی نقطہ سے اُس نے جون کی مذہبیت کا مطالعہ کیا ہے جون کو جو ندانیں سنائی دیتی تھیں وہ خدا کا پیغام سمجھتی ہے جو اسے اولیا۔ اللہ کی زبانی پہنچا ہے۔ بزار و کشا کے نزدیک یہ ندائیں خود جون کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک جاہل دیہاتی بھولی بھالی لڑکی ہے مگر اس میں غیر معمولی روحانی قوت ہے وہ رُوح کائنات کا بلا واسطہ مشاہدہ کرتی ہے لیکن چونکہ اس نے قدیم ہندو سہی روایات کی فضا میں پرورش پائی ہے، اس کے دل میں اولیا۔ اللہ اور انکی کرامتوں کا خیال بسا ہوا ہے اور وہ اپنی واردات قلب کو ولیوں کی طرف منسوب کرتی ہے۔ وہ مذہب کے ایک نئے تخیل کی علم بردار ہے جو تیرہویں صدی میں پیدا ہو چلا تھا اور جس سے رومی کلیسا کو سخت خطرہ تھا۔ کینتھولک مذہب کی رو سے کلیسا خلافت الہی کا وارث اور دینی اور دنیاوی حکومت کا حامل تھا۔ بندہ بلا واسطہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسے چاہئے کہ کلیسا کے آگے تسلیم خم کرے۔ اس کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور اس کے احکام کو قانون الہی سمجھ۔ جون اس اصول کی منکر ہے۔ اسکا یہ دعوئے کہ اس کے پاس خدا کا پیام اولیا۔ کی زبانی آتا ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کلیسا کے واسطے کی ضرورت نہیں۔ یہ کلیسا کی دینی حکومت سے بغاوت ہے۔ پھر اسکا یہ کہنا کہ خدا نے اسے انگریزوں کو فرانس سے بحال مینے پر مامور کیا ہے کیونکہ اس کی یہ مرضی نہیں کہ کسی ملک پر غیر ملک کے لوگ حکومت کریں کلیسا کے لئے ایک اور خطرہ کا پیش خیمہ ہے کیونکہ اس میں قومیت کا خیال مضمر ہے یعنی یہ کہ ہر ملک کے رہنے والے ایک روحانی اتحاد رکھتے اور ان کا حاکم صرف ان کا ہم قوم ہو سکتا ہے۔ یہ کلیسا کی دنیاوی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ جون کو خود اسکا احساس نہیں مگر کلیسا والے اسے خوب سمجھتے ہیں۔ انہیں کی کوششوں سے وہ جادوگری کے الزام میں انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر اسی الزام میں جیلادی جاتی

ہے۔

غرض ہزار ڈشاکے نزدیک جون لوہر کی پیشرو اور پروٹسٹنٹ مذہب کی ہر اول ہے۔ اس کا فیصلہ کہ اس نے جون کی جو تصویر پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا ان لوگوں کا کام ہے نہیں پندرہویں صدی کی تاریخ پر پورا عبور ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہزار ڈشاکے کی تصویر اور پروٹسٹنٹ مذہبوں کی بنیادی فرق کو اور اس انقلاب کو جو تیرہویں صدی میں رونما ہوا تھا۔ خوب دکھایا ہے۔ اس نے دونوں میں سے کسی ایک کو صاف الفاظ میں دوسرے پر ترجیح نہیں دی ہے۔ اس کے انداز تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود پروٹسٹنٹ مذہب کا پیروں ہے اور اسے روحانی ارتقاء کا بلند ترین سمجھتا ہے۔ البتہ اس کا عقیدہ عام پروٹسٹنٹ عقیدے سے اس بارے میں مختلف ہے کہ وہ خدا کو دنیا کے باہر نہیں بلکہ دنیا کے اندر مانتا ہے۔

ثانی اس بات میں قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے عام تمدن کا بھی مقابلہ کیا ہے۔ کسی زمانے میں وہ اس کا قائل تھا کہ ہر نیا دور تمدن کو ترقی کے بلند ترین پیمانے پر پہنچا دیتا ہے لیکن اب اس کے خیالات میں اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ وہ قرون وسطیٰ کو ایک حد تک عہد جدید پر ترجیح دیتا ہے۔ خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں زندگی کا ایک مکمل اور مرتب نظام موجود تھا جو آج کل مفقود ہے۔ عہد جدید کی بنیاد اس کے خیال میں قرون وسطیٰ کی بنیاد سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہے لیکن اس بنیاد پر جو عمارت بن رہی ہے وہ ابھی تک ناقص اور ناتمام ہے۔

ہزار ڈشاکے عذاب ۷۲ برس کی ہو چکی ہے اس کی شہرت عالمگیر ہے۔ اس کی نصیحت مقبول عام ہیں۔ جس سیاسی اور سماجی تحریک کا وہ علمبردار تھا آج انگلستان میں گرم بازاری ہے جس جماعت کا وہ رفیق تھا وہ آج برسرِ حکومت ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کی ناکامیوں

کے بعد اس کامیابی کو غنیمت سمجھتا۔ نصف صدی کی محنت شاقہ کے بعد آرام کا لطف اٹھاتا۔ لیکن برنارڈ شا کو سکون و اطمینان سے کیا غرض۔ آرام سے واسطہ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ہم خیالوں کو جتنی کامیابی ہوئی ہے وہ محض ابتدائی ہے۔ زندگی کی بڑی گتھیاں ابھی ب سلجھنے کو باقی ہیں۔ وہ بدستور سرگرمی سے اپنے کام میں مشغول ہے یعنی زندگی کو طنز و ظرافت کی ہمیز سے چھیڑ رہا ہے اور تنقید کی آگیں ہاتھ میں لئے اسے ترقی کی سیدھی راہ پر چلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

## پردہ غفلت

از ڈاکٹر میدعا بدین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی  
ڈاکٹر صاحب یہ ڈراما لکھ کر ایک سلمان زمیندار خاندان کی معاشرت کی سچی تصویر پیش کی ہے اور تعلیم نسوان اور آزادی نسوان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ڈرامے میں ایک مزاحیہ کیرکٹر بھی ہے کتاب فن ڈراما نویسی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان نہایت سستہ اور پاکیزہ ہے۔ اور ادبی خوبوں سے مالا مال۔ مطبع شرکت کاویانی (برلن) میں چھپی ہے حجم ۱۲۶ صفحے قیمت صرف پندرہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے طلب فرمائے۔

# مذہب اشتراک کے بانی

رسالہ جامعہ کی کسی پچھلی اشاعت میں ہم نے اس جماعتی ماحول پر نظر ڈالی تھی جس میں مذہب اشتراک نے نشوونما پائی اور ان تخیلات و نظریات کی طرف اشارہ کیا تھا جن سے اسے ذہنی غذا حاصل ہوئی۔ یہ ماحول نہ ہوتا اور یہ نظر سے نہ ہوتے تو غالباً مذہب اشتراک بھی پیدا نہ ہوتا۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ ان نظریوں کا اثر اور اس ماحول کا رد عمل اشتراک کے علاوہ کسی اور شکل میں رونما ہوتا۔ اس نے جو اشتراکیت ہی کی شکل اختیار کی اس کی وجہ وہ شخصیتیں ہیں اور ان شخصیتوں کی نفسی کیفیات جو اس ذہنی و جماعتی ماحول سے متاثر ہوئیں، یعنی با نیاں مذہب اشتراک کی شخصیتیں۔ نتائج تاریخی کے لئے ماحول اور شخصیت کی اعتباری اہمیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے۔ کچھ لوگ تاریخ کو تاثر حالات گرد و پیش کا بیگانہ کی نتیجہ تصور کرتے ہیں، کچھ اسے بالکل بڑی شخصیتوں کی کارگزاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ فلسفہ تاریخ کے اس دشوار مسئلہ کے متعلق بحث کرنا یہاں مقصود نہیں۔ صرف اس لئے اس طرف اشارہ کیا گیا کہ ہماری رائے میں مذہب اشتراک کے فہم کے لئے اس کے بانیوں کی نفسی کیفیت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ماحول جماعتی و ذہنی کی تشریح اس کے لئے کافی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اشتراکیت جدید کی ذہنیت دراصل مارکس کی ذہنیت ہے۔ اس لئے اگر مارکس کی ذہنی و نفسی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس مذہب کی بہت سی خصوصیات کے بچنے میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن مذہب اشتراک کے مورخ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ مارکس اور اس کے رفیق مائیکلس کے خیالات کا اہم ترین حصہ خود انکی اختراع نہیں بلکہ ان سے پہلے اشتراک کی مصنفوں کی تحریروں میں تقریباً وہ سب اصول ملتے ہیں جو عام طور پر مارکس اور مائیکلس کے ساتھ مخصوص کئے جانے لگے ہیں۔ اشتراکیت کے فہم کے لئے ان انگلوں کی کیفیت نفسی کو بھی

پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ س گروہ اولین میں وہ انگریز، فرانسیسی، اور جرمن اشتراکی ہیں جنہوں نے مشعلہ اور مشعلہ کے درمیان اپنی تصانیف مرتب کیں۔ مشعلہ میں اشتراکیت کے ارتقاء ذہنی میں گویا تخم ریزی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سال کے بعد سے آج تک اس مذہب میں کسی اہم نیا کوی خیال کا اضافہ نہیں ہوا۔ اس ابتدائی زمانہ کے لوگوں میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ فرانسیسی مورخ نے مشعلہ میں اپنی اصولی کتاب ”آئین نظریہ“ لکھی۔

۲۔ انگریز کادروں نے مشعلہ میں ”عدل سیاسی“ کے نام سے ایک مرکزہ الا کتاب شائع کی۔

۳۔ فرانسیسی چارلس فوسے نے ”نظریہ حرکات اربعہ“ مشعلہ میں شائع کی۔

۴۔ رابرٹ اوون (انگریز) نے مشعلہ میں ”جماعت کا نیا نظریہ“ پیش کیا۔ اور مشعلہ میں ”نئے عالم اخلاقی“ پر ایک کتاب لکھی۔

۵۔ فرانسیسی سین سیوں نے مشعلہ میں نئی صنعتی دنیا کے نام سے اپنی کتاب چھاپی۔

۶۔ مشعلہ میں انگریز دلیم ہاسن نے ”تقسیم دولت“ کے اصول پر بحث کی۔ اس کے بعد فرانس میں اس قسم کے مضامین پر اور کتابیں بھی نکلتی رہیں۔

مشعلہ کے بعد جن مصنفوں نے اس موضوع پر تسلیم اٹھایا ہے ان کی تحسیریں نیا واضح لیکن ذرا زیادہ تلخ و درشت بھی ہیں۔ ان میں خاص طور پر مستحق توجہ یہ ہیں۔

۱۔ لوی آبلان جس نے مشعلہ میں ”تنظیم محنت“ کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔

۲۔ پرودھان نے ”ملکیت“ کے مسئلہ پر بحث کی اور اسے سر قو سے تعبیر کیا۔

۳۔ ڈاکٹر لنگ نے ”حریت اور ہم آہنگی کی ضمانتوں“ کے نام سے جرمن میں اپنی کتاب

شائع کی

انکے علاوہ موسی ہس، دیسمی، کلبے، لیرو وغیرہم نے بھی کتابیں لکھیں۔ انہیں لوگوں

کے کام پر مارکس اور انگلس کے ابتدائی تصانیف بنی ہیں۔ چند تنقیدی کتابوں کے بعد ان دونوں نے وہ ”اعلان اشتراک“ لکھا جس پر کل مذہب اشتراک جدید کی بنیاد ہے۔ اور یہی ہے کہ مارکس اور انگلس کا بعد تصانیفی کام خود اسی اعلان کی تفسیر و توضیح پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد سے انہیں دو آدمیوں کی ذہنیت اس مذہب سے متعلق ہر تحریک میں کارفرما ہے۔ انہیں کے تابعین میں ولیم لیب کنٹش، بیکروٹیکن وغیرہ ہیں۔ متبع تابعین میں کاروسکی، بیٹل، پانچانو، ہانڈمین، وغیرہم اور متاخرین میں کچھ تو اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم میں ترمیم کے طالب ہیں یعنی بنی بنی نشان، کوٹو، فائڈرولڈ، کول، ہابسن، آڈلر وغیرہ، کچھ تعلیم قدیم کو قائم رکھنے پر مصر ہیں جیسے روزالکسبرگ، کارل لیب کنٹش، لینن، ٹروتسکی، راؤٹ، ہجارتین۔

ناموں کی یہ فہرست خاصی طویل ہو گئی۔ اور پھر بھی اس میں بہت سے نام نہیں آئے اب اس مضمون کا جو مقصد ہے یعنی بانیان مذہب اشتراک کی کیفیات ذہنی کا ایک مختصر خاکہ ناظرین کے سامنے رکھنا، اگر وہ اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ ان سب اشخاص کے حالات ذہنی کو ملحدہ ملحدہ۔ مختصر طور پر ہی سہی پیش کیا جائے تو اس کے لئے تو ایک خاصی ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ اور اگر کہیں ان سب کے سوانح حیات تفصیلی گفتگو کی نوبت آئے تو تو ایک سلسلہ کتب کی ضرورت ہے۔ اس وقت اس پر نہ راقم آمادہ ہے، نہ ناظرین راضی ہوں گے۔ اس دشواری سے بچنے کی کیا کوئی راہ نہیں؟ غالباً ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی شخصیت کو قابل فہم بنانے کے لئے سوانح نگاری اور ترجمہ کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی وہ شخصیت جس گروہ سے تعلق رکھتی ہو اس گروہ کی ذہنی کیفیات کو سمجھا جائے۔ اس کے مشترک نفسی حالات پر نظر ڈالی جائے اور اس سے افراد کے سمجھنے میں مدد لی جائے۔

اس طریقہ پر کاربند ہو کر ہم بھی بانیان مذہب اشتراک کی ذہنی کیفیات کو سمجھنے کے لئے ترجمہ اور سوانح نگاری کی راہ چھوڑ کر یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ نظر بین مذہب کو درملی لوگوں کو



اس وقت نظر انداز کرتے ہیں) ایک گمراہ تسلیم کر کے انکی مشترک مذہبی کیفیات کا چہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہوا تو شاید اس چھوٹے سے مضمون میں ان بہت سے لوگوں کے متعلق جن میں سے بعض کے نام اوپر گزر چکے ہیں کچھ نفسیاتی بصیرت حاصل ہو سکے۔ یہ عام نفسیاتی تبصرہ بڑی حد تک اپنے استناد پر فیسر زو مبارٹ المانی کی سرکرتہ الار کتاب "پروٹاری اشتراک" اور اسی موضوع پر انکے چند المانی پر مبنی ہے۔

اگر ہم انسانوں کو دو قسموں پر تقسیم کریں تو ان میں ایک گروہ تو انکا ہو گا جنہیں ہم قدرتی آدمی کہہ سکتے ہیں، دوسرا انکا جنہیں مصنوعی آدمی کہنا چاہئے۔ قدرتی آدمی وہ جن کا تعلق فطرت سے عضوی ہوتا ہے، مصنوعی وہ جن کا رشتہ اس سے میکانیکی ہوتا ہے۔ وہ حیلت اور جذبات والے آدمی ہوتے ہیں، یہ عقل اور ادراک والے، وہ دنیا میں رہتے ہیں، یہ دنیا کے خلاف، وہ اپنے ماحول میں گھل مل جاتے ہیں۔ ان میں ہر دم اس سے کچھ تناؤ سا رہتا ہے، وہ ہر حال میں گمن رہتے ہیں، ادویہ ہر وقت ذہنی کشاکش کا شکار، وہ اپنے پیروں سے چلتے ہیں اور یہ سر کے بل، کائنات سے انکا تعلق قریب کا ہوتا ہے، انکا بعد کا، انہیں ہر جگہ ہر طرف حل ملتے ہیں انہیں زرے سے ملے، وہ ہم آہنگ ہوتے ہیں، یہ بے آہنگ، وہ انسداد سے تعلق رکھتے ہیں یہ جنس سے، انہیں انسانوں کی نگر ہوتی ہے، انہیں انسانیت کی، وہ علمی ہوتے ہیں یا فطری۔ وہ بڑی چیزوں میں سمجھوتے کر لیتے ہیں، یہ ذرا ذرا سے اصولوں پر لڑھکتے ہیں۔ وہ سیاسی ہوتے ہیں، یہ غیر سیاسی۔

غیب بات یہ ہے کہ رابرٹ اوڈن اور انجمنس کے علاوہ، کہ پہلا اپنے انسان دوستی کے کاروبار میں تجربوں کے سلسلے میں اس گروہ میں آن ملا اور دوسرا محض مارکس کی دوستی کی وجہ سے باقی سب کے سب بائیان اشتراک جدید انسانوں کے اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے یعنی سب کے سب مصنوعی انسان تھے۔

لیکن اس تقسیم سے بنیان اشتراک کی شخصیتوں کی پوری پوری تشریح نہیں ہوتی بعضی انسانوں کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض کا رجحان طبع انفرادی ہوتا ہے، بعض کا اجتماعی کسی تصور کی اتباع میں حقیقت سے دونوں نیرا ہوتے ہیں لیکن ایک کی بیزاری اسے حقیقت سے الگ کر کے خود اپنی انفرادی شخصیت میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ دوسری کی بیزاری اس سے دوچار ہونے اور اس میں تغیر پیدا کرنے کی محرک ہوتی ہے۔ ایک کے نزدیک زندگی کی قدروں میں شخصی قدریں افضل ہوتی ہیں، دوسرے کی نظر میں جماعتی قدریں مایکے نیا سے بچتا اور اس سے بھاگتا ہے، دوسرا اپنا دامن اس سے چھڑا سکتا ہے نہ چھڑانا چاہتا ہے۔ ایک فلسفیانہ تخیلات اور مذہبی دار و ادا کی پرامن و سکون فضا میں محو فکر رہتا ہے، دوسرا ماحول سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار انقلابی سرشتگی اور پریشانی سے کرتا ہے۔ یہ جماعتی رجحان والا آدمی اگر مصنوعی انسان بھی ہو تو پھر یہ جماعت کی کسی مخصوص برائی کے کراس کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتا بلکہ جیثیت عام ظلم، اور نا انصافی سے برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ اور اپنے اس جذبے میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ سوائے جماعتی نظام کو بنیادی طور پر بدلنے کی کوشش کے کوئی دوسری چیز اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ بنیان اشتراک سب کے سب مصنوعی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اجتماعی رجحان بھی رکھتے تھے۔

’مصنوعی اور اجتماعی‘ سیلانات کے علاوہ ان بنیان اشتراک میں ایک اور چیز بھی مشترک تھی جس نے ان سب کو موجودہ نظام جماعت کی ہر چیز اس کے ہر الادے سے بیزار کر دیا تھا اور ان میں وہ منفی انکار کی کیفیت پیدا کر دی تھی جو ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ چیز کیا تھی؟ ایک سی قیمت، ایک سی تقدیر! کیا یہ ممکن ہے؟ بنیان اشتراک کے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالئے تو یہ بات ناممکن ہی معلوم ہوتی ہے۔ ان میں مختلف حیثیت کے لوگ ہیں، ان میں اگر رئیس زادے ہیں جیسے سین سیمول اور باکو مین تو متوسط الحال بھی

ہیں، جیسے ہنس، لاسال، کلبے، لوی بلاں، وائلنگ جیسے دستکار ہیں تو لیرہ اور پرو دھان جیسے غلّے وٹاوار بھی! انکا ماحول، انکی زندگی ایسی مختلف، اور سب کی ایک سی قیمت، ایک سی تقدیر! بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ یوں ہی ہے۔ یہ سب کے سب ایک نہایت اہم حیثیت میں ایک سے ہیں اور وہ یہ کہ تمام کے تمام اپنی زندگیوں میں ناکام و نامراد انسان ہیں۔

ان میں سے بعض تو پیدائش ہی سے کچھ ذات باہر سے تھے۔ مثلاً غریب وائلنگ کہ ماں باپ میں باضابطہ رشتہ مناکحت نہ ہونے کے باعث اپنے ہم چشموں میں ذلیل و خوار تھا۔ یا ہنس مارکس لاسال یہودی ہونے کی وجہ سے کبھی اپنے جماعتی ماحول کے ساتھ شیر و شکر نہ ہو سکتے تھے اور ان پر برابر حقارت کی نظریں پڑتی تھیں۔ اکثر کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ورنہ غالباً بچپن کے خانہ داری حالات ہی میں بہتوں کی پریشانیوں اور ناکامیوں کے اسباب مل جاتے۔ مارکس کے متعلق معلوم ہے کہ لڑکپن برابر باپ سے جھگڑے مٹنے میں کٹا۔ لوی بلاں کا باپ سنہ ۱۸۴۷ء کے انقلاب میں بالکل غلّے ہو گیا، سین بیوں اچھا خاصہ مالدار آدمی تھا لیکن اس طرف سے ناداری کا منہ دکھایا۔ فورس نے ۲۱ سال کی عمر میں شہر کے ساری جائیداد ختم کر دی۔ پرو دھان کے مطبع کا دیوالیہ بھلا، کلبے کا سرسیکا کا گورنر تھا اپنا عہدہ کھو بیٹھا، مارکس تعلیمی صیغہ میں ملازمت چاہتا تھا نہ مل سکی، لاسال، بالکینا، ہنس نے اپنے اپنے پیشوں کو خیر باد کہا اور ہجران سب نے کیا کیا؟ اکثر نے وہی جو اس زمانے میں سب ناکام و نامراد لوگ کرتے تھے یعنی صیغہ بھکاری تصنیف و تالیف! پرو دھان، ہنس مارکس، بلاں، لیرہ، وٹاوار، کلبے، سب اخبار نویس اور مصنف بن گئے! بعضوں نے کچھ اور چھوٹا موٹا کام کر کے زندگی کے دن گڈاے۔ ریس زادہ سین بیوں نقل نویس بنا اور فورس نے دلالی کا پیشہ اختیار کیا۔ غرض ان غریبوں نے اپنے ساتھیوں، ہم چشموں سے الگ ہی اپنی زندگی گزاری وطن میں بھی رہے تو ہمارے سر کی طرح اور جب وطن چھوڑ کر گئے یا بھلے گئے تو ہمارے ہی غرض اپنے زمانے کی سوسائٹی سے باہر رہے اور اپنے مصنوعی جماعتی رجحانات کے باعث اس کے مخالف۔

ان لوگوں کے "تضع" انکے جماعتی رجحانات، ان کی ناکامی و نامرادی کو پیش نظر رکھتے تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ کیوں اس پر مجبور تھے کہ دنیا کے ساتھ انکار شدہ منفی اور انکاری ہو۔ اس منفی تعلق اور ناکامی کی الجھنوں کا لازمی اور سب سے پہلا نتیجہ تنقید و نکتہ چینی ہے مختلف اشخاص کی طبائع اور انکی صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ نکتہ چینی مختلف ٹیکسٹس اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں یہ جنون تخریب کی شکل اختیار کرتی ہے کہ جو سامنے آئے اسے توڑ ڈالو، گرا دو، جماعتی اور تمدنی زندگی کی کوئی عمارت کھڑی نہ رہنے پائے، سب کچھ ڈھا دو۔ اس کی سب سے نمایاں مثال باکونین ہے لیکن مارکس اور دوسرے بانیان مذہب اشتراک بھی اس سے بری نہیں۔ کہیں یہ انقلاب معیار کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ یعنی آدمی دنیا کے سب معیاروں سے انکار کرنے لگتا ہے اور انکے بالکل مخالف معیار بنالیتا ہے۔ عرف عام میں جو اچھا ہوتا ہے وہ اسکے نزدیک برا ہے۔ جو اوروں کی نظر میں حسین وہ انکے لئے بد صورت ہے، جو دوسروں کے اعتبار سے غیر ہے وہ انکے خیال میں شر ہے۔ معروف اور مسلمہ محاسن کی تحقیر اور ان سے انکار اس رویہ کی خصوصیت ہے۔ اس میں آدمی کو انگور نہ ملیں تو وہ یہ نہیں کہتا کہ انگور کھٹے ہیں بلکہ یہ کہ انگور کی ہٹھاس نہایت لائق چیز ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ اگر اس انقلاب معیار کے ساتھ تھوڑے سے تخلیقی تخیل کی آمیزش ہوگئی تو پھر آدمی بہتر دنیاؤں کے خاکے تیار کرتا ہے۔ اور اپنی موجودہ زندگی کی حرام نصیبوں کی تلافی اس مکمل خیالی دنیا کی اسکانی کامیابیوں سے کرتا ہے، اور حقیقت کی نامرادیوں سے اپنوں بنائے ہوئے فسانے کی کامرانیوں کے تخیل میں پناہ لیتا ہے۔ ع

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں!

بانیان اشتراک جدید کی تصانیف پڑھئے، اس تنقید و نکتہ چینی، اسی جنون تخریب، اسی انقلاب معیار، انہیں مکمل تر دنیا کے نقشوں سے پر پائیگا کہ یہی ان میں سے اکثر کی ذہنی و نفسی زندگی کے عناصر ہیں۔

جس گروہ کا اوپر ذکر ہوا ابھاسٹرل کارل مارکس تھا۔ دیکھیں کہ اشتراکیوں کا یہ امام انقلاب کا یہ سترارجی اپنی نفسی زندگی میں ان عناصر کی جھلک دکھاتا ہے یا نہیں پہلے اس کی پرشافل زندگی کی اہم تاریخیں پیش کر کے ہم اس کی ذہنی زندگی پر ایک نفیاتی نظر ڈالیں گے۔

مارکس سترائے میں یعنی روسی انقلاب سے پورے سو سال پہلے جرمنی میں بمقام تریر پیدا ہوا۔ ماں باپ یہودی تھے اور پہلے ابھامام سورڈخانی تھا۔ مارکس ابھی ۶ برس ہی کا تھا کہ سترائے میں باپ نے سیمی مذہب اختیار کر لیا۔ سترائے میں یہ بان یونیوسٹی میں داخل ہوا۔ خاندان والوں کی آن جان براؤن شواینگ کے ڈپوک کے معتمد خاص فائ دست فالن کے یہاں تھی انکی صاحبزادی سے سترائے میں مارکس کی نسبت ہو گئی اور سترائے میں شادی۔ سترائے سے سترائے تک برلن میں تعلیم پانی سترائے میں سینا سے ڈاکٹر کی ندلی۔ سترائے میں ایک لبرل اخبار کا مدیر مقرر ہوا لیکن خیالات کی انتہا پسندی کے باعث دوسرے سال ہی علحدہ بھی کر دیا گیا۔ سترائے میں جلاوطن بھی کر دیا گیا اور پیرس میں مقیم ہوا اور فرانسیسی فلسفیوں اور اشتراکیوں کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک سال بعد روگے کے ساتھ مل کر جرمن۔ فرانسیسی سانہ بیکالنا شروع کیا۔ اور اسی سال سترائے پر ایک کتاب اور ہیگل کے فلسفہ قانون پر تنقید شائع کی۔ سترائے میں خاندان پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا تنقید تنقید۔ اسی سال پیرس سے بھاگ آیا اور بروسلز میں جا کر قیام کیا۔ سترائے میں پروڈھان کی کتاب فلسفہ فلاکت کا جواب فلاکت فلسفہ لکھا۔ سترائے میں انجمن کے ساتھ مل کر حزب الاشتراکین کا اعلان مرتب کیا جدید ہائی اخبار شروع کیا جو سال بھر بعد ہی بند ہو گیا اور مارکس پر غداری کا مقدمہ چلا گیا جرمنی سے فرار ہو کر لندن میں پناہ لی اور آخر عمر تک وہیں رہا۔ نہایت تنگی و عسرت سے زندگی گزاری۔ مصارف کا تھوڑا سا حصہ نیویارک کے اخبار ٹریبیون کی نامہ نگاری کر کے کماتا اور کچھ انجمن سے لیتا۔ یہاں کے قیام کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کیا۔ اور سترائے میں تنقید معاشیات کتاب شائع کی۔ سترائے میں بین الاقوامی حزب العمال کی بنا ڈالی۔ سترائے

میں اپنی شہوتِ تصنیف ”سرمایہ“ کی پہلی جلد شائع کی جس کی دوسری جلد ۱۸۷۱ء میں اوتیری  
۱۸۷۱ء میں انگلش نے شائع کیں۔ ۱۸۷۱ء میں انتقال کیا۔

اشتراکیوں میں مارکس کی فضیلت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں اس گروہ کی وہ تمام  
خصوصیات جن کا خاکہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ اس گروہ میں غالباً سب سے  
زیادہ حرماں نصیب، سب سے زیادہ مصنوعی اور سب سے زیادہ جماعتی اداروں میں تنہا کا طالب تھا۔  
خاندانی حالات نے اسکے مزاج میں غمِ شروع ہی سے عجیب نمئی اور تسننی پیدا کر دی تھی۔ مگر  
کی خرابی خاندان کو ورنہ میں ملی تھی۔ مارکس کا باپ بھی مگر کے مرض میں مرا اور خود مارکس بھی۔  
خاندان کی دماغی و روحانی کشمکش کی مصیبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہ لوگ یہودی تھے۔ لیکن جرمنی  
میں یہودیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اس نے انہیں عیسائی ہو جانے پر مجبور کیا۔ پھر  
مارکس کے باپ نے ایک پردین سے شادی کی تھی اور اس ذہین و طبع لڑکے کا دل مارکس  
کی ماں مرتے مرتے صبحِ برمن زبان نہ بول سکی۔ یہ لڑکا بلا کا ذہین و طبع تھا۔ اس کے ہر کام  
ہر بات سے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی قوت اس میں سے ابلی پڑتی ہے۔ قدرت نے ذہنی  
صلاحتوں کے عطا کرنے میں غیر معمولی فیاضی سے کام لیا تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس  
لڑکے کو زندگی سے براہِ راست دوچار ہونے دیا جاتا، بجائے اس کے کہ یہ لڑکوں میں کھیلتا  
کو دتا اور چڑیوں کے گھونسلے تلاش کرتا پھر تا اس کے باپ نے ہوش سنبھالتے ہی اسے  
کتابوں پر لگا دیا، حرفِ شناس ہوئے ابھی بہت دن نہ ہوئے تھے کہ اس کے ہاتھ میں والٹیر  
اور راسین کی کتابیں دیدی گئیں! جو کتابیں یہ خود نہ پڑھ سکتا وہ باپ پڑھ کر سناتا تھا۔  
لڑکپن ہی میں اس سے اسکا باپ فلسفہ، مذہب، تاریخ کے مشکل سے مشکل مسائل پر بحث  
کرنا چاہتا تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر مارکس نے زندگی کو کتابوں کی معرفت سمجھنے کی کوشش  
کی۔ یہ خود طالبِ علی کے زمانے کے متعلق لکھا ہے: ”مناظرِ قدرت، فنونِ لطیفہ، ساری دنیا“

سب کچھ پس پشت ڈال دیا گیا تھا، دوستوں سے پزیری تھی،۔ صرف مطالعہ کی خاطر! وہی باپ جس نے بچپن میں اس غریب کو کتابوں کی دھت لگائی تھی اسے خط میں لکھتا ہے: ”یہ کیا ہے کہ تم علم کے ہر گوشہ میں جھانکتے پھرتے ہو، اور رات کو لمپ ہے اور تمہارا طبع طبع کے خیالات میں غلطاں و پچاں ہونا“ ۲۶ برس کی عمر میں جب یہ پیرس میں جلاوطن ہے تو روگے اس کے متعلق ایک دوست کو لکھتا ہے ”مارکس پڑھنا بہت ہے۔۔۔ لیکن ختم کوئی چیز نہیں کرتا۔ ہمیشہ بیچ میں سے چھوڑ دیتا ہے اور پھر کتابوں کا ایک سمندر ہے جس میں غوطے لگانے لگتا ہے“ ایک کا رخانے دار نے اس سے ہنسی میں کہا کہ تمہاری کتابوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم خود کا رخانے دار ہو تو اس پر یہ کہتا ہے: ”اگر کہیں لوگ جانتے کہ میں اس ساری حماقت سے کس قدر کم واقف ہوں!“ اس کی طبیعت کا لگاؤ سراسر غیر مرئی، نظری، مجرد چیزوں کے ساتھ تھا۔ اور ساری تاریخ کو ابدیت کی تعبیر دینے والا خود دنیا کی مادی حقیقتوں سے بہت کم آشنا تھا!

اسپر تم یہ کہ اس کتابی آدمی کے سینہ میں جذبات کا ایک کوہ آتش نشاں ابل رہا تھا۔ اسکا دوست انگلس جب ”تذکرہ کے اس سیاہ بالوں والے“ کا ذکر کرتا ہے ”جو غصہ میں پھرا اور ہر آدمی پر ہر کتاب پر، اور غضب سے گھونٹے باندھے کے چلاتا ہے گویا ہزاروں شیطان اسے پکڑے ہوں اور وہ ٹھان چکا ہو۔ کہ آسمان کے خیمہ کو تکر کے زمین پر لا ڈالے گا!“ تو اسے اس کتابی آدمی کے اندرونی جذباتی کشش کا صحیح اندازہ ہے۔ حقیقت سے دوری اور جذبات کی یہ شدت مل کر قوی سے قوی آدمی کو پراگندہ خاطر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ مارکس کی طبیعت کی پریشانی و پراگندگی انہیں کا نتیجہ تھی۔ اسکی ۱۹ برس کی عمر ہی جب باپ نے اسے ایک خط لکھا ”یہ پراگندگی مجھے ایک آن نہیں بھاتی۔ اور پھر تم سے تو اس کی توقع ہی نہ تھی۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو؟ ذرا سی خلاف مزاج بات، ذرا کسی خواہش کا پورا نہ ہونا پس پریشانی و پراگندگی کے لئے کافی ہے! اسی کو مضبوطی کہتے ہیں، مردانگی اسی کا نام ہے؟“ غریب باپ نہیں جانتا تھا کہ خود

اس کی زندگی اور اس کی تعلیم اور پھر بعد کو اسے بیٹے کی سیرت سے ناواقفیت، خود اس پر انگڑی کے سببے بڑے اسباب تھے!

مارکس ایک غیر معمولی ارادی قوت کا آدمی تھا۔ اس کے جذبات کی ساری شدت خارجی اعمال میں اظہار کے لئے بیتاب رہتی تھی۔ اپنے ذہن اور اپنی رائے کا پر تو خارج میں ڈالنے کی خواہش اس کی زندگی کی خصوصیت امتیازی ہے۔ اس نے اپنی طالب علمی کے ختم پر سند کے لئے جو مقالہ لکھا اس کے آخر میں اس نے ایک نفیاتی قانون ”یوں بیان کیا ہے: ”جب فکر انسانی خود اپنی پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے تو وہ ارادہ کی شکل میں اس خارجی حقیقت دنیاوی سے برسرِ بیکار ہو جاتی ہے۔“ خود مارکس کی زندگی میں یہ حقیقت خارجی تا مگر جماعتی زندگی سے عبارت تھی۔ یعنی یہ ان مصنوعی لوگوں میں سے تھا جن کے نزدیک جماعتی زندگی زندگی کی قدر اعلیٰ ہے، مارکس نے خود لکھا ہے ”اب تک فلسفی دنیا کی تعبیر کرتے تھے، اب ضرورت ہے اسے بدلنے کی،“ ارادہ کی یہ قوت جماعتی زندگی سے یہ تعلق، اور غیر معمولی ذہنی تفوق کا لازمی نتیجہ تھا کہ مارکس اپنے ساتھیوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ ایک جرمن مصنف نے مارکس کی نفسی کیفیت کی تحلیل میں یہ ملاحظہ پر یہ لکھا ہے کہ حکومت کی خواہش اس کی ساری زندگی پر حاوی تھی۔ اور تمام تفوق طلب خطرات کی طرح اس کی خصوصیات بھی ”دشمنوں سے نفرت اور انتقام کی خواہش، رقیبوں اور حریفوں سے حسد و رشک، متعین پراقتدار کی آرزو، اور بالعموم انسانوں کی تحقیر تمسیر“۔ اس میں اشارہ کرتے ہیں: ”اپنے سیاسی رقیبوں اور مخالفوں سے انتقام کی خواہش اس میں قوی ہے اور یہ کبھی انہیں معاف نہیں کرتا۔ جب تک انہیں زمین پر نہ لے آئے یہ چین سے بیٹھتا نہیں۔ اس کی خصوصیات امتیازی بے حد وصلہ اور بے نہایت آرزوئے حکومت ہیں۔ باوجود اشتراکی مساوات کے جس کا یہ راگ گاتا ہے یہ اپنی جماعت کا بلا شرکت حاکم ہے۔ یہ سچ ہے کہ کام بھی یہ خود ہی سب کرتا ہے لیکن پھر حکومت بھی صرف اسی کی ہے۔ اور یہ اپنے خلاف ذرا سی بات



نہیں برداشت کر سکتا۔

خاندانی عدم توازن، شخصی کشاکش، ذہنی، قوت ارادی کی شدت، حکومت کی آرزو ان سب کے ساتھ جس چیز نے مارکس کی زندگی کو تلخ بنایا وہ اس کی ناکامی تھی۔ کوئی کام نہ تھا جو اس نے اٹھایا ہو اور وہ ناکام نہ ہو۔ گھر میں افلاس و فلاکت، کیس کچھ گرو رکھنا کبھی نگل کوروپے کے لئے لکھنا، جانہار بھالنا اس کا بند ہو جانا، اس کی زندگی کے سب سے بڑا عملی کارنامہ بین الاقوامی حزب العمال کا کچھ دنوں گھس گھس کر جیسنہا پھر چند ہی سال میں خستہ ہو جانا، اسکی آخری کوشش یعنی علی کام کا بھی اس کے سامنے بے نتیجہ رہنا۔ سب اسی ناکامی کی شاخیں ہیں۔

مارکس کی یہ ناکامیاں بڑی حد تک خود اس کی سیرت کی کیوں کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً عمل کی خواہش کے ساتھ اس میں وہ صفات نہ تھیں جو علی آدمیوں میں ہوتے ہیں۔ حقیقت سے دور یہ اپنی خیالی دنیا میں رہنا اور اسکے معیار اس دنیا پر مان کر ناچا ہوتا جو ان سے بے نیاز ہے۔ اشخاص کو سمجھنا اور ان کی صحیح قدر جاننا، وقت کی بات پہچاننا، لوگوں سے کام لے سکرنا، یہ سب صفتیں اس میں نہ تھیں۔ لیکن اتنا قابل اتنا ذہین، ایسا قوی آدمی کیسے سمجھ لیتا کہ اپنی ناکامی کا ذمہ دار وہ خود ہے، یہ ہمیشہ خارجی اسباب کو اپنی ناکامی کی وجہ گردانتا رہتا اسی لئے اس میں برائی ناکامی کے ساتھ ساتھ نئی اور شدید تر تلخی بھی پیدا ہوتی گئی۔ یہ ہر شخص اور ہر چیز سے نفرت کرنے لگا، ہر بڑے کی حقارت، ہر مشہور شخص کی عیب بینی اس کا شیوہ ہو گیا۔ معاشرہ میں اس کے دوست دشمن سب متفق ہیں کہ اس کے دل میں نہت تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ جن لوگوں جسکے ساتھ اس نے پہلے کام کیا تھا اور جو اس کے بڑے دوست تھے ان سے اکثر ان بن ہو گئی۔ اور جہاں ذرا بگڑی اور اس نے نہایت شدت سے انکی مخالفت اور برائی شروع کی اس نفرت کے ساتھ جب اس کی شبہ کرنے کی عادت کو ملا لو جو شروع ہی سے مارکس میں موجود تھی تو مارکس کی نکتہ بینی کی عادت ابھی طبع سمجھ میں آجاتی ہے۔ مارکس کی

تصانیف کو دیکھو یہ سب کی سب کسی نہ کسی چیز کی تنقید ہیں۔ ہیگل کے فلسفہ قانون کی تنقید، تنقیدی تنقید کی تنقید، معاشیات کی تنقید، یا نفسی نکتہ چینی و عیب جوئی، پرودھان کے خلاف، واگٹ کے خلاف، ڈیورنگ کے خلاف، باکونین کے خلاف، پھر تنقید بھی کس بلا کی تنقید اور نکتہ چینی بھی کس غضب کی نکتہ چینی۔ نوح مارکس میں بھی تمام وہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جو ہم نے شروع مضموں میں اشتراکی مفکرین کے ساتھ منسوب کی تھیں۔ یہ اس گروہ کا ایک فرد تھا، اور دوسرے زیادہ ذہین، زیادہ مہنتی، زیادہ قابل لیکن ساتھ ہی زیادہ پراگندہ خاطر، زیادہ مصنوعی زیادہ غیر عملی اور اپنی زندگی میں زیادہ ناکام! گذشتہ بالا ملاحظات سے اگر مفکرین اشتراک اور انکے سردار مارکس کی ذہنی کیفیت کے سمجھنے میں کچھ بھی مدد ملے تو ان کی تعلیم یعنی مذہب اشتراک جدید کے فہم میں بھی کچھ سہولت ہوگی۔

## کشاف الہدیٰ

مقدمہ کتاب الہدیٰ یعنی قرآن کریم کے حقائق و معارف اور علوم و مطالب کا مبسوط تبصرہ۔ بقول علامہ امت اس سے بہتر تفسیر آن کا تعارف نام اس سے پہلے کبھی مرتب نہیں ہوا۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کا پڑھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ غیر جلد ہجری مجلد پارچہ ہے۔ غیر مکتبہ جامعہ علیہ۔ دہلی

# روس کی ایک اسلامی جمہوریت

## جمہوریہ آذربائیجان

ڈاکٹر ابالجوزی پروفیسر عربی باکو یونیورسٹی نے روس کی اسلامی جمہوریت آذربائیجان پر مصر کے ایک مشہور پرمچ میں یہ مضمون لکھا تھا۔ ناظرین جامعہ کے لئے اس کا مخلص پیش کیا جاتا ہے۔

حدود اربعہ اور مختصر تاریخ | جمہوریہ آذربائیجان کے حدود اربعہ حسب ذیل ہیں: ۱۔ شمال میں بحال داغستان و شرق میں بحر خزر یا بحر کاسپین۔ مغرب میں کرج اور ارمن جمہوریتیں۔ جنوب میں بلاد عجم یا عجمی آذربائیجان۔ صحرا۔ موغان اور بحال طائش۔

جمہوریہ آذربائیجان روسی انقلاب اور اعلان آزادی (۱۹۱۸ء) سے پہلے دو بڑی ولایتوں (ولایت باکو اور غنجا) سے مرکب تھی۔ اب اس میں تیرہ اضلاع ہیں ان میں بعض قدیم ہیں جن کا ذکر یعقوبی یا قوت الحموی بلاذری اور دوسرے عرب فارسی اور ارمن مورخین اور جغرافیہ نویسوں نے بھی کیا ہے۔ اور کچھ روسی عہد یا اس سے کچھ دنوں پہلے قائم ہوئے ہیں۔ عرب مورخین نے جن اضلاع کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ غنجا (خرزہ) شتور (شمکور) شمانا کو با قراباغ (قراباغ) وغیرہ اس کی مساحت ۱۵۹۶۸ مربع کیلو متر ہے باشندوں کی تعداد آخری مردم شماری (۱۹۲۶ء) کے لحاظ سے دو ملین اور ۳۱۴۵۰۰ ہے اور اب یقیناً نو لاکھ پانچ لکھ تک پہنچ گئی ہوگی۔ ان میں

۱۴۶۹۶۵۶ ترکی اذری عنصر ہے۔

۲۸۴۳۹۱ ارمن ہیں

۱۷۰۰۰۰ ایرانی (فارسی کردتات وغیرہ)

۳۲۱۰۰۰ روسی ہیں

۸۰۰۰۰ داغستانی قبائل کے لوگ ہیں کس اوارہ وغیرہ)

۵۰۰۰۰ روسی جرمن یہودی اور دو سکریطوں کے لوگ ہیں

ترکوں کی آبادی ۶۴ فی صدی ہے اور بعض ایرانی اور داغستانی قبائل کی آمیزش کی وجہ سے وہ برابر ترقی پذیر ہیں، دوسری جانب یہودی ارمنی اور روسی آبادی بھی برابر بڑھ رہی ہے اس لئے کہ کوئٹہ کی کانیں، پھلی کی تجارت اور یہودیوں کی فسطاط سرمایہ داروں کی توجہ کو اس ملک کی جانب مبذول کر رہی ہیں۔

یہ وسیع ممالک عربی فتوحات سے پیشتر اکاسرہ عجم کی حکومت میں تھے۔ اس زمانے میں بھی یہاں کوئی ایک قوم آباد نہ تھی۔ جنوب اور جنوب مشرق میں زیادہ تر ایرانی قبائل آباد تھے شمال اور شمال مشرق میں ارمن اور افغان اور شمال مغرب میں یہود اور داغستانی قبائل اقامت گزین تھے۔ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان کے زمانے میں جس وقت عربوں نے اس علاقے کو مفتوحہ ملک میں شامل کیا تو انکے قافلے کے قافلے یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ انہوں نے یہاں کے بہترین سرسبز علاقوں کو اپنے لئے پسند کیا اور تھوڑے عرصہ میں بے شمار شہر قبضے اور گاؤں قائم اور آباد ہو گئے۔

ان علاقوں پر جب اچھی طرح تسلط اور اقتدار قائم ہو گیا اور زیادہ آبادی کی گنجائش نہ رہی تو انہوں نے پہاڑی علاقے کی جانب توجہ کی اور وہاں کے باشندوں کو دوبارہ شروع کیا بالآخر شدید معرکہ آرائیوں اور جدال و قتال کے بعد خلفائے بنو امیہ خصوصاً ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں اسے بھی انہوں نے مفتوحہ ممالک میں شامل کر لیا۔ عباسی خلافت تک یہ علاقہ عربوں کے زیرِ اقتدار اور حکومت سے منسلک رہا لیکن جب عباسی خلافت میں ضعف آیا تو دوسرے دور دراز ممالک کی طرح اسکا تعلق بھی مرکز خلافت سے منقطع ہو گیا اور مختلف روسا سلاطین کی

چھوٹی چھوٹی مستقل حکومتیں قائم ہو گئیں ان میں سے بعض پاستیں عربوں کی بھی تھیں لیکن اکثر خود ملک کے اہل باشندے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی امارتوں میں مختلف اسباب کی بنا پر اختلافات اور جنگ و جدال کی صورت قائم رہی، نویں صدی ہجری سے لیکر دسویں صدی تک ان باہمی لڑائیوں کا سلسلہ برابر قائم رہا جن کی وجہ سے ان میں براہِ ضعف و انحطاط پیدا ہوتا رہا۔ مٹی کا اب ان میں اتنی سکت بھی باقی نہیں رہی کہ ترکوں کے پیہم حملوں کا جواب دے سکیں جو وسط ایشیائے اٹھ کر خراسان اور آذربائیجان کے راستے سے اُن کے دولت مند ملک پر کر رہے تھے۔ ان ترکی حملہ آوروں نے وسط ایشیا اور افغانستان وغیرہ کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی یہاں بھی انہوں نے ان چھوٹی چھوٹی امارتوں کا تختہ الٹ دیا انہوں نے اس علاقے کو صرف فتح ہی نہیں کیا بلکہ انکے قبائل یہاں آکر رہنے بھی لگے اور اس کا سلسلہ پندرہویں صدی (۷۰۰) تک قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اور جو کچھ عربی فوج یا قبائل باقی رہ گئے تھے وہ بھی منتشر ہو گئے۔ لیکن پھر بھی بہت تھوڑی سی تعداد بعض علاقوں میں انکی باقی رہ گئی تھی اور انہوں نے عربی رسم و رواج اور عربی زبان کی فطرت میں پوری کوشش کی لیکن سترہویں صدی (۷۰۰) میں انہوں نے اپنی زبان بھی ضائع کر دی اور اس کے بجائے ان میں ترکی (اڈری) یا داغستانی زبان رواج پا گئی لیکن اپنے رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقوں کو انہوں نے اب بھی نہیں چھوڑا اور اس وقت تک وہ اپنی قدیم معاشرت پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہ اب صرف بادیہ موغان ضلع کو با اور داغستان کے بعض دیہاتوں میں آباد ہیں۔ عربوں نے اپنے زمانہ حکومت میں بڑے بڑے شہر بسائے تھے۔ مثلاً بروعة، دیبل، مراغہ اور درنید وغیرہ یہ شہر کثرت آبادی، تہذیب و تمدن صنعت و تجارت میں دور و نزدیک اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن زمانے کی نیرنگیوں نے اُنکے نشانات تک مٹا ڈالے ہیں۔ مثلاً بروعة یا قوت کے میان کے مطابق عربوں کے زمانے میں شہرِ بَاقان کا دار السلطنت اور بہت بڑا اور شاندار شہر تھا لیکن اب

اسکی حیثیت محض ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہ گئی ہے اسی طرح بیلقان، شروان اور قبیلہ کے ناموں تک سے آج ہم واقف نہیں اور اگر عرب مورخین اسکا تذکرہ نہ کرتے تو شاید ہمیں اسکے وجود میں بھی شک ہوتا۔

عربوں کا اقتدار مٹنے کے بعد یہ ملک مختلف حملہ آوروں کا آماجگاہ رہا۔ ترکوں کے بعد مغلوں اور مغلوں کے بعد ترکمانی (وختی) قبائل کی توجہات کا مرکز رہا۔ اس طوائف الملوک اور متواتر حملوں کے نتائج ملک کے لئے بہت مضرت ثابت ہوئے۔ عربوں نے اپنی کوششوں سے اسے ہر حیثیت سے ایک ترقی یافتہ ملک بنا دیا تھا۔ ہر طرف فارغ البالی امن و آسائش کا دور دورہ تھا لیکن اسکا تسلط ملتے ہی ملک پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا۔ تاآنکہ ایران میں صفوی خاندان نے عروج کیا اس نے اس ملک کو بھی اپنے ملوکہ علاقے میں شامل کر لیا اور یہ اب ایرانی حکومت کا جزو ہو گیا۔ اس وقت یہاں شیعہ مذہب اور ایرانی تہذیب کا غلبہ ہو گیا حتیٰ کہ ترکی زبان پر بھی اسکا اثر پڑا۔ صفوی خاندان کے سلاطین نے اس ملک کی ترقی کے لئے جو کوششیں کیں، ہمسایہ وختی قبائل کے حملوں کی جس کامیابی سے مداخلت کی اس کے آثار اب تک ملک میں موجود ہیں لیکن اس خاندان کے زوال کے بعد ملک کی پھر وہی حالت ہو گئی اور پہلے کی طرح پھر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں اور وہ احرار اور رؤسا جن کی سرکوبی میں صفوی خاندان پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا پھر سر اٹھانے لگے اور اپنی مستقل حکومتیں قائم کر لیں۔ ان ریاستوں میں آپس میں سخت اختلاف تھا اور ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اسی آپس کے تصادم اور نا اتفاقی کے سبب حکومت اسکے قریبی پڑوسیوں (ترک اور عجم) کے قبضوں میں چلی گئی اور برابر مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہی، چنانچہ ۱۵۷۷ء میں جب ایرانی حکومت میں ضعف آیا تو ترکوں نے اس پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن ۱۶۰۷ء میں عباس اول نے اسے پھر واپس لے لیا اور اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ انیسویں صدی (۱۹۰۰ء) تک اسی خاندان کا قبضہ رہا اور بالآخر انیسویں صدی میں روسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا

اور یہ ملک انکی عظیم اہمیت کا ایک جزو بن گیا۔

روسی حکومت | روسی حکومت نے اس ملک کے معاملات میں اس وقت سے دخل دینا شروع کیا جبکہ وہ اسطرخان (شہر کا نام) پر قابض ہو گئی۔ پہلے اس نے سیاح ۲۰۰ اور تجارتی اور سیاسی ہمیں بھیجنا شروع کیے تاکہ وہ وہاں کے کمزور قانون اور ملوک عجم سے تجارتی اور سیاسی معاہدہ کی طرح ڈالیں۔ اس لئے کہ اس زمانے میں ترکوں کے حملے برابر ان ملکوں پر ہو رہے تھے، اور ان کمزور قانون اور سلاطین کو روس کی امداد کی بے حد ضرورت تھی۔ روسیوں کا اصل مقصد اپنی تجارت کی توسیع تھی وہ بلاد عجم اور ہندوستان میں اپنی مصنوعات کے لئے ایک نیا بازار پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن اٹھارہویں صدی کے شروع تک اس ملک کے حکام سے انکے تجارتی اور سیاسی تعلقات بہت کمزور تھے۔ دونوں کے درمیان کوئی ایسا محفوظ و مامون راستہ نہیں تھا کہ تجارتی مال و اسباب بغیر کسی خطرے کے گزر سکے کہ اسطرخان سے بحر خزر کے بندرگاہوں تک تجارتی سامان لیجانے کے لئے کوئی تجارتی بیڑہ موجود نہیں تھا اس لئے مجبوراً خشکی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا اس لئے اسباب اور اسکے محافظ ہمیشہ معرض خطر میں رہتے تھے۔ بطرس اکبر چاہتا تھا کہ روس عجم اور ہندوستان کے درمیان تجارتی راستوں پر قبضہ کر کے چنانچہ ۱۷۲۲ء میں اس نے اسطرخان میں ایک بحری بیڑہ بھی تیار کیا تھا لیکن اس پر سوار ہو کر وہ در بند بھی نہیں پہنچا تھا کہ روس کے داخلی حادثات کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا ۱۷۲۳ء میں دوسری دفعہ اس نے تیاری کی اور اس مرتبہ باکو اور سالبان پر قبضہ کر لیا اس کے بعد روس اور ترکوں کے درمیان <sup>۱۷۲۲</sup> میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے بھی بندرگاہوں کا اکثر حصہ اس کے قبضہ میں آ گیا لیکن ۱۷۳۲ء میں اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے سے دست بردار ہونے کو تیار ہے نیز اس نے باکو اور در بند سے قبضہ اٹھالینے کا بھی وعدہ کیا بشرطیکہ ترکی حکومت مامور اسے اتفاقاً کے علاقے سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن جب ترکی حکومت نے اس سے انکار

کیا تو نادر شاہ جدید شاہ ایران نے اعلان جنگ کر دیا اور ترکوں کو اس علاقے سے زبردستی نکال باہر کیا اس لئے روسی حکومت نے بھی باکو اور دربند کو خالی کر دیا نادر شاہ نے ان دونوں کو اپنی وسیع مملکت میں شامل کر لیا اور ۱۷۲۴ء تک یہ علاقہ اس کے قبضہ میں رہا۔ بالآخر جس زمانے میں وہ شروان میں مصروف جنگ تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ملک میں پھر بغاوتیں اور انتشار پیدا ہو گیا اور حکومت پھر مختلف ادارہ میں منقسم ہو گئی تا آنکہ روس نے ۱۸۰۵-۱۸۲۲ء میں تمام ملک پر قبضہ کر لیا اور وہ روس کے وسیع علاقے کا ایک جزو ہو گیا۔

روسی قبضہ کے بعد روس کی سابق حکومت کے انفعال اسکی داخلی سیاست اور مشرقی ممالک اور مشرقی اقوام سے اس کے تعلقات کو کیسی ہی بُری نظر سے دیکھا جائے اور اسکی انتظامی غلطیاں اور خارجی سیاست کیسی ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہوں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روس کے عہد حکومت میں مذکورہ ممالک اور قومیں خصوصاً جو اس کی حکومت کے تحت میں آگئیں انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں ہر حیثیت سے اتنی ترقی کر لی کہ ہمایہ ممالک انہیں رشک و حسد کی نظر سے دیکھنے لگے۔ روسی قبضہ سے پہلے ان قوموں اور ادارے تھوڑے علاقوں کی تمدنی اور اقتصادی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسی آج کل جزیرۃ العرب کی ہے لیکن نصف صدی بھی نہیں گزرنے پائی تھی کہ روس کے ولتمدن ترین علاقوں میں انکا شمار ہونے لگا تمدنی حیثیت سے بھی وہ روس کے اندرونی ملک سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ہماری ذاتی تحقیق کے مطابق کئی حیثیتوں سے وہ اس سے بڑے ہوئے تھے ہماری تحریر سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ترقی محض اپنی حکومت کی برکت ہے بلکہ مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ دوسرے مشرقی ممالک کے مقابلہ میں نیز سابق روسی سلطنت کی تھوڑی سی مدت حکومت میں آذربائیجان نے حیرت انگیز ترقی کر لی جیسا کہ آئندہ علاوہ شمار سے آپ پر واضح ہو جائے گا۔

روسی قبضہ کے وقت آذربائیجان کی آبادی صرف ۵۰ لاکھ ۵۰ ہزار تھی لیکن ۱۹۲۷ء میں



دو ملین اور ۱۳۵۴۱ تک پہنچ گئی اور ڈھانی ملین کو بھی بڑھ گئی باکو جو اس ملک کا دارالسلطنت تھا کی آبادی ۱۸۲۰ء میں ڈھانی ہزار تھی۔ ۱۹۱۷ء میں دو لاکھ اکتیس ہزار تک پہنچ گئی اور اب نصف ملین اوو۱۰ ہزار ہے۔ ان آخری اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرصے میں باکو کے باشندوں کی تعداد دو سو گنا بڑھی ہے اور برابر حیرت انگیز طریقہ پر بڑھ رہی ہے یہ یاد ترقی کثرت مناسل یا قلت اموات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اندرونی ممالک کے لوگوں کے منتقل ہونے کی وجہ سے جو یہاں کی قابل زراعت زمین میں کاشت کاری کی غرض سے آئے ہیں یا مختلف کانوں میں کام کرنے کے لئے جو چاروں طرف سے دارالسلطنت باکو کو گھیرے ہوئے ہیں اور یا بحر خزر اور نہر کوراکے ساحلوں پر ماہی گیری کے لئے۔ اس لئے کہ یہاں ہر قسم کی بہتر سے بہتر اور قابل تجارت مچھلیاں بافراط پائی جاتی ہیں۔

روسی قبضہ کے وقت آذربائیجان کی مزرعہ یا قابل زراعت زمین کل ملک کا صرف ۱/۲ یعنی صرف دو ملین روسی ایکڑ تھی۔ سوائے میں ساڑھے پانچ ملین تک پہنچ گئی اور اب تقریباً ۶۶۳۸۹۰۰ ایکڑ ہے اور ہر سال مزید اضافہ ہو رہا ہے اس وقت خجری زمین صرف ایک ملین اور ۹۳۳۰۰۰ ایکڑ باقی رہ گئی ہے اور غالباً تھوڑے ہی عرصہ میں بجز تھپڑیلی اور شور زمینوں کے ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہ رہے گا جو ناقابل کاشت ہو یا جس پر کاشت نہ ہوتی ہو اس لئے کہ مرکزی اور مقامی دونوں حکومتیں خجری علاقے کو قابل زراعت بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ علاوہ بریں ہر سال وہ اپنے میزانیہ میں نہروں کی درستی و مرمت کے لئے کئی ملین روبل رکھتی ہیں۔ آذربائیجان میں روئی کی کاشت میں بھی برابر ترقی ہے نہروں کی درستی کے بعد لاکھوں ایکڑ زمین روئی کی کاشت کے قابل ہو جائیگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کو باہر سے روئی تنگ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اب بھی مصر یا امریکہ وغیرہ سے بہت کم روئی آتی ہے۔ سوائے میں صرف روئی کی تجارت کا منافع ۱/۲ ملین بڑھ گیا تھا۔

۱۵ ایک روسی سکے مساوی ۱۰۰ درہم

ملک کی اقتصادیات کے لئے زرینی سے بھی زیادہ اہم پٹرول ہے۔ پٹرول زیادہ تر آذربائیجان کے علاقے سے نکلتا ہے اور یہ ملک کی ثروت کا اہم ترین ذریعہ ہے اس وجہ مقدار سالانہ دوسرے ملکوں کو جاتی ہے اسکی قیمت تقریباً ۱۰ ملین پونڈ ہے اور خود ملک کے کارخانوں وغیرہ میں جس قدر صرف ہوتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ بیس ملین پونڈ لگایا گیا۔ پٹرول کو لوگ اس ملک میں ہزار ہا سال سے جانتے ہیں۔ عربی ساحل میں المقدسی وغیرہ نے اپنے سفرناموں میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ اکثر اوقات اس میں سے شعلے نکلے رہتے تھے۔ اس لئے آگ کے پونچے والے ہندوستان اور عجم سے آکر اس کی زیارت کرتے تھے۔ اور انکے زیر سایہ رہنا باعث برکت سمجھتے تھے۔ اُن معبدوں کے آثار اب تک موجود ہیں جن میں ملتان، شمالی ہند کے رہنے والے آکر ٹھرتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔ باکو کے علاقے میں سرفاخانہ ایک موضع ہے اس میں اب تک ایک معبد موجود ہے جس کی دیواروں سے فوارے کی طرح پٹرول اچھل اچھل کر نکلتا ہے اس معبد میں کئی کتابے بھی لگے ہیں ان میں بعض جدید فارسی میں بعض ہندی میں اور ایک سنسکرت حروف میں ان کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معبد ۱۸۶۱ء تک آباد تھا اب باکو کا محکمہ آثار قدیمہ اس کی حفاظت کر رہا ہے ورنہ پٹرولیم کمپنی اس کی زمین پر قبضہ کر لیتی اور معبد کا نہ معلوم کیا شرموتا۔ یہ امر تعجب انگیز ہے کہ بادجو کیہ روسی حکومت کو آذربائیجان میں پٹرول کے چشموں کا علم تھا لیکن ۱۸۶۲ء تک اس نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس وقت عام لوگوں اور کارخانہ کے مالکوں کو اس طرف توجہ ہوئی اور وہ لکڑی اور پتھر کے کوسے کے بجائے اسکا استعمال کرنے لگے، ملک اور بیرون ملک میں جب اسکا استعمال عام ہو گیا تو ملک اور بیرون ملک کے سرمایہ دار پٹرول کا علاقہ خریدنے اور پٹرول نکالنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے چنانچہ جنگ عظیم سے قبل جو پٹرول یہاں سے نکلا اسکی تعداد ۷۷ کم کر دو سو سالانہ ہے آج بھی وہ اسی مقدار میں نکلتا ہے حالانکہ روسی انقلاب کے زمانے میں پٹرول کے بہت سے چشمے برباد ہو گئے، صرف باکو کے علاقے سے ۷۷ ملین بود

پٹرول نکلتا ہے جس کی قیمت ۴۰ ملین پونڈ ہے پہلے آمدنی کی یہ کثیر تعداد اجنبی سرمایہ داروں کے قبضہ میں جاتی تھی مگر اب سوویت حکومت نے اسے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور اس کی آمدنی ملک کی ضروریات اور مزدوروں کی حالت درست کرنے پر صرف کی جاتی ہے ان کے لئے مکانات تعلیم نگاہیں شفا خانے وغیرہ تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آذربائیجان میں آمدنی کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن میں سے ایک اہم ذریعہ مچھلی کی شکار لگا ہے جس جو ساحل بحر اور نہر کو راہ پھیلی ہوئی ہیں مچھلی یہاں بکثرت ہوتی ہے اور مچھلیوں کی بعض قسمیں ایسی عمدہ ہیں کہ دوسرے مقامات پر بشکل پانی جاتی ہیں، بعض ایسی ہیں جو تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ اس کے بعد میوؤں کا نمبر بڑا اور میوؤں میں بھی سیب کی پیداوار خاص طور پر قابل ذکر ہے گذشتہ سال خود ملک میں ۵ ملین صندوقوں کی کھیت ہوئی ہے اور یہ سب کی سب صرف ایک ضلع کو باکی پیداوار ہے پھر انگور بھی یا فراط اور بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ ملک کی آمدنی کے اہم ترین ذرائع یعنی پٹرول، روئی اور مچھلی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں لیکن آذربائیجان کی حکومت بھی ان سے کافی فائدہ اٹھاتی ہے اس لئے کہ مرکزی حکومت کئی ملین صرف ان مزدوروں کی مختلف ضروریات پر صرف کر دیتی ہے جو اس ادارے میں کام کرتے ہیں علاوہ اس کے ہر کوڈ پٹرول پر وہ حکومت آذربائیجان کو ایک مقررہ رقم دیتی ہے جس کی تعداد اس سال ۵ ملین روبل تک پہنچ گئی۔ جس میں سے نصف تعلیم اور نصف زمین اور راستوں کی درستی پر خرچ کرے گی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس آمدنی کے اور بھی بہت ذرائع ہیں جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ جمہوریہ آذربائیجان اپنے باشندوں کی تعداد اور مساحت کے اعتبار سے روس کی تمام دوسری جمہوریتوں کے مقابلے میں دو تہندہ گزشتہ سال اسکا میزانہ ۱۳۰ ملین روبل تھا یعنی ۱۳ ملین مصری پونڈ۔ کاشتکاری اور حکومت کے کارخانوں کی آمدنی گذشتہ سال ۸۶۱ ملین روبل تھی اور ۱۹۲۵ء میں ۴۵۱ ملین تھی صرف باکو کی سالانہ آمد ۲۰ ملین روبل ہے یعنی دو ملین پونڈ۔ یہ آمدنی میونسپٹی اپنے خاص مدارس

پر صرف کرتی ہے مثلاً جامعہ بالکوا اور مدرسہ صنعت وغیرہ۔ مدارس زراعت صنعت موسیقی وغیرہ۔

اس مادی کامیابی سے بھی کہیں زیادہ شاندار وہ ادینی اور روحی کامیابی ہے جو اس جمہوریت نے بیسویں صدی کے ریلے اول خصوصاً آخری پانچ سالوں میں حاصل کی ہے۔ اگر مضمون کی لطاوت کا خوف نہ ہوتا تو بہت سے امور کا مفصل تذکرہ کیا جاتا جس سے حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی لیکن اس موقع پر علمی تحریکوں بالخصوص مدارس کی ترقی کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ایک خاکہ دیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ۱۹۱۷ء میں مدارس کی تعداد کس قدر تھی اور ۱۹۲۸ء تک ان میں کس قدر اضافہ ہوا۔

مدارس کی تعداد ۱۹۲۸ء میں	۱۹۲۸ء میں
دیہاتی مدارس	۶۵۰
مدرستہ المعلمین	۱
ثانوی مدارس	۲۷
اعلیٰ مدارس (کلج)	۰
	۳
	۱۱۹۷
	۱۴
	۱۳۲

مدارس عالیہ سے مراد بالکویا آذریجان یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اس وقت

۳۰ ہزار طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی ترک ہیں اور باقی یہود ارمن اور روسی وغیرہ۔ یونیورسٹی کے قیام کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں سابق حکومت نے اسکی

بنیاد ڈالی تھی۔ اب اس میں پانچ شعبے ہیں (۱) طب (۲) تاریخ و ادب (۳) تعلیم و تربیت (۴) قانون (۵) الشریعات۔ یہ آخری شعبہ آئندہ سشن میں تاریخ و ادب کے شعبہ میں ضم کر دیا جائے گا۔ دوسرا اعلیٰ مدرسہ صنعتی کلج ہے۔ اس میں بھی پانچ شعبے ہیں اور طلبہ اور طالبات کی تعداد دو ہزار ہے۔ اس کے بعد موسیقی کلج ہے۔ اس میں بھی طلبہ اور طالبات کی تعداد سناٹ سو ہے۔

ثانوی یا سکندری مدارس کی تعداد برابر روزانہ سنزوں سے لیکن ان مدارس کے مقصد اور

نصب بعین میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ حکومت کا نثار ہے کہ ان کی حیثیت بالکل منتقل کر دیجے طالب علم جب اس مدارس میں تعلیم ختم کر چکے تو وہ اعلیٰ تعلیم سے مستغنی ہو اور کسی صنعت کسی فن اور کسی علم میں اسے جہارت ہو تاکہ وہ اپنے لئے کوئی کام پیدا کر سکے یا کسی عہدے کے لئے مزدور ہو جو اس کے مستقبل کی خوش گواہی کا ضامن ہو۔ غرض کہ ثانوی مدرسوں میں طلبہ کو اعلیٰ مدرسوں یا کالجوں کے لئے تیار نہیں کیا جاتا بلکہ اصلی غرض یہ ہے کہ طلبہ ان مدارس سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہو جائیں اس طرح کہ صنعت یا فن یا علم میں انہیں کمال حاصل ہو۔ اسی لئے تمام ثانوی مدارس کو جن میں حسب معمول تعلیم ہوتی تھی صنعتی (فنی آرٹ) یا تعلیمی مدارس میں تبدیل کیا جا رہا ہے اس وقت تک اس قسم کے جو مدارس قائم ہو چکے ہیں ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :-

نام مدرسہ	تعداد	نام مدرسہ	تعداد
۱۔ تعلیمی مدارس	۱۱	۷۔ اقتصادی اور تجارتی مدارس	۲
۲۔ صنعتی	۴	۸۔ موسیقی	۳
۳۔ زراعتی	۶	۹۔ طبی	۳
۴۔ شبینہ (فردوؤں کیلئے)	۱	۱۰۔ تعلیم تشخیص	۱
۵۔ فنی (مصنوعی وغیرہ)	۲	۱۱۔ مدرسہ انتقال	۱
۶۔ مخلوط (صنعتی اور زراعتی)	۳		

ان کے علاوہ مزدوروں اور حرث پیشہ لوگوں کے لئے اور بھی شبینہ مدارس ہیں جن میں سے بعض وقتی ہیں اور بعض ہمیشہ کھلے رہتے ہیں ایسے مدرسوں کی تعداد ۴۲ ہے اور ان میں حکومت ہر سال بلکہ ہر مہینہ مدرسہ کھولتی رہتی ہے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں ان مدارس میں طلبہ کی تعداد ۱۰۹۹۱ تھی اور عملین کی ۵۶۰۵۔ جمہوریت کی مردم شماری کے اعتبار سے اس وقت حکومت کے مدرسوں میں (تمام مدارس حکومت کے ہیں بجز چند بچوں کے مدرسوں کے

جو چنداں قابل ذکر نہیں، پڑھنے والوں کی تعداد چودہ میں ایک ہے۔ جمہوریت کی نوعمری اور جنگ عظیم سے قبل کی تعلیمی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت غنیمت ہے۔ حکومت جبری تعلیم کی ترویج کے لئے اپنے پوسے وسائل صرف کر رہی ہے۔ اخراجات کے معاملے میں بھی وہ نخل سے کام نہیں لیتی۔ اس لئے گودہ جانتی ہے کہ ملک کی زندگی صرف تعلیم اور علوم و فنون کی پیش از پیش اشاعت پر ہے۔ اس ملک کی آبادی اور مساحت شام کے برابر ہے لیکن اس کے تعلیمی اخراجات سنکر آپ کو حیرت ہوگی صرف اس سال (غالباً ۱۹۲۹ء) اس نے تعلیم پر ۲۹ ملین روپے صرف کئے جو تقریباً ۲ ملین مصری پونڈ کے مساوی ہیں تعلیمی اخراجات کے لئے ملک کے جن اداریں سے جس قدر رقم حاصل کی ہے اس کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

خاص حکومت کے میزانیہ سے	روپے	۱۰۰۰۰
بلدیہ ہاکو کے میزانیہ سے	"	۶۳۴۴۰۰۰
اضلاع کے میزانیہ سے	"	۲۷۰۰۰
بحر خزر کی جہاز ران کمپنی سے	"	۵۷۶۰۰۰
چٹروں کمپنی سے	"	۱۷۰۰۰۰۰
ریلوے کمپنی سے	"	۳۶۵۰۰۰
"	"	۶۰۰۰۰۰
"	"	۱۰۰۰۰۰۰

اگر اس ۱۶۰۲۲۰۰۰ کے دوسرے ذرائع آمدنی کو بھی ملا لیا جائے تو کل آمدنی ۲۷ ملین اور ۴۰۳۰۰۰ روپے ہوتی ہے اور اسے ملک کے تمام باشندوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر حصہ میں ۱۰ روپے آتے ہیں یعنی ایک مصری پونڈ اور ایسی زبردست رقم ہے جس کی نظیر دوس کی دوسری جمہوریتوں میں تو کیا یورپ کے اکثر ممالک میں بھی نہیں ملے گی اور اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس ملک میں تعلیمی تحریک کس تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب مائل ہے۔ نیز ملک

کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اسکا کس قدر زبردست اثر پڑتا ہوگا طلبہ کی تعداد ہر سال بلکہ ہر مہینے بڑھ رہی ہے اسی نسبت سے ملک علمی ادبی صنعتی اور فنی انجمنوں میں امٹا فہ ہو رہا ہے۔ ترکی رسائل و اخبارات کی تعداد بھی تیسری سے بڑھ رہی ہے۔

ملک میں ایک بہت بڑی علمی انجمن قائم ہے جو عنقریب اکاڈمی کی حیثیت حاصل کر لے گی اسی طرح تاریخ۔ اقتصادیات ترکی لٹریچر اور موسیقی وغیرہ سے تعلق بہت شاندار ادارہ کامیاب انجمنیں ہیں۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ترقی کی اس دوا دوش میں صرف مرد ہی شریک نہیں ہیں بلکہ عورتیں بھی برابر کا حصہ لے رہی ہیں۔ اعلیٰ مدارس میں اس وقت لڑکیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے صرف طبی شاخ میں دو سو سے زائد لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں سرکاری محکموں میں بھی فنی تعداد روز افزوں ہے۔ ترکی عورت آج بالکل آزاد ہے اور تمام کاموں میں مرد کے پہلو پہلو شریک ہے۔

اس مبارک جدوجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام مدارس میں تعلیم مفت ہے حکومت اور بعض اداے اعلیٰ مدارس میں طلبہ کی لاکھوں روپیہ سے سادعت کرتے ہیں ان طلبہ میں سے پانچ سو صرف مفت تعلیم حاصل کرتا ہے بلکہ حکومت کی جانب سے ۳ سے ۷ پونڈ تک ماہوار وظیفہ بھی دیا جاتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم دیہاتی نیز ثانوی مدارس میں مقامی زبان ہے۔ جنگ عظیم سے قبل ذریعہ تعلیم روسی زبان تھی لیکن اب حکومت کا ارادہ ہے کہ اعلیٰ مدارس میں بھی ذریعہ تعلیم مقامی زبان ہو۔ اس وقت تک وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ ماہر ترک اساتذہ کی منور قلت ہے۔ دوسری وقت یہ ہے کہ اذری زبان علمی حیثیت سے بہت کم مایہ زبان ہے اگر عربی اور فارسی اصطلاحات سے مدونہ لیا جاتی تو ثانوی مدارس میں بھی اس کے ذریعہ تعلیم دینا ناممکن ہوتا پھر بھی یقین ہے کہ بیس سال تک یہ شکل مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ زبان کی اس وقت کو دور کرنے کے لئے پہلا قدم بڑھا دیا گیا ہے چونکہ عربی

رسم الخط ترکی زبان کی اصوات کو ادا کرنے سے قاصر تھے اس لئے اس سال سے اس کے بجائے  
 لاطینی رسم الخط کے استعمال کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ترکی نے بھی اس معاملے میں اسکی تقلید کی ہے۔  
 روس کی تمام اسلامی جمہوریتیں اسی تجویز پر کار بند ہو رہی ہیں اور غالباً ایران اور افغانستان بھی عنقریب  
 اسی پر عمل کریں گے۔ ترکی اذری (آذربائیجان) قوم تہذیب و تمدن کے میدان میں اس وقت  
 یورپین اقوام کا مقابلہ کر رہی ہے اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ تمام مشرقی قوموں سے  
 سبقت لے جائے گی۔ حتیٰ کہ عربوں سے بھی جس سے اس نے کب نور اور جس کے تہذیب  
 تمدن سے درس شائستگی حاصل کیا تھا اور جس کی علمی اصطلاحات ترکی زبان کے لئے بہترین  
 معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

(لمخص الرابطة الشرقية)



# کومبہ میلے کی سیر

الہ آباد ہندوؤں کا ایک بہت متبرک شہر مانا جاتا ہے و جس کی یہ ہے کہ یہاں پر لگنگھامانی و جمنامانی کا سنگم ہوتا ہے لہذا جس جگہ پر دو دریا ملتے ہیں وہ بہت مقدس مانی جاتی ہے اور اس جگہ پر نہانے سے گناہوں کی آلاشیں دور ہو جاتی ہے۔

یوں تو لگنگھامانی نشان کرنے والے سینکڑوں مرد و عورت، بوڑھے، بچے جاتری روز ہی اس نعمت سے متفیض ہوتے ہیں لیکن سال میں کچھ دن ایسے ہیں کہ اس میں نہانہ بہت ہی مقدس سمجھا جاتا ہے جنوری کے مہینہ میں یہاں ہر سال نہان ہو کر ہے اس کو مالگھ کا نہان کہتے ہیں اور اس میں دور دراز سے لاکھوں کی تعداد میں جاتری آتے ہیں اور سنگم میں نہاتے ہیں لیکن ایک بہت بڑا میلہ ہر بارہ سال کے بعد ہوتا ہے اس کو کومبہ کا نہان کہتے ہیں چنانچہ اس سال ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۷۷ء لیکر ۱۴ فروری سنہ ۱۹۷۸ء تک یہ نہان کا میلہ رہا اس میلے کی اتنی دھوم اور شہرت تھی کہ ہندوستان کے بہت ہی دور افتادہ مقامات سے لوگ جوق در جوق الہ آباد آئے ریلوں کی میلے آپس میں ان جاتریوں کے لئے مختلف مقامات سے سیکڑوں کی تعداد میں چھوڑی گئیں اس کے علاوہ ہزاروں موٹر لاریوں میں پنجاب اور کشمیر سے الہ آباد آئے۔ بہت ایسے تھے جو کئی ہفتہ کی پیدل مسافت طے کر کے نہان کے شوق میں میلے میں پہنچے۔ چنانچہ حال ہی کے ٹائمس آف انڈیا کے پرچے میں ایک سا دھوکے تصویر دکھائی گئی ہے جو زمین پر لڑھکتا ہوا کوچین سے یہاں پہنچا ہے شاید اس ریاست میں کچھ زیادہ ثواب ملتا ہو۔ کچھ سال سے لگنگھامانی اور جمنامانی کا اتصال قلعہ کے پاس شاہی زمانے کے بند کے پاس ہوتا تھا اور یہ جگہ بہت تنگ ہوتی تھی۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا تھا کہ لاکھوں آدمی جب اس جگہ جمع ہو کر دھک پیل کر کے نہانے کی کوشش کرتے تھے تو بہت سے بچے اور عورتیں کل جلتے تھے مگر کچھ سال سے لگنگھامانی اپنا رخ بدل دیا ہے اور جمنامانی قلعہ سے قریب و وسیل کے فاصلہ

پر ملتی ہے اور یہ دو میل کا ٹکڑا سوکھا چھوٹا ہوا ہے اس لئے ایک بہت بڑا وسیع میدان زائرین اور تماشائیوں کے لئے چھوٹ گیا ہے۔ اس سال گورنمنٹ اور الہ آباد میونسپلٹی نے بھی بہت فراخ دلی سے روپیہ انتظام کے لئے صرف کیا تھا گورنمنٹ نے قریب ۵ لاکھ اور میونسپلٹی نے بھی بہت کچھ صرف کیا۔ کئی سو ڈاکٹر مختلف ریلوے جنکشنوں پر اور سیلے کے میدان میں مقرر تھے کیونکہ پھلو تجربات کی بنا پر اسکا بہت اندیشہ تھا کہ کہیں اس موقع پر ہیضہ یا کوئی اور وبا نہ پھیل جائے اور ایک نئی بات اس سال یہ بھی تھی کہ بجائے مٹی کے تیل کی لالٹینوں کے میلہ میں بجلی کی روشنی لگائی گئی تھی اور کثرت سے پانی کے نل لگائے گئے تھے جس سے پانی کی کوئی وقت نہیں ہوئی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نل کا ٹھیکہ میرے دوست حافظ غصنفر اللہ صاحب کے پاس تھا جن کا انتظام نہایت قابل اطمینان تھا میرے دوست اس معاملے میں بہت تجربہ کار ہیں کیونکہ علاوہ الہ آباد کھنڈو کے اور دیگر شہروں کے واٹر ورکس بنانے کے خود میلے کے واٹر ورکس کے ٹھیکہ کا کام زاید از بارہ سال سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ اس سال چار خاص نہان کے دن تھے ایک تو شروع یعنی ۱۴ جنوری کا دوسرا ۲۹ جنوری کا اور تیسرا ۴ فروری بسنت کا اور پھر آخری ۴ فروری کا یہاں ایک میرے دوست مسٹر شفیع اللہ خاں ہیں جو ایک کامیاب وکیل ہیں اور جو میلہ دیکھنے کے اس درجہ دھمتی اور شائق ہیں کہ سب کام یک طرف اور میلہ دیکھنا ایک طرف مگر خیریت یہ ہوئی کہ ان متذکرہ بالا چاروں دنوں میں تمام دفاتر اور کچھ پولیس میں تعطیل تھی ورنہ کیا عجب تھا کہ یہ حضرت میلے کے دیکھنے کے جنون میں کچھری ہی کی چھٹی کر دیتے۔ چونکہ یہ پہلا موقع میرا اس نہان دیکھنے کا تھا میں اپنے دوست کے ساتھ ۱۴ جنوری کو گیا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ایک اور دوست بھی ہو گئے مگر میں اور مسٹر شفیع اللہ خاں تو سوٹ بوٹ میں تھے اور دوسرے صاحب شیر دانی پا جامہ اور رامپوری ٹوپی میں تھے۔ یہاں پر اس کا ذکر کر دینا مناسب ہو گا کہ میلہ میں علاوہ پولیس کے انتظام کے سیوا ستمی اور دیگر ہندو جماعتوں مثلاً بہا بیر دل وغیرہ کے بھی والنٹیئر موجود تھے چنانچہ ہم تینوں کئی گھنٹے تک میلے میں گھومتے

رہے اس کے بعد ایک سیوا ستمی کے والٹیر آئے اور ہم لوگوں سے جو سوٹ بوٹ میں تھے کہنے لگے کہ صاحب آپ لوگوں سے تو ہم کچھ نہیں کہتے البتہ آپ کے ساتھ جو اور صاحب ہیں وہ میلہ میں نہیں پھر سکتے۔ جب ان سے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے مسلمانوں کو سیلے میں پھرنے کی اجازت نہیں ہے ہم نے کہا کہ کس کی اجازت نہیں ہے کہنے لگے کلکٹر صاحب کا حکم ہے ہم نے کہا دکھاؤ کہاں ہے تو کہنے لگے میرے پاس نہیں ہے بلکہ نیمہ میں ہے غرض جب ہم لوگوں نے انہیں مانا تو پھر وہ ایک کانٹبل سے کچھ کہنے لگے ہم نے اس کانٹبل کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا کوئی حکم ایسا ہے جس میں مسلمانوں کو میلہ میں پھرنے کی ممانعت ہے تو اس نے کہا کہ میں نہیں معلوم یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ والٹیر چپکے سے کھسک گئے پھر اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایسا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ ایسا کوئی قانونی حکم دیا جاسکتا ہے۔ اس واقعہ سے ہمیں اپنے برادران وطن کی تنگ نظری کو دیکھ کر افسوس اور حیرت ہوئی کہ اگر کوئی غیر منصفہ انگریزی ہیٹ میں چلا جائے تو کچھ نہیں لیکن اگر کوئی غریب مسلمان ٹکڑا یا اور کوئی ٹوپی پہن جائے تو اس کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں غلامی کی ذنیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیوا ستمی کے والٹیرس نے اکثر مسلمانوں کو کلکٹر کے حکم کی دھمکی دے کر میلہ سے باہر جانے پر مجبور کیا وہ غریب سیدھے سادے مسلمان یہ سمجھے کہ واقعی کوئی ایسا حکم کلکٹر کا ہو گا اور سیلے سے باہر چلے گئے۔

اب ذرا میلہ کا حال سنئے۔ یورپین تہذیب پر انگشت نمائی کرنے والے اور انکی پوشاک پر اعتراض کے شائقین آئیں اور اس سیلے میں ذرا اپنی تہذیب کا نمونہ دیکھیں جیسا پبلک نظاں یہاں پر پیش کیا گیا ویسا تو یورپ کے کونوں کی خاک چھانے پر بھی پبلک میں نہیں مل سکتا۔ ہزار بار ہنر سادہ صوفی کے بدن پر ایک چمٹھڑا لمبی نہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھونی رائے بیٹھے ہیں اور ان میں سے اکثر بالکل جوان ہیں لاکھوں عورتیں اور لڑکیاں نہ صرف اوپر سے گذرتی ہیں بلکہ بہت آنکھ پائوں چھوتی ہیں اور نڈر میں پیش کرتی ہیں وہ سادہ

صاحب انکو ایک چنگی راکھ کی دیتے ہیں جو یہ عورتیں نہایت خوشی سے ایک منبرک چیسر سمجھ کر لے لیتی ہیں۔

الہ آباد میں نہیندوؤں کے دیگر مقدس منبرک مقامات میں سادھوؤں کے اکھاڑے یا جمعیتیں (Soceties) ہیں جو اکثر رجسٹرڈ ہیں اور لین دین اور دیگر کاروبار کرتی ہیں۔ یہ اکھاڑے بہت مالدار ہیں انکے پاس ماتھی میں موڑ ہیں اونٹ ہیں اور ہر ایک کے لئے زرق برق کا سامان موجود ہے۔ ان کے مانتہ اور دیگر پیروں کے پاس مریض کام کے لباس ہیں اور نہایت جگہ گاتے زرین کام کے بڑے بڑے پتھر ہیں جس کو ان کے پیرو جلوس میں ان حضرات پر لگاتے ہیں۔ بندے اُترتے ہی بائیں جانب ان اکھاڑوں کے بڑے بڑے احاطے تھے اور ان میں انکے ڈیرے دشا میمانے لگے ہوئے تھے جہاں پر دن میں اکثر اوقات بھجن وغیرہ ہوتے تھے اکھاڑوں کے ختم ہونے کے بعد پتیل کے علاوہ اور ہندی کتابوں کی دوکانیں تھیں اُن کے بعد برہمنہ سادھوؤں کے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں اُڑے تھے۔ یہ لوگ بہت سارے باقی چستریوں کے نیچے یا اور کپڑوں کے نیچے بیٹھے ہوتے تھے پاس جلانے کی لکڑیاں رکھی تھیں انکو جلا کر رات بسر کرتے تھے۔ ہر ایک کے پاس مالاتھی جو مٹی کے پڑ کی کہی جاتی تھی اس کو یہ جیا کرتے تھے۔

شروع میلے کے دن میں اپنے میلے کے خیاد دوست کے ساتھ کوئی دس بجے دن کے پہنچا اُس دن موٹر لاریاں مانگے وغیرہ بندے بہت دور روک دے گئے تھے برخلاف اور دنوں کے جب یہ سواریاں بند تک جاسکتی تھیں اور موٹر اور ٹانگے ایک مقرر فیس دے کر یا پاس سے بند کے نیچے بھی جاسکتے تھے مگر میلے کے دن ہم لوگوں کی موٹر بہت دور روک دی گئی اور ہم لوگوں کو پیدل چلنا پڑا اُس دن جمع بھی خاصا تھا پیدل چلنے والوں کی کثرت سے خاک بھی اُچی اُڑ رہی تھی چنانچہ ہم لوگ بھی پیدل چل کر میلے کے رقبے میں داخل ہوئے وہاں جاکر دیکھا کہ بندے کچھ نیچے ہی سے بانس لگا کر رسیاں بانہ دی گئی تھیں اور ایک راستہ قریب غنم تک کا بنا دیا گیا تھا۔ ان رسیوں کے اندر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ راستہ

مختلف اکھاڑوں کے جلوس کے لئے مخصوص تھا اور باجا پولیس اور سیواستی کے والنیر  
 کھڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا اس دن قریب چار پانچ چوبیسے صبح سے مختلف اکھاڑوں کے  
 جلوس نکھنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر ایک اکھاڑے کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا وہ اپنے وقت پر  
 باقی اونٹ موٹر وغیرہ کے جلوس کے ساتھ نکھتا تھا اس کے ساتھ پولیس کے انسپران اور کچھ میٹریٹ  
 ہوتے تھے جب ایک اکھاڑہ نکھا کر واپس ہوتا تو دوسرا جاتا تھا یہ انتظام اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ  
 بعض وقت ان اکھاڑوں میں آپس میں بحث ہو جاتی تھی اور ہر ایک دو سر کو نیچا دکھانے کی  
 کوشش کرتا تھا اس میں نقص امن کا اندیشہ رہتا تھا اس لئے ہر ایک کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا ان  
 رسیوں کی حدود سے ٹلی ہوئی عورتوں، لڑکیوں اور کہیں کہیں مردوں کی قطار دور دوری بیٹھی تھی  
 ہر اکھاڑے کے جلوس کے آگے بقول انبار پانیرانہ آباد کے ”سادھو ہوتے تھے جنکا تقدس  
 اتنا زیادہ تھا کہ انکو کسی قسم کے کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی“ انکے پیچھے کچھ بٹے باز ہوتے تھے  
 جو تلوار اور لکڑی کے کھیل کرتے جاتے تھے پھر انکے پیچھے مرصع ہاتھیوں کے ہودوں میں نہتہ  
 جن کے اوپر زرق برق کے پھاتے لگے ہوتے تھے وہ نکھتے تھے اور ان کے آگے سنکھ  
 بھی ہوتا جاتا تھا اور بعض بعض اکھاڑوں کے جلوس میں موٹریں بھی ہوتی تھیں۔ یہ سادہ لوح  
 عورتیں لڑکیاں اور مرد جو دور دوری سے لگے ہوئے بیٹھے تھے جیسے ہی کوئی اکھاڑہ  
 پاس سے گذرتا تھا ایک دم جمیٹ جمیٹ کر انکے پاؤں سے روندی ہوئی مٹی کے لینے کی  
 کوشش کرتے تھے ان کے نزدیک وہ مٹی بھی جو انکے پاؤں کے نیچے آگئی تھی تبرک ہو گئی  
 تھی یہاں پر بھی بر ملا یہ برہنہ سادھوان عورتوں کے غول کے سامنے سے گذرتے تھے۔  
 مگر یہ جیسا سوزنظارہ مذہب کے نام سے روا تھا۔ غرض یہ اکھاڑے یکے بعد دیگرے اپنی اپنی  
 باری سے نکھم جاتے تھے اور ایشٹمان کر کے اپنے جگے قیام کو واپس ہوتے تھے اس  
 کا سلسلہ قریب ایک بجے دن تک رہا۔ اُس وقت نہان کا زور شور ختم ہوا۔ میں اور  
 میرے دوست شام تک وہیں رہے اور کئی کئی گرو کی کپڑوں اور منہ پر بیٹھ گئی گھروٹ

کر رہا ہے جب جا کر یہ کثافت دور ہوئی۔ یہ تو پہلے دن کی داستان ہوئی۔

اب ۲۹ کا یعنی اصل کو مبدیہ میلے کا حال سنئے چونکہ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس دن مجمع بہت زیادہ ہوگا اس لئے سویرے سے چلنے کا قصد کیا اس سال ایٹ انڈین ریلوے نے ایک اسٹیشن نگم کے قریب اشان کرنے والوں کی سہولت کے لئے بنوایا تھا اور الہ آباد جنکشن سے نگم تک میڈک اسپنل جاتی تھی چنانچہ ہم لوگوں نے اس دفعہ ریل سے میلے جانے کا ارادہ کیا اور ٹکٹ خرید کر اندر پہنچے وہاں کیا دیکھتے ہیں ہر گاڑی میں سا فر کچا کچ بھرے ہوئے ہیں اور تل رکھنے کو جگہ نہیں ہے مجبوراً پلیٹ فارم سے باہر آئے اور موٹر لاری سے جانے کا ارادہ کیا۔ لاری والوں کی اس دن بن آئی تھی۔ انہوں نے معمول سے پھر گئے دام مانگے کچھ بات چیت کے بعد چار گئے پر لیجانے کو راضی ہوئے اب ہم لوگ لاری میں بیٹھ کر روانہ ہوئے جوں جوں میلے کے قریب پہنچتے جاتے تھے آدمیوں، سوڑوں، لاریوں، کیوں تاکلو کا جوم بڑھتا جاتا تھا۔ میلے سے قریب پون میل سیکڑوں بل گاڑیاں بھی کھڑی ہونی تھیں جن میں دیہات سے لوگ، بکثرت اس دن صبح یا رات کو آگئے تھے جدہز نظر جاتی تھی آدمیوں کے غول کے غول دکھائی دیتے تھے۔ سواریوں کی یہ کثرت تھی کہ ہماری لاری بہت دوکھڑی ہو گئی اور اس کے آگے اور پیچھے لاریوں، موٹرول وغیرہ کی ایک لمبی لائن کھڑی ہو گئی کچھ دیر انتظار کیا کہ اب آگے کا راستہ صاف ہو تو پہلے مگر دس بیس یا پچاس ہوں تو کچھ امید ہو جب دیکھا کہ جلدی راستہ صاف ہونے کی کوئی امید نہیں ہے تو لاری میں سے اتر گئے اور پیدل چلنا شروع کیا۔ آدمیوں کا جوم جیسے جیسے بندہ تک برسے گئے زیادہ ہوتا گیا۔ اس دن نہان اور سویرے سے شروع ہو گیا تھا اور ایک بہت بڑی تعداد لوگوں کی تھا مگر لوٹ رہی تھی۔ ان لوگوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا جب بندہ کے قریب پہنچے ہیں تو ہر طرف سے آدمیوں کے جوم میں گھر گئے خیر آئی رو کے ساتھ جو نہان کو بچا رہی تھی ہم لوگ بھی ہو گئے پچھلے تجربے کی بنا پر ہماری کل باریقی اس مرتبہ بیٹ اور سوٹ میں

تھی چنانچہ اس دن کسی نے بھی نہیں ٹوکا کیونکہ یورپین پوشاک کا باسپورٹ موجود تھا بند کے اوپر جب ہم لوگ پہنچے اور وہاں سے سیلے کے میدان کو دیکھا ہے تو حیرت ہو گئی اس قدر آدمیوں کا جم غفیر تھا کہ اس سے پہلے میں نے باوجود اپنی حال ہی کی یورپ کے بہت بڑے بڑے شہروں کے سیاحت کے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جدہہ نظر جاتی تھی سیلوں تک انسانوں کا سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہر طرف لاتعداد انسانی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ حیرت اور تعجب سے اس نظارے کو تھوڑی دیر تک دیکھا اس کے بعد ہی پیچھے کی ایک زبردست روس نے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ اسی طرح بند کے نیچے کوئی آدمی مل سکے اس کے بعد جھوم اور خاک کی کثرت سے دم گھٹنے لگا۔ آدمیوں کی کثرت سے آسمان پر خاک کا ایک بادل چھایا ہوا تھا۔ اس کشمکش سے تنگ آکر اس بات کی کوشش کی کہ چلو کہیں سے کشتی لیکر دریا پر چلیں مگر کشتی تک پہنچنا اتنا ہی زبردست مرحلہ تھا جتنا کہ اس مجمع میں پیدل چلنا ناچار اس سے بھی مایوسی ہوئی اور پھر بادل ناخو استہ واپس لوٹنا پڑا اس دن اندازہ کیا جاتا ہے کہ کم از کم ۳۰ لاکھ سے اوپر مجمع ہو گا!

اگر وہ لوگ جو اس زمانے میں بے دینی اور لامذہبیت کی بڑھتی ہوئی رو کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب اب کچھ دن کا جہان ہے ۱۹ جنوری کے جھوم کو دیکھتے تو ان کو اس بات کو ماننا پڑے کہ مذہب اب بھی ایک زبردست قوت ہے اور یہ قوت اتنی جلدی نہیں توڑی جاسکتی جیسا یہ خیال کرتے ہیں۔ وہ کیا قوت تھی جو ان لکھو کھا آدمیوں کو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے چینج لائی اور ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس میں سے ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ پیٹ بھر کھا ناکیا ہوتا ہے اور پورا تن ڈھکنا کے کہتے ہیں۔ اس سے زبردست اور پر اثر نظارہ دنیا کے سامنے جج کے دنوں میں پیش ہوتا ہے جب دنیا کے ہر حصہ سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان عرب کے رنگستان کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں اور خانہ کعبہ میں اپنے خالق اکبر کے سامنے جھک جاتے

ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ آج مذہب کی اصلی روح ہندو اور مسلمانوں کے بڑے حصہ میں  
 مفقود ہے اور وہ آج ملک کی بہبودی۔ رواداری۔ قومی ہمدردی کے بجائے مذہب  
 کا نام لے کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ کاش یہ دونوں قومیں اپنے  
 اپنے مذہب کی اصلیت پر غور کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ وہ مذہب سے کتنی دور جا پڑی  
 ہیں اور مذہب کے پرے میں ملک کے مفاد کو کس بے دردی سے نقصان پہنچا رہی ہیں  
 ہندوستان اس وقت اپنی تاریخ کے ایک بہت پرخطر دور سے گزر رہا ہے۔ اس وقت  
 ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں قومیں بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے متحد  
 ہو کر اپنے وطن کی بہبودی کی فکر کریں۔

---



# گرمیوں کی ایک رات

منشی برکت علی عشاء کی ناز پڑھ کر چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد پارک تک چلے آئے گرمیوں کی رات ہوا بند تھی۔ شربت کی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے پاس لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ لونڈا جھج جھج کر اخبار بیچ رہے تھے۔ بیٹے کے بارہ والے ہر بجلے ہانس کے پیچھے بار لیکر نکلتے۔ چور اسے پرتا نگہ اور یکہ دالوں کی لگاتار پکار جاری تھی۔

”چوک! ایک سواری چوک! میاں چوک پہنچا دوں!“

”اے حضور کوئی تانگہ وانگہ چاہئے!“

”ہمارے بیٹے کے! گجرے موتے کے!“

”کیا ملائی کی برف ہے!“

منشی جی نے ایک ہار خریدا، شربت پیا اور پان کھا کر پارک کے اندر داخل ہوئے بچوں پر بالکل جگہ نہ تھی۔ لوگ نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند بے ٹرے گانے کے شوقین ادھر ادھر شور مچا رہے تھے۔ بعض آدمی چپ بیٹھے، اپنی دعوتیاں کھاکر بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں اور رانیں کھانے میں مشغول تھے۔ اسی دوران میں وہ بچہ دوں پر بھی بھپٹ بھپٹ کر چلے کرتے جاتے تھے۔ منشی جی چونکہ پانجام پوش آدمی انہیں اس بد تمیزی پر بہت غصہ آیا۔ اپنے جی میں انہوں نے کہا کہ ان کمبنتوں کو کبھی تیز نہ آئے گی اتنے میں ایک پنچ پر سے کسی نے انہیں پکارا۔

”منشی برکت علی!“

منشی جی مڑے

”اغاۃ اللہ جی آپ ہیں۔ کہنے مزاج تو اچھے ہیں!“

منشی جی جس دفتر میں نوکرتے اللہ جی اُس کے سینکڑے تھے۔ منشی جی ان کے ماتحت تھے۔

لالہ جی تے جوتے اتار دے تھے، اور بیچ کے جو بیچ میں پیر اٹھا کر اپنا بھاری بھر کم جسم لئے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی تو ند پر زمی سے ہاتھ پیرتے جاتے اور اپنے ساتھیوں سے جو بیچ کے دونوں کو نوں پر ادب سے بیٹھے ہوئے تھے بیچ بیچ کر باتیں کر رہے تھے۔ منشی جی کو جاتے دیکھ کر انہوں نے انہیں بھی پکار لیا۔ منشی جی لالہ صاحب کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

لالہ جی من کے بولے: ”کہو منشی برکت علی یہ بار وار خریدے ہیں، کیا ارادے کیا ہیں!“ اور یہ کہکر زور سے قہقہہ لگا کر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف داد طلب کرنے کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لالہ جی کا منشا دیکھ کر ہنسنا شروع کیا۔

منشی جی بھی روکھی بھیکسی نہسی نہنے: ”جی ارادے کیا ہیں ہم تو آپ جانے غریب آدمی ٹہرے۔ گرمی کے مارے دم نہیں لیا جاتا۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ یہ مارے لیا شاید دو گھڑی آکھ لگ جائے۔“

لالہ جی نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پیرا اور نہنے: ”شوقین آدمی ہو منشی کیوں نہ ہو!“ اور یہ کہکر پھر اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

منشی جی نے موقع غنیمت جاکر کہا ”اچھا لالہ جی چلتے ہیں، آداب عرض ہے“ اور یہ کہکر آگے بڑھے۔ دل ہی نہیں کہتے تھے کہ دن بھر کی گھس گھس کے بعد یہ لالہ کجنت سر پڑا۔ پوچھتا ہے ارادے کیا ہیں! ہم کوئی رئیس اور تعلقہ دار ہیں کہیں کے کہ رات کو بیٹھ کر مجرائیں اور کوٹھوں کی سیر کریں حسیب میں کبھی چونی سے زیادہ ہو بھی سہی، بیوی، بچے، ساہ روپیہ، ہینہ، اور بے آمدنی کا کچھ ٹھیک نہیں آج نہ جاتے کیا تھا بوا یک روپیہ مل گیا۔ یہ دیہاتی اہل معاملہ کجنت روز بروز چالاک ہوتے جاتے ہیں۔ گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد حسیب سے کھانکھاتے ہیں۔ اور پھر سمجھتے ہیں کہ غلام خرید لیا، سیدھے بات نہیں کرتے کینہہ نیچے درجے کے لوگ اٹھا سر پھر گیا ہے۔ آفت ہم پر پڑے شریف سفید پوشوں کی ہے۔ ایک طرف تو نیچے درجے کے لوگوں کے مزاج نہیں ملتے۔ دوسری طرف بڑے صاحب دلوں

سرکاری سختی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی دو جینے کا ذکر ہے، بنارس کے ضلع میں دو محرابی چارے  
رشتہ ستانی کے جرم میں برخواست کر دیے گئے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے غریب بچہ رہتا ہے  
بڑے افسر کا بہت ہوا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلاً ہو گیا۔

منشی جی صاحب کی نے بازو سے پکارا۔ جن چیراسی کی آواز  
منشی جی نے کہا؛ ”اٹھ تم ہو جن!“

مگر منشی جی پتے پتے رہے۔ رکے نہیں پارک سے مڑ کر نظیر آباد میں پہنچ گئے جہن ساتھ  
ساتھ بولیا۔ دبے پتلے، بستہ قد، محل کی کشتی ناٹوپی پہنے، ہار ہاتھ میں لئے آگے آگے  
منشی جی اور ان سے قدم دو قدم پیچھے بڑا صاف ہانڈے، چپکین پہنے قوی، میکس لمبا چوڑا  
چیراسی جن۔

منشی جی نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس وقت جن کے میرے ساتھ ساتھ بیٹے ہیں  
کیا مقصد کیا ہے۔

”کہو بھی جن، کیا حال ہے۔ ابھی پارک میں ہڈ کلا رک صاحب سے ملاقات ہوئی  
تھی وہ بھی گرمی خشکایت کرتے تھے۔“

اجی منشی جی کیا عرض کروں۔ ایک گرمی صرف تھوری ہے جو مائے ڈالتی ہے ساڑھ  
چار پانچ بجے دفتر سے جھٹی ملی۔ اس کے بعد سیدھے وہاں سے بڑے صاحب کے ہاں گھر  
پر حاضری دینی پڑی۔ اب جا کر وہاں سے چٹکا راہو اتو گھر جا رہا ہوں۔ آپ جانتے کہ وہاں  
بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ کچھری کے بعد تین دفعہ دوڑ  
دوڑ کر بازار جانا پڑا۔ برف۔ ترکاری، پھل سب خرید کے لاؤ اور اوپر سے ڈانٹ الگ

پڑتی ہے، آج داموں میں تمکا زیادہ کیوں ہے اور یہ پھل سڑے کیوں ہیں۔ آج جو آم  
خرید کے لے گیا تھا وہ یکم صاحب کے پسند نہیں آئے۔ واپسی کا حکم ہوا۔ میں نے کہا،  
حصنور: اب رات کو بھلا یہ واپس کیسے ہوں گے تو جواب ملا ہم کچھ نہیں جانتے کوڑا تھوڑی

خریدنا ہے۔ سو حضور یہ روپیہ کے آم گلے پڑے۔ آم والے کے ہاں گیا تو ایک تو تو میں میں کرنی پڑی۔ روپیہ کے آم بارہ آنے میں واپس ہوئے چونی کی چوٹ پڑی۔ ہینہ کا ختم اور گھر میں حضور منشی جی قسم سے لیجے جو سوکھی روٹی بھی کھانے کو ہو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کونسا منہ لیکر جو روکے سامنے جاؤں۔“

منشی جی گھبرائے۔ آخر حین کا نشانہ اس ساری داستان کے بیان کرنے سے کیا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ غریب تکلیف اٹھاتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں۔ مگر منشی جی کا اس میں کیا تصور؟ ان کی زندگی خود کون بہت آرام سے کتنی ہے۔ منشی جی کا اتنا بے ارادہ اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ روپیہ جو آج انہیں اوپر سے ملا تھا صبح سلامت جیب میں موجود تھا۔ ”ٹھیک کتے ہو میاں جن، آج کل کے زمانے میں غریبوں کی مرل ہے جسے دیکھو یہی روناروتا ہے، کچھ گھر میں کھانے کو نہیں۔ بیچ پوچھو تو سارے آثار بتاتے ہیں کہ قیامت قریب ہے۔ دنیا بھر کے جملے فریبی تو چین سے سے مرے اڑاتے ہیں اور جو بیچاے اللہ نیک بندے ہیں انہیں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے۔“

جن چپ چاپ منشی جی کی باتیں سننا انکے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ منشی جی یہ سب کہتے تو جاتے تھے مگر ان کی گھبراہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی، معلوم نہیں ان کی باتوں کا جن پر کیا اثر ہو رہا تھا۔

”کل جمعہ کی نماز کے بعد مولانا صاحب نے آثار قیامت پر وعظ فرمایا۔ میاں جمن بیچ کہتا ہوں جس جس نے سنا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بھائی دراصل یہ ہم سب کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے جو کچھ عذاب ہم پر نازل ہو وہ کم ہے، کوئی برائی ہے جو ہم میں نہیں؟ اس سے کم تصور پر اللہ نے نبی اسرائیل پر جو مصیبتیں نازل کیں ان کا خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر وہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔“

جمن بولا ”ہم غریب آدمی منشی جی، بھلا یہ سب علم کی باتیں کیا جانیں۔ قیامت کے بارے

میں تو میں نے سنا ہے مگر حضورِ آخریہ بنی اسرائیل یہاں سے کون تھے؟

اس سوال کو سن کر منشی جی کو ذرا سکون ہوا۔ خیر، غریب اور فاقے سے گذر کر اب قیامت اور بنی اسرائیل تک گفتگو کا سلسلہ پہنچ گیا تھا۔ منشی جی خود کافی طور پر اس قبیلے کی تاریخ سے واقف نہ تھے مگر ان مضمون پر گھنٹوں باتیں کر سکتے تھے۔

”ایں! واہ میاں جن داہ، تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل کس چڑیا کا نام ہے۔ میاں سارا کلام پاک بنی اسرائیل کے ذکر سے تو بھرا پڑا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟“

”جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟“

”ارے بھی حضرت موسیٰ۔ مو... سا۔“

”موسا... وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی؟“

منشی جی زور سے ٹھٹھا مار کر بٹے۔ اب انہیں بالکل اطمینان ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ قیصر باغ کے چوراہے تک بھی آ پہنچے تھے۔ یہاں پر تو ضرور ہی اس بھوکے چیرا سی کا ساتھ چھوٹے گا۔ رات کو اطمینان سے جب کوئی کھانا کھا کر، نماز پڑھ کر، دم بھر کی دہشتگی کے لئے جیل قدمی کو نکلے، تو ایک غریب بھوکے انسان کا ساتھ ساتھ ہو جانا جس سے پہلے کی واقعیت بھی ہو، کوئی خوشگوار بات نہیں۔ مگر منشی جی آخر کرتے کیا؟ جن کو کتے کی طرح دھکار تو سکتے نہ تھے۔ کیونکہ ایک تو پکھری میں روز کا سامنا، دوسرے دہ نیچے درجے کا آدمی ٹھہرا، کیا ٹھیک، کوئی بد تمیزی کر بیٹھے تو سر بازار خواہ مخواہ کو اپنی بنی بنائی عزت میں بڑے لگے بہتر ہی تھا کہ اب اس چوراہے پر پہنچ کر دوسری راہ لیجائے اور یوں اس سے چٹکھارا ہو۔

”خیر، بنی اسرائیل اور موسیٰ کا ذکر میں تم نے پھر کبھی پوری طرح کروں گا، اس وقت تو ذرا مجھے ادھر کام سے جانا ہے... سلام میاں جن!“

یہ لیکر منشی جی قیصر باغ کے سینما کی طرف بڑے۔ منشی جی کو یوں تیز قدم جاتے دیکھ کر

پہلے تو جمن ایک لمحہ کے لئے اپنی جگہ پر کھڑا کھڑا رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر کسے تو کیا کرے۔ اس کی پیشانی پر پسینے نے قطرے چک رہے تھے۔ اسکی آنکھیں ایک بے سنی طور پر ادھر ادھر مڑتی تھیں۔ تیز بجلی کی روشنی، فوارہ، سینما کے اشتہار، ہوٹل، دوکلیا موٹر، مانگے، یکے اور سب کے اوپر تار یک آسمان اور جھلکاتے ہوئے ستارے غرض خدا کی ساری ہستی۔

دوسرے لمحہ میں جمن منشی جی کی طرف لپکا۔ وہ اب کھڑے سینما کے اشتہار دیکھ رہے تھے اور بید خوش تھے کہ جمن سے جان چھوٹی۔

جمن نے انکے قریب پہنچ کر کہا ”منشی جی“

منشی جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ساری مذہبی گفتگو، ساری قیامت کی باتیں سب بیکا گئیں۔ منشی جی نے جمن کو کچھ جواب نہیں دیا۔

جمن نے کہا ”منشی جی اگر آپ اس وقت مجھے ایک روپیہ قرض دے سکتے تو میں

ہمیشہ . . . . .“

منشی جی مڑے ”میاں جمن میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت تنگی میں ہو۔ مگر تم تو خود جانتے ہو کہ میرا اپنا کیا حال ہے۔ روپیہ تو روپیہ ایک پیسہ تک میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ اگر میرے پاس ہوتا تو بھلا تم سے چھپانا قہور ا ہی تھا۔ تمہارے کہنے کی لمبی ضرورت نہ ہوتی پہلے ہی جو کچھ ہوتا تمہیں دے دیتا“

باوجود اس کے جمن نے اصرار شروع کیا ”منشی جی قسم لے لیجئے میں ضرور آپ کو تنخواہ ملتے ہی واپس کر دوں گا۔ سچ کہتا ہوں حضور اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہیں . . . . .“

منشی جی اس جھک جھک کے بہت گھبراتے تھے۔ انکار چاہے وہ سچا ہی کیوں نہ ہو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو وہ شروع سے چاہتے تھے کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔

استنے میں سینما ختم ہوا اور تماشا ٹائی اندر سے نکلے۔

”ارے سیال برکت، ابھی تم کہاں ہو!“ کسی نے پہلو پکارا۔ منشی جی جن کی طرف سے ادھر مرے۔ ایک صاحب سوٹے تازے، تیس نپتیں برس کے۔ انگھر کھا اور دوپٹی لوٹی پہنے، پان کھائے، سگریٹ پیتے ہوئے منشی جی کے سامنے کھڑے تھے۔ منشی جی نے کہا: ”اغاہ تم ہو! برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ تم نے لکھنؤ تو چھوڑ ہی دیا، مگر بھائی کیا معلوم آتے بھی ہو گے تو ہم غریبوں سے کیوں ملنے لگے!“

یہ منشی جی کے پرانے کالج کے ساتھی تھے۔ روپے، پیسے والے رئیس آدمی وہ بولے: ”خیر سب باتیں تو چھوڑو۔ میں دو دن کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ذرا لکھنؤ میں تفریح کے لئے چلو اس وقت میرے ساتھ چلے تھیں وہ مجرا سنواؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ میری موٹر موجود ہے۔ اب زیادہ مت سوچو، بس چلے چلو۔ سننا ہے تم نے کبھی نور جہاں کا گانا؟ اہا ہا کیا گاتی ہے کیا بتاتی ہے، کیا ناچتی ہے۔ وہ ادا وہ بھین۔ اس کی کمر کی لچک، اس کے پاؤں کے گھنگھر وکی جھنکارا میرے مکان پر، کھلے صحن میں، تاروں کی چھاؤں میں جھل جھل ہوگی۔ بھیروی سنکر جلسہ برخواست ہو گا بس اب زیادہ نہ سوچو، چلے ہی چلو۔ کل اتوار ہے۔۔۔۔۔ بیوی! یکم صاحب کی جوتیوں کا ڈر ہے۔ اگر ایسا ہی عورت کی غلامی کرنا تھی تو شادی کیوں کی چلو بھی میاں! لطف رہے گا۔ روٹھی یکم کو منانے میں بھی توفرہ ہے۔۔۔۔۔“

پرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا، تاج، جنت بگھا، فردوس گوش، منشی جی بیک کے موٹر میں سوار ہوئے۔ جن کی طرف اسکا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔

# نغمہ چین

ہم ذیل میں چند چینی نظموں کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ امید ہے 'گل سرین' جامد کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔

چینیوں کی عشقیہ شاعری انکی متاع ذہنی کا نہایت اہم جزو ہے۔ چینی لوگ اپنے پچھلے شاعروں کے عشقیہ کلام سے عام طور پر واقف ہوتے ہیں۔ آج بھی بی۔ تائی پو کے اشعار جو ہزار سال سے اوپر ہوئے لکھے گئے تھے ہر طبقے کے لوگوں میں پڑے اور گائے جاتے ہیں۔ آپ چین میں بہت عشاق کی زبان سے بھی انہیں سن سکتے ہیں اور شام کو اپنے کھیت پر کسان بھی اب تک انہیں گاتا ہے۔

چین کے سب سے بڑے شاعر عشقیہ شاعری کرتے تھے۔ ڈراما یا نیا نیا تھیں چینیوں کی نظر میں دوسرے درجے کی چیز ہیں۔

چینی شاعری کے سب سے قدیم نمونے کوئی ۳ ہزار سال پرانے ہیں اور اس طرح چینی شاعری ہندوستانی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ دنیا کی سب سے قدیم شاعری کہی جاسکتی ہے۔ قوم میں اسکا عام رواج اب تک اس لئے ہو کہ اس طویل زمانے میں چین میں تقسیم کیا کوئی تغیر نہیں ہوا۔ چینی شاعری کے عروج کا زمانہ وہ ہے جسے اس وقت کے حکمران خاندان کے نام پر عہد تھانگ کہتے ہیں یعنی ولادت مسیح کے بعد کی ساتویں سے نویں صدی تک کا زمانہ۔

اس عہد کے دو سب سے مشہور شاعر لی۔ تائی۔ پو اور تھو۔ فو ہیں۔ لی عرصہ تک شاہ منگ ہوا تک۔ تی کے دربار میں رہا۔ بادشاہ نے ہر طرح اسکا اعزاز و احترام کیا لیکن اسکی طبیعت بے چین تھی۔ پخلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ دربار کو چھوڑ چل کھڑا ہوا اور سائے ملک میں پھر پھر کر لوگوں کو اپنے اشعار سے مسحور کرتا رہا۔ ۶۱ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ چینیوں نے



اس کی موت کا ایک افسانہ بنایا ہے جس سے تقریباً ہر چینی واقف ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی ایک مکہ شتی میں بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور یہ اپنے شعر گار ہاتھاک بچا ایک ایک عجیب سی موسیقی سنائی دی جس کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا۔ اس موسیقی کو سنکر پانی سے پیوں کی ایک فوج نکل آئی اور آسمان سے دو فرشتے اترے۔ ان دونوں نے کئی کو ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ ایک پری کے کندھے پر بیٹھ کر دونوں فرشتوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور انقی۔ مکہ پہنچ کر سنہری فضا میں غائب ہو گیا۔

تھو فوجوئی کے بعد اس عہد کا سب سے شہور شاعر ہے، کئی سے کوئی ۱۲ سال چھوٹا تھا۔ یہ دونوں بڑے دوست تھے۔ پہلے اس کا تعلق لمبی دربار سے تھا لیکن پھر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ جلاوطنی میں اس نے درد اور شوق سے بھری ہوئی نظمیں لکھی ہیں۔ ۵۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پچھلے ہزار سال میں بھی چینی شاعروں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں، لیکن آٹھویں صدی کی سی خوبی پھر پیدا نہیں ہوئی۔ پندرہویں اور سترہویں صدی میں بھی چین میں بڑا ادبی چرچا رہا۔ لیکن زیادہ تر کام نثر میں ہوا۔ آخری زمانے میں چینی شاعروں پر علمی رنگ زیادہ غالب ہو گیا لیکن اب بھی غنیمت شاعری کے اچھے نمونے کچھ بہت کمیاب نہیں ہیں۔

## تقدیر آدم

(کا نگ - فو - سے)

(۱۵۱۰ء تا ۱۴۴۰ء ق م)

خزاں کی خشکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے،

برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بیمار کے پھول بیج سجاتے ہیں۔

سولج جب صبح سوکر اٹھتا ہے تو سر خرو۔  
 جب شام کو سونے جاتا ہے تو سر خرو،  
 چھوٹے چھوٹے پٹھے سمندر سے جلتے ہیں،  
 زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے،  
 ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے باہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔  
 مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔  
 یہ مڑ کر دیکھتا ہے نہ لوٹ کر آتا ہے۔  
 اسکی ہستی ایک جباب ہے۔ ٹوٹا اور خستہ ہو گیا۔  
 اسکی زندگی کا حاصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اگتی ہے!

## دیوتاؤں کا قرض

(لی۔ تائی۔ پو)

(سنہ ۱۹۳۳ء)

دل میں درد کا ایک طوفان اٹھا،  
 میں نے اپنی زمریں بانسری سے انہوں کو ایک گیت سنایا!  
 وہ ہنسے اور کسی نے میرے دکھ کو نہ سمجھا۔  
 درد کی شدت سے میں نے اپنی زمریں بانسری کا رخ آسمان کی طرف کر دیا۔  
 اور اپنے گیت کا تحفہ دیوتاؤں کو پیش کر دیا۔  
 دیوناست ہو گئے اور روشنی سے دیکھتے ہوئے بالوں پر میرا گیت سن کر نہ چنے لگے۔  
 اب کیا ہے، اب میں آدمیوں کا دل پہلانے کے لئے بھی اپنا گیت سناتا ہوں۔

اور جب میں اپنی زمردیں بانسری سے گاتا ہوں تو یہ میرا گیت سمجھتے بھی ہیں۔

## پرویس میں

(لی - تائی - پو)

میں پرویس میں تھا۔  
میرے خیمے کے سامنے چاند نے چمکتی ہوئی سفید چاندنی بچھا دی تھی۔

سمجھا کہ شاید صبح کا سفیدہ ہے۔ جس کی چمک دیکھ رہا ہوں۔  
غور سے دیکھا، نہیں یہ تو چاند ہے، چاند، میرا چاند  
میں نے آنکھیں نیچی کر لیں  
دور سے کسی نے، میرے وطن نے مجھے اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ دیا۔

## آتشزدہ مکان

(تو - فو)

(۱۴۴۴ تا ۱۴۴۵ھ)

میرا پیارا مکان جس میں میں پیدا ہوا تھا، شعلوں کے نذر ہو چکا،  
جہاں یہ مکان تھا، آج کچھ راکھ ہے کچھ کوئلے۔  
ننگین تھکا ماندہ، میں ایک سنہری کشتی میں بیٹھ گیا،  
کہ شاید دنیا کی ننگینی دیکھ کر اپنا غم غلط کر سکوں۔

رات کا وقت تھا۔ میں نے اپنی بانسری پر ایک گیت گایا اب اس کا چاند تک پہنچ جائے۔  
 ایک شوق و تمنا سے لبریز گیت،  
 آہ۔ میرا گیت سن کر چاند بھی ٹھکین ہو گیا  
 اور اس نے بھی اپنے بوڑھے چہرہ کو ایک بڑے سے بادل سے ڈھانپ لیا۔  
 ناچار، میں پہاڑوں کے پاس گیا۔

لشکے پاس بھی میرے درد کا درماں نہ تھا  
 میں نے اپنی ساری داستان ان سے کہی، مگر۔ بیکار  
 اب تو میں سمجھا کہ میری خوشی، میرا چین،  
 میرے بچپن کی ساری یاد، راکھ کے اس انبار میں مدفون ہے جہاں پہلے کبھی میرا  
 مکان تھا!

میں نے موت کی دعا مانگی۔ میرا چہرہ زرد تھا،  
 سمندر کے کنارے بس اپنے کو موجوں کے سپرد کرنے کے لئے تیار تھا کہ میرے  
 پاس سے ایک ننھی سی کشتی گزری!  
 پہلے تو میں سمجھا کہ یہ کشتی نہیں، پانی میں چاند کا عکس ہے، لیکن نہیں، یہ ایک ننھی سی سفید  
 کشتی ہی تھی۔

جسے ایک عورت چلا رہی تھی!  
 لے لے تو، لے تو، کیا قسمت تھی کہ اس وقت میری آنکھ نے تجھے دیکھا اس وقت اپنی  
 زندگی کے سب پر درد پر یاں گھڑی میں۔

اب میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں، کہ میرے درد کا درماں کہاں ملے گا۔

اب میرا ایک مقصد ہے: تجھے پانا  
 لے میری بچا نیوالی، مجھے پناہ دینے والی،

اب میں تیرے دل میں اپنا مکان بناؤں گا !

## مایوسی

(لی - امی - بان)

(بارہویں صدی عیسوی)

مصیبت ، آنسو التجائیں اور دعائیں -

ہمیشہ وہی مصیبت ، ہمیشہ وہی آنسو ، وہی التجائیں  
لے بڑھیں آخر تیرا کیا حشر ہوگا ؟

گرمی کی خوشگوار راتوں کا احساس بھی نہیں ہوتا

کہ ملک پر بھر سردی کی فرما زوائی ہو جاتی ہے -

اور صبح کی ہوا میں درشتی اور تندی آ جاتی ہے -

دیکھو دیکھو وہ جنگلی راج ہنس پھر آئے ،

اور میرا دل در دے لبریز ہے -

جنگل کے پرندو ، پس نے کتنی دفعہ تمہیں آتے بھی دیکھا ہے ، جاتے بھی ؟

دیکھو تو ہر طرف گرسنگم کی کیا فراوانی ہے !

لیکن یہ پھول احراماں نصیب اور پڑ مردہ

کیا کسی کا جی نہیں چاہتا کہ اسے بھی آکر چن لے ؟

مدام اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں

کیا دن اب تک ختم نہیں ہوا ؟

پانی کی مٹی پھوڑ پڑتی ہے اور کلیوں کو غمناک بناتی ہے -

شفق ہلکے ہلکے ڈبے پاؤں نیچے اترتی ہے  
 شام ہوتی ہے رات دنیا پر چھا جاتی ہے۔  
 لیکن میرے اندر سب کچھ اسی طرح رہتا ہے جیسے تھا!  
 مصیبت، آنسو، التجائیں اور دعائیں!  
 کوئی ہے جو میرے زخمی دل سے اس کاٹنے کو کھینچ لے؟  
 ورنہ پھر یالوسی کا تسلط ہے اور موت!

## سروش لاہور

سروش پنجاب کا ممتاز ترین علمی ادبی مصور صحیفہ ہے جو اپنے بلند پایہ مضامین نظم  
 نثر کے باعث ملک میں خاص شہرت حاصل کر رہا ہے۔ اس کے صحیفہ نگاروں میں  
 پروفیسر غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے۔ پروفیسر غلام عباس ایم اے۔ پروفیسر فضل الدین  
 فیاض بی اے۔ سر ضیاء الدین برنی بی اے۔ مولانا احتشام الدین دہلوی ایم اے  
 حضرت اختر شیرانی۔ ایم شاہ دلی بھٹی بی اے۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اور حضرت راز  
 جیسے انشا پرداز خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک چٹوٹہ منگوا کر ملاحظہ فرمائیں۔  
 سالانہ قیمت تین روپے فی پرچہ ہے۔

ملنے کا پتہ - میجر رسالہ سروش لاہور

## تنقید و تبصرہ

اسلامی قانون فوجداری - حجم ۴۴ صفحہ ۱۰۰۰ کتابت و طباعت ابھی - کاغذ چکنا۔  
ملنے کا پتہ - دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۲۲۱ھ میں مولانا سلامت علی خاں عرف خذاقت خاں جو شہر محمد آباد میں عدالت مرافعہ ثانیہ میں احکام شرعیہ لکھنے پر مامور تھے فقہ حنفی کی مختلف کتابوں سے اسلامی تعزیرات کے مسائل ایک مجموعے میں ترتیب کے ساتھ جمع کر کے اسکا نام کتاب الاختیار رکھا تھا۔ اب اس کو میرا حمد شریف صاحب دیکس درجہ اول حیدر آباد دکن کے ایم اے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے سلیس اردو میں ترجمہ کر دیا اور دارالمصنفین نے اپنے مطبع سے شائع کیا۔

آئینہ اردو - حجم ۱۶ صفحہ - لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط قیمت ایک روپیہ۔  
ملنے کا پتہ کتب خانہ تجارتی - اسٹار بک ڈپو نمبر ۴۴ لورسٹر روڈ کلکتہ

یہ کتاب مولوی محمد شفیع اللہ صاحب صفی آروی بید مولوی شمع اسکول گیارنے تالیف کی ہے جس میں اردو رسم الخط کے قواعد اور املا کے ضوابط الفاظ مستعمل کی تذکرہ و تائید مع سند مترادفات کی تشریح عبارت نگاری کے اصول اور دیگر بہت سے فوائد دیئے گئے ہیں۔ اور جو کچھ لکھا ہے۔ تحقیق کاوش کے ساتھ لکھا ہے۔ مولف کی محنت اور کتاب کی خوبی قدر کے قابل ہے۔

میرے خیال میں اردو کے ہر ناظم و ناظر کے لئے یہ کتاب مفید ہے۔ اور اس زبان میں اس کی حیثیت اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی عربی میں ادب الکاتب و الشاعر کی ہے۔

رسالہ چمنستان - یہ ماہانہ ادبی رسالہ محمد افضل خاں اور سید ظفر ہاشمی صاحبان کی ادارت میں امرتسر

سے نکلتا ہے۔ حجم ۵۰ صفحے کا ہوتا ہے۔ اسکا جنوری نمبر خصوصیت کے ساتھ سالانہ نمبر کے نام سے بہت مفیم نکالا گیا ہے جو ادبیات نظم و نثر کا نہایت دلچسپ مجموعہ ہے۔ اڈیٹروں کی محنت اگر اسی طرح قائم رہے تو یقیناً یہ رسالہ بہت کارآمد ہو جائے گا۔ قیمت سالانہ ۵ روپے

**عزیز**۔ یہ رسالہ تعلیمی اور اخلاقی ہے۔ اور گو رکھپور کے دو مشہور رئیسوں سید جواد علی شاہ (ایساں صاحب) اور خان بہادر مرثیہ محمد اسماعیل صاحب بیرسٹرا ایم۔ ایل۔ سی کی سرپرستی اور ہیڈ ماسٹر صاحب جابج اسلامیہ ہائی اسکول گو رکھپور اور مرثیہ شاکر علی بیرسٹر کی نگرانی میں مولوی بدیع الزمان صاحب اعظمی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اسکول کے طلبہ کے لئے حسب ضرورت اور حسب حال مختلف قسم کے اخلاقی اور علمی مضامین نیز نصاب اور معلومات سلیس زبان میں لکھی جاتی ہیں۔

رسالہ کا حجم ۲۲ صفحے ہے اور ماہوار ہے۔ قیمت سالانہ ۵ روپے  
اگرچہ ہم گو رکھپور جیسے مقام سے اس رسالہ کو غنیمت سمجھتے ہیں لیکن یہ نشورہ ضرور دیں گے کہ بچوں کے دوسرے رسالوں کی طرح جو ملک میں نکل رہے ہیں مثلاً ہونہار یا نو نہال وغیرہ اگر اس میں بھی تصاویر کا سامان کیا جائے تو یہ بچوں کے لئے زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید ہوگا۔

**خضر راہ**۔ یہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ماہوار علمی اور ادبی رسالہ ہے جس کے دبیر نمبر کی بابت ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔

دارالعلوم ندوۃ اسلامی اور مشرقی علوم کا مرکز ہے۔ ہم اس کے ارگن سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسلامی روایات اور مشرقی عالمانہ شان کو قائم رکھے گا۔ خضر راہ ہر چند اچھا رسالہ ہے اور محنت اور کوشش سے تیار کیا جاتا ہے اور ایک حد تک مفید مضامین شائع کرتا ہے لیکن اس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی ہم اس دارالعلوم سے امید رکھتے ہیں۔

شذرات کا انداز بیان بھی کچھ ہم کو پسند نہ آیا۔ یہ ”جذباتی طنزیہ“ طرز تحریر مدبر ”سچ“



دریابادی کے لئے چھوڑ دینا چاہئے اور طلبائے علوم اسلامیہ و مشرقیہ کا قلم اس سے زیادہ محقول اور متین ہونا چاہئے۔

نسوانی دُنیا۔ عورتوں کے لئے ایک دیدہ زیب نیم تہنی و بندہسی اور نیم علمی و اسلامی ماہوار رسالہ زیر ادارت شوکت علی صاحب فہمی خواجہ بک ڈپو دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کی قیمت سالانہ ۷۰ روپے۔ رسالہ کی چھپائی اچھی ہے اور تصویریں بھی دیکھائی ہیں۔ شوکت علی صاحب فہمی ایک خوش رزق و قلم ستم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں جس کی جولانیاں دلکش ہوتی ہیں امید ہے کہ نہ صرف اپنی تعلیمی قوت بلکہ اپنی دماغی اور قلبی قوتوں کو بھی وہ نسوانی دنیا کی ترقی اور اصلاح میں صرف کریں گے۔ کیونکہ مسلمان عورتوں کے معاند اور خیالات کی خرابیوں اور انکی فضول رسموں اور جہالتوں سے قوم قعر مذلت میں گرتی جا رہی ہے۔

قول حق۔ مصنفہ اکبر شاہ خان صاحب لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ تقطیع ۲۰×۲۴ صفحات ۲۴ قیمت فی نسخہ ۷۰ روپے۔ ملنے کا پتہ منیر صاحب عبرت نجیب آباد۔ ضلع بجنور (یوپی) ہمارے دوست اکبر شاہ خان صاحب (میں نے مولوی یا مولنا کا لفظ قصداً انکے نام کے ساتھ نہیں لکھا کیونکہ ان کو ان الفاظ سے نفرت ہو) ان خالصین اور مفکرین ارباب علم میں سے ہیں جو حق کے ساتھ امت اسلامیہ کی حالت پر غور کرتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کو اخلاص و درمندی و امانت داری اور جرأت کے ساتھ لکھ دیتے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے قومی لیڈروں کے متعلق ”اکابر قوم“ کے نام سے ایک رسالہ اسی طرح کا شائع کیا تھا۔ اب یہ کتاب ”قول حق“ کے نام سے لکھی ہے جس میں انہوں نے امت کی تفریق اور تباہی کے اسباب۔ انکی تاریخ اور انکے اذالہ کی تدبیریں بتائی ہیں۔ اور بالخصوص مسلمانان ہند کے اسباب تنزل سے بحث کی ہے اور جو مذہبی اور دینی خرابیاں ان میں پیدا ہو گئی ہیں ان کو ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد اصلاح

دینی و دنیاوی کے لئے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پیش کی ہیں۔ اور تدبر فی الہدٰی اور کتاب و سنت پر عمل کر نیکی و عتد دی ہے۔

مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر اخلاص اور درہندہ سے لکھا ہے کہ دل پر اسکا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ سراسر حقیقت ہے اور یہی وجہ ہوگی کہ اسکا نام انہوں نے قول حق رکھا۔ میرے خیال میں انکی یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر بڑھا لکھا مسلمان اس کو پڑھے اور اس پر عمل پیرا ہو۔ یہ سمجھنے کے لئے آسان۔ تفرقہ منانے والی اور حقیقت اور وحدت امت کی طرف لیجانے والی ہے۔

رسالہ ادب - یہ ماہانہ رسالہ اردو ادب کی خدمت کے لئے سید غلام حسین صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اسکا حجم ۲۰x۲۶ تقطیع پر چار رجز ہوتا ہے اور قیمت چار روپیہ سالانہ ہے۔

اردو کے متعدد ادبی رسائل ملک میں جا بجا شائع ہوئے ہیں لیکن اس رسالہ سے ہم خصوصیت کے ساتھ بہت کچھ توقع رکھتے ہیں کیونکہ یہ اردو کے ایک عظیم الشان مرکز یعنی لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ جہاں اردو نے تربیت پائی ہے۔

اسکے چوتھا نمبر جنوری ۱۹۳۷ء کا ہمارے سامنے ہے جس کی ظاہری اور مغوی خوبیاں دونوں قابل تحسین ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ آئندہ یہ رسالہ ترقی کرے گا۔

ہمارے نزدیک محض نشر و نظم شائع کر لینا کوئی بڑی خدمت اردو زبان کی نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ علوم ادبیہ بحث و تحیص کے بعد مرتب کئے جائیں۔ اگر اس رسالہ کی ادارت کے پیش نظر یہ امر رہے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ اس میں کامیاب ہو سکے۔

ملنے کا پتہ: دفتر ادب متصل چوراہہ یحییٰ گنج لکھنؤ

ہونہار۔ جامعہ ملیہ کے فانی طلبہ نے پچھلے ۹ سال میں قوم کی اور کوئی خدمت کی ہونی انکی ہو۔ اردو صحافت میں انہوں نے یقیناً قابل قدر حصہ لیا ہے آج کوئی آٹھ روزانہ اور ہفتہ وار اردو اخبار بالکل جامعہ کے سابق طالب علموں کے ہاتھ میں ہیں لیکن بیخبات عملاً سیاسی ہیں۔ جامعہ کے اپنے کام کو محض وقتی سیاست تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ ان تعمیر کو خستہ نہیں حصہ لینے کو اور بھی ضروری سمجھتے ہیں، جنکا اثر آج کل میں نہیں بلکہ ایک عرصہ بعد ظاہر ہوتا ہے لیکن دیر پا بھی ہوتا ہے۔

ان تعمیر کو خستہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت سب اہم کام ہے، بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس کے علاوہ بلکہ بعض حیثیت سے نئے مدرسے قائم کرنے سے زیادہ ضروری بچوں کے ٹوفیڈ کتابوں اور رسالوں کا شائع کرنا ہے جس میں اب تک اردو زبان افسوس کہ بہت کم مایہ ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ کے سابق طالب علم فیاض حسین صاحب سیم نے بچوں کے لئے ایک بالتصویر ماحوار رسالہ ہونہار نامی نکالا ہے۔ اس کے ۳ نمبر ہمارے سامنے ہیں اور انکو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور بچوں بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس کے مضامین کی عبارت سہل و سلیس ہوتی ہے اور بچے اسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی دیدہ زیب ہے اور سرورق نہایت خوشنما تصویروں کا بھی انتظام ہے۔ اور آئندہ تصاویر کے طبع ہونکی توقع ہے جن لوگوں کے بچے اردو پڑھنا سیکھ چکے ہیں انہیں یہ پرچہ ضرور شگاف کر بچوں کو دینا چاہئے سال بھر کے لئے سہ ماہیہ صرف بچوں کے سرپرستوں کے لئے اس رقم کا بہت اچھا صرف ہوگا۔

سننے کا پتہ : رسالہ ہونہار، صدر بازار، دہلی

# شذرات

”ناظرین جامعہ کو اس سے پہلے اخبارات کے ذریعہ یہ خبر معلوم ہو چکی ہوگی کہ علیحضرت نظام کن خداداد ملکہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لئے پچاس ہزار یکشت اور ایک ہزار روپیہ مہوار کی مستقل امداد عطا فرمائی ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے ہر ہائس نواب صاحب بھوپال نے ایک ہزار روپیہ مہوار مقرر فرمایا اور عمارات کے لئے ڈیڑھ لاکھ کا وعدہ فرمایا ہے۔ ملک کے تمام اخبارات نے بلا قید مسک ان خبروں پر جو اظہار شکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں روشن خیال والیان ملک کو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوستان کی قومی زندگی میں کیا اہم بان شان مرتبہ حاصل ہے۔ اس وقت جب کہ امارت و اخلاص کی تفریق پر زور دیکر لوگوں میں نفرت کے بیج بونا ایک گروہ کے نزدیک مذہبی فرض کی حیثیت اختیار کر رہا ہے ان دو ہستیوں نے اپنی زندگی اور اپنے عمل سے براہ ثابت کیا ہے کہ امارت و اخلاص کی اہمیت جو اور اس حقیقت کو روشن کر دیا ہے کہ سروری و دین ماضی شکر کی است۔

جامعہ والے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان والیان ملک لیکن خادان ملت سے انکی دستگیری کرائی اور ایسے وقت میں جب خدا پر ہر دہلے اور اپنے کام کی اچھائی پر اعتقاد کے علاوہ انکے پاس کچھ نہ تھا اس نے ان دو چشمہائے فیض کا رخ جن سے ہمارے ملک کے لاتعداد ادوارے فیضیاب ہوئے ہیں، جامعہ کی طرف بھی پھیر دیا۔ ان گرانقدر عطیات سے پہلے جامعہ دہلی کے کن کن مشکلات میں اپنے کام کو چلا رہے تھے۔ اسکا علم بہت کم لوگوں کو ہے اس لئے ہمارے جذبہ شکر کی شدت کا اندازہ بھی دشوار ہو گا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اظہار شکر کی صحیح شکل یہ ہے کہ ہم اس سیر کی حالت میں بھی ان مقاصد کو نہ بھولیں جن کی خاطر عسر و کربورداشت کیا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان نقاصد کی خاطر محنت و ریاضت کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سے جو امیدیں ہمارے محسنوں اور ہمدردوں نے قائم کی ہیں ہم انکے اہل ثبات ہوں۔

فان مع العسر يسرا ، ان مع العسر يسرا  
فانوافرغت فانصب ، والى ربك فارغب

پایج سستمہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اس لئے نہیں کہ اس مہینہ میں جو یہاں  
تحریک جہانگاندھی اور ان کے ساتھیوں نے احمد آباد سے شروع کی ہے اس کے جلد کامیاب ہونے  
کی کوئی توقع ہے بلکہ اس لئے کہ کامیابی و ناکامی کو خدا پر چھوڑ کر ایک کرم یوگی نے سیاست ہند میں پھر  
ایک بار اس راہ پر گامزن فرمائی ہے جسے وہ اپنے ملک اور اپنے ملک کے واسطے سے انگلستان اور  
ساری دنیا کے لئے نجات و فلاح کی راہ جانتا ہے۔ آج سے دس سال قبل بھی اس نے اور اس کے  
ساتھ مسلمانوں کے مقتدر رہنما علی برادران نے اس راہ پر قدم اٹھایا تھا لیکن اس وقت ہندوستان  
کے سامنے معاملہ اس فصاحت سے نہیں آسکتا تھا جیسا اس مرتبہ ممکن ہے۔ ملک میں مختلف گروہوں  
کو مختلف شکایتیں تھیں، مسلمانوں سے ترکی کے معاملے میں بدعہدی کی گئی تھی، جنگ کے زمانے میں  
ملک موجودہ وعدے ہوئے تھے انکی تعبیر علیا نوالہ باغ میں ملی تھی، ملک کی سیاسی جماعتیں جن میں تعلیمیت  
ہندوستانیوں کا نفوذ ہے حقوق سیاسی کے مطالبے یعنی کونسلوں میں زیادہ نیابت، ملازمتوں میں  
زیادہ جگہوں کے لئے کوشاں تھیں، ان سب کو ساریستی کے ایک سادھو نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور  
عدم تشدد کی شرط لگا کر سب کے دکھوں کی دار و تلاش کرنے نکلا تھا۔ اس تلاش میں بھی اس نے  
عدم تشدد کو شرط اول قرار دیکر اور پھر غریب کسانوں کی خاطر کھد کر کو اپنے سیاسی لائحہ عمل کا لازمی  
جزو بن کر سیاست ہند کو بالکل نئی راہ پر ڈالنا چاہا تھا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا تھا۔  
لیکن تحریک میں عام فساد کی اور سیاسی فضا میں اس پروردگی کے بعد عدم تشدد کے اصول پر دست  
داری سے قائم نہ ہونے کے باعث ہوئی اور پھر تنگ دل ساتھیوں کی غلطیوں سے اور کوتاہ بین دوستوں  
کی زود رنجیوں سے اس حد کو پہنچی کہ ملک کا ہر بچا ہی خواہ اس پر خون کے آنسو روتا تھا اس سادھو  
نے پھر سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو اس مرتبہ ان دو چیزوں کو (جو حقیقتاً سیاست ہند میں

اس کا مخصوص اضافہ ہے، بالکل واضح کر دیا۔ ان میں سے ایک چیز مقصد سے متعلق جو دوسری طریقہ کار سے۔ اب ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں یہ ممکن نہ ہو گا کہ چند تعلیم یافتہ لوگ اپنے کروڑوں ہم قوموں کے مفاد کو نظر انداز کر کے بس اپنی بیسیں بھرنے کی سیاست ملکی کی واحد غرض سمجھیں۔ ہندوستان میں سوانح کے معنی ان کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کی حق یا جانی ہوں گے جو اب تک بے زبان تھے اور جن کا نام لے لیکر ہمارے تعلیم یافتہ ہندوستانی ایک سفید و فتریت کے بجائے سیاہ یا گندمی و فتریت قائم کرنا چاہتے تھے۔

طریق کار میں عین اس وقت کہ تشدد کی قوتیں زور پکڑ رہی تھیں اور بہت ممکن تھا کہ ان قوتوں کی ناقابت انڈیاں اور عجلت پسندیاں ملک کو ایک غیر متعین عرصہ تک کے لئے تہمت کشت و خون اور دلوں کو بے سود نفرت و حقارت کا آماجگاہ بنا دیتیں اس منہج شناس سادھو نے پھر عدم تشدد اور پر امن سعی کے لئے وہ راہ نکالی جو صرف اسی وقت ملک کو محرک و محرک تشدد پسندوں کے تجربے سے محفوظ نہ کرے گی بلکہ آئندہ کے لئے بھی مسائل کے تصفیہ کا ایک موثر طریقہ بتلا کر ملک کو شدید خانہ جنگیوں سے بچا سکے گی۔

ہر ملک کے نوجوان آزادی کی جنگ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ ہندوستانی نوجوان بھی اس جدید تحریک میں شرکت کے لئے بیتاب ہوں۔ پچھلے دنوں اس قسم کی متعدد خبریں شائع ہو چکی ہیں کہ سرکاری کالجوں کے طالب علموں نے کہیں تو می جھنڈا لگا کر کہیں تقریروں اور نعروں سے اس تحریک کے ساتھ اپنی ہمدردی کے ثبوت کی کوشش کی اور نادان معلم نے ان نوجوانوں کے دلوں کو امتحانوں، سندوں، ملازمتوں کا واسطہ بن کر روکا۔ کاش یہ معلم سمجھتے کہ انکے سپرد ان نوجوانوں کی روحوں کی پرورش کا کام ہے نہ انکے قتل کا! تعلیم و سیاست کے تعلق پر بے ربط اور کٹھن بے معنی خیالات کا اظہار اس سنگین جرم کی نوعیت میں ذرا تغیر نہیں پیدا کر سکتا جو نفسیات شباب سے ناواقف معلم سے ایسے موقعوں پر سرزد ہوتے

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر علی سیاست میں شرکت سے مصالح شخصی کی بنا پر نوجوانوں کو روکا بھی جائے تو ہر پہلے معلم کی ذمہ داری تو ضرور ہے کہ وہ موجودہ تحریک کے مذکورہ بالا دو عناصر خصوصی کو ہندوستانی طالب علم کے ذہنی متاع کا جزو بنانے میں مدد دے۔ جدید تعلیم نے ہندوستان کو تقریباً دو مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک قوم میں ہندوستان کے گرد و دل محنت کش ہیں اور دوسری قوم میں تھوٹے سے سفید پوش جوان کے نام سے اپنی روزمی اپنی عزت اور اپنی نمود کا سامان کرنا چاہتے ہیں۔ ہر فرض شناس ہندوستانی معلم کو چاہئے کہ وہ ان نوجوانوں کو جن کی ذہنی و اخلاقی تربیت اس کے سر پر ہے اس شرمناک خواہش سے دور رکھے کہ وہ اپنے غریب بھطنوں کے مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنی اغراض کو پورا کرنا چاہے۔ اس لئے کہ اس کا لازمی نتیجہ جلد یا بدیر وہ ہوتا ہے جو روس میں اس ملک کے تعلیمی طبقہ کا ہوا۔ خدا ہندوستان کو اس دن سے بچائے۔ جب صدیوں کے اس جماعتی فرض کو زمین کی سطح میں چکانے کے لئے اس تعلیم یافتہ طبقے کے ساتھ ہماری ذہنی زندگی کے قیمتی عناصر بھی تباہ و برباد کئے جائیں۔

دوسری چیز جس کا راسخ عقیدہ معلمین کو اپنے طلبہ کے دلوں میں بٹھانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مخصوص حالات میں تمام مسائل سیاسی و جماعتی کا حل پر امن طریقوں سے ہونا چاہئے۔ علاوہ ان بے شمار فوائد کے جو اس وقت اور آئندہ ہمارے ملک کو اس سے حاصل ہونگے۔ اس کا کامیاب تجربہ ساری دنیا کے لئے ایک بڑی برکت ثابت ہوگا۔ اس طریقہ کار کے لئے میدان عمل فراہم نہ کرنا اور اس تجسس رب کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا بلا قصد ان تشدد پسند جماعتوں کے اثر کو بڑھانا ہے جن کا اثر ان فوس ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

نوجوانوں کے معاملہ میں معلمین کی ذمہ داری جتنی بڑی ہے اس سے بھی زیادہ اس وقت مسلمانان ہند کے معاملہ میں ان کے سیاسی رہنماؤں کی ہے۔ مسلمانوں میں آزادی کی محبت و ارادت ہے۔ ان کی مذہبی روایات میں غلامی و محکومی کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں۔ لیکن دنیا میں ایک سو

دن کبھی کسی کے نہیں رہتے۔ یہ قوم جو آزاد تھی اور دنیا کو غلط توہمات اور غلط اداروں سے آزاد کرنے کو اپنی غایت وجود جانتی تھی آج محکوم ہے مگر پچھلی آزادی کی تحریک میں اس نے جس جگر سے حصہ لیا، اس نے امید دلائی تھی کہ اس کا سینہ ابھی تک حریت نوازی کے جذبات سے معمور ہے۔ اس تحریک کے دہجانے کے بعد ملک میں اور بیرون ملک کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ اس نے تحریک آزادی سے بے تعلقی سی کر لی۔ ادھر ترکوں نے خلافت کو ختم کیا اور اس کی وجہ سے جو عام سیاسی پچپی مسلمانوں کو پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہوئی اور ہر کچھ تنگ نظر اور تنگ دل ہندوؤں نے اپنی مخصوص اغراض کے حصول کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کی اور ملک کی سیاسی فضا کو شبہ اور رقابت کے جذبات سے آلودہ کر دیا۔ مسلمانوں کو خیال ہوا کہ اس قسم کی اکثریت کے ساتھ نجات و مشکل ہے۔ اپنی تعداد کی کمی، علم کی کمی، دولت کی کمی کے باعث انہوں نے اس شکل کا مبالغہ آمیز تصور بھی اپنے ذہن میں قائم کر لیا۔ خود غرض لوگوں نے جو ان میں ہندوؤں سے بے اعتباری کو محسوس انگریزی کی مضبوطی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اس تصور کو اور قوی کیا۔ اس شبہ اور بے اعتباری کی فضا میں حقوق سیاسی کے تعین کی، مبارک کوشش شروع ہوئی اور نہرو رپورٹ پر بحث و گفتگو پھیلنے لگی۔ اس میں بظاہر مسلمان ہندوؤں سے بالکل الگ ہو گئے۔ ان دو جماعتوں کی باہم مخالفت کو رفع کرنے کی طرح طرح کوششیں ہوئیں لیکن ہندوؤں کی ایک جماعت اپنی کوتاہ اندیشی سے مسلمان اقلیت کو کسی طرح اپنی نیک نیتی کا یقین نہ دلا سکی۔ ادھر مسلمانوں کے رہنماؤں نے ایک فرضی دستور العمل میں اپنے حقوق کے تسلیم کے جانے کو نادانی اور بیکاری کے باعث ایسی اہمیت دی جس سے عاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رہنماؤں میں سیاسیات کے حقائق کا صحیح حس نہیں اور وہ اپنے گفتگو کے تعلیمیافتہ لوگوں کی نوکریوں اور کرکسی نشینیوں کو اپنی پوری قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔

بہر حال اسی شبہ و اختلاف کی فضا میں یہ نئی سیاسی تحریک شروع ہوئی۔ اور غالباً ہمارا اندازہ غلط نہیں کہ اگر تشدد پسند جماعت کے ہاتھ میں ملک کی سیاست نہایت تیزی سے جاتی نہ دکھائی دیتی تو ہوتا مگر اندھی اس ہندو مسلم اختلاف کی وجہ سے ابھی اس قسم کی تحریک کا ارادہ



نہ کرتے۔ لیکن اب یہ تحریک شروع ہو چکی۔ مسلمانوں کے بعض ذمہ دار لوگوں نے اپنی پوری کوا س سے علیحدہ رہنے کا مشورہ بھی دیدیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مشورہ غلط ہے اور اگر ہم مسلمانوں کے خارج ملی اور انکی روایات جماعتی کو صحیح سمجھیں تو ہمارا یقین ہے کہ اس مشورہ پر عمل بھی نہ کیا جائے گا۔ اور یہ مشورہ ہماری سیاست کی ان لاتعداد بے احتیاطیوں میں شمار کیا جائے گا جنہوں نے بیوقوف تیزی سے ہمارے مفاد ملی کو نقصان پہنچائے ہیں۔

مسلمان اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انہیں اگر اس ملک میں رہنا ہے تو ہندوؤں سے بچنا و کرنا ہوگا۔ بیشک عزت کا بچنا و کرنا اپنی ملی خصوصیات کو ترک کر کے بچنا و جماعتی موت کے مرادف ہوگا۔ اس بچنا و میں انہیں اپنے حقوق منوانے ہوں گے۔ مسلمانوں نے دنیا میں آکر اپنی حقوق منوائے ہیں اس لئے وہ جانتے ہیں کہ سیاست میں خیرات نہیں ملتی بلکہ جو کچھ حاصل ہوتا ہے بازو کے کس بل، دماغ کی صحت، اور اخلاق کی استواری سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے اس دھوکہ میں نہ آنا چاہئے کہ اگر اس نے روٹھ کر یا جلا کر، یا خوشامد کر کے کسی دستو سیاسی میں اپنی حقوق لکھوائے اور ان حقوق کے حاصل کرنے کی قوت اپنے اندر نہ پیدا کی تو اس دستور کے الفاظ کسی مقدس الہام کی طرح سب کے لئے واجب العمل ہونگے۔ اگر مسلمانوں میں یہ قوت نہیں کہ ہر وقت ان حقوق کو منواسکیں اور اپنے عمل سے ہر وقت اپنے کو ان حقوق سے زیادہ کا اہل ثابت کرتے رہیں تو ان دفعات تحفظ حقوق کی قیمت اس کاغذ کے پرے سے زیادہ نہ ہوگی جس پر وہ لکھے جائیں گے۔ حیات قومی میں حقوق کے دفعات قوم کے خون و دار کے پسینہ سے لکھے جاتے ہیں تب تو پاؤں اڑھتی ہے۔ اگر مسلمان اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تو انکے لئے ہندوستان میں تین راہیں مکی ہیں۔ اگر انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ہندوؤں سے کسی طرح بچنا و اور سمجھوتہ ممکن نہیں تو انہیں (۱) یا تو ملک میں ایک خالص اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کرنی چاہئے (۲) یا پھر ملک میں جمہوری اداروں کے قیام کی یکسر مخالفت کرنی چاہئے اور انگریزوں کا ساتھ خود انگریزوں سے زیادہ دینا چاہئے۔ یعنی اگر انہی مصالح سے ہندوؤں کے مقابل میں کمزوری دکھائے تو انہیں انگریز سے برسر پیکار ہونا پڑے گا۔

اگر وہ ملک چھوڑ کر جانا چاہے تو انہیں اسے روکنا چاہئے۔ (۳) یا اپنی قوت کو بڑھا کر ہندوؤں کے ساتھ باعزت اشتراک عمل کو ممکن بنا چاہئے۔

مسلمان رہنمایان سیاسی میں اسلامی حکومت کے قیام کے نام سے ہر شخص کانوں پر ہاتھ دھر چکا ہے۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ یہ کوشش نہ ممکن ہے نہ مفید۔ اس وقت کوئی ذمہ دار رہنما جمہوری اداروں کے قیام کا بھی مخالف نظر نہیں آتا۔ اس لئے اگر یہ دونوں صورتیں مسلمانوں نے اپنے لئے پسند نہیں کیں تو سوائے تیسری صورت کے اور کوئی راہ ہیں انکی سیاست کے لئے نظر نہیں آتی یعنی ہندوؤں سے اشتراک عمل۔ باعزت و مساویانہ اشتراک عمل جو صرف اسی وقت ممکن ہے کہ یہ اپنے کو مضبوط بنائیں اور حیات قومی کے لئے مفید و ناگزیر۔

اس مقصد کے لئے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حصول آزادی کی کوشش کی کیسے ملحدگی کیسے ہمدردی معادن ہو سکتی ہے۔ قوت جہد و عمل سے نشوونما پاتی ہے اگر کھڑے کھڑے تاشہ دیکھنے سے نہیں بڑھتی جو ہندو آج اتنے مضبوط ہیں کہ مسلمان ان سے ملکر اپنی حیات جماعتی کو خطرہ میں سمجھتے ہیں وہ اس جہاد حریت کے بعد اگر وہ اس میں ناکام بھی رہیں تو اس سے کہیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔ اور جو مسلمان آج اپنی کمزوری کا اتنا یقین رکھتے ہیں کہ اپنی قوت کے بھروسہ پر اپنے کو تحریری ضمانتوں سے بے نیاز نہیں سمجھ سکتے وہ اگر کھڑے کھڑے متہ کیس گئے تو اس سے زیادہ کمزور ہونگے۔ اور اعتباری قوت کا یہ تفاوت جس قدر بڑھیکام باعزت اشتراک عمل کے امکانات کم ہونگے اور بے عزت مجبوری کے زیادہ! خدا ہماری قوم کو صراط مستقیم دکھائے اور اس کو عزت دے کہ ملک کی عزت کو چار چاند لگائے۔ اسکا گمراہ ہو کر پس جانا خود اس کے لئے مصیبت نہ ہوگا بلکہ بہائے ملک کی زندگی جس میں یہ وسعت نظر، ہمت، شجاعت، رواداری کا حامل ہو اسکی تباہی سے تباہ ہو جائے گی۔ کہ یہی صدیوں تک اس کا دل زندہ رہا ہے

ہیں یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ رہ جائے کہ زندگیانی عبارت ہو تیرے جیسے سو

# مطبوعات ہندوستانی ایکادمی صوبہ متحدہ

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات | از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم لے۔ ایل ایل۔ ایم

سی بی ای۔ مجلد قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ غیر مجلد ایک روپیہ  
۲۔ اردو زبان اور ادب۔ از سید ضامن علی قیمت ایک روپیہ

۳۔ مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات | از مولانا سید سلیمان صاحب مذوی

قیمت صرف چار روپے (للعہ)

طبع  
زیر

۱۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔ از مولانا محمد امین صاحب عباسی  
۲۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ از رے بہادر مہا ہوپا دھیانیہ پٹت

گوری شنکر ہیر چندا دجھا

۳۔ ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کرپوری

۴۔ ناٹن۔ (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمن صاحب ایم لے۔ ایم آر۔ لے ایس

۵۔ ترقی زراعت۔ از ناصح مولوی محمد عبدالقیوم ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت الہ آباد

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی (لیو۔ پی) الہ آباد



# THE NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY

## BOOK-DEPOT

DELHI.

---

*The Spirit of Islam*: New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added to this new edition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the Chapter on "The Rationalistic and Philosophical Spirit of Islam". By the Rt. Hon. Syed Amir Ali, P. C., L. L. D. C. I. E.

Rs. 20-

*Studies in Persian Literature*: An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and a Criticism of the poetry of Firdawsi, Manu- chehri and Unsuri. By Syed Hadi Hasan B.A., B.Sc. (Cantab)

Rs. 5-

*Islamic Culture and National Education*: By Dr. Sir. P. C. Roy, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab), Bar-at-Law.

As. -8-

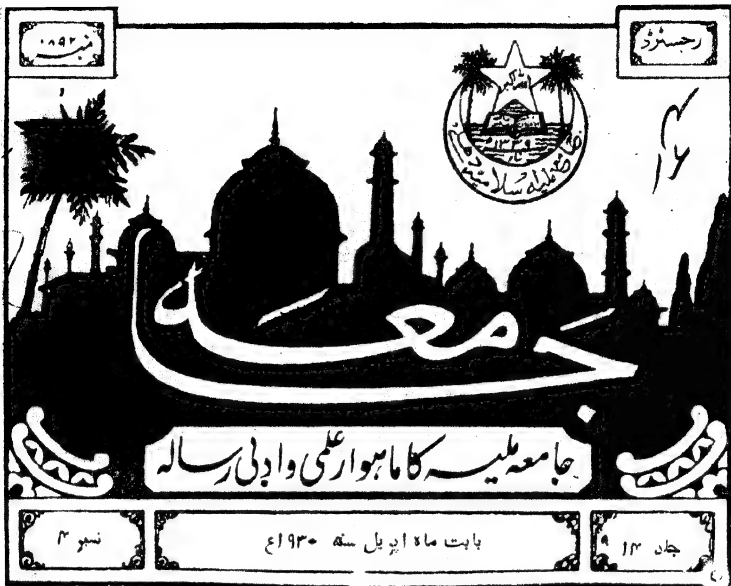
*Laolus and other Poems*: Charminglly bound. Printed at the Jamia Press in clear type. The Volume makes an appropriate gift for those who not only appreciate handsome books but desire to read and re-read the books they possess. By Eric Dickinson.

Rs. 2-4-

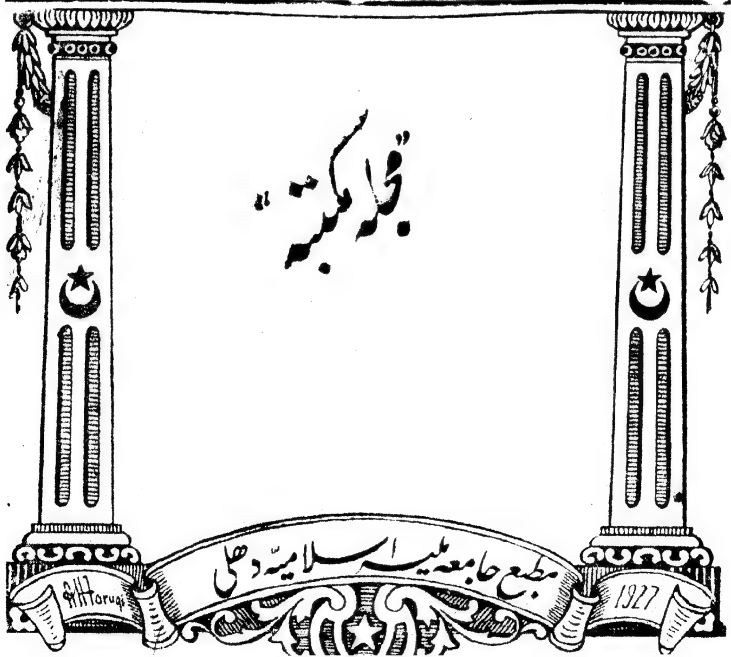
*Thoughts on the present Discontent*: Reprinted from the "Times of India" and the "Indian Spectator." By Maulana Mohammad Ali.

Rs. 1-

---



”مکبہ“





بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# جانب

زیر ادارت

مولانا اسلم حیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابۃ ماہ اپریل ۱۹۳۰ء	نمبر ۲
--------	----------------------	--------

## فہرست مضامین

- |     |   |                                     |
|-----|---|-------------------------------------|
| ۲۴۲ | (قاضی عبدالغفار صاحب)                       | ۱۔ میح الملک مرحوم کا سفر نامہ یورپ |
| ۲۵۲ | عبدالحلیم صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ        | معتزلہ                              |
| ۲۶۵ | شفیق الرحمن صاحب بی۔ اے، استاد جامعہ        | ۲۔ مالیات ہند                       |
| ۲۷۵ | .....                                       | ۳۔ مسئلہ تاوان جنگ                  |
| ۲۸۰ | مولوی محمد اسلم صاحب حیراجپوری، استاد جامعہ | ۵۔ کتب لغت عربی                     |
| ۲۸۵ | محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)                | ۶۔ باغبان                           |
| ۳۱۰ | ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی پی ایچ۔ ڈی     | ۷۔ رائنر مار یارکے                  |
| ۳۱۷ | .....                                       | ۸۔ شذرات                            |



# مسیح الملک مرحوم کا سفر نامہ یورپ

مسیح الملک مرحوم و مغفور کی وفات کے بعد ہی میں نے کوشش کی تھی کہ ان کے کاغذات و مسودات کو محفوظ کر دیا جائے اور جہانگیر میری دسترس میں نہ پہنچے کی، لیکن یہ ایک تعجب انگیز اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سوائے چند منتشر پرچوں اور دس سبب خطوط کے مرحوم کے سامان میں اور نیز دفتر میں کاغذات کا کوئی ایسا ذخیرہ نہ ملا جو اس کے کسی سوانح نگار کے کام آسکتا۔ مسیح الملک مغفور اپنی زندگی میں ذاتی طور پر ہمیشہ بے سرو سامان رہے، دولت اور عزت کی بہت بلند سطح پر پہنچنے کے بعد اُن کی زندگی میں معمولی ضروریات کا سامان بھی اس قدر کم تھا کہ جب کوئی لمبا سفر و شہر میں ہوتا تھا تو اکثر دھوبی کے یہاں سے دھلے ہوئے کپڑے لٹکائے جانے کی فکر کی جاتی تھی، گناہ سے بچنے کے چند کرتے اور پاجامے اور چند بکلیں ایک پرانے سوٹ کیس میں، یہ سب سامان تھا جو اُن کے لئے کافی ہوا کرتا تھا اور اپنے اس توشہ خانہ کی بھی ان کو کبھی خبر نہ ہوتی تھی کہ کتنے کپڑے بچت گئے اور کتنے باقی ہیں۔ خاص خاص یا زمندان چیزوں پر نظر رکھتے تھے اور جب کبھی اس "توشہ خانہ" کی خراب حالی کا ان میں سے کسی کو علم ہو جاتا تھا تو پانچ چار کرتے پاجامے تیار ہو جاتے تھے، مجھے یاد ہے ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لے گئے تو تین برس کا ایک پرانا جوتہ پانوں میں تھا جو غالباً سو ڈالر کی دوکان سے آنے کے بعد کبھی ہولی کپڑے بھی صاف نہیں کیا گیا تھا، پاشس یا روغن کا تو ذکر ہی کیا! چمڑا گھس کر آدھا رہ گیا تھا، ہائے گھس کر کھل گئے تھے لیکن وہی جوتہ نہ انہیں نواب صاحب رامپور کے ایرانی قالینوں پر بھی بے تکلف جاتا تھا اور بڑے بڑے عالی مقام رضوی

## مسیح الملک موحوم کے سفر نامہ کا ایک صفحہ

حضرت مسیح علیہ السلام کا سفر نامہ دار جب مجاز پر ہوتا ہے تو دیکھی وہ اس کا  
 کردار ہے جو حضرت شیخ جی دیکھی جاتی ہے سب کچھ پر مانی ہے اور یہ سب کچھ صحت پر مانی ہے اس کا  
 ساتھ ہی تصور کے دوسرے کو بھی دیکھنا چاہئے اور یہ بتانا چاہئے کہ مجاز پر دار ہوتا ہے اور  
 خود حضرت شیخ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اور وہی ہے باوجود کچھ مجاز پر زندگی کا آتش پرکاش اثر ہوتا ہے  
 میرا عقیدہ یہ ہے کہ "کردار" (کھوٹا) ایک سچ اور انی ہوئی حالت ہے۔ اور یہ ایک مجاز پر  
 نظر مجاز پر زندگی ہے جس میں ایک طرف انگریز خود کو خفا سے دور پرکھی وجہ سے کچھ برکت ہے  
 دیکھی دیکھی ہے وہی مضمون قوم کے افراد ہی ذات اور نسبت کی فضا کو ترک کوئی وجہ سے نسبت ہزاروں  
 سوا میں مانی ہے یہ سب دیکھی دیکھی ہے۔ لیکن حضرت شیخ جی مانی کے مجاز پر زندگی میں جو مجاز پر  
 معلوم ہوتا ہے اور جو سفر کے آخری مضمون تک انہی سے انہی کے دل سے رہتی ہیں وہ ان کی کورانہ  
 عقیدہ ہے جس کا آغاز وہ مجاز پر زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں۔ ان کی رفتار ان کے اور ان کی کردار  
 میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گودہ نیاں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ کی فضا کے اثرات  
 میں سے پورے میں عقیدہ اور سبب کی ایک ہی ایک ہے انہی سے جو اسی قوم سے دور رہا چھوٹا  
 جو کسی آئندہ زمانہ میں اسی قوم کے کوئی روایت، اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے مرکز پر رہنے  
 کی وجہ سے محفوظ رکھا اور ایک ہی قوم کی تہذیب سے غریبی کرنا چاہتی ہے۔

یہ فقیر کو حضرت شیخ کے حوالہ کے لئے باعث شرح ہو گئی ہے لیکن اس مجاز پر بعض حضرت شیخ  
 خوانم کی روایت و کلمات ہم سے دو گونہ زیادہ دکھائی دیتی ہیں بلکہ وہی صورت ایک ہی ہے کہ ہم جس وقت  
 سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں۔ اور جس رہنمائی میں ہم اپنی فوری تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں  
 نہیں لے سکتے۔ یہ سب چیزیں حضرت شیخ کو اسی وقت میری ہو گئی ہیں کہ وہ اپنے ملک کے انتظام  
 کا باگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے ساتھ ہی ملکی اور قومی نقطہ نگاہ سے تعلیم اور تربیت  
 کا بندہ رہتے رہ سکیں۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری خود کوئی سادہ ہے  
 انہیں میں لے رکھی ہے ہمیں ہون سکھانا چاہئے کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت و سرکار سے انجام دیتے ہیں



کی آراستہ کھوشیوں پر مبنی۔ مجھے جوتے کی یہ حالت نہ دیکھی گئی تو بازار سے ایک تیا جوتہ منگوا کر میں نے دروازے پر رکھوا دیا اور پُرا نے جوتے کو وہاں سے اٹھوالیا جب موٹر میں سوار ہونے کے لئے اُسے تو اتفاقاً جوتہ نظر پڑ گئی یا شاید پاؤں نے نئے اور پُرا نے جوتے کے فرق کو محسوس کیا، پاؤں آگے بڑھا کر نئے جوتے کو دیکھا پھر سیری طرف دیکھا، مکرانے، اور خاموش ہو گئے! میلی اچکن پُرا کی ٹوپی بوسیدہ جوتے، مسلمانوں کے سبے بڑے لیڈر اور بہترین انسان کی یہ شان اور یہ وضع تھی، دولت اور شہرت سے ان کا نفس مستغنی تھا اور جسم و جان کی آرایش سے وہ ہمیشہ بے پروا رہتے تھے جس انسان کی بے نفسی کا یہ عالم ہو وہ دنیا میں اپنی بڑائی اور عالی مقامی کی کاغذی سندیں کیوں چھوڑ کر جائے! اُس گزری ہوئی زندگی کا ایک افسانہ ان کے نیاز مندوں کی زبانوں پر ہے۔ کتابوں اور اخبارات کے صفحات پر وہ اصلی تصویریں نہیں مل سکتیں جس کو ہماری آنکھوں نے ایک دفعہ دیکھ لیا اور پھر کبھی نہ دیکھیں گی۔

۱۹۴۷ء میں جب صحت کی خاطر مرحوم کو سفر یورپ اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا، تو خوش قسمتی سے میں بھی اُس زمانے میں فرانس میں مقیم تھا اور عرصہ تک اس سفر میں مرحوم کے ساتھ رہا۔ اُس زمانہ میں اُنکے کچھ کاغذات میں نے ایک بکس میں محفوظ کر لئے تھے، وہی ایک چھوٹا سا بکس انتقال کے بعد میرے ہاتھ آیا۔ اور وہی اُنکے سوانح نگار کا سارا کاغذی سرمایہ ہے۔ ان کاغذات میں ایک مکمل مسودہ حالات سفر کا بھی ہے جس کو انہوں نے سفنامے کے رنگ میں لکھا تھا۔ کیا تھا، لیکن غالباً ہندوستان واپس آکر اس کو مکمل کرنے کا وقت نہ ملا۔ اور وہ اور اوراق منتشر حالت میں مجھ تک پہنچے، اُس مسودہ کے چند صفحات جو آج شائع ہوتے ہیں ”جامعہ“ کے ناظرین کے لئے محض ایک تبرک ہے جس میں کہیں کہیں

سج الملک مغفور کے خیالات کی ایک جھلک بھی نظر آئے ہوگی۔

عبدالغفار

بِسْمِ الرَّسُولِ الرَّحْمَنِ  
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تہید میں اس سے پہلے ۱۹۰۹ء میں ہندوستان سے باہر عراق کی سیاحت کی غرض سے گیا تھا اور کچھ یادداشت سفر بھی لکھیں تھیں لیکن وقت نہ ملنے کی وجہ سے میں اُسے مکمل نہ کر سکا اور اس وجہ سے سفر عراق کے نتائج جو میرے دماغ میں تھے انہیں اور اوراق تک لائیکلی نوبت نہ آئی۔

دوسرے سفر میں نے ۱۹۱۱ء میں یورپ کا کیا اس سفر میں انجینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور رڑکی کی سیاحت کی لیکن یہ سیاحت اسی قسم کی تھی جیسی کہ آجکل امریکن مسافریا کرتے ہیں اسکے علاوہ میں نے دوران سفر میں کوئی یادداشت بھی نہیں لکھی تھی اس لئے یہ سفر بھی نتائج کے لحاظ سے عقیم رہا جس کا وہ مستحق بھی تھا۔

اب ۱۹۱۲ء میں پھر میں ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں اور یہ ارادہ کرتا ہوں کہ حالات سفر برابر لکھتا رہوں گا کہ وہاں پر احباب کے سامنے ایک حقیر مدد پیش کر سکوں۔

یہ تیسرا سفر دماغ اور اعصاب کو جن کی حالت برسوں کی متواتر سہانگی کی وجہ سے واقعی طور پر قابلِ رحم ہو گئی تھی آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا تھا اُسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

میرے محترم بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر تم آرام کرنے کے خیال سے سفر کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے ہم سفر برابر رہوں گا۔ انکی اس برادرانہ محبت و ہمدردی نے جس کا میں شکر گزار ہوں بالآخر مجھے اس سفر پر آمادہ کر دیا۔

میرے ارادہ سفر کی وجہ سے میرے عزیز دوست قمر شاہ خاں صاحب بیرسٹریٹ لا بھی

جورامپور کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل جوڈیشل سکریٹری کی خدمات کو ریاست مذکور میں انجام دیتے ہیں آما وہ سفر ہو گئے لیکن وقت بعض موانع کی وجہ سے وہ اپنی آمادگی پر قائم نہ رہے اور اس طرح سے افسوس ہے کہ ہمارے مثلث کا یہ زاویہ قائم نہ رہ سکا مگر اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ برادر مکرم نواب سر امیر الدین خان صاحب بہادر کی آمادگی سفر نے اس نقصان کی تلافی کر دی جو عزیز قمر شاہ خان صاحب کے ترک ارادہ کی وجہ سے اس مثلث کی پہنچ تھا۔

نواب صاحب کے ہمراہ حکیم محمد بنی صاحب سند یافتہ طبیبہ کالج دہلی بھی بطور ایک سکریٹری کے تھے جن کی وجہ سے انہیں اور مجھے دونوں کو آرام مل رہا ہے۔

بہر حال ہم تین دوستوں کا مختصر گروہ بمبئی میں پہنچ گیا اور ۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو ”رزک“ جہاز پر دوپہر کے بعد سوار ہو گیا۔

بمبئی سے اریلیٹنگ جہاز پر ہم سوار تھے اور جس کا نام ”رزک“ ہے اس کا وزن دس ہزار ٹن ہے گو یہ جہاز بڑا نہیں ہے لیکن نیا بنا ہوا اور صاف ہے۔ ہندوستان سے مارسیلز کا سفر اس کا پہلا سفر ہے۔

اس جہاز کے پہلے اور دوسرے درجہ کے تمام مسافروں کی مجموعی تعداد ۱۸۳ ہے جس میں چھوٹی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل نہیں ہیں۔ اس جہاز کی رفتار فی گھنٹہ سولہ تریخات کی ہے جو بھری میل ہے اور جو ہندوستان کے میل سے کسی قدر کم ہے۔ ”رزک“ کے ممتاز مسافروں میں سے ہر کلسنی لارڈ ریڈنگ، ہبارجہ صاحب گوالیار اور سر مارکوٹ ٹیلر گورنر بہار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ہندوستانی اجباب بھی ہیں جن کا ذکر اس حصہ سفر میں کسی نہ کسی جگہ آجائے گا لیکن غلطی ہوگی اگر ان اجباب کی فہرست میں سے ایک دوست کو نمایاں جگہ نہ دی جائے۔ جو قابل اور بالیاق ہونے کے علاوہ خاص خصائل کے مالک بھی ہیں۔ بہت کم آدمی انہیں ان کے قیافہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں سیدھے ہیں لیکن

جب کوئی بات تحقیق کی غرض سے انہیں سپرد کی جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ سوراج کے زمانہ میں غالباً یہی شخصیت سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمہ میں سب سے اوپر آنے والی ہے۔ انہیں بات کرنے کی بہت کم عادت ہو اور بظاہر بہت شرمیلے ہیں لیکن ضرورت کے وقت اپنے کھانگی میز پر قیامی یا چاقی میز کے کسی مرد یا عورت سے بے تکلف باتیں کر لیا کرتے ہیں۔ اہم قول ہے کہ بات کرنے کے لئے کسی تعارف یا شناسائی کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاز کی زندگی | جب کوئی شخص جہاز پر سوار ہوتا ہے تو وہ اپنے گرد پیش کی کو بہت ہی تنگ دائرہ میں دیکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی مصروفیتیں بہت ہی محدود ہوتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واقعی طور پر چونکہ اُس کے پاس کوئی خاص کام باقی نہیں رہتا اسلئے وہ اس مختصر دنیا میں بھی اپنے لئے مناسب اشغال پیدا کر لیتا ہے۔

صبح کی بیداری پہلا کام بستر پر چائے نوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد غلخانوں پر حملہ شروع ہو جاتا ہے اس سے اور تبدیل لباس سے جب فراغت حاصل ہوتی ہے تو صبح کی حاضری کی گھنٹی جو دھندور سے کی طرح جہاز کے ہر درجے میں ایک آدمی بجاتا ہوا تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے اُسے کھانسیکہ کمرہ میں پہنچا دیتی ہے اس حاضری سے جب نجات ملتی ہے تو ”ڈک“ کی جہل پھیل کا آغاز ہوتا ہے۔ رات کی نیند کی طرح پرسیاں شروع ہوتی ہیں موسم کی گرمی یا خشکی پر گفتگو ہوتی ہے۔ سمندر کی لطیف ہوا پر تبادلہ افکار ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ڈاکٹر انصاری اور میری طرح بد قسمتی سے خوش قسمت یا خوش قسمتی سے بد قسمت نہیں ہیں۔ تنہا گردش کرتے ہوئے یا کرسیوں پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عام طور پر ”ڈک“ کی مشن لیتوں کو اگر تقسیم کیا جائے تو ذیل کے نمبروں میں انہیں محدود کر کے بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) گشت

(۲) کتاب بینی

(۳) نیند اور خزانے

(۴) رقص و سرود

(۵) جہاز کی رفتار پر شرط بازی

اگرچہ گشت کا سلسلہ دن بھر کم و بیش جاری رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور دلچسپی رات کے کھانے کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جہاز کی ان گھڑیوں کا آغاز جو دن بھر کی سست زندگی میں کسی قدر جیتی پیدا کر دیتی ہیں رات کے کھانے کے بعد سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت تک خوشدلی باقی رہتی ہے جب تک کہ مسافر اپنے اپنے بستر پر نہیں جاتے ہیں۔

عام طور پر ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ اس کے انگریز عہدہ دار جب جہاز پر سوار ہوتے ہیں تو انکی وہ انسانی کمزوریاں جو ہندوستان میں دیکھی جاتی ہیں بہت کم ہو جاتی ہیں اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھنا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد خود ہندوستانیوں کی کیا حالت ہوتی ہو اور وطن سے باہر نکلتے ہوئے جہاز کی زندگی کا انپر کیا اثر ہوتا ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ ”کمپرمانز“ (سمجھو تم) ایک مسلم اور مافی ہونی طاقت ہو۔ اور اس کا ایک چھوٹا سا منظر جہاز کی زندگی بھی ہے جہاں ایک طرف انگریز غرور کی فضا سے دور ہونے کی وجہ سے کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتے ہیں وہاں ظالم قوم کے افراد بھی ذلت اور کمکت کی فضا کو ترک کرنے کی وجہ سے نسبتاً آزادی کی ہوا میں تسک لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی بھائیوں کی جہاز کی زندگی میں جو مجھے کمزوریاں معلوم ہوتی تھیں اور جو سفر کے آخری لمحوں تک ان میں سے اکثروں کی دماغ زہتی ہیں وہ انکی کورانہ تقلید ہے جس کا آغاز وہ جہاز کی زندگی سے عام طور پر کرتے ہیں، ان کی رفتار، گفتار اور انکی کردار میں نمایاں تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ گو وہ خیال کرتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اثرات میں سے یورپین تہذیب اور شائستگی کی تقلید بھی ایک ایسا اثر ہے جو اس قوم سے دور رہنا چاہئے جو کسی آئندہ زمانہ میں اپنی قومیت کو اپنی روایات



اپنی شائستگی اور اپنی تہذیب کے برسر رکھنے کی وجہ سے محفوظ رکھنا اور ایک ایٹائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔

یہ تقلید گوہندوستان کے ہر ایک فرد کے لئے باعث شرم ہو سکتی ہے لیکن اس جہاز کی بعض ہندوستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم ہستی سے اپنی تعلیم تربیت کے خد مالک نہیں ہیں۔ اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں، انہیں لاسکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کی اسی وقت میسر آسکتی ہیں جبکہ وہ اپنے ملک کے انتظام کی یاگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے سایہ میں ملکی اور قومی نقطہ نگاہ سے تعلیم اور تربیت کا بندوبست کر سکیں۔ موجودہ حالت میں جب گورنمنٹ نے ہماری ضرورتوں کی مناجاری اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے یہیں یوں سمجھنا چاہیو کہ ہم اپنے ملک کی کوئی چھوٹی سی خدمت بھی منحل سے انجام دے سکتے ہیں۔

ہمارا جہاز گوعدن ٹہرنے والا نہیں تھا لیکن یہ سنا گیا کہ ہر سلسلی لارڈ ریڈنگ کے نام بعض ضروری چھٹیاں عدن پہنچی ہوئی ہیں اس لئے ”زربک“ کوئی پون گھنٹے کے لئے بند گاہ سے آدھ میل کے فاصلہ پر ٹھہرا اور پھر سون کی طرف روانہ ہو گیا۔

۱۴ مارچ کو ہم نے عرب و افریقہ کے ساحلی خشک پہاڑوں کو دیکھا اور دن بھر دیکھتے رہے اس نظارہ نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ گزشتہ زمانے میں یہ دونوں جانب کی وسیع سرزمینیں اسلامی آزاد سلطنتوں یا ریاستوں کے تصرف میں تھیں لیکن اب وہ محکوم قوموں کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر جو ملک ہے (عرب و فلسطین و شام) وہ ایک زمانہ میں انبیاء علیہ السلام کا گہوارہ تھا۔ اس کے ہر ایک ذرہ سے روحانی انوار اور حقیقی آزادی کے اطوار نمایاں تھے لیکن آج وہ یا تو شقاق و تفاق کا مرکز ہے اور یا محکوم و غلامی کی بدترین زندگی کا نمونہ۔ ان گہرے اور غم آلود خیالات کے ساتھ یہ دن ختم ہوا اور رات کے پردہ نے ان پر حسرت مناظر کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

ہمارا چار رات کو تین بجے سوز پر لنگر انداز ہوا، لیکن جب ہم صبح کو اٹھے تو پھر سوز میں  
 آہستہ آہستہ آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اول تو ہمیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی  
 البتہ وہ ریلوے جو قاہرہ سے پورٹ سعید گئی ہے اور اس کے تاروں کے کھنچے ہمارے  
 بائیں ہاتھ پر بار دکھائی دیتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد پھر کہیں کہیں سوز کی چوکیاں دکھائی دیں  
 اور جس قدر ہم پورٹ سعید کی طرف بڑھتے گئے اُسی قدر آبادی کے آثار بھی بتدريج نمایاں ہوتے  
 گئے۔ راستہ میں اسماعیلیہ سے بھی گزے جہاں دو چار کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور گذشتہ جنگ  
 کے زمانے میں جہاں سے ترکی فوج کا ایک حصہ عارضی پل کے ذریعہ سے نہر کو عبور کر کے ہماری  
 بائیں جانب کی مصری حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم القطرہ سے گزے جو گذشتہ  
 جنگ کے زمانے میں انگریزی افواج کا جنگی مرکز تھا گو یہ اب ویران نظر آتا ہے لیکن اُس وقت  
 جو عارضی مکانات بنائے گئے تھے انکا ایک معقول حصہ اب بھی یہاں موجود ہے۔ اور اس  
 لائن کا ابتدائی اسٹیشن بھی اسی القطرہ میں ہے جو غلطین کو جاتی ہوا اس اسٹیشن پر عربی علی حروف میں  
 جو جہاز سے بھی نظر آتے ہیں۔ ”سکہ حدید سینا الحریۃ“ لکھا ہوا ہے۔

ہم سپر کو چار بجے پورٹ سعید پہنچے ہمارا چار نہر کے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا چونکہ  
 شیخ محمد ماضی ابو الغزام صاحب صدر لجنۃ التعمیرۃ العلیا مجلس الخلافتہ کے دو عنایت نامے میرے  
 پاس دہلی میں مسئلہ خلافت کے متعلق آئے تھے اور میں انکے جواب نہیں لکھ سکا تھا اس لئے لکھنؤ  
 سے چلتے وقت میں نے انکے نام قاہرہ میں تار دید یا تھیں میں نے انکے خطوط کی رسید دی تھی اور  
 یہ بھی لکھا تھا کہ میں پورٹ سعید سے زرکٹ پر گذر رہا ہوں اس لئے اور نیز اسوجہ سے کہ بھائی  
 شوکت علی صاحب نے جیسا کہ میں پورٹ سعید پہنچ کر معلوم ہوا تھا قاہرہ میں ایک تار اس مضمون کا  
 دید یا تھا کہ ہم دونوں (یعنی ڈاکٹر انصاری اور میں) زرکٹ کے ذریعہ گزے ہیں المقطم، الاخبار  
 اور دیگر مقامی اخباروں میں ہمارے پورٹ سعید سے گذرنیکی خبر شائع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ  
 شیخ ابو الغزام صاحب اور چند مصری و ہندی بھائی جن کے نام آئندہ لکھوں گا، قاہرہ سحریت

گوارا کر کے اس ماہ رمضان میں پورٹ سعید پہنچ گئے۔

ہم جہاز سے اترنے اور پورٹ سعید جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک کشتی میں ہمارے چند مصری بھائی ہم سے ملے اور ہمیں شہر میں بیجا نیکی غرض سے آئے۔ ان بھائیوں میں سے چند کے نام ذیل میں لکھ دینے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) عبد الحمید سعید بے ایک ترکی مصری خاندان کے مغز رکن جن کے دل میں خاص طور پر اسلامی درد ہے اور بڑی خدمات اسلام کے لئے درجہ امتیاز رکھتی ہیں جو مصر کی مشہور سیاسی جماعت حزب الوطنی کی جانب سے آئے تھے۔

(۲) سید حسنی مار دینی دمشقی (جواز ہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور خلافت کیلئے کام کر رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آچکے ہیں۔

(۳) سید محمود سلامہ

(۴) سید محمود ماضی } یہ دونوں شیخ ابوالعزائم کے صاحبزادے ہیں۔

(۵) سید احمد ماضی

(۶) کامل بک عثمان وکیل المرکزہ

(۷) ابراہیم محمد طوبی تاجر المنیا

یہ سب صاحب سوائے عبد الحمید سعید بے کے شیخ ابوالعزائم کی طرف سے اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ ہمیں پورٹ سعید لیجائیں جہاں شیخ موصوف اور دوسرے مصری بھائی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انکے علاوہ ابوالنصر سید احمد صاحب بھوپالی (جو کہ ریاست بھوپال کی نجبا سے یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں) اور سید عبدالکریم صاحب حیدر آبادی (جو کہ ریاست حیدرآباد کی جانب سے دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں) ابھی ہم لوگوں سے ملنے کے لئے رزمک پتھر پہنچے۔ چونکہ جہاز کی روانگی کے ٹھیک وقت کا بھی اس وقت تک علم نہیں ہوا تھا اور درجس وقت علم ہوا تو وقت زیادہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے غدر کیا

اور سب سے وقت کی تنگی کی وجہ سے پورے سید پر نہ اترنے کی معافی چاہی اور شیخ ابوالعزائم صاحب کی خدمت میں بھی زبانی پیام معذرت کہلا بھیجا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خود جہاز پر مع اپنے چند ہمراہیوں کے تشریف لے آئے ہیں اسلئے ہم ان سے ملنے کیلئے گئے اور انکی تکلیف فرمائی کہ مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ شیخ صاحب ایک بزرگ عالم ہونیکے علاوہ خلافت اور اسلامی معاملات کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ انکی ملاقات کا ہم لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر ہوا لیکن افطار کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے مغرب سے کچھ پہلے واپس تشریف لے گئے۔

میں یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ مصری خلافت کے متعلق دو گروہ ہیں ایک گروہ جس میں علمائے ازم بھی شامل ہیں خلافت کی خدمت ملک فواد (سلطان مصر) کو سپر کرنا چاہتا ہے اور دوسرا گروہ اس سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے علاوہ خلافت کے سلسلہ میں اور بھی چند مسائل ہیں جن میں دونوں گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

## معتزلہ

اسلام ایک ایسا سیدھا سادہ دین ہے جس کو ایک عامی سے عامی شخص بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہو۔ بخاری میں ہے کہ ایک صحابی کو مسلمان غلام آزاد کرنا تھا وہ آنحضرت صلیم کی خدمت میں ایک حبشیہ کو جو حد درجہ احمق تھی لے آئے، اور آپ سے دریافت کیا کہ کیا یہ مسلمان ہے، آپ نے اس سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے، اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی آپ نے فرمایا لیجاؤ یہ مسلمان ہے شروع شروع میں جب تک صحابہ زندہ تھے اسلام، نبی اسی سادگی پر بانی رہا وہ مافوق الفہم سرا جہ کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور نہ عملی زندگی کے لئے ابھکا علم ضروری تھا۔ اس کو اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے، وہ اس آیت کے مصداق تھے جو قرآن کی ابتدائی سورۃ میں بیان کیا گیا ہے

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ ولعلہن ۛ  
کل ۛسن ۛ اللہ و ملکۃ و کتبہ و رسلہ لا تفرق  
بین احدہن رسلہ  
(بقرہ)

پیغمبر پر جو کچھ بھی اس کے خدا کی طرف سے اترا اس پر وہ اور تمام نوینین ایمان لائے، خدا پر اس کے تمام فرشتوں پر، اکی تمام کتابوں پر اور کل کے کل پیغمبروں پر وہ ایمان اور یقین رکھتے ہیں، اس کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کی تفریق نہیں کرتے۔

یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک  
و بالآخرۃ ہم یومنون (بقرہ)

جو کچھ تم پر اور تیرے پیشروں پر اترا اس پر وہ (برگزیدہ لوگ) ایمان لائے ہیں اور آخرت پر بھی ابھکا ایمان ہے۔

اور حقیقتاً ابھکا یہ عمل منشا ایزدی کے باطل مطابق تھا چنانچہ ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے۔  
ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات  
محکمات ہن ام الکلمات و آخر متشابہات

خدا نے تجھ کو یہ کتاب دی جس میں کچھ آئین واضح اور صلیف ہیں اور وہ اصل کتاب ہیں بعض متشابہ ہیں جو کج دل

فاما الذين في قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشاء منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تأويله والاعلم تأويله  
 ہیں وہ انگیزی اور اس کے مطلب کو حل کرنے کے لئے  
 متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔ حالانکہ جو معنی کہ اس کے  
 حقیقی ہیں وہ بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ کہ علم  
 میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سب  
 خدا کی جانب سے ہیں۔ اور عقلمندوں کے سوا کوئی حجت  
 نہیں کھڑا کرتا۔

آیت بالا سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قرآن کی صحیح تعلیم یہی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ ان باتوں کے پیچھے  
 نہ پڑیں جن کا علم انکو کسی حالت میں مفید نہیں وہاں یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ عرب کے  
 بعض انسرد باوجود اپنی فطری سادگی اور سیلان طبع کے قرآن کی بعض آیتوں میں رد و قبح  
 جھوٹی تاویلیں اور بلا ضرورت بہت سی باتیں من گھڑت بیان کیا کرتے تھے، احادیث کی  
 روشنی میں بھی ہم اس حقیقت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے  
 روایت ہے کہ ایک روز آنحضرت نے مذکورہ بالا آیت ہو الذی الخ تلاوت فرمائی اور پھر کہا  
 اذا رايتهم الذين يتبعون ما تشاء منه فادلك الدين سى اللہ فخذہم، جب تم ان لوگوں کو  
 دیکھو جو متشابہات کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی ہیں جن کا خدا نے نام لیا ہے  
 تو تم ہمیشہ ان لوگوں سے بچتے رہو۔ اس کے علاوہ عربوں کی شاعری میں بھی اگر ہم ایسے لوگوں کا صحیح  
 کریں تو یقین ہے کہ آسانی سے پا لیں گے۔

مصنف ظل و نخل کا خیال ہے کہ یہ منافق لوگ تھے جنہوں نے خواہ مخواہ اپنی خاص  
 غرض کو پوشیدہ رکھ کر آیات متشابہات کی تاویلیں کیں اور اس طرح فتنہ کا ایک دروازہ کھلوا  
 چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

یہ تمام شبہات جو آخر زمانے میں پیدا ہوئے کفار اور منافقین کے پیدا کردہ ہیں جنہوں

نے ابتدائی زمانہ اسلام میں اسکی تخم ریزی کی یہ لوگ پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلے بلکہ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی، جس چیز کے غور و غوض سے منع کیا گیا اسی کے متعلق خواہ مخواہ سوالات کئے، غلط اور باطل باتوں میں مجاہدہ اور دباکتہ چنانچہ حدیث ذی خویصرہ اہمیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت (صلعم) سے کہا کہ اے محمد عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آنحضرت (صلعم) نے فرمایا کہ اگر میں عدل نہیں کرتا تو کون کرے گا۔ اس پر بھی وہ یلعین باز نہ آیا اور کہا کہ کیا تو اسی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، یہ صریح بنی پر خراج نہیں تو اور کیا ہے اگر وہ شخص جو سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جاتا ہے پھر تو بدرجہ اولیٰ وہ شخص جو سچے رسول پر اعتراض کرے خارجی ہو گا تو کیا یہ نص اور امر الہی کے مقابلہ میں انہی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ اس بنا پر آنحضرت نے فرمایا کہ عنقریب اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوسوں دور ہوگی جیسے کہ تیرکمان سے، اور یہی حال ان منافقین کا تھا جنہوں نے غزوہ احد میں کہا تھا کہ ہل لٹا من الامر شیء، یعنی کیا کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟ اور نیز یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو اقلتنا پہننا، اپنی ہم یہاں قتل نہ ہوتے، کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے، ایک دوسرا گروہ مشرکین کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بجز اس کے کسی کی عبادت نہ کرتے، لو شاء اللہ ما عبدنا من دوزن من شیء، اور ایک جماعت ایسی بھی تھی جو کہتی تھی کہ کیا ہم اس کو کہلاتے ہیں جس کو خدا غود کہلاتا ہے علیہ السلام، لو شاء اللہ اطعمہ من لولہ، کیا یہ صریحاً جبر نہیں، اور اسی طرح اس جماعت کا بھی خیال کر جس نے اللہ کے جلال اور اس تصرف انہما میں بحث کی یہ یہاں تک کہ انکو اس آیت سے روکا گیا، ویرسل الصواعق نزیب بہاں سیشہ وہم یجادلون فی آیت اللہ وہوشدیدا لہما لہ، یہ واقعات سب اس زمانے کے ہیں جب آنحضرت زندہ اور صحیح و سالم تھے، اور یہ سب کچھ منافقین

نے کیا جو ظاہر میں اسلام کا اظہار کرتے لیکن باطن میں وہ منافق تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتداء سے ایک جماعت ایسی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کی تعلیمات کو خلط ملط کرے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ مومنین کے دل میں اس قسم کے خیالات کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ وہ بھی ان آیتوں سے جو بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں کھٹکتے لیکن ان کے قلب کی کوششی اور حضور کے فیض صحبت نے ان کے عقیدہ میں کسی قسم کا فتور نہ آنے دیا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک آیت میں دو صحابہ کو آپ نے لڑتے ہوئے سنا تو آپ حجر سے باہر آگئے چہرے پر غصہ کے آثار تھے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں کتاب میں اختلاف کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں، اس کے علاوہ تہذیبی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ باہر تشریف لائے کچھ صحابہ آپس میں بیٹھے ہوئے بحث و مباحثہ کر رہے تھے، آپ نے پوچھا کہ کس مسئلہ گفتگو ہے کہا گیا کہ مسئلہ تقدیر پر، یہ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، راوی کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے روتے مبارک پر انار کے دانے نہ چوڑ دئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟ کیا میں یہی پیغام لیکر آیا ہوں؟ کیا تمہاری پیدائش کا یہی مقصد ہے؟ قرآن کی ایک آیت کو دوسری آیت پر پٹکتے ہو، تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی بنا پر ہلاک ہوئیں۔ میں تاکید سے کہتا ہوں کہ اس میں جھگڑا امت کر دو۔

بہر حال عقائد میں اختلاف گونا گونہ کی طرف سے پیدا کر نیکی کو کشش کی گئی اور صحابہ بھی کبھی کبھی خصوصی مسائل میں چونکنا ہوئے لیکن آنحضرت جب تک زندہ رہے اختلاف رونا نہ ہو سکا، عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کبھی کبھی اس قسم کا خطرہ پیش بھی آیا تو خلفاء اولین



کے اثر و اقتدار نے انکو ابھرنے نہ دیا اس کے علاوہ فتوحات اور اشاعت اسلام نے اس طرف توجہ کا موقعہ بھی کم دیا، البتہ بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانے میں جب فتوحات اسلامی کا سیلاب طرف اور اطراف سے گزر کر دور دراز مقام تک پہنچ گیا تھا مختلف قومیں وائرہ اسلام میں داخل ہوئیں تو انہی اپنی فطرت کے مطابق اسلامی عقائد میں نکتہ جینی خسر فرمیں اور وہ تمام خیالات جو ان کے قدیم مذہب میں تھے، قرآن کی آیتوں سے منطبق کرنا چاہا، کسی نے ان الفاظ سے جو ہاتھ پیرا لکھ ناک کے ہم معنی تھے مجازی معنی لئے کسی نے اس کے حقیقی معنی مراد لیکر خدا کو ایک بزرگ اور مقدس انسانی پتلا تصور کیا جو عرش پر بیٹھ کر دنیاوی خداوندوں کی طرح حکومت کرتا ہو، اس کے علاوہ وہ اور بہت سے دوسرے مسائل جو کبھی دبا دئے گئے تھے ابھرائے۔ الغرض اسی قسم کی اور بہت سی باتیں پیدا ہو گئیں جو علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں۔ ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف امامت و خلافت کی بحث نے اختلاف عقائد اور دنیا کا ایک وسیع دروازہ کھولا اور وہ اس طرح پرکھرب آنحضرت صلعم کا انتقال ہو گیا تو جہاں اور بہت سے سوالات پیدا ہوئے، مثلاً نبی صلعم آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں، جو لوگ یہ کہتے کہ عام انسانوں کی طرح فوت ہوئے وہ غلط کہتے ہیں، دفن کا کونسا مقام ہوگا، نبی کی اولاد وارث بنی بن سکتی ہے یا نہیں، سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ آنحضرت کا خلیفہ کون بنے اور وہ کس خاندان کا ہو، لیکن بجز اللہ تعالیٰ تمام اختلافات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے دانی اور ہوشیاری سے مٹا دیے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک کوئی خاص اختلاف رونما نہ ہوا کہ البتہ حضرت عثمان غنی کے ملکی اور سیاسی طرز عمل سے تین جماعتیں پیدا ہوئیں، ایک علویہ تھی جن کا خیال تھا کہ خلافت اور امامت کا حق صرف حضرت علیؑ اور ان کے خاندان تک

(۱) تفصیلی بحث کے لئے مولانا شبلی کا الکلام دیکھو

(۲) الملل والنحل لشہرستان صفحہ ۲۰۱۹

محدود ہے، دوسری عثمانی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ کے حامی تھے، اور ایک تیسری جماعت خواجہ کی تھی جو دونوں کے مخالف تھی۔ عثمانیہ تو تھوڑے دنوں کے بعد ختم ہو گئے لیکن علویہ اور خواجہ نہ مٹ سکے۔ یہ جماعتیں ہمیشہ اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو کافر کہتیں اور اس معاملے میں ان سب کی دلیل قرآن کی یہ آیت: من قتل مونا متعمداً فجزاہ جہنم خالداً فیہا تھی، بہر حال پال ایک عرصہ تک قائم رہا کہ بنو امیہ بر اقامت دار ہوئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ظلم اور سفاکی کا بازار اکثر گرم رہتا، اس لئے بہت سی طبیعتیں بنی امیہ سے متنفر ہو رہی تھیں، انکا روحانی اثر ختم ہو رہا تھا کہ ملکی ضرورت سے بنو امیہ کی ایک طرفدار جماعت پیدا ہوئی، اور یہ جمعیہ تھے جنہوں نے کہا کہ یہ باتیاں محض اس لئے ہیں کہ خدا کو ایک کرنا منظور ہے ہمارے اعمال کی یہ سزا ہے ورنہ خدا چاہتا تو کیا روک نہ سکتا تھا، انسان مجبور محض ہے وہ اپنے اعمال کا بالکل مختار نہیں اب جمعیہ کے مخالف ایک دوسرا مذہب سبکی گردہ قدریہ کا پیدا ہوا اس نے قرآن کی بعض آیتوں کی بنا پر یہ دعویٰ کیا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے خدا نے اس کو اس کے اعمال پر قدرت دے رکھی ہے، اس خیال کے پھیلانے میں بہت سے لوگ جان سے مارے گئے۔ مبعداً بعد کے بعد غیلان دمشق اور پھر کچھ دنوں کے بعد جھم بن صفوان، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے سختی اور ظلم کے بعد اس مسئلہ کو عام کرنا دین و مذہب کا ایک بڑا رکن بنالیا، بہر حال یہی قدر یہ آگے بڑھ کر معتزلہ کے لقب سے پکارے گئے۔

اسلام میں فرقہ سازیاں نہیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ دن بدن اس میں اضافہ اور زیادتی ہوتی رہی، بنو عباسیہ کے زمانے میں جب بہت سے علوم و فنون عربی زبان میں منتقل کئے گئے یونانی فلسفہ کا چرچا بر علمی اور مذہبی سوسائٹی میں ہونے لگا علاوہ انہیں ہر شخص کو رائے اور

کی عام آزادی دیدی گئی تو میسویں فرستے اور پیدا ہو گئے، مولنشاہی لکھتے ہیں کہ  
ملکی ضرورت نے اگرچہ صرف جبر و قدرت کے مسئلہ پر توجہ دلائی تھی لیکن جب ایک دفعہ  
کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی ہی گئی بہانہ کہ جو امیہ کا دور ختم  
نہیں ہو چکا تھا کہ خلق قرآن آنزیدہ تشبیر، صفات باری وغیرہ کی پیشین چھڑ گئیں اور  
جس کے منہ سے جو بات نکلی ایک مذہب بن گئی

## بانی معتزلہ

اوپر کہیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ قدریہ جو امیہ کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا تھا لیکن پھر بعد  
میں بعض ایسے حالات اور واقعات پیش آئے کہ اسی خاندان کے دور آخر میں انکی وہ پہلی  
شان نہ رہ سکی لیکن باوجود اس کے خیالات کا بیج جب ایک دفعہ پو بجا چکا تھا تو بالکل جڑ  
سے اکھاڑ پھینکنا مشکل تھا، اس لئے ٹھیک اس وقت (دوسری صدی ہجری) جب کوفہ اور  
بصرہ علوم و فنون کے مرکز بن رہے تھے، ہر طرح کے لوگ اور ہر فن کے امام وہاں موجود تھے،  
علماء، تو علماء عوام کو بھی حق رائے آزادی کے ساتھ حاصل تھا، اور پھر اس کے علاوہ یہ دونوں  
شہر ایسی جگہ پر واقع تھے، جہاں کہ فارس کی وہ موجیں جو شیعہ اور خوارج کی پیدا کردہ تھیں  
آسانی آتی جاتی تھیں، ان تمام اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آگ جو جو امیہ کے ابتدائی دؤر  
میں کبھی جلی تھی اور بمشقت میں بجھنے والی تھی اس کی ایک معمولی چنگاری یہاں ان زمین طہمتوں  
کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی چنانچہ سب سے پہلے بصرہ میں واصل بن عطاء نے اس آگ کو روشن  
کیا اور یہی وہ شخص ہے جس نے مذہب اعتزال کی بنا ڈالی۔

وجہ تسمیہ یہ جماعت خود اپنے کو اہل توحید اور عدل کے نام سے موسوم کرتی لیکن عوام اس کو

قد یہ کہتے، اس لئے کہ ایسا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال پر قادر ہے جیسا کہ انکے پیشروں بعد  
 بھی اور غیلان وغیرہ کا مسلک تھا۔ ان لوگوں کو معتزلہ کہے جانے لگے بہت سی وجہیں بیان کی گئی  
 ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب واصل بن عطاء نے اپنے شیخ حسن بصری سے اس ایک خاص  
 مسئلہ میں اختلاف کیا کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس کو کیا کہا جائے، شیخ کی رائے یہ  
 تھی کہ وہ کافر ہے، واصل بن عطاء نے ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ ایسا شخص نہ مومن ہے نہ کافر  
 بلکہ ان دونوں کے درمیان میں منزل میں ہے، یہ کہتے ہوئے جماعت سے اٹھ آئے، شیخ  
 موصوف نے کہا لہذا معتزل عنہا اسی مناسبت سے یہ اور انکی جماعت معتزلہ کے لقب سے  
 پکارا گئی لیکن بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ واصل نے اس مسئلہ میں ائمہ سے اعتزال  
 (علحدگی) اختیار کیا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ مومن ہے لیکن فاسق کہا جائیگا،  
 ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ تباہی ہے کہ اکثر اس مذہب کے شیوخ نے دنیا سے  
 اعتزال (علحدگی) اختیار کی اس بنا پر اسکا نام معتزلہ رکھا گیا

## معتزلہ کا مختلف قول میں منقسم ہونا

دعائی سوسال کی مدت میں یہ جماعت تدریجاً بیسیس شاخوں میں منقسم ہو گئی، بغدادی  
 نے اس میں سے دو حلقہ اور حماریہ کو غلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن شہرستانی اور عمرزی نے  
 معتزلہ میں انکو رکھا ہے۔ معتزلہ کے ان تمام فرقوں کے تدریجی حالات اور انکے مخصوص  
 خیالات سے ناظرین کو روشناس کر نیکے لئے میں بہتر طریقہ یہ سمجھتا ہوں کہ انکو انکے حالات کے

(۱) مل و نخل شہرستانی

(۲) الفرق بین الفرق

(۳) تعلیق، اتنا ویلیب جشی علی مختصر الفرق بین الفرق

محافظے تین بڑے بڑے تاریخی دور میں تقسیم کروں لیکن اس سے پہلے انکے عام عقائد کا مطالعہ جس پر کہ سبھی کا اتفاق ہے ضروری ہے۔

## عام عقائد

(۱) خدا سے صفات انہی کا اہکا رہی جس کے معنی صاف لفظوں میں یہ ہیں کہ اللہ بذاتہ زندہ ہے قادر ہے صاحب ارادہ ہوجیات، قدرت اور علم دارادہ کی وجہ سے نہیں، زمان، مکان، جسم و جوہر کے تود سے آزاد ہے، اسی عقیدہ کی بنا پر وہ اپنے کو اہل توحید کہتے تھے، اس لئے کہ وہ تمام صفات کا اہکا محض اس لئے کرتے تھے کہ شرک باری تعالیٰ نہ لازم آئے، غالباً یہ افلاطون اور غیرہ ڈوئس کے عقیدہ سے متاثر ہو کر یہ عقیدہ ان میں قائم ہوا یہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ خدا نہ کسی خاص صفت کے ساتھ موصوف کیا جاسکتا ہے اور نہ ادراک کیا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود مختار ہے، خدا انہوں کے افعال اور اعمال کا خالق نہیں، وہ خود اپنے اچھے برے کے آپ ذمہ دار ہیں اس لئے کہ خدا عادل ہے، انکے اس قول کی بنیاد قرآن کی بعض آیتیں ہیں مثلاً کل نفس باکسبت ربہا (مدثر) من عمل صالحاً فلنفسہ من اساعیلہا وماربک بظلام للبعید (حم سجدہ) قد جاربصار من ربکم فمن البصر فلنفسہ من عی فیہا واما علیکم بحفیظ (انعام) اس عقیدہ کی بنیاد پر اپنے کو وہ اہل عدل کہتے تھے

(۳) فاسق کے متعلق اہکا یہ عقیدہ ہے کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ ان دونوں کے بیچوں بیچ والی منزل میں ہے۔

(۴) اس بات پر انکا اجماع ہے کہ کلام الہی حادث ہے قدیم نہیں (انجیلناہ قرآن علیٰ)  
حبلنا کے معنی خلقنا کے ہیں۔

(۵) جمہور مسلمانوں کے خلاف انکا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں نہ وہ خود اپنے کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کو دیکھ سکتا ہے اور اس کے علاوہ  
المر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن پر فرض ہے۔

### پہلا دور

یہ دور دوسری صدی ہجری کے ساتھ ساتھ شروع اور ختم ہوتا ہے گو اس زمانے میں اس  
کو وہ اثر و اقتدار حاصل نہیں ہوا تھا جو آئندہ چلکر ہونیوالا تھا مگر پھر بھی واصل بن عطاء اور عمر بن عبید  
(جن کا تذکرہ الہمی کرنا ہے) کی کوششوں سے اعتراضات نے خواص میں کچھ کچھ مقبولیت حاصل کرنا  
شروع کر دیا تھا۔ اس دور کا سب سے پہلا اور مشہور عام فرقہ واصلیہ ہے جو بانی فرقہ مغزلہ واصل کے  
نام سے منسوب ہے، اور دوسرا فرقہ عمریہ جس کی نسبت عمر بن عبید کی طرف کی گئی ہے لیکن عام طور  
پر مورخین ان دونوں فرقوں کو ایک شمار کرتے ہیں اس لئے کہ جس وقت واصل بن عطاء انچو استاد  
سے اس مسلہ خاص میں جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے اختلاف کر کے استاد کے حلقہ درس سے  
اٹھ آئے عمر بن عبید کو یہ یقین تھا کہ واصل سے بحث و مباحثہ کر کے استاد کے حلقہ درس میں  
دوبارہ شامل کر دیں گے لیکن صاحب موصوف نے ان سے مناظرہ کیا تو یکایک اس کے کہ  
انکو اپنی رائے سے متفق کرتے خود انکے جال میں گرفتار ہو گئے، واصل نے اپنی بہن سے انکا  
بکاح کر دیا اور اس طرح تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ دونوں اپنے خاص معتقدات کی  
اشاعت میں مشغول ہو گئے، واصل کا شمار اپنے زمانے کے مشہور متکلمین میں تھا اور نہ صرف یہی بلکہ  
لفت و ادب کے ماہر تھے، انکا ایک تمصص نے انکی مٹح میں یہ شعر کہا۔

علیہم بابدال الحرف وقامع  
لکل خطیب غلب الحق باطلہ

ابن خلکان کی روایت کے مطابق واصل ایک بڑا مصنف بھی تھا چنانچہ اسکی کلمی ہوئی کتابیں حسب ذیل ہیں: کتاب فی اضاف المرحیہ، کتاب فی التوبہ، کتاب المنزلہ بین المنزلیں، کتاب معانی القرآن، کتاب السبیل الی معرفت الحق، کتاب انطب فی التوحید والعادل، کتاب بینہ دین عمر بن عبید، کتاب فی الدعویۃ، کتاب طبقات اہل العلم والہبل، واصل کی پیدائش مدینہ میں سنہ ۳۷ میں ہوئی بصرہ میں سنہ ۳۷ کو انتقال ہوا واصل اور عمریہ دونوں ہوا علی عرب سے تھے، واصل نے معتزلہ کے عام معتقدات کے ماوراء جس چیز کا اضافہ کیا تھا وہ اصحاب اہل اور خوان کے پاسے میں تھا جہو مسلمان حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ نہ علی رضی اللہ عنہما کو کافر سمجھتے ہیں لیکن واصل کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس یہ تھا کہ حضرت ملی رضی اللہ عنہ بعد قضیہ حکیم ایک حیثیت سے کافر اور عائشہ رضی اللہ عنہا وطلحہ رضی اللہ عنہ بھی دوسری حیثیت سے کافر تھے۔

## دوسرا دور

تیسری صدی ہجری معتزلہ کا دوسرا دور بعض حالات اور واقعات کی بنا پر خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب جوق جوق بہت سے علماء اور وزراء اس جماعت کے رکن بنے، اعتزال نے حکومت پر جگہ حاصل کی، امام احمد بن حنبل کو اور دوسرے بزرگوں کو

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) وہ علماء جو اپنے زمانہ کے متنازرا وراثتوں میں تھے اور مذہب اعتزال اختیار کر لیا تھا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں، احمد بن داؤد، جاحظ، ابن عباد

(۳) قاضی احمد بن داؤد نے جو کہ معتزلین کا سردار تھا مامون الرشید کے کان میں مسئلہ خلق قرآن کو پھونک دیا اور اس عقیدہ فاسد نے مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس مسئلہ کی اشاعت کی کوشش کرے (تبیہ صغیرہ پر)

سنت سے سخت مصیبتیں خلیفہ مامون الرشید اور متصم کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں اس زمانہ کا نقشہ مولانا ابوالکلام نے تذکرہ میں یوں کھینچا ہے:

تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنہ اعتزال و تقی فی الدین اور بدعتہ مضلہ سکھم بغلفہ و انحراف از اختصاص بالسنہ نے سر اٹھایا، اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ گناہ تین عظیم شر

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

سلسلہ میں اسحق بن ابراہیم خراسانی کو بغداد میں لکھا کہ علمائے بغداد کو خلق قرآن کی طرف جبراً متوجہ کرے بھن روپوش ہو گئے اور بعضوں نے تو یہ کیا، اور ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حسب نشار قبول کیا، امام احمد بن حنبل انکار کے جرم میں خلیفہ کی خدمت میں بھیجے گئے جو وقت امام موصوف رحمہ میں پہنچے مامون کے مرئیکی خبر طوس میں آئی، اثنائے راہ سے بغداد کو واپس گئے، لیکن مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین سے یہ وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد سلسلہ خلق قرآن میں وہ بھی ایسی ہی کوشش کرے چنانچہ جب متصم خلیفہ ہوا تو اس نے بہت بیدردی سے امام موصوف کو قید کیا، چار چار بوجھل بٹیریاں پیسروں میں ڈالی گئیں ہیں لیں، اسی حالت میں بغداد سے طوس لے چلے اور حکم دیا گیا کہ بلا کسی مدد اور سہارے کے خود ہی اونٹ پر چڑھیں اور اتریں امام موصوف بوجھل بٹیریوں کی دہرے بل نہیں سکتے تھے۔ اٹھتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ عین رمضان المبارک کے آخر عشرہ میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھا دے گئے اور لگا تار کوٹے اس طرح مائے گئے کہ ہر جلاوہ و ضریریں پوری قوت سے لگا کر بچے بہت جاتا اور پھر دوسرا تازہ دم جلاوہ اسکی جگہ لیتا لیکن اس کے باوجود وہی رت القرآن کلام اللہ غیر مخلوق کی جاری تھی آخر باوجود دیکڑوں متصم کی ترغیبات کے وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے بلکہ اذیت پہنچتے گئے اور بالآخر رتہ میں ۲۸ روز قید رہ کر اسی مصیبت میں امام موصوف کا انتقال ہوا ابن خلکان، تذکرہ ابوالکلام، المامون رسالہ ابن تیمیہ و غیرہ دیکھو

(۴) عبد اللہ بن عمر القرطبی اور جن بن حماد وغیرہ دوسرے علما بھی قید ہوئے لیکن تاب نہ لائے لاکر اتر کر کے چھوٹ گئے۔



فرار و اؤل بنی اموی، متصم، و اثنی بالہ کی تشریف رستبہ ادا و تہر حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا حتی کہ بقول علی مدینی کے فتنہ ارتداد و منہج کوکۃ (بعد حضرت ابوبکر) کے بعد یہ دوسرا فتنہ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔

بغدادی نے اس زمانے میں جتنے فرقے معتزلہ کے پیدا ہو گئے تھے گیارہ بتایا ہے لیکن شہرستانی وغیرہ نے حارثیہ، حلیطیہ، مرثیہ کو شمار کر کے ۱۴ بتائے ہیں۔ ہذیلیہ، نظامیہ، اسواریہ، مغمیریہ، بشریہ، ہشاشیہ، مراویہ، جعفریہ، اسکاظیہ، شناسہ، جاحظیہ۔

ہذیلیہ فرقہ "بذیل علف مولیٰ عبدالقیس کی جانب منسوب ہے، شیخ موصوف بصرہ کی معتزلہ جماعت کے سردار تھے، بہت بڑے عالم تھے اپنے مذہب کے ثبوت میں بعض خاص مقالات لکھے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے فرقے معتزلہ کے مثلاً نظامیہ، بشریہ، ہشاشیہ جن کا تذکرہ آگے آئے گا اور بعد میں پیدا ہوئے بعض خیالات میں شیخ موصوف کے خوشہ چیں ہیں۔

ابو بذیل (۲) ۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲ھ میں فوت ہوئے، وہ خاص خیال جس کی وجہ سے یہ ایک الگ اور مستقل جماعت بن گئی وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے فنا ہو جانے کے بعد از سر نو اس کے بنانے پر قادر نہیں ہے۔

نظامیہ۔ یہ اپنے بانی ابراہیم بن یساہ نظام کی جانب منسوب ہے یہ مدینہ میں ۷۵ھ میں پیدا ہوئے اور عراق میں ۱۲۵ھ کو وفات ہوئی، ان کا بھی شمار معتزلہ کے اہم لوگوں میں تھا فن بیان اور بلاغت کے امام تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جاحظ جو مشہور امام فن بلاغت کا گزراہر صاحب موصوف کا شاگرد اور انہیں کا تربیت یافتہ تھا۔ وہ خاص مسائل جس میں انہوں نے عالم جماعت سے اختلاف کیا وہ یہ ہیں (۱) جو صلاحیت جس چیز میں موجود ہوتی ہے اس کے

(۱) مختصر الفرق بین الفرق

(۲) ابن فہکلا ن جلد اول صفحہ ۶۸۴

خلاف اگر خدا چاہے کہ اس کی اس خاصیت کے اور انتیہ طور میں آئے تو یہ ناممکن ہے۔ بالفاظ دیگر جیسا کہ بذیلیہ (نعموۃ باللہ) خدا کے عجز کے قائل تھے یہ بھی ہیں (۲) کسی چیز کی کمی (الی غیر انتہایت) انتہائی تقیم نہیں ہو سکتی۔ (۳) یہ لوگ اعجازِ سران کے قائل نہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لعن و لعن کرتے اس لئے کہ انہوں نے نبی صلعم کی وفات میں شبہ کیا، یومِ حدیبیہ کے موقع پر شک کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث سے محروم کیا۔

اسواریہ۔ یہ فرقہ گونظامیہ کی ایک شاخ تھی بہت کم ایسی باتیں ہیں جس میں ان سے اختلاف کیا۔

معمریہ۔ یہ جماعت عمر بن عبد سلّی کی تابع تھی جن کا زمانہ وفات سنہ ۳۷۰ء ہے۔ زمانہ پیدائش میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ انکا خاص عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے نجر مادے کے کچھ پیدا نہیں کیا جو غیر آسمانی مخلوقات عالم میں روز و رات دیکھتے ہیں وہ انہیں مادے کے خواص ہیں جن کا ظہور ان کی طبیعت اور خاصیت کے لحاظ سے ہوا کرتا ہے۔ خدا کو (نعموۃ باللہ) اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔

بشریہ۔ اسکا بانی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بشر بن معمر ہیں انکے معتقدات تقریباً وہی ہیں جو بذیلِ خلاف کے تھے انکا مخصوص عقیدہ یہ ہے کہ کل کے کل افعال متولدہ ہیں انکا فاعل کوئی نہیں اور یہ عقیدہ بہت زیادہ عمر بن سلّی اور ثنایہ بن اثرس بن جن کا تذکرہ آگے آتا ہے کے زیادہ مشابہ ہے۔ ایک خاص عقیدہ عام معتزلہ کے عقیدہ کے خلاف یہ ہے کہ خدا صاحبِ ارادہ ہے اس معنی کر کے کہ ارادہ اسکی صفت ازلی ہے۔

ہشامیہ۔ انکا سردار ہشام بن عمرو الغوطی ہیں انہوں نے قرآن کی اکثر آیتوں کی تاویلیں بہت غلط طریقہ سے کیں ہیں۔ یہ بھی خلاف کی طرح خدا کے عجز کے قائل تھے۔

اسکافیہ جعفریہ۔ ان دونوں کا عقیدہ عام سے بالکل الگ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ سے محفوظ محض گناہ صغائر کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہوگا۔

ثنامیہ۔ معتزلہ کے اہم ترین فرقوں میں اس فرقہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسکا شیخ ثنایہ بن اثرس

انجیری ہیں، شخص مامون الرشید کا ہم عصر تھا۔ اس جماعت کا خیال یہ ہو کہ عالم کی پیدائش خدا کی مشیت سے نہیں ہوئی، بلکہ مادہ پہلے سے موجود تھا جس نے رفتہ رفتہ موجودہ شکل اختیار کی، عالم ازلی ہے جیسا خدا خود ازلی ہے عقل اچھائیوں برائیوں کی پرکھنے والی ہے، اس لئے شریعت خواہ آئے نہ آئے ہر حالت میں اللہ کی معرفت انسان کو واجب ہو۔

جاخطیہ - ثمامیہ کے بعد اس جماعت کا نمبر ہے اس کی نسبت جاخط جو عربی کا مشہور کاتب ہو اس کی طرف منسوب ہے، جاخط نے نظام کی تلقین سے مذہب اعتزال اختیار کیا، معتزلہ جن وجوہ اور بنا پر مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں اس نے اپنے زور قلم سے بہت حد تک ان الزامات کو دور کر نیکی کوشش کی اور کم از کم اپنے زمانہ میں تو کسی قدر کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ کسی کو دینی عذاب نہ دیا جائے گا بلکہ گنہگار شخص سختیوں اور مصائب کے جھیلنے کے بعد پاک و صاف ہو جائیگا۔

ان فرقوں کے علاوہ دو فرقے اور ہیں جاخطیہ اور حاررہ جس کو بغدادی نے خلاۃ میں شمار کیا ہے لیکن اور دوسرے مصنفین نے جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں معتزلہ میں گنا ہے۔ جاخط کا خاص عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں، دوسرے حضرت عیسیٰ ہیں، اور حاررہ یہ تاسخ کے قائل ہیں بغدادی نے ان کے عقیدوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ قطعاً معتزلہ نہیں ہو سکتے اس لئے کہ توحید جو معتزلہ کا بنیادی اصول ہے اسی چیز کا یہاں انکار ہے۔

اوپر جتنے فرقوں کے نام ابھی گناے گئے ہیں سب اسی دور کی پیداوار ہیں جن میں سے بہت سے فرسے ہم عصر ہیں، اور اکثر بہت کم عرصہ تک زندہ رہے، البتہ پانچ جو بڑے فرقے تھے ہذلیہ، نظامیہ، عمریہ، بشریہ اور جاخطیہ انکا اثر زیادہ دن تک قائم رہا۔ ان پانچوں میں بھی نظامیہ اور جاخطیہ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

## تیسرا دور

مامون، معتصم اور واثق باللہ کے دور حکومت تک معتزلہ کا بہت زیادہ اثر رہا لیکن اس کے

بعد واثق اور متوکل نے ساتھ نہ دیا۔ متوکل نے تو اس درجہ اپنی سختیاں کیں کہ وہ بے دست و پا ہو کر منتشر ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک باخظ نے اپنے زور قلم سے اس کی ساکھ باقی رکھنے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ عرصہ تک بند نہ سکی اور رفتہ رفتہ زوال شروع ہو گیا اور یہی حالت اس کی اس تیسرے دور میں پیش آئی، مگر اب بھی شامیہ، خیاطیہ، ادکعبیہ، جشمیہ وغیرہ نامی جماعتیں پیدا ہوئیں لیکن جیسا کہ ظاہر کر چکا ہوں کہ حالات نامساعد تھے اس لئے اب یہ فرقے کچھ ترقی نہ کر سکے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ معتزلہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔ انکی اس آزاد خیالی کو دیکھ کر بعض وہ فرقے جو زمانہ مابعد یا انکے زمانہ میں پیدا ہوئے مستفید ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اگر توفیق ہوئی تو ہمارے آئندہ مصنفین میں جو قراطلہ یا اہلسنیہ پر ہوگا، آپ دیکھیں گے کہ ان پر انکا کچھ اثر تھا یا نہیں۔

---

(۱) خیاطیہ جس کی جانب یہ فرقہ منسوب ہے، انکی لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کا علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ اس کتاب کا نام کتاب الاتصاریہ۔ ایسی صراحت کے ساتھ اس جماعت کے عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اس کتاب کو آپس لایونیورسٹی (سوڈن) کے ایک استاد ڈاکٹر پینرگ نے اسکو قاہرہ کے کتب خانہ سلطانی کے ایک مادر الوجو نسخہ سے لیکر ایک مفصل عربی دیباچہ کے ساتھ ۱۲۷۲ھ میں شائع کیا ہے (معارف جلد ۱، ماہ اگست ۱۲۷۲ھ) مصنفین لکھتے وقت معارف کے ذریعہ اس کتاب کا علم ہوا مگر دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اس سے استفادہ کا موقع نہ ملا۔ بہر حال اس مفید کتاب کے علاوہ جن کتابوں کی مدد سے یہ لکھا گیا ہے اسکا پانچ پانچ میں حوالہ دیدیا گیا ہے۔

# مالیات ہند

ہندوستان کے آئندہ دستوراسی کے مرتب کرنے میں دیگر فرقہ وارانہ اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ بعض ایسے اہم مسائل بھی درپیش ہیں جن کو حل کے بغیر کوئی دستوراسی کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا ہے۔ چنانچہ سائن کمیشن نے سٹریڈ بلو۔ ٹی لین جو مالیاتی مسائل کے ماہر سمجھے جاتے ہیں خاص اسی غرض سے مقرر کیا تھا کہ صوبجات اور مرکزی حکومت کے فرائض کا لحاظ رکھ کر اسکے لئے ذرائع آمدنی کی تقسیم کے متعلق علیحدہ تحقیقات کریں اور اپنی تجاویز پیش کریں جو سائن کمیشن کی رپورٹ میں شامل کر لی جائے گی۔ گذشتہ معاشی کانفرنس منعقدہ الہ آباد میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا اور مختلف انجیال ماہرین فن نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا جس سے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

مسئلہ ۱۵۰ سے مسئلہ ۱۵۱ تک برطانوی ہند کے تمام محاسن حکومت ہند وصول کرتی تھی اور وہی اس کو صرف کرنے کی ذمہ دار تھی۔ صوبجات کو ان کی ضرورت کے مطابق مرکزی حکومت کی طرف سے گویا روپیہ تقسیم ہوا تھا۔ محاسن میں اضافہ یا تخفیف کا ختمبیار صرف مرکزی حکومت کو تھا۔ لیکن مسئلہ ۱۵۱ کی اصلاحات میں صوبجاتی حکومتوں کو ایک طرف تو اکثر معاملات میں مرکزی حکومت کے اثر سے بالکل آزاد اور خود مختار کر دیا گیا اور دوسری طرف صوبجاتی حکومت کی مجالس قانون ساز میں انتخابی عنصر کو بڑھا کر قوم کے سامنے ایک حد تک جوابدہ بنایا گیا۔ اس لئے اگر یہ تھا کہ صوبجاتی حکومتوں کے مدات محاصل کو مرکزی حکومت کے مدات محاصل سے علیحدہ کیا جائے۔ اور صوبجاتی حکومتوں کو اپنے محاصل وصول کرنے اور صرف کرنے میں نیز ان میں اضافہ کرنے اور تخفیف کرنے کے ختمبیارات تفویض کر دے جائیں تاکہ فرائض اور خدمات صوبجات پر عائد کئے گئے ہیں ان کو وہ بحسن و خوبی مرکزی حکومت کی ”بالادستی“ سے آزاد ہو کر انجام دے سکیں۔

اصلاحات سے قبل حکومت ہند کے ذرائع آمدنی میں سے خاص خاص قابل ذکر مذاات مالگذا ری، آبکاری، انکم ٹکس، کرو گیری، افیون اور نمک کا محصول اور سرکاری ریلوں کا سٹاف شمار کی جاتی تھیں۔ ان میں سے مالگذا ری اور انکم ٹکس کی آمدنی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم ہو جاتی تھی، آبکاری کی آمدنی بعض صوبوں کو پوری کی پوری مل جاتی تھی اور بعض صوبوں میں مرکزی حکومت کا حصہ بھی ہوتا تھا۔

اصلاحات کے بعد تقسیم آمدنی کا یہ اصول ترک کر دیا گیا اور بعض ذرائع آمدنی کلیدیہ صوبائی حکومتوں کے انتظام میں دیدے گئے اور بعض کلیدیہ مرکزی حکومت کی تحویل میں دے گئے چنانچہ مالگذا ری اور آبکاری کی آمدنی صوبجات کے حصہ میں آئی اور باقی محصول کرو گیری، انکم ٹکس محصول افیون اور نمک اور ریلوں کا سٹاف مرکزی حکومت کے قبضہ میں رہا۔

لیکن گزشتہ سال دس برس کے تجربہ کے بعد اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا جو کہ جس طرح صوبائی حکومت میں دوئی کا طریقہ اصولی اور دونوں حیثیتوں سے ناقص اور ناقابل عمل تھا۔ اسی طرح نئے دستور کو چلانے کے لئے ذرائع آمدنی کی جو تقسیم کی گئی تھی وہ بھی بہت ناقص تھی۔ صوبجات ذمہ دار قرار دے گئے ہیں تو می تعمیر اور مفاد عامہ کے تمام امور کہ جس میں شعبہ جات تعلیم، صنعت و حرفت، زراعت، صحت عامہ، ہسپتال وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان شعبہ جات کی ترقی پر قوم و ملک کی ترقی اور فلاح کا دار و مدار ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر روپیہ ان پر لگایا جائے وہ کم ہے لیکن صوبجات کی آمدنی کے جو سبب بڑے دو ذریعے ہیں یعنی مالگذا ری اور آبکاری وہ ادل تواضاف پذیر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ رائے عامہ اخلاقاً اور اصولاً ان دونوں ذرائع سے اضافہ آمدنی کے خلاف ہے۔

ملک کی موجودہ غربت اور افلاس اور خصوصاً زراعت پیشہ طبقہ کی بپت حالت سے دنیا قنفا ہے اور جن لوگوں نے معاشی حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زراعت پیشہ طبقہ کی فوسنک حالت بہت حد تک مالگذا ری کے موجودہ نظام اور بندوبست کی مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ جس وقت سے قوم کو اپنے میزانیہ پر رائے زنی کا حق دیا گیا اس وقت سے برابر مالگداری کی تخفیف اور نظام بندوبست میں تبدیلی اور تنظیم پر ہر صوبہ میں زور دیا جا رہا ہے۔ آبکاری کا محصول بھی ہندوستان کے ایسے ملک میں جہاں مذہب پرست ہندو اور مسلمان بے ہیں کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اب تو کچھ عرصہ سے ہر صوبہ میں حکومت کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ ان کے شراب نوشی کو مقصد قرار دے کر ملک کو اس لعنت سے اس طرح پاس کر دیا جائے کہ ہائے میزانیہ سے محصول آبکاری کی مدد بالکل غائب ہو جائے۔ غرض جب ان بڑی مدد آمدنی کی مخالفت میں قوم کی رائے عامہ کا یہ حال ہوا اور دوسری طرف یہ مطالبہ بھی ہو کہ ان شعبہ جات پر سو گنا اور ہزار گنا زیادہ روپیہ صرف کیا جائے جن کا تعلق براہ راست قوم کی ترقی اور خوشحالی سے ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کوئی صوبہ جاتی حکومت اپنے فرائض اور خدمات کو قوم کی منشاء کے مطابق انجام نہیں دے سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ کی حکومتیں گوانسدا و شراب نوشی کے اصول کو تسلیم کر چکی ہیں مگر محصول آبکاری کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مالگداری میں بھی بجائے تخفیف کے ہر بندوبست میں اضافہ ہی کیا جا رہا ہے۔ لیکن گذشتہ جو کچھ برادری میں پیش آیا اس سے حکومت اور ملک کو زراعت پیشہ طبقہ کی معاشی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے اور صوبہ جاتی حکومتوں کو اپنی ان یادداشتوں میں جو سامان کمیشن کے سامنے پیش کی گئی ہیں یہ قرار کرنا پڑا کہ ان مذکورہ مددوں میں اضافہ آمدنی کی بالکل گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اب مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ انکم ٹیکس اور دیگر برادری دونوں میں ایسی ہیں کہ ملک کی خوشحالی، تجارت کے فروغ، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں روزانہ فزوں و اضافہ کی گنجائش ہے۔ اور حقیقتاً کسی ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دو مددیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اگر آمدنی کے ذرائع کے مقابلہ میں ان خدمات اور فرائض کو دیکھا جائے جو حکومت ہند کو انجام دینا پڑتی ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذرائع آمدنی کی تقسیم

میں صوبجات کے ساتھ بڑی نا انصافی کی گئی ہے، اس وقت اس میں شک نہیں کہ مرکزی حکومت فوجی مصارف کے بارے اس قدر لدی ہوئی ہے کہ کل آمدنی تقریباً نصف حصہ اس ”سفید ہاتھی“ کو کھلانے، اور اس کے رکھ رکھاؤ پر صرف ہو جاتا ہے، جس سے ہندوستان کو سو میں سے ایک حصہ فائدہ بھی بخشل پہنچتا ہے، اور اگر ہندوستان کے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تو لیشیہ اور افریقہ کی قومیں اس کی شہادت دیں گی کہ ہندوستان کی فوج اور سپاہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو انگلستان کے قبضہ میں رکھنے کے لئے اور ایشیا، اور افریقہ میں برطانوی شہنشاہیت کے قیام اور استحکام کے لئے تیار کی گئی ہے۔ قوم کی آواز حکومت کے ایوانوں میں ہزار بار اس فوجی پالیسی کے خلاف اٹھ چکی ہو لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہندوستان کی غیر ذمہ دار حکومت تلج انگلستان کے زیر نگین رہ کر برطانوی مفاد کے مقابلہ میں ہندوستان کے مفاد کا خیال کرے! بہر حال اگر آئندہ کبھی قوم کو اپنے معاملات میں دخل ہوا سب سے پہلی چیز جس میں قطع و برید کی جائے گی وہ حکومت ہند کے فوجی مصارف کی مد ہے۔ اس وقت بھی قوم کی مسلسل احتجاجات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکومت نے اپنے فوجی مصارف کو بتدریج کم کر لیا وعدہ کیا ہے اور اسی سے ہوا کا نرخ معلوم ہوتا ہے اس لئے اگر اس مد میں مقبول تخفیف کی ضرورت تسلیم کر لیا جائے تو پھر حکومت ہند کے موجودہ ذرائع آمدنی سے جو رقم وصول ہوگی وہ اس مصارف سے صوبجات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت زیادہ ہوگی۔ دریاں حالیکہ صرف کی مدت میں ملاوہ فوج کے کوئی ایسی مد نہیں ہے جس سے قوم کی تعمیر اور فلاح کا براہ راست تعلق ہو۔

اب مندرجہ بالا حالات کو پیش نظر رکھ کر صوبجات کی مالیاتی شکلات کو دور کرنے کی دو ہی تدبیریں ہو سکتی ہیں یا تو محصول میں اور زیادہ اضافہ کیا جائے اور خون کے چند قطرے جو کسانوں کے جسم میں رہ گئے ہیں ان کو بھی چوس لیا جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور دیگر نشیات کو رواج دیا جائے تاکہ ایک طرف تو شراب کے نشہ میں چور ہو کر نہ ان کو بھوک کی



شدت معلوم ہونہ جسم کی برہنگی کا احساس رہے اور دوسری طرف بلا وقت محصول میں بھی اضافہ ہوتا رہے۔ دوسری تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ ذرائع آمدنی کی موجودہ تقسیم میں تبدیلی کی جائے۔

پہلی تجویز سے غالباً کوئی شخص اصولاً یا اخلاقاً اتفاق نہیں کر سکتا اور اگر حکومت اصول و اخلاق کو پس پشت ڈال کر انہیں دوسروں سے اپنی تمام ضروریات کے لئے آمدنی فراہم کرنا چاہے تب بھی غلاب یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ البتہ دوسری تجویز قابل غور ہے اور یہ ممکن ہے کہ صوبجات کو بھی کوئی ایسا ذریعہ آمدنی دیا جائے جو اہل تو اضافہ پذیر ہو دوسرے یہ کہ رائے عامہ اصولاً اور اخلاقاً اس کے خلاف نہ ہو۔ اس وقت تمام مدت آمدنی میں صرف دو ہی مدت ایسی ہیں جن کو اصطلاحاً اضافہ پذیر کہا سکتا ہے۔ یعنی کروڑ گیری اور انکم ٹکس۔ کروڑ گیری کا محصول علاوہ ساحلی صوبوں کے دوسرے تمام صوبوں کے حصہ میں نہیں آ سکتا۔ اور اگر ایسا ممکن بھی ہوتا تب بھی اصولاً ایسا کرنا مناسب نہیں تھا اس لئے کہ پھر کروڑ گیری کے محصول میں یکسانیت باقی نہیں رہ سکتی۔ دوسری مدت انکم ٹکس کی ہے۔ اس کے متعلق البتہ تمام صوبجات شروع سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ خصوصاً بمبئی اور بنگال کے صوبے اس وجہ سے کہ ان دونوں صوبوں میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ایک مدہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبجات کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے صحیح اور جائز ہے۔ چنانچہ مسن کمیٹی نے بھی دہلی زبان سے یہ تسلیم کیا تھا کہ ”صوبجات کو ایک عرصہ تک انکم ٹکس کی آمدنی میں شریک نہ کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ درست“

لیکن اگر صوبجات کی مالیاتی دشواریوں کو دور کرنے کے لئے انکم ٹکس کی آمدنی کلیتہً صوبجات کی تحویل میں دیدی جائے تو بعض علی دشواریاں اس انتظام میں ایسی پیدا ہوں گی جن کو بحالات موجودہ نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا! پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس تبدیلی سے مرکزی حکومت

کے موجودہ مصارف جو بیشتر فوجی مصارف پر مشتمل ہیں کسی طرح پورا نہ ہو سکیں گے اور آئندہ بھی حکومت ہند برطانوی بحری اور ہوائی بیڑہ کی حفاظت میں بھرنے کی بجائے خود اپنا ہوائی اور بحری بیڑہ تیار کرنا چاہیے تو مرکزی حکومت کے لئے بھی معقول آمدنی کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس دشواری کا حل سر دست تو یہ ہے کہ انکم ٹکس کو صوبہ جاتی مقدار دیا جائے اور آبکاری کو مرکزی اس انتظام میں مرکزی حکومت کو بجائے فوری نقصان کے تین کروڑ روپیہ سالانہ کا فائدہ ہوگا۔ اس وجہ سے اس وقت انکم ٹکس کی کل آمدنی سے محکمہ آبکاری کی آمدنی بقدر تین کروڑ روپیہ کے زیادہ ہوتی ہے۔ آئندہ صوبہ جات کو وقتی طور پر اس انتظام سے نقصان ہوگا، لیکن آئندہ کی توقعات پر غالباً وہ تمام صوبہ اس نقصان کو برداشت کرنا پسند کریں گے۔

محصول آبکاری پر جو اعتراض اخلاقی حیثیت سے اس وقت ہے وہ بہر حال قائم ہو سکتا اور حکومت ہند کو جلد یا بدیر اس انداز خراب نوشی کو اپنا مقصد بنانا پڑے گا اور اس مدنی آمدنی میں تخفیف گوارا کرنا پڑے گی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر آبکاری کی آمدنی میں تخفیف کے لئے قوم کا مطالبہ کچھ کم زور دار نہیں ہے۔ اور حکومت کو اس معاملے میں بھی ایک دن تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ اس طرح حکومت ہند کو مستقبل قریب میں اسکا کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ میزانیہ کے دونوں سرے اس تجویز کو قبول کر کے نہیں ملائے جاسکے۔

ایک اور دشواری بھی انکم ٹکس کو صوبہ جاتی مقدار بنانے میں پیش آئے گی اور وہ یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ کسی شخص یا ایک کمپنی کی تجارت کئی صوبوں اور ریاستوں میں پھیلی ہوئی ہے اور جو آمدنی ہوتی ہے وہ تنہا ایک صوبہ سے نہیں بلکہ مختلف صوبوں کی بدولت ایسی صورت میں انکم ٹکس کس صوبہ کو ملے گا؟ یہ سوال اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے، جب یہ دیکھا جائے کہ مرکزی حکومت کے قائم کردہ ذرائع آمد و رفت سے سب سے زیادہ فائدہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور بڑے بڑے تیار راتھاتے ہیں۔ پھر مرکزی حکومت اگر اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کرے تو کیا بیجا ہے

اس دشواری کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ شخصی آمدنی کا کس تو صوبہ جاتی حکومت کو دیا جائے  
 اور کپنی یا شرکتوں کی آمدنی کا محصول مرکزی حکومت کو دیا جائے۔ زرعی صوبہ اب بھی بجا بلصنعتی صوبہ  
 کے نقصان میں رہیں گے۔ لیکن زرعی صوبہ ہمیشہ زراعت ہی کی ایک صنعت پر قائم نہیں رہینگے  
 اس لئے ابتدائی دور کا یہ نقصان آئندہ کی توقعات کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دوسرے  
 ممالک جہاں اتحادی نظام ریاست رائج ہو مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا۔ اور  
 اسٹریلیا ان ممالک میں بھی یہی طریق عمل ہے اور اس وجہ سے اور بھی ذرائع آمدنی کی تقسیم جو بطور  
 بالا میں تجویز کی گئی اصولی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مناسب اور معقول معلوم ہوتی ہے۔

## مبادی معاشیات

علم المعیشت پر پروفیسر ایڈون کینن کی مشہور و معروف کتاب ہے جس کے سات آٹھ  
 برس پہلے ڈاکٹر ڈاکٹر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے سلیس صاف اردو میں  
 منتقل فرمایا تھا۔ یہ کتاب طلبہ کیلئے خاص طور پر مفید ہے قیمت ۷/۸

مکتبہ جامعہ ملیہ - دہلی

# مسئلہ تاوان جنگ

جنگ عظیم کے ختم ہونیکے بعد سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ اخبارات میں تاوان جنگ کے مسئلہ کے متعلق بے شمار خبریں اور اعداد و مضامین چھپتے رہے ہیں، پچھلے دنوں بھی جب بیگ میں تاوان جنگ کے مسئلہ کا تصفیہ کرنے کے لئے دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی اخباروں کے کام کے کام اس کی خبروں سے پر ہوتے تھے۔ لیکن ہمارا گمان ہے کہ رسالہ جامد کے ناظرین کی واقفیت کے لئے ہم ذیل میں مسئلہ تاوان جنگ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ اسید کہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جنگ کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ خارج مغرب سے تاوان وصول کرتا ہے۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو جرمنی کی طرف سے برابر اعلان ہونے کہ وہ ختم جنگ پر اپنے مخالفوں سے جمی بھر کے تاوان وصول کریگا۔ لیکن جب جنگ نے طول کھینچا اور جرمنی کی کامیابی اتنی یقینی نہ رہی تو اعلان ہوا کہ اس جنگ کا نتیجہ کچھ سو نہ کسی کا ملک چھینا جائے گا نہ کسی سونا دان لیا جائے گا۔ ادھر انگلستان اور فرانس نے جنگ کے شروع میں تاوان اور ملک گیری کا ذکر ہی نہ کیا وہ حریت و جمہوریت کے اصولوں کی خاطر میدان جنگ میں اترے تھے، ایسی سبت باتوں کا کیا ذکر کرتے لیکن جب کامیابی کی اسید نہیں چلی تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ جنگ سے جو نقصانات ہوئے ہیں ان سب کا معاوضہ جرمنی سے وصول کیا جائے گا۔

جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کو تاوان جنگ کی ادائیگی کا اقرار کرنا پڑا۔ مسئلہ اٹلجارج انگریزی وزیر اعظم اور موسیو کلیمانو وزیر فرانس نے جو مطالبہ کیا اس کے اعداد ایسے تھے کہ جیسے نجوم میں تاروں کے فاصلہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اصل کانفرنس میں ”ہیندیک یہ لوگ اپنے نقصانات کی فہرست مرتب کر سکے نہ اس کی رقم کا تخمینہ کر سکے اور جرمنی سے کہا گیا کہ تم ان

تقصانات کی تلافی کا اقرار کر لو۔ رقم تہیں یکم مئی ۱۹۱۷ء کو بنیادی جائے گی لیکن اس وقت تک تم ۲۰ ارب مارک سالانہ دیتے رہو (ایک مارک تقریباً ۱۲ کے برابر ہوتا ہے) اور روپیہ نہ ہو تو مال و اسباب کی نقل میں ادا کرو۔ چنانچہ جرمنی نے وہیں، جانور، جہاز، اس رقم کو پورا کرنے کے لئے دئے۔ اور جب پہلی مئی ۱۹۱۷ء آئی تو جرمنوں نے بتلایا کہ وہ اس مدت میں تقریباً ۱۴ ارب کا سامان بے چکے اور اس سے دو سال کا جو مطالبہ تھا وہ پورا ہو چکا۔ لیکن فرانس کے اثر سے تاوان کے کمیشن نے فیصد کیا کہ جرمنی نے ۲۰ ارب میں سے کل ۶ ارب دئے ہیں، غیر جانبدار مہینے مارچ کی رائے میں بھی جرمنوں نے کم سے کم ۲۰ ارب مارک ادا کر دئے تھے۔ مئی ۱۹۱۷ء میں بالآخر فرانس اور انگلستان وغیرہ نے اپنی فہمائش کا اندازہ لگا کر جرمنی کو بتلایا کہ تمہیں کل اکھرب ۲۲ ارب مارک بطور تاوان دینے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ملجیم کو کم ارب مارک دینے ہونگے۔ جرمنی بہت چیخا چلایا کہ اتنی رقم ادا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ لیکن زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ لاجاً جرمنی کو اس ناممکن رقم کے ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔ لیکن اس وقت چونکہ جرمنی کوئی معتد بہ رقم نہیں دے سکتا تھا اسلئے قرار یہ پایا کہ جرمنی اسی وقت ۵۰ ارب کا قرضہ ۶ فیصدی شرح سود پر لے اور بعد کو بقیہ ۸۲ ارب کا بھی اسی طرح انتظام کیا جائے۔ اور فی الحال جرمنی ۵۰ ارب پر سالانہ ۲ ارب مارک بطور سود ادا کرتا رہے۔ اور اگر اس رقم کی ادائیگی ناممکن ہو تو کم سے کم ۲ ارب ۵۰ سود تو ضرور سال کے سال دے دیا کرے۔ یوں وہ اکھرب ۲۲ ارب کا قرضہ واجب الادا تو برسرِ رہے اور جرمنی سالانہ کم سے کم ۲ ارب بطور سود ادا کرتا رہے۔

کوئی ڈیڑھ برس تک تو جرمنی نے یہ رقم واکر نیکی کو شش کی اور اسے حتی الوسع اجناس کی شکل میں ادا کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اس نے کندھا ٹال دیا۔ اوہ ہر زانس والے اپنی تباہ شدہ علاقوں کی درستی پر اربوں روپیہ صرف کر رہے تھے اور جرمنی سے روپیہ ملتا نہ تھا جو کچھ ملتا اس میں ملجیم کا حق سب سے اول رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ڈانسیسی بگڑ گئے اور انہوں نے

جرمنی کے صنعتی علاقے ریمور پر قبضہ کر لیا تاکہ اس طرح جرمنوں سے رقم وصول کریں۔ مگر اس کا اثر اٹا ہوا۔ ریمور کے کان کنوں نے ہڑتال کر دی، جرمنی میں اس فعل سے فرانس کے خلاف سخت نفرت پھیل گئی اور جرمنی کے سرکار کی رہی سی ہیمن الاقوامی حیمت بھی ختم ہو گئی۔

لیکن فرانس کے اس قبضہ پر جہاں بہت سی برائیاں پیدا ہوئیں وہاں ایک براہی بات ضرور ہوئی کہ حالات ناقابل عمل ہونے کا یقین سب کو ہو گیا اور واز کمیشن نے صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس کمیشن نے ۱۹۲۱ء میں جرمنی کے سرکار کو اس طرح درست کیا کہ پانچ کاغذ کے نوٹوں کو بالکل تھکرا دیا اور اس کے بجائے دوسرے نوٹ تیار کر اسے جن کی تعداد محدود تھی اور جن کی ادائیگی کے لئے کافی سونا محفوظ کر لیا گیا تھا۔ تاوان کے متعلق اس کمیشن نے یہ طے کیا کہ پہلے سال جرمنی ایک ارب مارک ادا کرے، اور اس میں رفتہ رفتہ اضافہ کر کے ۵ سال بعد ۱۹۲۵ء میں ۲۶ ارب۔ اس کے بعد جوں جوں جرمنی کی مالی اور معاشی حالت بہتر ہوتی جائے اس رقم میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ فرانس ہر سہ ماہی نوچیں ہٹائے واز کمیشن کے فیصلے، سابقہ بے عنوانیوں کے مقابلے میں بہت معقول تھے۔ لیکن اب تجارتی رنگ کے نام سے اس کو بھی بدل دیا گیا ہے۔ اس نئی قرارداد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک کھرب ۳۲ ارب کی ناقابل ادائیگی رقم اور اس پر ایک غیر معین مدت تک سود کے بار کو جرمنی کے سر سے ہٹا دیا ہے اور اس کے بجائے یہ طے کر دیا ہے کہ ستمبر ۱۹۲۵ء سے مئی ۱۹۲۵ء تک یعنی ۸ سال تک جرمنی ایک مقررہ رقم ادا کرتا رہے یعنی ۲ سال تک اوسطاً ۲ ارب مارک اور اس کے بعد ۲ برس تک تقریباً ۱ ارب سالانہ۔ اس روپیہ کے لین دین کے لئے سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں ایک بین الاقوامی بینک قائم ہو گا جس کے ہمنوں میں دول متعلقہ کے نمائندے ہونگے۔ امید ہے کہ یہ بینک اس قدر فائدہ دے گا کہ آخری سال کی رقم نادان کا بڑا حصہ اس کے منافع سے ادا ہو سکیگا۔ اس نئی تجویز کی رو سے جرمنی جو رقم ادا کرے گا اس سے سب وہ قرضہ ادا ہو جائیگے جو جنگ کے لئے دول فائج نے ادا کیے

لئے تھے اور اس کے بعد انہیں اپنے نقصانات کی تلافی کے لئے بھی رقم بیج رہے گی۔ برطانیہ کو البتہ جرمنی سے اس سے بہت کم ملے گا جتنا اسے امریکہ کو دینا ہو لیکن اسے فرانس اٹلی اور بیلجیئم کے دوسرے قرضداروں سے اتنا مل جائے گا کہ اس تاوان کی رقم کو شامل کر کے وہ امریکہ کا قرضہ اٹار سکے گا۔

قرضوں کی ادائیگی کی صورت مختصر یوں ہو گی کہ جرمنی سلسلہ میں فرانس کو ۲۱۴ ملین ڈالر دے گا۔ برطانیہ کو ۳۶۶ ملین اور مجموعی طور پر سب قرض خواہوں کو ۴۰۰ ملین ڈالر۔ ادھر امریکہ کو فرانس ۳۵ ملین ڈالر دیگا، انگلستان ۱۶۰ ملین اور سب قرضدار مجموعی طور پر ۲۱۴ ملین ڈالر۔ ان رقموں میں ہر سال مناسب تغیر ہوتا رہے گا اور سلسلہ میں جرمنی فرانس کو ۳۰۰ ڈالر دیگا۔ برطانیہ کو ۹۰ ملین اور سب کو ملا کر ۵۰۰ ملین۔ ادھر امریکہ فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۸۳ ملین اور سب قرضدار مل کر ۳۰۰ ملین ڈالر۔

سلسلہ میں جرمنی فرانس کو ۱۸۹ ملین ڈالر دیگا، برطانیہ کو ۸۵ ملین اور سب کو ملا کر ۳۸۳ ملین، ادھر امریکہ کو فرانس ۱۲۵ ملین ڈالر واپس کرے گا، برطانیہ ۸۱ ملین اور سب قرضہ مل کر ۳۸۰ ملین۔

سلسلہ میں جرمنی فرانس کو ۱۰۹ ملین ڈالر دیگا، برطانیہ کو ۸۵ ملین اور سب قرض خواہوں کو ملا کر ۲۱۳ ملین، امریکہ کو اس وقت کوئی رقم نہیں ملے گی۔ آخری ۳ سال میں سلطنت برطانوی کو اپنے سابقہ حلیفوں سے قرضیں ملیں گی جنہیں وہ بین الاقوامی بینک میں داخل کر دے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ جنگ کی تجاویز جنہیں دول متعلقہ نے منظور کر لیا ہے اگرچہ گذشتہ تمام تجاویز سے زیادہ معقول اور قابل عمل ہیں تاہم ۱۰-۱۵ سال کے اندر انہیں بھی بدلنے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے سلسلہ کے بعد سے حیرت انگیز صنعتی ترقی کی ہے اور باوجود ان نقصانات کے جو صلنامہ ورسائی سے اسے پہنچ چکے ہیں اس نے اکثر اعتبار سے اپنی جنگ سے قبل دہائی مرزا محالی حاصل کر لی ہے لیکن اس مطالبہ تاوان جنگ کی ادائیگی

کے لئے ضرورت ہے کہ اسکی برآمد بناس سالانہ درآمد سے بقدر تقریباً ۳ ارب مارک کے زیادہ ہو۔ کہ وہ ۱۲ ارب سالانہ بطور تادان اور ایک ارب بطور سود قرضہ خارجی کے ادا کر سکے۔ جنگ سے پہلے معمولاً جرمنی کی درآمد برآمد سے زیادہ تھی۔ ۱۹۲۹ء میں بیشک درآمد سے برآمد کچھ زیادہ رہی لیکن ۳ ارب کا اضافہ قرین قیاس نہیں خصوصاً اس لئے کہ اس کے حریفوں نے اس کے مال کی درآمد پر رکاوٹیں عائد کر رکھی ہیں۔

پھر دورانہ پیش اور پیش میں معاشی سمجھ بے ہیں کہ تادان کی یہ بڑی بڑی رقمیں وصول کرنا کہیں آگے جا کر نقصان نہ پہنچائے۔ کہ اس کی وجہ سے جرمنی اپنی تجارت برآمد کو بڑھانے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح اپنی صنعت کی کارکردگی میں ترقی دے گا اور پھر صنعت و تجارت میں اسکا مقابلہ مشکل ہو جائیگا۔

موجودہ رفتار سے تقریباً ۱۵ سال کے اندر امریکہ اپنے اندرونی قرضہ جنگ کو پورا پورا ادا کر چکا ہوگا۔ اس وقت جو رقمیں اسے اپنے قرضداروں سے ملیں گی وہ خالص بھت ہونگی غالباً اس وقت جرمنی اور دیگر دول کی طرف سے مسئلہ تادان پر نظر ثانی کی تجاویز پیش ہونگی اور جرمنی کا بار پھر ایک مرتبہ ہلکا کر دیا جائے گا۔ اور ساتھ ساتھ امریکہ اپنے قرضداروں کے ساتھ رعایت منظور کرے گا۔



# کتاب لغت عربی

اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ جب عربی زبان بھی دیگر ممالک میں پھیلی اور غیر عرب اقوام دین اسلام میں داخل ہونے لگیں اس وقت مجیوں کو قرآن مجھے کے لئے عربی زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے ایک جماعت صحرائے عرب کی ویر بدر خاک چھانکر اس زبان کے الفاظ کو قبائل کی بول چال، محاوروں ضرب الامثال اور اشعار سے چن چن کر کتابوں میں مدون کرنے لگی۔ اس جماعت کا مقدم ترین امام خلیل بن اسماعیل مروسی ہے۔

سب سے پہلا لغت عربی میں ہی مدون ہوا جس کو امام اللغویین ابو عبد الرحمن خلیل بن کتاب العین احمد فراسیدی نے ۱۲۷۱ھ میں مرتب کیا اس میں اس نے کوشش یہ کی کہ عربی

زبان کے جملہ مادوں کو کلمے خواہ موضوع ہوں یا ہل اس وجہ سے یہ کتاب بڑی ہو گئی اور وہ اس کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کے بعد لیث بن مظفر نے جو بنی امیہ کے مشہور صوبہ دار اور انصار نصر بن سيار کا پوتا تھا اس کی تکمیل کی

خلیل نے جب اس کتاب کی ترتیب کی بابت سوچا تو اس نے دیکھا کہ پہلا حرف الف کن ہے جس سے ابتدا نہیں ہو سکتی اسلئے عین سے اس کو شروع کیا کہ حرف حلقی میں انتہا ہے حلق نے علما بحر بھی وجہ تھی کہ یہ کتاب کتاب العین کے نام سے مشہور ہوئی۔

پھر زمانے کے بعد ابوطالب فضل بن سلیم بن ماعزم کو فی نے کتاب العین پر تفتیح لکھی اور اس میں جو غلطیاں اس کو نظر آئیں ان کو دکھایا، اور اس کا نام استدراک رکھا۔ ابوالعباس سمرقانی نے استدراک کا جواب لکھا اور یہ بتایا کہ فضل نے جو غلطیاں ظاہر کی ہیں حقیقت میں اکثر خود اس کی غلطیاں ہیں۔

مفضل نے الباری نام سے ایک لغت بھی مدون کیا جو علماء میں مقبول ہوا مفضل کے بعد قاضی محمد بن الحسن ابوبکر زبیدی متوفی ۳۴۰ھ نے مختصر العین کے نام سے ایک کتاب لکھی ابو غلیل کی غلیبان نکالیں جس کے بعد امام ابو غالب تام نے جو ابن التبانہ کی کنیت سے مشہور ہے، کتاب العین کے صحیح لغات چھانٹ کر مع شواہد و زیادات کے نسخہ العین کے نام سے مرتب کیا۔

اس کی دوسری کتاب موعب کے نام سے ہے جو لغت کی عمدہ کتب میں سے خیال کی جاتی تھی مگر اب ناپید ہے۔ یہ کتاب بترتیب حروف ابجد لکھی گئی تھی۔ اسی زمانے میں لغت کی ایک عمدہ کتاب باریع کے نام سے ابو علی بغدادی نے لکھی تھی وہ بھی زمانے کی دستبرد سے فنا ہو گئی اور اب دنیا میں کہیں اسکا پتہ نہیں۔

**کتاب النوادر** امام غلیل کے شاگرد ابو الحسن علی بن حمزہ کسائی نے جو شاہزادہ امین عباسی کا اہلیق تھا اور لغات جمع کئے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی کسائی کا زمانہ ۱۱۴۰-۱۱۵۰ھ ہجری۔

**کتاب النوادر والغریب**۔ کسائی کے بعد اسی پنج پر ابو عمر اسحاق شیبانی متوفی ۳۵۰ھ نے بہت بڑی کتاب لکھی۔ اس نے عمر بھی ۱۱۰ برس کی پائی اور زندگی بھر اس کام میں لگا رہا۔ **کتاب النوادر واللغات**۔ امام فراء ابونکر لیسجی بن زیاد ۳۸۰ھ نے جو کسائی کا شاگرد اور خلیفہ مامون عباسی کے بچوں کا استاد تھا یہ کتاب زیادہ واضح ترتیب کے ساتھ مدون کی۔ **کتاب النوادر**۔ فراء کے بعد تقریباً دو لغات ابو عیدہ عمر بن شافعہ ۳۸۰ھ نے لکھے۔

**الاجنباس والنوادر واللغات**۔ ابوزید سعید بن ادس انصاری ۳۸۰ھ جو صہمی اور ابو عیدہ کا ہم عصر مگر علم میں ان سے ممتاز تھا یہ لغت مدون کیا۔ علما اسکو معتد سمجھتے تھے۔ اس کے بعد اجناس کی جداگانہ کتب مرتب کرنے کا مذاق پھیل گیا۔ چنانچہ ابو سعید عبدالملک بن ابی نے جو صہمی کے نام سے ادب عرب میں غیر فانی شہرت رکھتا ہوا اور جو اخبار

یہ عالم اور ہارونی کے دربار کا ایک مغز رکھن جو حسب ذیل کتابیں مرتب کیں۔  
 کتاب الاجناس۔ کتاب النوادر۔ کتاب الانوار۔ کتاب النبات۔ کتاب النحل۔ اور کتاب النحل  
 اسی کے بعد انساب النحل۔ اور انساب الاعراب پر ابو عیسیٰ قاسم بن سلام <sup>۲۶۲-۲۶۳</sup> نے جو  
 ائمہ حدیث میں شمار کئے گئے ہیں عمدہ کتابیں لکھیں۔ انہوں نے اور ول کی غلطیاں بھی ایک  
 رسالہ میں جمع کیں اور اسکا نام استدراک رکھا اس کے ساتھ کتاب الغریب بھی مرتب کی۔  
 لیکن نوادر اور اشعار عرب کا سب سے بڑا عالم ابو عبد اللہ محمد بن زیاد کو فی <sup>۲۶۳-۲۶۴</sup> نے مانا جاتا ہے  
 یہ ابن بکیت اور ثعلب کا استاد ہے۔ اس نے بھی کتاب النوادر کتاب الانوار کتاب صنعتا  
 کتاب النخل والزرع اور کتاب النبات وغیرہ لکھیں۔

**کتاب الفصحیح**۔ ابو العباس احمد بن یحییٰ معروف بہ امام ثعلب <sup>۲۶۴-۲۶۵</sup> کو لغات کا تیرشت پند آیا  
 اس نے اس نے ہر قسم کے فصیح الفاظ کو خواہ وہ نوادر ہوں یا صفات سے تعلق رکھتے ہوں  
 بہ ترتیب ایک سلک میں منسلک کر دیا۔ اس کی کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ چھوٹی  
 قلمی اور نہایت مفید۔ کوفہ میں اس کے بعد اس کے درجہ کا کوئی دوسرا لغوی نہ پیدا ہو سکا  
**مجرد**۔ ثعلب کی کتاب کے نمونہ پر ابو الحسن النہائی گراں متونی <sup>۲۶۵-۲۶۶</sup> نے اپنی کتاب مجرد کے  
 نام سے لکھی۔ اس میں چونکہ کوئی خاص اضافہ نہیں تھا اس لئے یہ ثعلب کی کتاب کو گوگوں  
 کو بے نیاز نہ کر سکی۔

**مقصد**۔ گراں کے سینے سے نکلنے والے بپ کے طرز پر لکھی۔  
**یواقیت**۔ ابو عزادہ طرز جو ثعلب کا غلام تھا لیکن اس کی شاعری کی بدولت انت کا امام ہو گیا  
 تھا۔ یہ کتاب اپنے آقا کے انداز پر لکھی اور ترتیب اچھی رکھی۔ اس کی وفات <sup>۲۶۶-۲۶۷</sup> میں ہوئی  
**دیوان الادب**۔ اسحاق بن ابراہیم فارابی <sup>۲۶۷-۲۶۸</sup> نے ان الفاظ کو جمع کیا جو  
 ادب میں مشتمل تھے۔

**کتاب الجہرہ**۔ امام ابو بکر محمد بن حسن بن درید <sup>۲۶۸-۲۶۹</sup> نے جو بعد علماء بصرہ میں ہو کر کوئی

انکے درجہ کا نہ تھا کتاب العین کے انداز پر چار جلدوں میں یہ لغت مرتب کیا۔ کامل مگر متوسط۔ اس نے لوگوں کو جلد کتاب لغت سے بے نیاز کر دیا۔ ابوالقاسم اسماعیل بن عباد نے جس کا لقب صاحب ہوا وجود دیا کہ مشہور زراہ میں سوتا اس کا خلاصہ کر کے جوہرہ نام رکھا۔ اور ایک دوسرا لغت بھی محیط کے نام سے ترتیب دیا۔

اس زمانہ کے بعد سے جو کتابیں لغت عربی میں لکھی گئی ہیں انکی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں مگر یہ صرف مشہور کتابوں کی فہرست ہو مکمل نہیں ہو۔

کتاب الافعال۔ ابن قوطیہ متوفی ۳۸۵ھ کتاب الافعال۔ ابن طریف  
تذکرہ۔ ابوعلی حسن بن احمد فارسی متوفی ۳۸۵ھ

کتاب التہذیب (۶ جلدوں میں ہے) ابونصرت محمد بن احمد ازہری ہروی ۳۸۵ھ امام لفظویہ کا شاگرد  
مجل۔ ابوالحسن احمد بن فارس ۳۹۰ھ

صحاح۔ ابونصر اسماعیل بن حماد جوہری ۳۹۲ھ فصیح الفاظ کا سب سے بڑا ذخیرہ یہ کتاب بہی  
کی کتاب مختصر العین اور ابوالحسن کی مجل کے بعد لکھی گئی ہو کیونکہ ان میں ان دونوں کی عبارتیں متوالی  
ہوتی ہیں۔ اسکی ترتیب حروف بحکم پر ہو اور علماء میں سے زیادہ جاکس اسکا اعتماد ہو۔ ابومحمد  
عبداللہ متوفی ۳۹۵ھ نے اس پر حاشیہ لکھا جو صرف شین تک تھا شیخ عبداللہ بن محمد نے اس کو  
پورا کیا۔ پھر امام رضی الدین صفائی ۳۹۵ھ نے ان صحیح لغات کو جو رہ گئے تھے اس میں  
بڑایا اور اس کا نام مکملۃ الصحاح رکھا۔ امام محمد بن ابوبکر رازی متوفی ۴۱۰ھ نے اس پر  
ان الفاظ کو جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتے ہیں چکر جمع کر لیا اور اس کا نام مختار الصحاح  
رکھا لیکن اسکی ترتیب صحیح نہ تھی اس وجہ سے علامہ محمداً فندی نے نئے سرے سے اس کو مرتب کیا۔  
الحکم والمجیط الأعظم۔ امام ابوالحسن علی بن سیدہ اندلسی نے جو بائنا تھے اٹھ جلدوں میں لکھوائی۔  
مختص۔

تہذیب اللابیۃ والافعال۔ ابوالقاسم بن قلع ۴۱۵ھ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور اس پر

موضوع پر بے نظیر ہے۔ ایام بھی مگر ایک نغاس کا ہندوستان میں مل گیا جس کی نقل جامعہ کے کتب خانہ نے بھی بصر فائدہ حاصل کر لی۔

مغرب۔ ابو النسخ ناصر بن عبداللہ متوفی ۱۱۶ھ

تہذیب الہندیہ۔ ابوالنثار توخنی متوفی ۳۲۵ھ یہ کتاب ۷ جلدوں میں ہے صحاح تہذیب و بحکم تینوں کی مجموعہ علامہ سراج الدین عسکری ۳۸۵ھ کی خدمات بھی اس فن کی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں انہوں نے اساس۔ فائق۔ مقدمہ الادب اور مستقصد الاشغال چار کتابیں لکھیں ہیں۔

جامع۔ ابن قزاز

مفردات۔ ابوالقاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی

نہایہ۔ مجد الدین معروف ابن اثیر جزیری

بیان الاوارش شیخ محمد طاہر۔ یہ کتاب لغات حدیث میں ہے اور اس کا مصنف ہندوستانی ہے۔ اچھی اور مقبول کتاب ہے۔

القاموس المحیط۔ عربی کا سب سے مشہور لغت ہے۔ فیروز آبادی متوفی ۱۱۷۵ھ ابو الفیض سید محمد رفیع حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے قاموس کی فخر لکھی جس کا نام جامع العروص رکھا قاموس نے لغت میں اس قدر اہمیت حاصل کی کہ بجائے خود بہت سی تصانیف کا مرجع بن گئی۔ اور علماء ادب نے اس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا۔

قاموس کے بعد جو لغات لکھے گئے وہ بہت ہیں مگر تا مگر اس سے یا اس سے پہلی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ یا نثر لغت۔ فلسفہ لغت اور فقہ لغت میں بھی بہت کتابیں لکھی گئی ہیں جو نہایت مفید اور محققانہ ہیں۔ انکا کسی دوسرے موقع پر ہم ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ۔

## باغبان

واجد حسین صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جن کی ہمت اور جفاکشی دنیا کی تمام مشکلوں کو آسان کر دیتی ہے۔ گو وہ خاندان کے شریف تھے لیکن باپ دادا کی فضول خرچی نے ساری شرافت خاک میں ملا دی تھی اور ان کے بہت سے عسکری اسوت بھی نسب نامے پر فخر کرتے اور جو تیاں چٹاتے پھرتے ہیں۔ واجد حسین صاحب کا بچپن آبا و اجداد کی دولت کی داستانیں اور اس دنیا کی خشکاتیں سننے میں گذرا جو بننے کو برکت دیتی ہے اور شرفاء کی جائدادیں نیلام کر دیتی ہے۔ جتنی نصیب تیس ان کے کان میں پڑیں سب اسی کی تعلیم دیتی تھیں کہ حوصلہ کرنا عبث ہے، اور اس دولت سے جو چند روز کی جہان ہو وہ مفلسی بدرجہا بہتر ہے جو قناعت اور توکل سکھائے لیکن عقلمندوں کی قابلیت کے باوجود وہ اپنے حوصلے پست نہ کر سکے، اپنا وطن چھوڑ کر وہ شہر..... احاطہ بھٹی میں جا بے محنت کی کمایا، اور جب ۳۵ سال کی عمر میں انکا انتقال ہوا تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کے لئے اتنا روپیہ چھوڑ گئے کہ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتی تھیں، دولت کے علاوہ وہ ایک خاص قسم کے خیالات بھی ورثے میں چھوڑ گئے تھے جنہیں ترک کرنا انکی بیوہ زیب النساء کی کم اتنا ہی برا بھتی جتنا کہ دوسری شادی کر لینا۔ واجد حسین صاحب کا خیال تھا کہ عورتوں کو پرے میں رکھنا ایسا جرم ہے کہ اگر اسکی سزا میں کوئی قوم غلامی اور فاقہ کشی کی مصیبتوں میں مبتلا کر دی جائے تو مجھے سمجھنا چاہیو کہ وہ سستی چھوٹی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی بیوی کو آزاد اور خود مختار بنایا اور مرنے دم وصیت کر گئے کہ انکی بچیوں کی روحانی نشوونما بجا پابندیوں سے نہ روکی جائے اور انہیں تعلیم سے اس قابل بنادیا جائے کہ دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں، اور کسی کی دیکھیری کی محتاج نہ ہوں۔ واجد حسین صاحب کے انتقال کے وقت انکی بڑی بیٹی نیاز آٹھ سال کی تھی، اور چھوٹی ارجمند چھ سال کی دونوں اسکول میں داخل ہو چکی تھیں اور جب واجد حسین صاحب انہیں نہادھو کر اور

صاف صاف کپڑے پہن کر اسکول جاتے دیکھتے تو اچکا دل خوشی سے متوالا ہو جاتا اور آنکھوں میں آنسو بہہ آتے۔ زیب النساء بیگم کو کیفیت یاد تھی، انہوں نے شوہر کی وصیت پر وفاداری سے عمل کیا اور بچوں کی تعلیم اور تربیت انکی سب سے گہری آرزو بن گئی۔ جب دونوں لڑکیاں بڑی ہوئیں اور اسکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہوئیں تو ہر جگہ مشہور تھا کہ انکی لیاقت اور سلیقے کا شہر میں جواب نہیں۔ بعضے کہتے تھے وہ لڑکیاں نہیں پھول ہیں جنہیں باغبان کی محنت اور محبت نے باغ کی زینت بنا دیا ہے، بعضے کہتے تھے وہ پھول نہیں لڑکیاں ہیں جن میں تعلیم اور تربیت نے نہ حسن اور دلربائی پیدا کر دی ہے جو پھولوں میں ہوا کرتی ہے۔

تعریف لوگ دونوں بہنوں کی کیا کرتے تھے، لیکن انہیں مشابہت بہت کم تھی۔ نیاز گوری تھی اور ذرا لمبی، ارجمند سانولی اور میا نہ قد کی۔ نیاز کے ناک نقتے میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ مبصر عین یہ بھی کہتی تھیں کہ اسکے منہ کا دہانہ ذرا بڑا ہو گیا ہے، ناک ذرا چھوٹی رہ گئی ہے، مگر نقیص صرف انہیں کو نظر آسکتے تھے جن کی نگاہ میں نیاز کی شوخ، چمکیلی آنکھیں چکا چوند نہ پیدا کرتیں، جنہیں اس کی ابروؤں کے خم میں مصوری کا انتہائی کمال دکھائی نہ دیتا، ایسے لوگ بہت کم تھے، اور وہ بھی نیاز کی ان خامیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ نیاز کے حسن کا انحصار صرف آنکھوں اور ابروؤں پر نہیں تھا اسکی گرم گفتار، اسکی ہنسی اور سب سے زیادہ اسکی پروردہ سری آواز جو کبھی غزل گاکر سننے والے کو زندہ بنا دیتی تھی کبھی دوہے گاکر میراگی، ایسے تیر تھے جن کا نشہ خطا نہیں کر سکتا تھا، ارجمندان خویلوں سے محروم تھی لیکن اسکی آنکھیں آبدار اور زرخیز تھیں، ناک اونچی اور نازک، منہ پھول جیسا، بال بے ادھونگہ دالے اور گھنے جسم نہایت سڈول جس کی جڑبش میں ایک ادا تھی، عورتیں تک تسلیم کرتی تھیں کہ حسن کی کوئی صفت نہیں جو اس میں موجود نہیں ہے مگر افسوس ہے یہ سن جس پر کسی زمانے میں جاگیریں اور جائدادیں اور اہل نظر کی زندگیاں نثار ہوتی تھیں اب اس قدر وافی کے لائق نہیں سمجھا جاتا، اب لوگ ایسی حسین عورتوں سے شادی کر کے توفیق کے مطابق انہیں کپڑوں اور زیوروں سے سنوارتے ہیں، اور انکے حسن کا کرشمہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسے کران کے شوہروں پر قہر

کرتے ہیں۔

نیاز اور ارجمند میں صورت سے زیادہ سیرت کا فرق تھا، نیاز بھولی تھی، مگر تنگ مزاج، لبہ کی اتنی اچھی کوس شخص سے سابقہ پڑا اس کی نسبت بہت سی خوبیاں فرض کر لیتی، اور جب معلوم ہو جاتا کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں تو اس طرح خفا ہوئی گویا اسے جان بوجھ کر دھوکہ دیا گیا ہے، اس کی طبیعت بغض اور کینے سے پاک تھی، لیکن جیسی وہ تعریف کرنے میں جوشی تھی ویسی ہی مذمت کرنے میں تیز جو اسے پسند آتا اسے دیتا بنا دیتی، جو خطرے گر جاتا اس کے ساتھ اس طرح پیش آتی گویا وہ ایک مجرم ہے۔ جس کی سزا اس کی مجبوریوں کا خیال کر کے معاف کر دی گئی ہے، اسے یقین تھا کہ سستی کا ہرل پراثر ہوتا ہے، ہر انسان کو ازل سے اس فن کے سمجھنے کی قابلیت ملی ہے، اور ہر شخص کو حسب استعداد اس کی قدر دانی کرنے پر آمادہ ہونا چاہئے، اس کا عقیدہ تھا کہ ہر ذی روح ہستی کو انتہائی کمال حاصل کرنے کی آرزو ہمیشہ بیتاب رکھتی ہے، اور جو کوئی جو کچھ کرے اس کا اہل مقصد اپنا اور دوسروں کا کاروبار فروغ ہونا چاہئے ظاہر ہے نیاز مرد شناس نہیں تھی، اس کا دوست بننا معمولی آدمیوں کے لئے بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ تجربہ ہر ہوشیار انسان کو سکھا دیتا ہے کہ اسے بچپن کی سادگی اور سادہ دلی بچپن کی اور یاد دگاریوں کے ساتھ بھول جانا چاہئے، لیکن جس کا دل پاک اور صاف ہوا ہے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ دنیا میں بھلائی کے ساتھ برائی کیوں تسلیم کرنا ہوتی ہے، خصوصاً خود انسان کی فطرت میں ان دونوں عناصر کی ایسی آمیزش کیونکر ہو جاتی ہے کہ ہم انہیں جدا نہیں کر سکتے اور خالص خوبیوں کے مجسمے تلاش کرنا کس لئے بیکار ہے۔ نیاز کے خیر خواہوں نے، نیاز کی ماں نے، نیاز کے اپنے تجربے نے سلامت روی کے بنیادی اصول اس کے ذہن نشین کرنے کی لاکھ کوشش کی، مگر وہ نہ مانا تھا نہ مانی۔

ارجمند کو ایسی ہدایت کی مطلق ضرورت نہ تھی، اس کی طبیعت بچپن سے فطرتی تھی، ایسی فطرتی کہ ماں اور بہن کی محبت پر اسے اعتبار نہ تھا۔ بچپن ہی سے وہ گھنی اور ضدی تھی، بچپن ہی اس نے دل کی بات میں رکھنا بغض اور کینے اور حسد کا بوجھ سنبھالنا سیکھا، عمار اور تجربے نے اسے اور جا بجا لاکھ



کر دیا، اور اسکی مدد بھری مسکراہٹ اور ریلی آنکھوں نے جن لوگوں کو لبھالیا تھا ان میں بہت کم تھے جو باوجود ثبوت کے یہ ماننے پر تیار ہو جاتے کہ اس کے غیر میں خالص انسانی خوبیوں کے علاوہ اور کچھ بھی شامل ہے، ارجمند ایسی سیانی اپنی ہوس کی شدت سے ہو گئی تھی، یہ ہوس کہ دنیا کی کوئی نعمت ہاتھ سے نہ جائے، نہ شہرت نہ دولت نہ سکون اور اطمینان، اسے رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ حق اور چالاک کے سوا اس کے پاس اپنی ہوس پوری کرنے کے اور ذریعے نہیں ہیں، اور اس نے ان ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر لی۔ لیکن اسکا طور طریقہ اتنا صحیح تھا کہ بڑے بڑے نکتہ میں بھی اس کبھی قسم کا الزام نہ لگا سکتے۔

نیا زکی سیرت اسکی کشادہ پیشانی پر لکھی ہوئی تھی، اس کی جان بچ پال کے لئے کوئی مہتری یا کوشش درکار نہ تھی، زیب النساء بیگم اسے ہر مناسب موقع پر ٹوکتی تھیں، اسے بیجا جن جن کے نظروں سے آگاہ کرتیں، بیجا بدگمانی سمجھا بھگا کر رفع کرتیں، ہر وقت رواداری کے گن گاتیں اور اس کے دل چڑچومیں گنتیں انکا محبت سے علاج کرتیں۔ لیکن نیا زکی طبیعت میں ہولای کسی طرح پیدا نہ ہو سکی۔ اسے ماں سے بہت محبت تھی، ماں سے کوئی بات چھپانا اس کے نزدیک چوری سے بھی براتھا، مگر خوف کہ ماں کا کہنا ماننے سے اس کی ہمت پست ہو جائے گی۔ رفتہ رفتہ اس کے مضبوط عقیدوں میں شامل ہو گیا، یہ عقیدہ بھی کوئی راز نہ تھا، وہ اکثر ماں سے کہتی رہتی تھی کہ اسے اپنی ہمت اور حوصلے ان تمام نعمتوں سے زیادہ عزیز ہیں جو سلامت روی ہمیا کر سکتی ہوں اور اس لئے وہ ہر معاملے میں انکی رائے نہیں مان سکتی، زیب النساء بیگم کا اصل مطلب کہ عقل سلیم کے بغیر ہمت اور حوصلے محض ننگ راہ ہیں جن سے آدمی ٹھوکر کھاتا ہے نیا زکے کبھی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی زیب النساء بیگم کو نیا زکی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ نیا زکی عداوت اور دوستی، اسکا اچانک بگڑ مٹنا اور پشیمان ہونا، ہر ایک کو اپنا بچپن یاد دلادیتا تھا، اور تجربے نے انسان کو کیسا ہی سخت گیر کیوں نہ بنا دیا ہو، بچوں کو دیکھ کر اس کا دل آپ ہی آپ نرم ہو جاتا ہے، ارجمند کی طبیعت زیب النساء بیگم کے لئے بہت دنوں تک ایک سمر رہی، اور جب وہ اسکا کسی قدر اندازہ

لگا سکیں تو بہت گھبرائیں۔ نیاز کی خود سری اور خفگی میں بھی ایک وفاداری اور سچی محبت تھی جو انہیں ارجبند کی اطاعت گزاری میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ارجبند کی ہر بات میں سیان پن ہوتا تھا، ہر بات میں ایک منفی مطلب، نہ وہ نیاز کی طرح تھا ہوتی، نہ روٹھتی، نہ جی کھول کر منتی، نہ جی بھر کر روتی تھی۔ وہ ہر چیز میں دونوں بیٹیوں کو برابر کا حصہ دینا چاہتی تھیں، لیکن تقسیم کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ ارجبند کو زیادہ مل گیا ہے، نیاز کو کم، چاہے روپیہ ہو، چاہے زیور ہو، چاہے کپڑے، نیاز بہت سی فرمائشیں کرتی تھی جن کا صاف جواب دیدیا جاتا، لیکن کیا مجال تھی ارجبند جو مانگے وہ نہ ملے، جو چاہے وہ نہ ہو، اس وجہ سے نہیں کہ ماں کو اسکا زیادہ خیال تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ مانگنے اور حاصل کرنے کی ترکیبیں جانتی تھی، اور انکے استعمال کرنے میں مشاق تھی، جیسے جیسے لڑکیوں کی عمر بڑھتی گئی، زیب النسا، رنگیم کو یقین ہوتا گیا کہ انکی طبیعتیں بدلنا یا ان کی حسب منشاء اصلاح کرنا انکے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ دونوں انکے باغ کے پھول ہیں جن کی نگہداشت رکھنا انکا فرض ہے، مگر ان کے رنگ بدلنا نہ انکے امکان میں جو نہ سچ پوچھے تو ان کا کام ہے۔ ایک بات تو کل باغبان کی طرح وہ سب کچھ خدا کی مرضی پر چھوڑ بیٹھیں، مگر دل میں کھٹکا ضرور رہا کہ دیکھے ہوائیں کیسی چلتی ہیں۔

نیاز اور ارجبند جب کالج میں داخل ہوئیں تو ان کا گھر خوش مذاق اور شائستہ طالب علموں کا مرکز بن گیا، نیاز کے دل میں بہت سے حوصلے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ہندوستان کی شریف عورتیں بہت کر کے گھر بیروزندگی کے تنگ حدود سے باہر نکلیں، قومی زندگی کو سدھاریں اور سنواریں، میٹروں میں ایکٹ کریں، جلسوں میں گائیں، ملک میں فنون لطیفہ کا سہارا بن کر لیں اور عصمت کا دامن چھوڑے بغیر اس قابل ہوں تو اپنی روٹی بھی کمایا کریں۔ یہ حوصلے صرف اس وقت بار آور ہو سکتے تھے جب کوئی جرأت کر کے پہلا قدم اٹھائے اور پیش قدمی کے نتائج بگھٹے۔ نیاز یہ ذمہ لینے پر تیار تھی اور جتنی زیادہ ماں اور جان پہچان کے لوگ اس کی مخالفت کرتے

اتنی ہی اس کے جوش کی آگ اور بھڑک اٹھی اپنی ماں اور نسوانی "عزت آبرو" کے تمام بزدل یا قدامت پسند حامیوں کو اس نے اپنے حوصلوں کا دشمن فرض کر لیا، اور اگر اسے "عزت آبرو" کے معیاروں پر حملہ کر نیکہا موقع ملتا تو وہ کبھی نہ چوکتی۔ اس قسم کی بغاوت نوجوانوں میں بہت مرغوب ہوتی ہے، نیاز کلن میں بہت جلد ہر دلغیز ہو گئی، اسے بہت سے ایسے نوجوان مل گئے جنہیں اس کے حوصلوں سے ہمدردی تھی، کچھ ایسے بھی ملے جو عملی امداد دینے پر راضی تھے، نیاز نے بھی احسان کے بدلے احسان کیا۔ وہ طالب علموں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھی، تفسیریں کرتی تھی، اور جب کوئی ہم درپیش ہوتی تو کسی محنت اور جفاکشی کے کام سے دریغ نہ کرتی۔ اس کے عوض میں طالب علم اس کے ڈراماؤں میں ایکٹ کرنے پر آسانی سے تیار ہو جاتے، اگر وہ کوئی قومی گیت یا ترانہ سنگت میں گوانا چاہتی تو خوش آواز طالب علموں کی کمی نہ ہوتی، جو مصروف رہنا چاہے اس کے لئے بہت سے کام مکمل آتے ہیں۔ نیاز کی طالب علمی کا زمانہ اس کے مشاغل میں دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔

جب خلیفہ ختم ہوئی اور دنیا کے امتحان گاہ میں قدم رکھنے کا وقت آیا تو یکبارگی نیاز کی آنکھیں کھل گئیں وہ نوجوان کسی زمانے میں اس کے مقاصد کے فدائی معلوم ہوتے تھے اپنے ولولے بھول گئے۔ کسی نے نوکری کر لی، کوئی تجارت میں لگ گیا، کوئی شادی کر کے گھر سستی بن بیٹھا۔ نیاز کے یہاں اب بھی بہت سے آیا جایا کرتے تھے لیکن سب کی فکریں انکی پیشانیوں پر ایسی صاف ہوتی تھیں کہ ان سے کسی قسم کی امیدیں رکھنا صریحی ظلم ہوتا۔ نیاز یہ رنگ دیکھ کر نوجوانوں کی قوم کی قوم سو خفا ہو گئی، اور ماں کے بھجانے پر بھی اس خفگی کے اظہار میں ذرا بھی محکف نہیں رہتا۔ اسکے طعنے تھنے کا خوف ایسا تھا کہ سب اس کے یہاں آنے سے ڈرنے لگے اور سواد و چار کے جنہیں محبت اور وفاداری کھینچ لاتی تھی، نیاز کے یہاں طالب علموں کی آمد رفت بتدریج بند ہو گئی، نیاز نے اپنی طرف یہ تہیہ کر لیا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے گی، اور کچھ دنوں اس نے اس ارادے پر عمل بھی کیا۔ لیکن زیب النساء بیگم کو یکبارہ ہوسکتا تھا کہ اس کی عمر کے بہترین سال گوشہ نشینی میں گزر جائیں۔ شہر کے اکثر خوشحال خاندانوں سے انکے پہلے سے مراسم تھے، جب نیاز نے

بی۔ لے پاس کر لیا تو انہوں نے کثرت سے دعوت دینا شروع کر دیا، اور انکے یہاں دوسرے تیسرے جہان آنے لگے۔ نیاز دنیا و اردوں کو بہت ترچھی نکا ہوں سے دیکھتی تھی، اس کے خیال میں وہ سب کے سب اپنی روٹی کمانے میں ایسے مشغول تھے اور دل کے ایسے ٹھنڈے کہ اسکی ہاں میں ہاں ملانا بھی اکوڑی ذمہ داری کا کام معلوم ہوتا تھا اور اسوجہ سے وہ ماں کی دعوتوں میں صرف برے نام شریک ہوتی تھی، اور جہاں نوازی کا سارا بار ارجمند اور زینب بیگم پر پڑا تھا لیکن جب اسے طالب علم دوستوں سے قطعی مایوسی ہو گئی تو کچھ دنوں بعد وہ انہیں لوگوں میں اپنے ہمدرد تلاش کرنے پر مجبور ہوئی۔ زیب النساء بیگم نے ایک دن کہیں کہہ دیا کہ اسے اب دوستی کے بجائے شادی بیاہ کی فکر کرنا چاہئے تو وہ بہت بگڑی اور کئی روز تک روٹھی رہی۔ لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ ایسا دوست جو اسی کے سہمے رکھتا ہو، اور ایک اعلیٰ نصب العین کی خدمت کو گھر گھرتی اور اولاد پر ترجیح دیتا ہو اسے ملنے کا نہیں، اس نے شادی کی رسم کی مخالفت کرنا چھوڑ دی، اور امید اس کے دل کو ایک ایسے شوہر کی تصویر دکھا کر بھاننے لگی جو اسکی آرزوؤں پر قدا ہو اور اپنی محبت سے اس کی ہمت افزائی کرے۔ مگر یہ اسکا پختہ رہا کہ مزدوں کو جانچنے میں وہ سب سے زیادہ اسکا خیال رکھے گی کہ انہیں اس کے حوصلوں سے کتنی ہمدردی ہے، اور اگر اسے ہمدرد نہ ملتا تو شادی بھی نہ کرے گی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں نادر حسین، ایک برسر کا زیب النساء بیگم سے تعارف کرایا گیا وہ انگلستان سے نیا نیا واپس آیا تھا، اور ہندوستانی زندگی کی پابندیوں اور مجبوریوں سے وہ ابھی تک اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کھانے کے بعد نیاز کا گانا سنا کر اس نے کہا: ”نیا زہن، آپ کی آواز تو اتنی نفیس ہے کہ میرے خیال میں اگر آپ یورپ کی طرح گانے کے جلسے کرائیں تو بہت کامیابی ہوگی۔ ہندوستان میں خواہ مخواہ موسیقی کا فن بدنام ہو گیا ہے یورپ میں گانا بہت سی شریف عورتوں کا ذریعہ معاش ہے، اور لوگ انہیں برا کہنے کے بجائے اور الٹی انکی عزت کرتے ہیں، بس آپ بہت کیجئے اور فن موسیقی کو بدنامی سے بچائے۔“

نیا زچھل پڑی۔ آخر کار وہ شخص مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی! اس نے نادر حسین کی صہوت اور سیرت، مالی حالت اور دنیاوی حوصلوں پر غور کرنا فضول سمجھا۔ اس جانچ پر تال کی کیا ضرورت تھی جب اسے نیا ز کے خیالات سے ہمدردی تھی؟ نادر حسین کی دعوت پر دعوت ہونے لگی، اور نیا ز اس کی آؤ بھگت اس جوش سے کرتی تھی کہ وہ خوشی سے پھولے نہ سنا۔ ہر ملاقات پر دونوں بیٹھ کر مشوے کرتے، لگانے کے جلسوں کے پروگرام بنتے، آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب ہوتا، لیکن امید اور جوش کی یہ آب و تاب صرف چند روز رہی۔ خاندان والوں نے نادر حسین کو دکالت کرنے پر مجبور کیا، وہ آدمی ہوشیار تھا، اور تھوڑے عرصہ میں اس کے پاس مقدے اس کثرت سے آنے لگے کہ وہ کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کی طرح روپیہ کمانے کے سوا اور کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اسے نیا ز اور نیا ز کے حوصلوں سے وہی دھچی رہی جو پہلے تھی، لیکن وقت کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اکثر دعوتوں میں شریک ہونے سے معذرت چاہنے لگا۔ اور جب کبھی آتا تو اپنی مصروفیت کا دکھڑا روتا۔ نیا ز پر یہ بہت گراں گذرا، وہ چاہتی تھی کہ نادر حسین کے پاس دوسرے تیسرے دن مشوے کے لئے آئے کیونکہ وہ ایک عظیم الشان جلسے کی تدبیریں سوچ رہی تھی جو اس کے تمام مخالفین کا منہ بند کر دے اور اپنی تدبیروں کی سرگرمی میں یہ بھول گئی کہ نادر حسین کے اپنے دنیاوی اغراض بھی ہیں۔ جب نادر حسین نے مجبور ہچکچا ہچکچا کر اعتراف کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے فی الحال جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا تو نیا ز کے دل میں مایوسی اور بدگمانیوں نے هجوم کیا اور اس نے سمجھ لیا کہ نادر حسین نے اسے دھوکہ دیا ہے جس وقت نادر حسین نے قطعی طور پر مدد دینے سے انکار کیا سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے، نیا ز کی آنکھوں سے غم اور غصہ کی بجلیاں گرنے لگیں۔ غدر کچھ اور کیا گیا تھا، اس نے اپنی طرف سے الزام کچھ اور لگایا :

”نادر بھائی، آپ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آپ کو لوگوں نے ڈرایا ہے۔

وقت آپ کے پاس بہت کافی ہے، لیکن آپ میری مدد صل میں کرنا نہیں چاہتے۔“

”نادرسین کو چند لوگوں کے اعتراضات بھی یاد آ گئے، اور اس نے کچھ کمزور لہجے میں جواب دیا: ”جی ہاں، لوگوں کے سمجھانے سے اس معاملے میں میری رائے بھی ذرا بدل گئی ہے۔“  
 ”تو بس، میری آپ کی دوستی ختم ہو گئی، کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ آپ پھر تو نہ کرنا چاہتے۔“

اردچند چلائی ”ارے باجی، آپ کی کسی باتیں کرتی ہیں!“، زیب النساء بیگم نے نیاز کو خوب لٹکارا۔ نیاز منہ پھیرے بیٹھی رہی اور نادرسین سے بات تک نہ کی، کھانے کے ٹھوڑی دیر بعد وہ اپنا سامنہ لیکر چلا گیا۔

نیاز کے اوپر اس ”دعا بازی“ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کچھ دنوں بیمار رہی اور اچھے ہونے کے بعد بھی اس کے خیالات کا رنگ مانتی رہا۔ نادرسین سے اس کی صلح کرا دی گئی، لیکن اس کی آنکھیں بتا دیتی تھیں کہ گو وہ دوستانہ برتاؤ کرنے پر راضی ہے، مگر اب اس کے دل میں نادرسین کی کوئی وقت نہیں رہی ہے اسکا جی پھر چاہئے لگا کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ دعوتوں کے دن وہ اکثر طبیعت کی ناسازی کا بہانا کر لیتی یا اگر مجبوراً شریک ہونا پڑتا تو خاموش بیٹھی رہتی، کچھ گانے کی فرمائشیں کجاتی تو کہہ دیتی کہ گٹھے میں درد ہے۔

کلنچ کے دوستوں میں سے اب صرف عبداللہ کبھی کبھی ملاقات کو چلا آتا تھا، اس کی عمر قریب تیس سال کے تھی، اس کے غیر معمولی لمبے ڈیل، چوڑے سینے اور دہرے بدن نے اسے طالب علموں کی صحبت کے لئے کچھ ناموزوں بنا دیا تھا اور چونکہ ان اوصاف کے علاوہ اسکے لمبی گھنی داڑھی بھی تھی اس لئے اسے ”مولوی“ کا خطاب ملا تھا۔ طالب علم اسے بہت چھیڑا کرتے تھے، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ موقع بے موقع مخرے پن کی باتیں کیا کرتا تھا، اور انگریزی بہت غلط بولتا تھا۔ نیاز بھی دوسروں کے ساتھ اسکی ہنسی اڑایا کرتی تھی، لیکن اسے تجربے سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ عبداللہ دیکھنے میں چاہے جیسا ہو، دراصل وہ نہایت درجہ محبت کیش، وفادار اور جفاکش آدمی ہے اور اس کے انبار کی نظر ہر کوئی اتہا نہیں نیا ز اس کا

ادب کرنے لگی، اور ممکن ہے دونوں میں گہری دوستی ہو جاتی، مگر ایک برطینت طالب علم نے نیاز سے کہہ دیا کہ عبداللہ کا کچھ عرصہ پہلے ایک ہنگن سے باہر تعلق تھا، نیاز نے دریافت کیا تو سب نے اس واقع کی تصدیق کی، اور عبداللہ نیاز کی نظروں میں باطل گر گیا۔ اسکا یہاں تک ارادہ ہوا کہ عبداللہ کو گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کرے، مگر زیب النساء بیگم نے اسے روک دیا، وہ خود عبداللہ کی خوبیاں معلوم کر چکی تھی، اور جانتی تھیں ایسے آدمی وقت پر بہت کام آتے ہیں۔ اس لئے عبداللہ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی تھیں، اور جس طرح ہو سکا ظاہر کرتی رہیں کہ ان کے دل میں اس کی بہت عزت ہے، جب وہ کلج سے فارغ ہوا تو انہوں نے کہہ سن کر اسے ایک دفتر میں نوکر رکھا دیا۔ اور اس کے علاوہ دو تین خاندانوں میں بچوں کے پڑانے کے لئے بھی مقرر کر دیا۔ عبداللہ کو معلوم ہو گیا کہ نیاز اور ارجبند نے اس سے کیوں ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے انکے رویہ کی کوئی شکایت نہیں کی، نہ کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی، ہفتہ عشرے میں وہ زیب النساء بیگم سے ملاقات کرنے آتا تو نیاز اور ارجبند کی خیر و عافیت پوچھ لیتا تھا۔ اس کے سوا اسے انکے مشاغل سے اور کوئی سروکار نہیں رہتا تھا۔

نادرجین سے جس روز نیاز خفا ہوئی اس کے دو چار دن بعد ہی عبداللہ سہ پہر کے وقت زیب النساء بیگم سے ملنے آیا۔ وہ ارجبند کو ساتھ لیکر کسی دعوت میں گئی ہوئی تھیں، نیاز کو ملنے سی حرارت تھی اس لئے وہ گھر پر وہ گئی تھی، خادوم نے عبداللہ کو یہ سب بتا دیا، وہ حال دریافت کر کے فوراً چلا جاتا، کیونکہ اسے کوئی امید نہیں تھی کہ نیاز اس سے ملے گی، مگر وہ کئی میل پیدل چل کر آیا تھا، اور ذرا ستانے کی غرض سے تھوڑی دیر ٹہر گیا، خادوم بھی وہ نیاز کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور اس نے نیاز کو جا کر اسکی اطلاع کر دی۔ نیاز پلنگ پر بیٹی تھی، یہ خبر سنا کہ وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ جائے یا نہ جائے، اور پھر جلدی سے اٹھی، کپڑے بدلے اور گول کمرے میں پہنچتی عبداللہ جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ پیچھے سے نیاز کی آواز آئی:

”اسلام علیکم، مولوی صاحب کہنے کیے تشریف لائے؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں تھی صرف آپ لوگوں کی خدمت میں سلام عرض کرنے حاضر ہوا تھا“  
عبداللہ نے بڑھکر معاف فرمایا، اور پھر ادب سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”ابھی خادمہ سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت کچھ نامناسب ہے۔ بہت افسوس ہوا، آپ تو ایک زمانے میں ماشا اللہ انتہائی تندرستی کا نمونہ تھیں، یہ بخار کب سے آنے لگا؟“  
نیا نے منہ بنا کر جواب دیا۔

”مولوی صاحب، یہ وہ بخار نہیں ہے جو منچھر کے کاٹنے یا سعدی کی خرابی سے ہوتا ہو  
کبھی کبھی ایک انسان دوسرے کے ایسا ڈنک مارتا ہے کہ وہ برسوں ٹپتا رہتا ہے، میرا بخار  
اس قسم کا ہے“

عبداللہ کو یاد تھا کہ وہ ابھی تک راندہ درگاہ ہے، اور اسکی بے تکلفی پر گستاخی کا شبہ  
ہوگا، لیکن جو سوال زبان پر لانے کی اسے بہت نہ تھی وہ اس کی آنکھوں نے پوچھ لیا۔ نیاز اس  
کی آنکھوں میں ہمدردی، محبت اور وفاداری کا جلوہ دیکھ کر اپنی پرانی نفرت بھول گئی اور بڑھکھنی  
سے کہنے لگی:

”جی ہاں میری قیمت میں غالب لکھا ہے کہ جس شخص سے میں ہمدردی اور دوستی کی امید  
کروں وہ مجھے آخر میں دھوکا دے۔ پہلے کالج کے دوستوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ سب  
مجھے بھول گئے، ابھی ایک پیر منیر صاحب نے خود ہی وعدے کئے اور خود ہی وفادارے گئے۔  
دونوں کچھ دیر خاموش رہے، عبداللہ کو یکبارگی وہ دن یاد آگئے جب نیاز کی شوخ  
آنکھیں اور مصعوم منہ اسے یہاں کی تمام دعوتوں پر کھینچ لاتی تھی، وہ طالب علموں کے فخرے  
اور گستاخیاں برداشت کرتا تھا، نیاز کی بے پروائی اور دوستوں کی حقارت بھرنی نظروں  
کے جواب میں خدمت اور ایثار کے تحفے دیتا تھا، اور اس کی محبت مسخرے پن کا بھیس بنا کر  
آتی تھی کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ خاموش بیٹھا سوچتا رہے، نیاز بھی اپنی  
ناکامی کے تصور میں محو تھی، جب خادمہ ٹھنڈے شراب کے گلاس لائی تو دونوں چونک اٹھے۔



عبداللہ نے دو چار گھنٹہ شربت پی کر کہا:

”میرے خیال میں آپ بیکار اس ذرا سے معاملے کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگر آپ کی خدمت کے لئے ایک بیسٹرنالافٹ ثابت ہوا تو اس پر افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو خدمت اور ایثار کرنے والے خدا کے فضل سے بہت مل جائیں گے۔“

”آپ کا خیال یہ ہے؟“ نیاز نے مایوسی سے مسکرا کر جواب دیا، ”اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے لو کی طرح کسی قبرستان میں پناہ لینا چاہئے جہاں نہ کوئی امیدیں دلا کر پھیل سکے، نہ دھوکا دے، نہ دل کو صدمہ پہنچا سکے۔“

”آخر کیوں؟ آپ اپنے لوگوں سے امیدیں کیوں کیجئے جن پر آپ کو بھروسہ نہ ہو؟“

”تو آپ سمجھتے ہیں یہ پہلے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون آدمی کیا ہے؟“

”جی ہاں کیوں نہیں؟ بڑی حد تک آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بنیادی شخص کو فرض دیتا ہے جو کچھ رہن یا گریڈ رکھا سکے، اگر کوئی شخص کسی پر اعتماد کرتا ہے تو اسی صورت میں جب اسے اپنے یا دوسروں کے تجربے سے معلوم ہو جائے کہ وہ اسکا سہی ہے۔ میں ایک دفتر میں نوکر ہوں، اگر میں کسی سے تجارت کے لئے روپیہ مانگنے جاؤں اور اسے معلوم ہو جائے کہ میں تجارت کے ساتھ نوکری بھی کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے روپیہ نہ دیگا، خواہ وہ مجھے کتنا ہی ایماندار سمجھتا ہو، میں ان بیسٹرنالافٹ کے حالات سے واقف نہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، لیکن غالباً وہ روپیہ کمانے میں مصروف ہیں، اور اسے آپ کی خدمت سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آپ کے کام صرف وہی شخص آسکتا ہے جس کے اپنی کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔“

”جی ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں،“ نیاز کچھ سوچ کر بولی ”مگر ساتھ ہی آپ اگر یہ بھی بتا دیتے کہ ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں تو واقعی مجھے بڑا احسان ہوتا۔“ نیاز کے الفاظ میں کچھ طنز تھا لہجے میں غلو ص، عبداللہ سو اسکا کرنے کے اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر نیاز یکبار پوچھ اٹھی نہ ”اچھا آپ کے ذاتی اغراض کیا ہیں؟ اگر آپ سے میں مدد چاہوں تو آپ دینے پر تیار“

ہوں گے ؟ ”

عبداللہ گھبرایا ، گھبرا کر مسکرایا ، جھوٹ بولنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنا چاہے کبھی بات زبان سے نکل گئی :

” میں تو دل و جان سے ادٹے سے ادٹے خدمت کے لئے سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں ، مگر میری حیثیت کیا ہے کہ آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کروں مجھے کوئی جانتا نہیں میرا کوئی اثر نہیں ، اور آپ جانتی ہیں میں بدن نام بھی کافی ہوں ۔“

نیاز کے دل پر اس آخری جملے سے بڑی چوٹ لگی ، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ، عبداللہ یہ دیکھ کر بہت پچھتایا ، مگر بات منہ سے نکل چکی تھی ، نیاز نے اس کے دل کا غم دیکھ لیا تھا ، وہ سمجھتا تھا کہ نیاز خفا ہوگی یا روئے گی ، مگر کسی امید نے کبارگی نیاز کے حوصلوں کو پھر جگادیا تھا ، اور وہ کسی نئے سے مست معلوم ہوتی تھی ۔

” مولوی صاحب ، آپ غریب ہیں اور بدنام ہیں ، اگر آپ میری وجہ سے ذرا اور غریب یا بدنام ہو گئے تو آپ کا زیادہ نقصان نہ ہوگا ۔ بس اب آپ ہی میرے یار و مددگار و غمگسار بنئے ۔ . . . .“

زیب النساء بیگم اور ارجمند نے دعوت سے واپس آکر دیکھا کہ نیاز بڑے جوش سے تقریر کر رہی ہے ، اس کے منہ پر ہنسی ہے اور آنکھوں میں چمک ، اس کے مقابل کچھ دود عبداللہ سر جھکائے بیٹھا ہے ، زیب النساء بیگم نے نیاز کی بغض و کینہ تو معلوم ہوا اسے بہت تیز بخار ہو۔

نیاز کا خیال تھا کہ اس کی خفگی کے بعد نادر حسین شرمندہ ہو کر اس کے یہاں رخصتہ رفتہ آنا جانا بند کر دیگا ، اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ گاہے ماہے آنے کی بجائے وہ پابندی سے ہفتے میں دو بار آنے لگا ، اگر اس کی طبیعت نادر حسین سے بالکل ہٹ نہ گئی ہوتی تو وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی اور اسے آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ دراصل ارجمند سے

ملنے آتا ہے، یوں بھی وہ زیادہ عرصہ تک مغالطے میں نہیں رہی، نا حسین نے زیب النساء بیگم کی موجودگی میں ارجمند کو دو چار تحفے دئے، اور ایک دن نیاز کو ارجمند کی انگلی پر انگٹھی دکھائی دہی اب سارا معاملہ صاف ہو گیا۔

ارجمند کی طبیعت میں وہ بے تکلفی نہیں تھی جس نے اسکول اور کالج میں نیاز کی تفہیت کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا تھا، ارجمند اپنی اس خصوصیت سے بہت نالاں تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ہر جگہ، ہر مجمع میں نیاز کی ماتحتی اختیار کرنی پڑتی تھی، اسے نہ گانے کا شوق تھا نہ ڈراما کا، نہ طالب علموں کی صحبت سے کوئی دلچسپی، مگر محض اس خوف سے کہ کہیں ساری شہرت اور ہر ولعزیزی نیاز کے حصہ میں نہ چلی جائے، وہ ہر چیز میں شریک ہوتی تھی، اور نیاز کے مقابلے میں ذہانت اور جوش کی جو اس میں کمی تھی اسے اپنے حسن اور مدد بھری مسکراہٹ اور ہوشیاری کو کام میں لاکر پورا کرتی تھی، اس کے منہ سے نیاز کے خلاف کبھی کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا کہ وہ نیاز سے بازی لیجانے کی جی توڑ کوشش کر رہی ہو، جب زیب النساء بیگم نے دعوتیں دینا شروع کیا تو اسے اپنے داؤں چبھ دکھانے کا بہتر موقع ملا، نیاز کی طبیعت ان خوشحال مردوں اور عورتوں کو کبھی نہیں پسند آ سکتی تھی جو اپنی زندگی آسودگی سے بسر کرنا چاہتی تھیں، جیسے خزانہ منڈک ان بچوں کی شرارت نہیں پسند کر سکتا جو اس کی گڑھیا میں گھس کر سبز کافی کی چادر بھاڑ ڈالتے ہیں اور پانی میں ایسی اودھم مچاتے ہیں کہ اسے اپنے سکن سے جان بیکر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن ہنر کہاں چھپ سکتا ہو، وہی لوگ جو نیاز کی طبیعت سے گھبراتے تھے۔ اس سے بڑی لجاجت سے گانے کی فرمائشیں کیا کرتے تھے اور جب وہ گاتی تھی تو ایسے متاثر ہوتے کہ ارجمند کے تکلفات اور بیٹھیمی بنگا ہوں اور مدد بھری مسکراہٹ کی جادوگری اسکے مقابلے میں کوئی بعیت نہیں رکھتی تھی۔ ارجمند کا یہ دیکھ کر بہت جی جلتا تھا، اس لئے جب کبھی نیاز دعوت میں شریک نہ ہوتی تو اسے سید خوشی ہوتی، اگر کبھی نیاز بے وقت روٹھ کر مہمانوں کی طرف پیٹھ پھیر لیتی تو اس کا دل باغ و بستان ہو جاتا، مگر حاسد کی قیمت میں کرٹھنا کچھ کھا ہی ہوتا ہو

ارجند کے حسن کے سب گرویدہ تھے، اس کے مزاج اور اخلاق کی سب تعریف کرتے تھے لیکن جس لیے میں نیاز کے گن گائے جاتے تھے وہ کچھ اور ہی تھا۔

جان پہچان کے نوجوانوں میں بہت سے ارجند کی نظر سے گزے۔ جن کے پاس اتنا روپیہ جن کے مستقبل میں اتنی چمک تھی کہ وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے، اس کا خیال تھا کہ اسکی اپنی جھبک انہیں دور رکھتی ہے۔ دراصل اس کا حسن اور وہ توجہ جو وہ اپنی آرائش کی طرف کرتی تھی انہیں بھرکا دیتی تھی اور اسکی آنکھوں میں ایک خود غرضی کی جھلک بھی تھی جو سمجھدار نوجوانوں کو سلطنتوں کا حسن کے قریب میں آکر برباد ہونا، جائیدادوں کا نیلام ہونا اور بے آدمیوں کا تباہ ہونا یاد دلاتی تھی۔ نیاز خوبصورت نہیں تھی، اسے لباس اور زیور کا کوئی شوق نہ تھا، وہ نازک مزاج بھی تھی، مگر اس کی سادگی، بے تکلفی، سریلی پردہ آواز اور جوش بھری آنکھیں ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، اور ارجند کو دنیا داروں کے حلقے میں بھی محبوبہ اور بانی کی سند نیاز کے لئے خالی کرنا پڑا۔

نادر حسین بھی ان لوگوں میں تھا جنہیں ارجند نے اپنے لئے موزوں قرار دیا تھا۔ شروع میں وہ اس طرح نیاز کے قبضے میں تھا کہ ارجند ڈوبے ڈالنے کی ہمت نہ کر سکی، اور اس کے علاوہ وہ اسوقت تک محض ایک خوشحال آدمی کا لڑکا تھا اور اس نے اپنی کمائی سے خاندانی دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ارجند کی نظر اس پر رہی، اور جب اس نے دیکھا کہ وہ وکالت میں مصروف ہو، خوب کما رہا ہے اور آئندہ اور بھی کمائے گا تو اس میں مالدار بیریش کی پیروی بننے کی ہوس نے زور باندھا، اسکی خوش قسمتی تھی کہ نیاز اسی زمانے میں نادر حسین سے خفا ہو گئی۔ اس نے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اور جس شام کو نیاز کی دوستی ختم ہوئی اس نے اپنی دوستی کی بنیاد ڈال دی۔ اسے نادر حسین سے مطلق محبت نہیں تھی، لیکن عاشقانہ گفتگو کی اصطلاحیں سب کے کانوں کو بجلی معلوم ہوتی ہیں، اور ارجند اپنے دل کی کیفیت چھپا ناجانتی تھی اس نے جو انداز اختیار کیا اس سے نادر حسین کو یقین ہو گیا کہ اسے بہت اچھا مال مستل رہا ہو

اور اسے نہ کسی رقیب کا مقابلہ کرنا ہوگا نہ کسی چور کا اندیشہ رہے گا، اگر مجبندی آنکھیں اسے کبھی کبھی ڈرا ضرور دیتی تھیں، اس کے دل میں کچھ کھٹکا سا تھا جیسے اسکی عقل بھانہ نہ سکی، مگر دوسرے گزریا وہ قوی جذبات اس کی طبیعت پر حاوی ہو گئے، اس کے اندر اپنے دور کے بادلوں کی گرج بن گئی جن کے برسنے کا خوف رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

اگر مجبند اور نادرسین میں جو تعلقات قائم ہو گئے تھے ان سے نیاز کو کوئی شکایت نہیں تھی، نادرسین سے وہ مایوس ہو چکی تھی، اگر مجبند سے اسے ہمدردی یا مدد کی کوئی امید نہیں تھی اس کا دل کہنے سے باطل پاک تھا، اور اس لئے وہ دونوں اپنی زندگیوں کے باسے میں جو کچھ ملے کرتے اسے وہ خلوص سے تسلیم کرنے پر تیار تھی، اسے اس زمانے میں ایک دوست بھی مل گیا تھا جس کی وہ دل سے عزت کرتی تھی، جو اس کے تصور میں ان تمام خوبیوں کا مجسم بن گیا تھا جو کسی انسان میں پائی جاسکتی تھیں۔ خود عبداللہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد جب نیاز نے انتہائی سادہ دلی اور جوش سے اسے اپنا دوست اور مددگار بنالیا تھا بہت پریشان رہا، وہ اس ذمہ داری سے نہیں گھبراتا تھا جو نیاز نے اس پر ڈال دی تھی اسے اسکا یقین نہیں تھا کہ نیاز وہ حد سے بڑا کام کے گی جو دنیا انقلاب کے ہر اولوں کو ہمیشہ پہنچاتی ہے۔ نیاز سے اسے جو محبت تھی اس کا یہی تقاضا تھا کہ کسی طرح نیاز اپنے حوصلوں کو علی صورت دینے سے روکی جائے، اس لئے اس نے نیاز کو بدنامی سے، لوگوں کی تحقیر سے، بے غرتی سے بہت ڈرایا، مگر یہ بدبیریا بیکار ثابت ہوئیں۔ نیاز سب کچھ سن کر آخر میں پوچھتی تھی :

”میں نے ماما آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہوگا، مگر کیا آپ اسکی وجہ سے میرا ساتھ چھوڑ دینگے؟“

اور عبداللہ اپنی زبان کو چھوٹ بولتے پر آمادہ نہیں کر پاتا تھا۔ بطور آخری کوشش کے اس نے سارا معاملہ زیب النسا بیگم کے سامنے پیش کر دیا۔ زیب النسا بیگم دل میں تو ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ نیاز مفت میں مصیبتیں اٹھائے، لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں کہ محض انکی مخالفت اسکے حوصلوں کی مکر توڑ دے۔ انہیں امید تھی کہ نیاز کو بہت جلد ایک ہمدرد شوہر

ل جائیگا، اور اگر وہ اپنے حوصلے پر سے نہ کر سکی تو شوہر اور اولاد کی محبت ناکامی کی یاد بھلا دے گی۔  
 ناور حسین اور نیا زکی دوستی کا رنگ پہلے ایسا تھا کہ وہ سمجھیں نیا زاس سے شادی کرے گی، انکے  
 ایک دوسرے سے خفا ہونے کا رنج سب سے زیادہ انہیں کو ہوا، اور ارجمند نے جس خود غرضی سے  
 ان دونوں کو پھر میل ملاپ کرنے کا موقع نہیں دیا وہ انہیں بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ نیا زکا یا کو  
 ہو کر اپنے آپ کو یا اپنی نیک نامی کو صدمہ پہنچانا کوئی ناممکن بات نہ تھی، اس لئے وہ نیا زکی کسبیت  
 پر غور کرتی جاتی تھیں، مگر اس کے معاملات میں دخل دینا انکے اصول کے خلاف تھا۔ عبداللہ  
 نے جب ان کو بتایا کہ نیا زاس سے کیا چاہتی ہو تو انہوں نے پہلے اسی کے ذریعے سے نیا زکو بھجانا  
 چاہا، اور پھر ایک بار اس کی موجودگی میں انہوں نے نیا ز سے کہا:

”بیٹی تم نے اپنا دل تو مضبوط کر لیا ہے، مگر یہ بھی تو سوچو میرے کمزور دل پر کیا گزے گی جو  
 بہاری طبیعت کی درسی ناسازی تک نہیں برداشت کر سکتی تم اگر بدنام ہو میں تو مجھے قبر میں بھی نصیب  
 نہ ہوگا۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو تمہارے حوصلے پر سے نہ کرنے کا سامان کتنا کیا ہے۔ ایک بیچارہ عبداللہ  
 جو اپنی رونی کمانے کے لئے سارا دن محنت کرتا ہو تمہارے واسطے کیا کیا کرے گا؟ تمہیں بہت سے  
 لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہئے، تمہارے ساتھ دو چار شریف، دوزخ حال لڑکیاں شریک ہونا  
 چاہئیں جس سے لوگوں پر کچھ رعب ہے، اب تمہاری کوششوں کو ایک آوارہ لڑکی کا بھیرا  
 نہ سمجھ لیں جو گھر میں بھلے مانسوں کی طرح رہنے کی بجائے جلسوں میں گاتی پھرتی ہے۔ اگر دس آدمی  
 تمہارے اوپر انگلیاں اٹھائیں تو وہ چار لیے ہونا چاہئیں جو تمہاری طرف سے کچھ کہنے پر تیار ہوں  
 اور تمہیں مردوں سے کیا کام، تم کو تو عورتوں پر اثر ڈالنا چاہئے، اگر تم نے اپنے عقیدوں کی  
 پیروی کر کے بدنامی اٹھائی اور دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوئیں تو شریف لڑکیاں ڈر جائیں گی، کوئی  
 تمہاری تقلید نہ کرے گی، اور تمہاری محنت اور جفاکشی اور رسوائی سے کسی خدا کی بندی کو کوئی فائدہ  
 نہ پہنچے گا۔ میں نے آج تک تمہاری مخالفت نہیں کی ہے، لیکن سچ پوچھو تو تم نے ذرا بھی دودھ اندیشی  
 سے کام نہیں لیا۔ سب سے بڑی جھگڑتی ہو، اور تمہاری بد مزاجی سے سب نالاں ہیں ٹھیک طریقہ تو

یہ کہ تم اپنے جان پہچان کے لوگوں کو خوش کرو، سب کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرو پھر وہ آپ ہی تمہاری مدد کریں گے، تمہیں کامیابی کی دعائیں دیں گے۔ اور تمہارے بعد اگر کوئی غریب اور شریف لڑکی گانے کا پیشہ اختیار کرے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ واقعی کوئی خدا کی بندی اس کی شکایں آسان کر گئی ہے، میں برسوں سے اس فکر میں ہوں کہ تم نام پیدا کرو، مگر بیٹی تمہاری سمجھ کچھ ایسی اٹھی ہے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو اور جن لوگوں سے میں تمہاری تعریف کرنا چاہتی ہوں انہیں کے منہ سے تم مجھے نکالتی سنواتی ہو۔“

زیب النسا گیم کی تفسیر میں بے ترتیبی بہت تھی، مگر وہ کارگر ہوئی، نیا زاس وقت کچھ نہیں بولی شام کو جو دہان آئے ان سے خوب مٹھی مٹھی باتیں کیں اور انہیں جی بھر کر گانا سنایا، مگر اسکی سادہ دلی کا اندازہ ابھی تک زیب النسا گیم کو نہیں ہوا تھا، رات کو گیارہ بجے کے قریب وہ سونے کے لئے لیٹیں تو نیا زاس کے میں آئی اسنے گلے سے لپٹ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی، انہوں نے پوچھا، سر سہلایا، رونے کی وجہ پوچھتی رہیں، مگر نیا زاس منہ سے آواز ہی نہ نکلی، آخر کار اس نے نیکہ میں منہ چھپا کر کہا:

”اماں ہم مولوی صاحب سے شادی کرینگے۔“

یہ سنتے ہی معلوم ہوا تھا کسی نے زیب النسا کا گلا گھونٹ دیا۔ اسنے دل کا دھڑکنا بند ہو گیا۔ آنکھیں معلقوں سے نکلی پڑتی تھیں، اس گم تھے، تھوڑی دیر بعد جب صدرہ کا اثر کچھ کم ہوا تو انہوں نے نیا زاس کی بانہہ اپنے گلے سے ہٹائی اور کچھ بالوسی، کچھ غصے کے لہجے میں بولیں،

”نیا زاس باہل ہی دیوانی ہو گئی ہے؟ اچھے بھلے نوجوانوں سے جو تجھے کھلا پلا سکتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر روتھ جاتی ہے، کبھی کہتی ہے گانے والی کا پیشہ خستہ کیا کرے گی کبھی ایک غریب آدمی سے شادی کر کے اس کی جان مصیبت میں ڈالنے پر تل جاتی ہے، اری ذرا ہوش حواس درست کر، تجھے ہو کیا گیا ہے؟“

نیا زاس نے نیکہ میں اور منہ چھپا کر جواب دیا:

”اماں ہم کو امیر آدمی نہیں چاہئے، ہمارے حوصلے صرف غریب آدمی پوسے کر سکتا ہے۔“

”ہاں غریب اور کیا غریب! بیچارے پر کسی نے الزام لگا دیا کہ بھگن سے تعلق رہ چکا ہے تو ایسی بگڑی کہ کتنے کی طرح دھماکانے پر تیار ہو گئی، اب خدا جانے کیسے اس سے شادی کرنا چاہتی ہو، تو تو اپنی زندگی بگاڑ کر چھوڑے گی، تجھے میں کیا سمجھاؤں، مجھے اس بیچارے پر ترس آتا ہے اس میں کہاں بوتل ہے کہ تیرے ناز و خیر برداشت کرے، تو اس سے دو چار دن میں نفا ہو کر کہہ دے گی کہ جانے ہماری دوستی ختم ہو گئی اور اپنے گھر بھاگ آئے گی، اس بیچارے پر مفت میں ایک شریف زادی کے بہکانے کا الزام لگے گا، لوگ کہیں گے اس نے تجھے دھوکہ دے کر تیری زندگی برباد کی۔۔۔۔ تو تو ایسی خود غرض نہیں ہے، ذرا دوسرے کی نیک نامی کا خیال کر، نیاز نے تجھے پر سے سر نہیں اٹھایا، وہیں روتے روتے سو گئی، سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو زیب النسا بیگم اسے بڑی محبت سے پیار کر رہی تھیں۔“

اس دن سے زیب النسا بیگم سے زیادہ نیاز کے حوصلوں کا بہدر داور خیر خواہ کوئی نہ تھا نیاز منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کے لئے آئی تو انہوں نے کہا:

”دیکھ لڑکی تو بھتیجی ہو میں سستھیا گئی ہوں، اب میں تجھے بتاؤں گی کہ سمجھدار آدمی اپنا مطلب کیسے حاصل کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد تجھے بھاگ کر ڈیڑھ سو دعوت نامے لکھاؤں گی، دعوت نامے لکھ کر تجھے جتنی غزلیں اور گیت یاد ہیں سب سنوں گی، اور جو مجھے پسند آئے ان کی روزانہ دعوت کے دن تک مشق کروں گی، جب تو دعوت میں سب کو غزلیں سننا کہ خوش کر چکے گی تو تیری ہمدردی میں ایک تقریر کروں گی اور پھر دیکھیں گے گانے کا عام جلسہ کرنے کا کون مخالف ہوتا ہے جب تو نے ایک جلسہ کامیاب کر دیا اور تمام اخباروں نے تیری تعریف کر دی تو پھر کیا باقی رہے گا۔ تیرا جی چاہا باپ کی کمائی پر مسرور، جی چاہے اپنی روتی کما۔ تو ایسی مندی اور بیوقوف نہ ہونی تو یہ سب کب کا ہو گیا ہوتا۔“



نیا زکی طبیعت میں شک باطل نہیں تھا، ماں کی باتیں نگر خوشی سے پھول گئی، اور جلدی جلدی ہاتھ کر کے دعوت نامے شروع کئے۔

”دیکھو نیاز، زیب النساء بیگم نے اچانک کہا ”عبداللہ کو ضرور بلانا“

نیاز نے ماں کی طرف غور سے دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور وہ ماں سے جا کر بڑی محبت سے لپٹ گئی۔ انہوں نے شادی کی مخالفت کی تھی تو کیا ہوا، نیاز کو یقین ہو گیا کہ انہیں اس سے اور عبداللہ سے سچی محبت ہے۔ بڑی دعوت کے دن تک نیاز کے دل میں یقین بچتا رہتا تھا، اور ماں کا آلہ انشراح بھی اس کی سمجھ میں آ گیا، اس نے عبداللہ سے شادی کرنے کا خیال تو چھوڑ دیا مگر وہ الفت جس نے یہ خیال پیدا کیا تھا اس کے جذبات کا جوہر بن گئی، ایک زیور جس نے اس کے حسن کو دہلا کر دیا، ایک خوشبو جس میں اس کا جسم ہر وقت بسا رہتا تھا۔ جب دعوت کا دن آیا تو نیاز ایک نئی زندگی شروع کرنے پر تیار تھی۔

زیب النساء بیگم نے بہان بہت چن چن کر بلائے تھے، صرف ایسے نہیں جو محض امیر تھے یا ایسے جو ہر تجویز کی تائید کرنے پر راضی ہوں، اور تائید کے سوا اور کسی قسم کی مدد دینے میں مستی، غفلت کریں، نیاز کی آواز بھی خوب رنگ پر تھی، غزلوں اور گیتوں کے بیچ بیچ میں زیب النساء بیگم نے بہانوں کو اس کے ارشے سمجھائے۔ جو اختلاف رائے انکی تقریریں نہیں مناسکیں وہ نیاز کے نغموں نے خاموش کر دیا، اور جب مجلس برخاست ہوئی تو سب نے نیاز کی ہمت افزائی کی اور حتی الامکان مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

بہانوں کے هجوم میں نیاز ایک نوجوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکی جسے نادر حسین ساتھ لایا تھا، اس کا نام ہدایت اللہ تھا اور وہ اُسی صوبے کے ایک بڑے شہر کا رہنے والا تھا، بنگلہ میں نادر حسین اور وہ قریب ایک سال کے ساتھ رہے تھے اور دونوں میں بہت دوستی ہو گئی تھی وہاں سے واپس ہونے پر وہ اس کو شش میں مبتلا رہا کہ اپنی محنت سے کمائے کھائے اور آبائی جائیداد کی آمدنی کا سہارا نہ لے، نادر حسین کی طرح وہ بھی بیسٹر تھا، مگر کچھ دنوں دکھلا کر صحبت

اور مقدمہ بازی کی فضا میں رہنے کے بعد اس نے طے کیا کہ اس پیشے کی کمائی مفت خوری سے بھی بدتر ہے، اور اسے چھوڑ کر تجارت کے ارادے سے دو چار دوکانیں اور کارخانے قائم کئے، مگر اسے معلوم ہو گیا کہ لوگ اسے طرح طرح کے سبز باغ دکھاتے ہیں، دوکان یا کارخانے کا معائنہ کر کے باسجیدہ پھرہ بنا کر اسے یقین دلادیتے ہیں کہ اسے غریب دس بارہ فیصدی کا منافع ہونے والا ہے مگر اسے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور صرف چند ہزار کا نقصان اٹھانے کے بعد اس نے یہ ”پیشہ بھی ترک کر دیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اور کوئی شغلہ تجویز کرے، دولت اور فراغت نے اس پر جاو دو کر دیا، اور اپنے اچھے ارادے بھول کر وہ آوارہ میموں اور طوائفوں کے پھندے میں پڑ گیا۔ اس راستے پر اسکی روک ٹوک کر نیا لامبی کوئی نہیں تھا والدین نے اس کے ولایت جانے سے پہلے جائداد کے لالچ میں اس کی ایک مدقوق لڑکی سے شادی کر دی تھی جو بہت جلد مر گئی، اور اس سے جو ایک بچی ہوئی وہ صرف چند دن کی جہاں رہی، ہدایت اللہ جب ولایت سے واپس آیا تو اس کے پاس بہت سی دولت تھی جسے خرچ کرنے کے علاوہ اس کی زندگی کا بظاہر اور کوئی مصروف نہ تھا، پھر میں اور طوائفیں اپنے نصیب کو کیوں دعائیں نہ دیتیں۔

ناور حسین کی جب گنگنی ٹہر گئی تو اس نے ہدایت اللہ کو ارجمند سے ملنے کے لئے بلایا، ہدایت اللہ پر اسی زمانے میں عیاشی کی ایک موج گزر چکی تھی اس زندگی سے اس کی طبیعت سیر ہو گئی تھی اور ایک میم جس کی آشنائی اس کے خیال میں محبت کے درجے تک پہنچ گئی تھی اسے چھوڑ کر کسی راجہ کے پاس چلی گئی تھی۔ ہدایت اللہ نے کچھ اس غرض سے کہ کرنٹی کا ماجرا بھول جائے کچھ عیاشی کا خمار آتا رہنے کے لئے ناور حسین کی دعوت منظور کر لی۔ اتفاق سے وہ ایسے وقت پہنچا کہ زریب اللہ بیگم کی بڑی تقریب میں بھی شریک ہو سکا، ارجمند سے مل کر وہ بہت خوش ہوا، لیکن ارجمند جیسی لڑکیاں اس نے بہت دیکھی تھیں، کبھی شریف خاندانوں میں، کبھی آوارہ عورتوں کے حلقوں میں نیاز کی سی صورت اور سیرت سے اسے ابھی تک سابقہ نہیں پڑا تھا، اور اس کی ذہنیت پر عیاشی

کا رنگ اس طرح لگ گیا تھا کہ وہ ایسی عورتوں کے وجود ہی کا قائل نہیں رہا تھا، نیاز کو دیکھ کر اس کے دل میں نئے دلوںے پیدا ہوئے، اسے اپنی گذشتہ زندگی یاد کر کے شرم آنے لگی، اور اس کے دل میں ایک امید جاگ اٹھی کہ شاید نیاز کا اثر اس کی بری عادتیں چھڑا سکے اسے ہوس کے گرداب سے نکال لے اور پھر ایک مہذب انسان بنا دے اس لئے نادر حسین کے ذریعہ سے اس نے دوسرے دن چائے پر اپنی دعوت کرائی اور دل کا پیمانہ امیدوں سے لبریز کر کے گھر واپس ہوا۔

اس کی نیاز سے دوسرے دن ملاقات ہوئی، تیسرے دن وہ بن بلائے پہنچ گیا اور چوتھے دن بھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ رویہ درست نہیں ہے، اس سے خواہ مخواہ بدگمانی ہوتی ہے، مگر اسے خوف تھا کہ اگر نیاز کی دوستی کا سنہارا نہ ملا تو پرانی صحبت میں جا کر وہ پھر عیاشی میں مبتلا ہو جائیگا۔ اپنی کننگش سے نجات پانے کے لئے اس نے چوتھی ملاقات پر نیاز کو اپنی ساری سرگذشت سنا دی اپنی مجبوریاں سمجھا دیں، اور نیاز جیسی پاک دل عورت کا اس کے اخلاق پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ بھی بتلا دیا، ہدایت اللہ نے عیاشی سیکھ لی تھی، مگر عیاری اور مکاری سے ابھی تک باہل بیگا نہ تھا، اور نیاز سے باتیں کرتے وقت اس کے چہرے اور لہجے سے اتنا خلوص ظاہر ہوتا تھا کہ اگر نیاز نے اپنے عام قاعدے پر عمل کیا ہوتا تو وہ ہدایت اللہ کو ایک فرشتہ سمجھ لیتی جو دنیا کے قریب میں آگیا ہے اور اس کے ہمراہ فلک پائی کرنے کے خواب دیکھنے لگتی، مگر پچھلے دنوں وہ اپنی ماں کی بھرتی کی بہت قائل ہو گئی تھی، اور اسے اپنی غلطیوں کا بھی کچھ احساس ہو گیا تھا، اس موقع پر اس نے اپنے جوش کی لگام تھامی، ہمدردی اور اخوس کا اظہار کیا، لیکن کسی قسم کا قطعی وعدہ کر کے اپنے آپ کو پابند نہیں کر لیا۔ زب النساء بیکم کو معلوم تھا کہ از دو واجبی زندگی میں بیوی اگر چاہے تو کتنا اثر ڈال سکتی ہو، اور اس لئے جب نیاز نے انہیں ہدایت اللہ کا سارا قصہ سنایا تو انہوں نے اسے ایک ناقابل رحم مجرم قرار دے کر نیاز کو اس سے دور دور رہنے کی تاکید نہیں کی، ہدایت اللہ کی صورت میں شائستگی اور شرافت کے آثار ابھی اس قدر باقی تھے کہ اس کے مدھرنے کی امید کجا سکے، اور اگر انکو یقین ہو جاتا کہ اس نے اپنا چال چلن درست کر لیا ہے تو وہ نیاز کی اس سے شادی کر سکی

بھی مخالفت نہ کرتیں، اس لئے انہوں نے ہدایت اللہ کو تین چار روز بعد چائے پر بلایا اور باتوں باتوں میں اسے مشورہ دیا کہ اس کے شہر میں مکان لیکر دو چار مہینے رہے۔ یوں وہ اپنی صحبت سے پیچھا چھڑا سکے گا، اور وہ سب بھی اس سے اکثر مل سکیں گے۔

ہدایت اللہ نے اس تجویز پر عمل کیا، اور شہر میں مکان لیکر رہنے لگا، اس کا زیب النساء بیگم کے یہاں کثرت سے آنا جانا ہوتا تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وقت کاٹنے کے لئے وہ نیاز کے گھانے کا جلسہ کرانیکے دھندے میں پڑ گیا، شہر میں سکونت اختیار کرنے کے ایک مہینہ بعد ہی اس نے بڑے اہتمام سے جلسہ کرا بھی دیا، جلسے میں بہت لوگ آئے، ٹکٹ بہت بکے، نیاز کی تین سو روپے نقد آمدنی ہو گئی اور اخباروں میں اس کی خوب تعریف بھی چھپی، نیاز اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوئی اور ہدایت اللہ کے سلیقے اور حسن انتظام اور پاک نیتی پر اسے اتنا اعتماد ہو گیا کہ جب اس نے کوشش جاری رکھنے کی صلاح دی تو وہ فوراً راضی ہو گئی اور ہدایت اللہ نے اپنے شہر میں بھی اسی اہتمام اور کامیابی سے جلسہ کرا دیا۔ نیاز کے حوصلے پورے ہو رہے تھے، اوہ ہدایت اللہ سے اس کی وہ گہری دوستی ہو گئی جس کی دونوں کو اتنی متناہمی، اس عرصہ میں زیب النساء بیگم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہدایت اللہ پھر شریف اور خوش اخلاق لوگوں کی زندگی بسر کرنے لگا ہے اس نے بڑی سچی کے داغ اپنی طبیعت اور اپنے دل سے بالکل مٹا دے ہیں، اور اب اس کے خلوں اور نیت میں شک کرنا بجا ہو گا۔ ایک اور خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ اس نے نیاز کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اور اس سے امید کی جاسکتی تھی کہ بغیر نیاز کا دل دکھائے وہ اسے سادہ دلی کی حالتوں سے بچاتا رہے گا۔

لیکن زیب النساء بیگم کو مسرت کے زیادہ دن نصیب نہیں ہوئے، ارجمند کی شادی تین مہینے بعد ہونے والی تھی، ایک روز نادرسین نے ان سے شکایت کی کہ ارجمند نے تاج مہتری کرنے کو کہا ہے اور یہ نہیں بتایا کیوں، زیب النساء بیگم نے بھی ارجمند سے پوچھا، مگر کچھ صاف صاف معلوم نہ ہو سکا۔ ارجمند ایسی بیوقوف نہیں تھی جو اپنے ارادوں کا اعلان کرتی۔ اور ہدایت اللہ نیاز

کے جلے کی فکر میں تھا، ادھر اُس نے ماں سے چھپا کر نادرسین کے ساتھ منیما اور اس کے بعد نائج  
 دیکھنا شروع کیا اور پھر کسی میم کے یہاں خود ناچنا بھی سیکھ لیا، ہدایت اللہ جب نیاز کے جلوں سے فانی  
 ہوا تو ارجمند اسے بھی نادرسین کے ذریعے سے بلا کر ساتھ لے جانے لگی۔ نادرسین اپنی جھک اس قدر دور  
 نہ کر سکا کہ خود ارجمند کے ساتھ نہ پے اس لئے ارجمند اور ہدایت اللہ اپنے آپ اور وہ بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔  
 نادرسین کا قد ہدایت اللہ سے کہیں چھوٹا تھا، اس کا جسم سڈول، مگر وہ بلا، اور اسے انداز گفتگو کے وہ راز  
 بھی نہیں معلوم تھے جو لچپپی اور لگاؤ پیدا کرتے ہیں۔ ہدایت اللہ میں یہ سب صفیں تھیں، اور ان کے  
 علاوہ نادرسین سے، مالدار بھی زیادہ تھا۔ پھر ارجمند کی شادی کی تاریخ ملتوی نہ کرتی؟ اسے  
 خیال تھا کہ اگر اسے کافی مہلت ملی تو اس کا حسن، اس کی مدھری مسکراہٹ، اس کا نائج اور سنیما  
 کا شوق ہدایت اللہ کے دل میں نیاز کی جو محبت تھی اس کی بیخ کنی کے لئے کافی ہوگا، لیکن جب  
 اسے ذرا اندیشہ ہوا کہ شاید یوں کام نہ چلے تو اس نے ایک اور ترکیب سوچی، وہ معصوم بی بی ایک  
 رات کو نیاز کے پاس جا کر رونے لگی، اور یہ دکھلا کر کہ نیاز اور ہدایت اللہ کی خواہشوں کا اسے  
 کوئی علم نہیں اس نے کہا کہ اس کی طبیعت نادرسین سے بالکل ہٹ گئی ہے اور وہ ہدایت اللہ سے  
 شادی کرنا چاہتی ہو۔ نیاز کی ایثار پسند طبیعت بھلا یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی خواہش پوری  
 کرنے کے لئے وہ چھوٹی بہن کی آرزوئیں مٹی میں ملائے۔ اس نے صرف اپنی محبت اور اپنے  
 ارادے چھپائے نہیں بلکہ جوش میں ارجمند سے وعدہ کر لیا کہ وہ نادرسین کو سمجھا دے گی، ہدایت اللہ  
 کو اگر خدا نخواستہ کوئی تامل ہوا تو اس کو بھی راضی کر لے گی، اور ارجمند کو لوریاں بگاڑ سلا دیا۔

نیاز نے ایثار تو کیا لیکن اس کا صدمہ برداشت نہ کر سکی، دوسرے دن شام کو اسی بہت  
 نیز بخار چڑھا، بخار میں نیند آگئی، دو بجے رات کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو پسینہ جاری تھا اور  
 طبیعت بہت ہلکی تھی، اس نے سوچا کہ بخار کسی مرض کی وجہ سے تو ہے نہیں، اس لئے پسینہ بھگنے  
 سے جو ابھن ہو رہی تھی اسے دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی سے نہالی، سویرے ڈاکٹر  
 آئے اور کہا اسے نمونہ ہو گیا ہے اور اس کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔

نیا زکی موت نے سب کی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا، ہدایت اللہ کے دل میں پھر عیاشی اور آوارہ گردی کی ہوس پیدا ہو گئی۔ نیا زکی کے تیجے کے بعد ہی اس نے اپنے شہر واپس جا کر شراب نوشی اور نایج گانے میں نیا زکی یا د بھلائے کا ارادہ کر لیا لیکن نیا زکی کے مرتے ہی ارجمند کا حسن ایک عجیب طریقے پر نکھر آیا اسکی مسکراہٹ اور شیشلی ہو گئی، اس کے انداز نے ایک بیباکی سیکھ لی جو اس میں پہلے نہیں نظر آتی تھی، ہدایت اللہ پر اسکا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنا جانا ملتوی کر تا رہا۔ ارجمند اپنی طرف اپنی شادی کی تاریخ ملتوی کرتی رہی یہاں تک کہ نادرسین نے اس سے شادی کر لیا خیال فصول سمجھ لیا اور اس سے ملاقات کرنا تک چھوڑ دیا، زیب النساء یگم کو اب زندگی سے مطلق کوچی نہیں رہی، یہ ممکن تھا کہ وہ بیٹیوں کی محبت سے وہ اس ایک فیصل پہنچائیں جو زندہ تھی اور خوش معلوم ہوتی تھی لیکن خدا جانے انہیں کیسے شبہ ہو گیا کہ نیا زکی موت کی دراصل ارجمند ذمہ دار ہے۔ انہوں نے ارجمند کو اس کے حال پر چھوڑ دیا، کبھی یہ خواہش بھی ظاہر نہیں کی کہ وہ ہدایت اللہ سے شادی کر لے اور گھر آباد کرے۔ ارجمند نے بھی انہیں اپنے معاملات سے الگ ہونے دیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ نادرسین اس سے کوئی توقع نہیں رکھتا تو ہدایت اللہ سے شادی کر لی۔ دونوں کی رنگینی زندگی شہر مشہور مشہور ہو گئی، باتصویر راجا روں میں ارجمند کے نوٹو بھی چھپنے لگے، اور ارجمند کا نام ملک کی خوش قسمت عورتوں میں شامل ہو گیا۔

زیب النساء یگم سے صرف عبداللہ کبھی کبھی ملنے آتا تھا، اور دونوں گھنٹوں بیٹھ کر نیاز کی باتیں کیا کرتے تھے، آخر کار وہ موت کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں، اور عبداللہ کے ذریعے سے انہوں نے ایک شریف اور غریب لڑکی تلاش کر کے اسے متبنی کر لیا۔ روزنام کو وہ اس کے ساتھ باغ میں بیٹھتی تھیں، اس کے سر کو بھولوں سے سنوار کر اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور انکے دل کے حوصلے اپنی گہری نیند میں گمنما تے تھے۔

# راتر ماریا کے

گزشتہ جلدوں میں ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی اس برہن شاعر کی زندگی اور اُس کے کلام سے  
ناظرین جامعہ کو روشناس کر چکے ہیں۔ اس پرچہ میں اس کی چند اور منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں،

## بیوہ کا گیت

شروع شروع زندگی میں ایک فرہ تھا،  
ایک انگ تھی، ایک ڈھارس تھی۔  
یہ کہ جوانی میں یونہی ہوتا ہے۔

ان دنوں کیا معلوم ہوتا۔  
نہ معلوم تھا کہ زندگی کیا چیز ہے،  
اور فقط زندگی یہ ہو گئی۔  
کہ سال آیا اور سال گیا۔

نہ اس میں مزار ہا، نہ تغیر، نہ تحیر،  
جیسے کوئی بچ سے دو ٹکڑے کرے۔  
اس میں نہ انکی خطا تھی نہ میری،

ہم دونوں صابر تھے اور صبر بھی کرتے رہے،  
لیکن موت کو صبر نہیں۔

میں نے اس کو آتے دیکھا، دیکھا ہی برا آنا تھا اس کا آنا،  
اور میں اس کو نکلتی رہی اور وہ سمیٹتی گئی، سمیٹتی گئی۔

کچھ میری تھوڑی ہی تھی، میری !  
 پھر تھا کیا میرا؟ میری، میرا؟  
 کیا میرا سوگ، تک مانگے کا نہ تھا،  
 قیمت کا دیا قرض؟  
 تقدیر نصیب ہی نہیں لیتی  
 دل کا بیج اور جگر کے نالے تک لوٹ لیتی ہے۔  
 اور پھر اجڑے کھنڈل کو گدڑی کے داسوں خرید لیتی ہے۔  
 ہاں! تقدیر آتی اور ایک نہیں کے بدلے سب کچھ لے گئی،  
 میرے چہرے کی ہر بات،  
 میری چال، ڈھال،  
 سب،  
 جیسے روز کے روز کا نیلام،  
 اور جب کچھ نہ رہا تب اپنے حالوں چھوڑ دیا۔۔۔۔۔  
 خالی ہاتھ کھڑی ہوں!

## سٹران کا گمیت

لوگ مجھے روکتے نہیں، پتانے دیتے ہیں۔  
 کہتے ہیں کچھ ہو نہیں سکتا۔  
 فرزے<sup>(۱)</sup> ہیں۔

(۱) تشدید ”م“ پر ہے ”ز“ پر نہیں



کچھ ہو نہیں سکتا! ایک دنیا آتی ہے  
 اور چکر پر چکر لگاتی ہے،  
 یا رب روح القدس کے گرد،  
 اُرمہ ایک روح ہے روح القدس،  
 (سمجھے!)۔

قرے ہیں۔  
 نہیں، سچ مج کوئی یہ نہ سمجھے،  
 اس میں کوئی ڈر کی بات ہے،  
 یہ خون ہے خون۔

اور خون کا بوجھ سائے بوجھوں پر بہا رہے  
 میاں بڑا وزن ہوتا ہے خون کا۔  
 اور اب تو اکثر یوں لگے ہیں۔  
 کہ بھی اب تو اپنوں سے یہ نہیں سدھنے کا۔  
 قرے ہیں۔

ارے، یہ کیا ہے، گیند کہ غبارہ!  
 لال لال، گول گول، جیسے سارا سنسار  
 بھٹی اچھا کیا لوگو اسے بنایا۔

مگر یہ آنے کا بھی جو اسے بلاتیں؟  
 کیسی ہر چیز لایینی لاثانی ہے  
 ایک دوسرے میں گھسی جاتی ہے  
 ایک دوسرے سے نکلی آتی ہے:

کچھ فرسے فرسے، کچھ ڈھل ڈھل یقین،  
بھئی فرسے ہیں لوگو، فرسے ہیں (۱)

## یتیم کا گیت

میں نہ کچھ ہوں، نہ کچھ ہوں گا۔  
ابھی تو خیر ہوئے کو عمر ہی کیا ہے،  
لیکن آئندہ بھی۔  
مان باپو۔  
رحم کرو مجھ پر رحم۔

(۱) ہمارے گاؤں میں بادل دین نامی ایک سڑی رہتا تھا۔ میری عمر اس زمانے میں چار پانچ سال کی ہو گئی۔ جب کبھی وہ اپنی چٹ بھر لنگوٹی باندھے گھر کے پاس سے گزرتا میں اس کے ہونٹ چہرے سے ڈر کر بھاگ جاتا۔ وہ نہ کسی کو مارتا نہ بیٹا صرف سہرا تھا کہ چاروں طرف گردن کو آہستہ سے گردش دیتا اور دبی آواز سے بڑبڑاتا ”یو سب ہمارے آئے“ قارئین میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی ایسی ہی ہستی کا تجربہ ہوا ہوگا کہ اس کی اس نظم کو پڑھ کر اس سڑی کی شکل سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہر سڑی کی بڑ میں کچھ نہ کچھ دل کو لگتا ہوا فلسفہ ہوتا ہے اور ایسا نہ ہوتا تو مجذب و مجذب کیوں کہلاتے۔ رکتے کے سڑی میں اس کی خاص شہرت ہے۔ وہ کہیں اپنے خون کے بوجھ سے عاجز ہو کر جیتتا ہے کہ اب یہ بار نہیں اٹھتا کبھی قلابچ مار کر کہتا ہے کہ ”فرسے ہیں، کبھی اس دنیا کو سمجھنے یا سمجھتے ہوئے آفتاب کو لال لال غبارہ قرار دیتا ہے اور انگلی کے اشارے سے ہلتے ہوئے کہتا ہے کہ ”مگر یہ آٹکا جواب بلائیں، رکتے کی ایک ایک تحریر آنکھوں کے سامنے ایک ایک تصویر پیش کر دیتی ہے اور تصویر بھی ایسی تصویر کہ نہایت شدید اور جامہ دریدہ ہے دیکھ کر انسان کچھ دنوں تک تو آنکھوں سے محو نہ کر سکے۔ واللہ واعلم بالصواب

مگر عبث ہے میرا اپنا پوسنا ،  
 میری بنیاد بے بود -  
 میرا کون اور میں کس کا ؟  
 آج ابھی بہت سویرا ہے  
 اور کل ہو جائے گی بہت دیر  
 میرے صرف یہی ایک تن کا جامہ ہے  
 گھٹا ہے ، بیزنگ ہوتا ہے -  
 مگر کٹتے نہیں آتا ،  
 شائد یہ ابدابد کا ساتھی خدا کے گھر تک جائے -  
 میرے صرف یہی سر کے چند بال ہیں -  
 ( نہ کبھی کٹے نہ بے )  
 کبھی کسی کے پیارے تھے ،  
 اب کسی کے نہیں -

## باونے کا گیت

میری روح شائد میدمی اور ثابت ہو  
 لیکن اس سے میرا دل ، میرا میٹر صاخون ،  
 میری میٹر می رگیں ، میرے میٹرے عضو ،  
 ( یہ میری کفایت کے نشان )  
 میدمے نہیں ہوتے  
 اس کے لئے نہ باغ ہیں نہ کیا ریاں ،

میری نکیلی پڑپوں کے نکیلے دھلنے پر لٹکی  
 دہشت کے مارے پر پڑ پڑا رہی ہے  
 میرے ہاتھوں سے بھی کچھ نہیں ہونے کا۔  
 کیسے مار گئے ہیں یہ دیکھو:  
 چڑے چڑے، بیگے بیگے، بھاری بھاری،  
 پھدکتے ہیں جیسے برساتی بوٹ۔  
 اور تن بدن میں اور جو کچھ ہے  
 سب پٹا پانا افسوسناک،  
 پھر تجھے کاہیلی دیر ہے۔  
 کیوں ان لٹوں کو کوڑے کے ڈھیر میں نہیں کر دیتا۔  
 یا شاید وہ میرے اس چہرے پر خفا ہے  
 میرے بھولے منہ پر؟  
 ہاں یہ منہ بار بار تیار تھا کہ بالکل ہلکا۔  
 اور دل میں صاف ہو جائے  
 لیکن کتوں کے سوا کوئی پاس نہ پھسکا۔  
 اور کتوں میں وہ بات کہاں

## کوڑھی کا گیت

دیکھو میں وہ ہوں جس کو سب نے چھوڑ دیا ہے۔  
 شہر میں کسی کو میری خبر نہیں  
 مجھے کوڑھ چھا ہے۔

اور میں اپنی ڈگڈگی بجاتا ہوں،

(اپنی آفت کا نشان)

کہ سب سن لیں۔

اور کہیں پاس نہ آجائیں

اور اونچے کانوں سننے والے ہیں

کہ اس طرف نظر تک نہیں کرتے

کہ دیکھیں تو سہی کسی پر کیا مصیبت آئی ہے۔

انکی بلاے۔

(میرے بھی فرے ہیں)

جہاں تک اپنی ڈگڈگی کی آواز جائے اپنا گھر ہے

لیکن شاید تو اس ڈگڈگی کی آواز اتنی کرے

کہ اب پاس سے کتر ا جانے والے پھر کوسوں دور پر گھبرائیں۔

اور میں دیر دیر تک دور دور چلا جاؤں

اور نہ کوئی لڑکی دکھائی دے

نہ عورت

نہ مرد

نہ کوئی بچہ

جاوور شاید نہ بھاگیں سہم کر۔

(۱) پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ کوڑھی شہر سے باہر رکھے جاتے اور انکو شہر کے نزدیک آتے وقت ایک ڈگڈگی بجانی پڑتی تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں اور انکے سامنے سے چلیں۔

## شذرات

۱۲ اپریل قومی ہفتہ کا آخری دن ہے اور یہ دن جس طرح ہندوستان کے ہر حصہ اور ہر ہر گوشہ میں منایا جاتا ہے، جامعہ میں بھی اس دن کی یادگار منائی گئی، لیکن جامعہ میں یہ یادگار ایک خاص طریقہ سے منائی جاتی ہے۔ اس دن یہ ہوتا ہے کہ بیٹنگی، بھشتی، خدمتکار اور تمام دوسرے ملازمین کو چھٹی دیدی جاتی ہے اور انکا تمام کام لڑکے خود اپنے ہاتھ سے ملکر کرتے ہیں جس میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ غرض اس کی یہ جو کہ لڑکوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے سے بھی کبھی حار نہ پیدا ہوا اور ضرورت پڑے تو نہ صرف اپنا بلکہ دوسٹروں کا بھی معمولی سے معمولی کام کرنے میں تامل نہ ہوا اور اسکا مشاہدہ اس دن صاف طور پر ہوتا ہے۔ لڑکے اپنے کمرہ اور گرد و پیش کی صفائی کے لئے توفی الفور تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب دوسروں کا سوال آتا ہے تو اسوقت کینتھریپس و پشیش کرتے ہیں۔ لیکن جب اس رسم کی غرض دعا و غایت اور اس کام کا اصل مقصد ان کو بیا یا جاتا ہے تو پھر وہ بلا تامل اس کے لئے آگے قدم بڑھاتے ہیں اور چہرہ میں دتو کی تفریق نہیں ہوتی۔

’بڑوں کو چھوٹوں کے درجہ پر لانے کا تو یہ حال ہوتا ہے لیکن چھوٹے جب بڑے، رتبہ پر آگے کئے جاتے ہیں تو اس وقت کا نظارہ اس سے بھی زیادہ قابل دید ہوتا ہے۔ دیکھ کر کے وقت جب تمام لڑکے اور اساتذہ اپنے اپنے کام سے فارغ ہو چکے ہیں تو اس وقت کاکھانا طلبہ و اساتذہ مع تمام دیگر ملازمین ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اس موقع پر خدمتگارانہ اور نکر دل کو اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ بیٹھنے میں جو گریز اور تامل ہوتا ہے، وہ اس ذہنیت کو مٹانے کا سب سے کھلا ثبوت ہے حیرت ہر بنی آدم نے جو ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہیں، رسم ریت آپس میں ایک دوسرے سے اس درجہ بے گانہ اور نا آشنا ہو گئے ہیں کہ بڑے کو چھوٹے،

کے کام سے اس درجہ تنگ و عار آئے اور چھوٹے کو بڑے کے قریب سے اس قدر بعد اور گریز ہوا، بیچ تو یہ ہے کہ 'بڑائی' اور 'چھوٹائی' کا تین خیل خود ہمارا پیدا کردہ ہے، جب تک ہم ہی اس کو دور نہ کریں گے یہ لعنت ہم سے دور نہیں ہو سکتی، جامعہ اپنی اس چھوٹی سی برادری کے اندر اور ۲۶۵ دن میں کم سے کم ایک دن عملاً یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان انسان برابر ہیں اور کام اور فرائض کے اختلاف سے انسانیت کے درجہ میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

لیکن اس سال جامعہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور اپنے کام کا دائرہ نہ صرف جامعہ کے اندر محدود نہ رکھا ہے بلکہ اپنے گرد پیش کے انسانوں کی خدمت اور عہد ردی بھی اس نے اپنے ذمہ لی ہے، بعض حضرات کی تحریک سے یہ طے پایا ہے کہ خدمت خلق ورفاء عام کے اس قسم کے کام ہی کافی نہیں کہ صرف سال میں ایک دن یا دو دن کے جائیں بلکہ انہیں مستقل اور متواتر جاری رہنا چاہئے تاکہ دوسروں کو نفع بھی پہنچے اور کرنے والوں میں اس جذبہ اور خواہش کی استھلال کے ساتھ پرورش اور نشوونما ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جامعہ نے سر دست خود کام اپنے ذمہ لئے ہیں، ایک قریب بارغ میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام اور دوسرے بے کار مرد اور عورتوں کے لئے تھوڑی بہت معاش کا انتظام۔ اول الذکر کام تو ایک جماعت "ریٹ پرزائیسوسی ایشن" کے نام سے انجام دے رہی ہے جس کے ناظم بھی ہماری جامعہ ہی کے ایک کارکن ہیں لیکن موخر الذکر کام کے لئے البتہ کوئی جماعت کام نہیں کر رہی تھی اور اس کے لئے طلبہ اور چندا ساتھ ہی ایک جماعت تیار ہو گئی ہے جو عنقریب اس کام کو شروع کرے گی۔ یہ سرت طلبہ معاش کا انتظام اس کے سوا اور اس سے بہتر اور کوئی دوسرا نظر میں نہیں آیا ہے کہ ان بیکر دیلا بیواؤں اور غریب بوڑھیوں کو چرہ اور رونی فراہم کیا جائے اور اس کے عوض مناسب اجرت دیکر ان سے سوت لیا جائے۔ اس سوت سے اگر خود اہل سستی میں ایسے بننے والے نکل آئے تو انہی کو اجرت دیکر کپڑا تیار کر لیا جائے، ورنہ فی الحال دوسری جگہ بھیج کر بنوایا جائے۔ یہ کام نہ صرف

وقت کا ایک اہم ترین کام ہے بلکہ اپنے اندر ایک مستقل اور دیر پا نفع رکھتا ہے اور اس سے علاوہ اس کے کہ ایک طرح سے ملک کے اقتصادی پروگرام کی تعمیل ہوگی خود طلبہ میں مفلس اور نادانوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا جن کے اندر رہ کر انہیں آئندہ بہت کچھ کام کرنا ہے۔

کسی نے سچ کہا لوگ فرعون کو ناحق بدنام کرتے ہیں۔ اس میں اور ہماری سرکار میں فرق صرف یہ ہے کہ اُس غریب کو ”کلج کی زسوجی“ اور تعلیم کا دارالتموار سے کسی طرح بھی کم کارگر نہیں ثابت ہوا یہ صحیح ہے کہ مفتو لہین تعلیم کے جان و تن کا ربط قائم ہے مگر وہ آج اپنے لئے، اپنی قوم کے لئے، اپنی دین ایمان کے لئے بالکل مردہ ہیں۔

سمیات ذہنی کے عظیم الشان معلم جو سرکاری مدارس کہلاتے ہیں اپنا کام جس نظم و استقامت سے کر رہے ہیں اس پر ارباب نظر کو سنجیدہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تدارک کی معقول صورتیں نکالی جاسکیں۔ ہم یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو صورت حال پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ محکمہ تعلیم کی جانب سے دلی کے منتظمین۔ مدارس امدادی کو ایک گشتی جہتی کے ذریعہ دھکی دی گئی ہے کہ اگر مدرسہ کانپور یا کوئی کرن مجلس انتظامیہ حکومت کے خلاف سیاسی سورشوں میں حصہ لے گا تو حسب دفعہ قانون گرانٹ ان ایڈ بلا اطلاق مدرسہ کو سرکاری امداد دینا بند کر دیا جائیگا۔ گویا سرکار کا روپیہ تعلیم کے لئے نہیں رعیت کی آزادی عمل خریدنے کے لئے ہے!

جبکہ ہندوستان میں قومی تحریک کا زور ہوا ہے مدرسہ کے لڑکوں کو سیاسیات سے الگ رکھنے میں سرکار و عامیان تعلیم سرکاری نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بلاشبہ اس معاملہ میں اس کے عذر کے اندر ایک معقولیت تھی، سیاسی تحریکوں کی تخریبی ذہنیت اس سکون و اطمینان کی دشمن ہے جو جو عمر لڑکوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے۔ اگرچہ اس اعتراض کا جواب کسی کے پاس نہیں کہ



سرکاری تعلیم بذات خود ایک مضرت ہے جس سے اجتناب ہی کرنا بہتر ہے۔ لیکن طالب علموں سے گزر کر مدرسہ کے فیجیروں اور اراکین مجالس انتظامیہ کو یا سہی تحریکوں میں شرکت سے روکنا ایسا غیر معقول اور استبدادی طرز عمل ہے جس کی ہر طرح مخالفت کرنی چاہئے۔

اس وقت کہاں ہیں وہ لوگ جو مدارس کے لئے سرکاری امداد نہ لینا حماقت تصور کرتے تھے اور جن کو سرکاری دیم سرکاری تعلیم کا ہوں کی پیدا کردہ غلامانہ ذہنیت، ان کے خود غرضی و قوم فرشی سکھانے والے ماحول، ان کی فرقہ وارانہ جذبات کو برائے کھینچنے کرنیوالی کتب تواریخ، ان کی سطحی اور قومی علی کو مفلوج کرنیوالی تعلیم سے اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا کہ ”گورنمنٹ سے اپنا ہی روپیہ تعلیم کے لئے ہم کیوں نہیں لیں؟“ آئیں اور محکمہ تعلیم کی اس گشتی جٹھی میں اپنے سوال کا جواب لکھا ہوا دیکھ لیں۔ کیا اب بھی انہیں شبہ ہے کہ حکومت تعلیمی اداروں سے اپنا استحکام جاتی ہے نہ کہ رعیت کا فائدہ؟۔

بلاشبہ بے حصول کی تشفی اس جٹھی سوجھی نہ ہو سکے گی۔ ان کے نزدیک تو یہ ایک بر محل ہدایت نامہ ہے جو حکومت کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں غیرت قومی ہے وہ جانتے ہیں کہ جس قانون کے ماتحت یہ جٹھی بھٹی گئی ہے اس کا وجود اور استعمال ملک کے لئے ایک اہانت آمیز چیلنج ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری امداد واپس کر دیا جائے اور مدارس کو حکومت کے اغراض نہیں بلکہ قوم کا فائدہ منظر کھڑکھڑ چلایا جائے، خواہ اس کوشش میں کچھ مدرسے ٹوٹ ہی کیوں نہ جائیں۔

# رسالہ ادب

”ادب“ ہر حیثیت سے اہم باہمی ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس کا شیوہ ہوا اور تہذیبی  
مٹانت اس کا شمار۔ تمام معاصرین نے اس کا شمار بہترین رسالوں میں کیا ہے۔ اور آئندہ بہت کچھ  
ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ دل آزاری۔ دیدہ دہنی۔ فطری نزع۔ جماعتی تنگ نظری۔ مذہبی  
تعصب اور سیاسی اختلافات کے دھبوں سے ادب کا دامن پاک ہو اس کی تنقیدیں بے لاگ ہوتی  
ہیں لیکن ادب کے دائرے سے خارج نہیں ہوتیں۔ ادب کسی خاص جماعت کا نقیب نہیں ہے۔  
تہا با ادب اہل ادب اس کی پروری میں شامل ہیں۔

”ادب“ دنیا کو دکھانا چاہتا ہے کہ موجودہ صحافتی طوفان بے تمیزی میں بھی ادبی خدمات کا  
دامن تمام آلائشوں سے کیونکر پاک رکھا جاسکتا ہے۔ مذاق عام کی پیروی کے سائے میں پروان  
چڑھنا تو آسان ہے لیکن ادب کا سطح نظر اس سے بلند ہے۔ وہ مذاق عام کی اصلاح اور اہمیت  
و ادبی خدمات کا صحیح معیار پیش کرنا چاہتا ہے۔ کیا اردو کے ہی خواہ اس مقصد مقاصد کے  
حصول میں ادب کی مدد کرینگے۔

اگر آپ کو اس رسالے کی شان۔ بلند نگاہی۔ اور مٹانت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے چند  
پرچے ملاحظہ فرمائے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ حجم کم از کم ۷۲ صفحے چندہ للہ سالانہ  
ایک پرچے کی قیمت ۶۔

فیجر ادب ”متصل چوراہا یحییٰ گنج لکھنؤ“

مطبوعات

# ہندوستانی ایکاڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں ہندستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات | از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم اے ایل ایل ایم

سی۔ بی۔ ای۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے غیر مجلد عمر

۲۔ از زبان اورادب (یعنی زبان اورادب کی مختصر تاریخ) از مولوی سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ (عمر)

۳۔ عرب و ہند کے تعلقات | از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مجلد ۴۴۴ صفحات۔ قیمت چار روپیہ

۴۔ ناتن (جرمن ڈراما) | ترجمہ۔ مولانا محمد عظیم الرحمن صاحب ایم اے ایم آر اے۔ ایس مجلد ۵۰۰ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عمر)

۵۔ فریب مسل (انگریزی ڈراما) | ترجمہ۔ بابو ملک موہن لال صاحب روال۔ مجلد ۳۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ (عمر)

زیر طبع

۱۔ قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن | از اسے بہادر مہا ہنوپادھیاسے پنڈت گوری شنکر ہیرا چنداوجھا

۲۔ ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کروی

۳۔ ترقی زراعت۔ از رضا نصاحب مولوی محمد عبدالقیوم ڈاکٹر زراعت۔

ملنے کا پتہ: جنرل سکرٹری ہندوستانی ایکاڈمی۔ یو پی۔ الہ آباد

# مذہبی جھگڑے آج ختم ہو سکتے ہیں

بشرطیکہ ہم دوسرے مذاہب کا مطالعہ نیک نیتی اور انصاف پسندی سے کریں اور اظہار خیالات میں فرقی ثانی کے جذبات و حسیات کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھیں مذہبی مناقشات کی سب سے بڑی وجہ غلط بیانی اور بدگمانی ہے ہندو مسلم فسادات کا سبب بھی یہی ہو اسلئے پرامن اور صلح کل زندگی بسر کرنے کیلئے مذہبی معلومات کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہو یہ مقصد صرف

## اخبار پیغام صلح

کے مطالعہ سے پورا ہو سکتا ہے جو لاہور کا ایک سہ روزہ مذہبی اخبار اور اسلامی غیر اسلامی معلومات کا مخزن ہے پیغام صلح تمام دنیا کے مذہبی پیشواؤں کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو اسلام کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور انہیں صلح کا پیغام پہنچاتا ہے ہر مذہب ملت کے اردو خواں سنجیدہ اور مذہبی مذاق رکھنے والے صحاب اس کے بصیرت افزا اور مضامین سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی پیغام صلح ایک اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے

شرح چندہ سالانہ (مچیروپے) ششماہی (عین روپے) ستمبر روپے اطلباء سالانہ (پچاروپے)

ممالک غیر سے سالانہ (پندرہ شلنگ) نمونہ کا پرچہ مفت \* منیجر اخبار پیغام صلح لاہور

# کیا نام کہ ہم پھر آگے

حاجی الحرمین الشرفین حاجی مبلغ اعلیٰ المعروف بالچہول بجاجی بعلول نور اللہ قدس

## کیا نام کہ

صرف تین روپے سکہ رائج الوقت چہرہ شاہی کہ نصف جس کے ایک روپہ آٹھ آنے ہوتے ہیں، دفتر رسالہ "کامیابی" دہلی میں پہنچ کر آپ پوسٹ ایک سال تک بحساب شیشی و قری ہر مہینہ ہماری زیارت کر سکتے ہیں۔

کہ ہم کامیابی میں ہر مہینہ اتنی "پانچ" طبع کر اگر ادھر چھپو اگر پرنٹر لو بہتر کیا کریں گے۔

روپے بھیجنے کا پتہ :- منیجر رسالہ "کامیابی" پوسٹ بکس نمبر ۱۵۱ دہلی

## ایجنٹوں کی ضرورت ہے

جو ہمارے ہر قسم کے دیہی اور ولایتی کپڑے کے آرڈر حاصل کر سکیں۔ تنخواہ تین روپیہ ہمارے سنواریہ ہمارے ایک دیہاتی بھائی بھانے نقد مبلغ دو سو پچاس روپیہ داخل کرنا ہوگی، جو صاحب نقد ضمانت نہ داخل کر سکیں وہ درخواست کرنیکی زحمت نہ گوارا فرمائیں۔ جواب کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آٹا لائی ہے۔

سنٹرل کمیشنل پسنی لائل پور (پنجاب)



# THE NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY.

## BOOK-DEPOT

### DELHI.

---

*The Spirit of Islam:* New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added to this new addition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the chapter on "The Rationalistic and Philosophical Spirit of Islam" By the Rt. Hon. Syed Amir Ali, P. C., L. L. D. C. I. E.

Rs. 20.

*Studies in Persian Literature:* An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and a Criticism of the poetry of Firdawsi, Manu- chehri and Unsuri. By Syed Hadi Hasan B.A., B.Sc. (Cantab)

Rs. 5.

*Islamic Culture and National Education:* By Dr. Sir P.C. Roy, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab) Bar-at-Law.

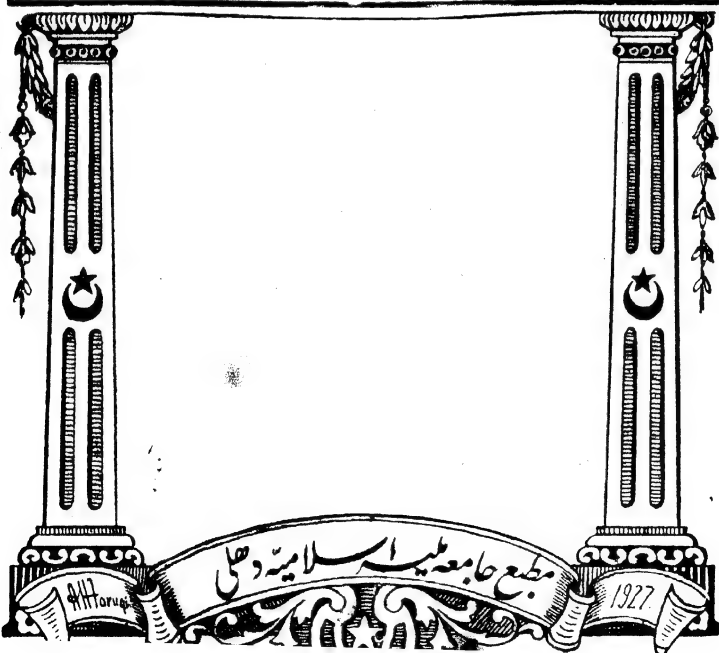
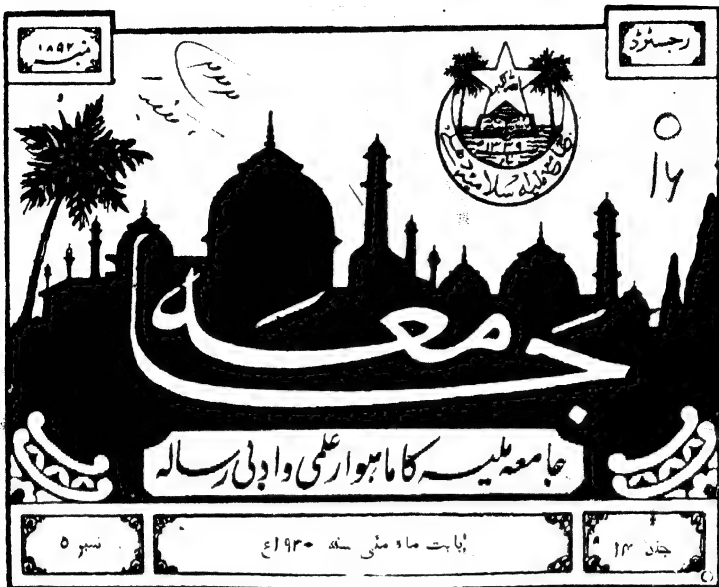
As. -8-

*Laolus and other Poems:* Charming bound. printed at the Jamia Press in Clear type. The Volume makes an appropriate gift for those who not only appreciate handsome books but desire to read and re-read the books they possess By Eric Dickinson.

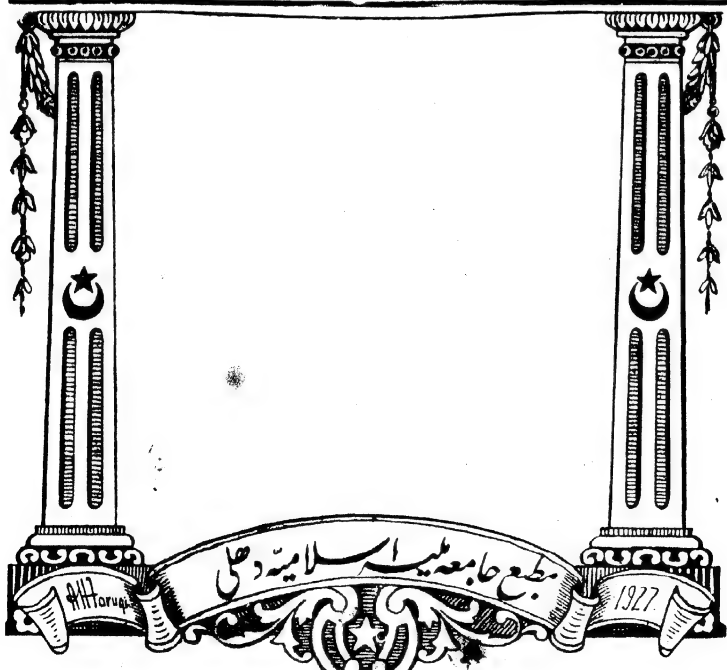
Rs. 2-4-

*Thoughts on the present Discontent:* Reprinted from the "Times of India" and the "Indian Spectator." By Maulana Mohammad Ali.

Re. 1.









بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# مجلہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیر جوی ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی  
جلد ۴۴ | بابۃ ماہ مئی ۱۹۳۰ء | نمبر

## فہرست مضامین

- |     |                                   |                                |
|-----|-----------------------------------|--------------------------------|
| ۳۲۲ | ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب پی ایچ۔ ڈی | ۱۔ ہندوستان میں فن کا دور جدید |
| ۳۲۹ | مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی   | ۲۔ رباعیات عزیز                |
| ۳۳۰ | عبد القادر صاحب بی اے (جامعہ)     | ۳۔ سیاسیات پر چند عربی تصانیف  |
| ۳۴۰ | قاضی عبدالغفار صاحب               | ۴۔ سنجیدگی کا دوسرا رخ         |
| ۳۴۹ | قاری سرفراز حسین صاحب             | ۵۔ جدید علم کلام               |
| ۳۵۸ | جناب احسن مارہروی                 | ۶۔ تاریخ نثر اردو              |
| ۳۶۶ | جناب عسکریہ احمد صاحب عثمان آبادی | ۷۔ روس میں افسانوں کا ارتقار   |
| ۳۷۷ | مولانا محمد حسین صاحب محوی        | ۸۔ ایک بد نصیب انسان           |
| ۳۸۷ | " " "                             | ۹۔ مزدور و سرمایہ دار (نظم)    |
| ۳۹۰ |                                   | ۱۰۔ تنقید و تبصرہ              |
| ۳۹۵ |                                   | ۱۱۔ مشذرات                     |

# ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۳)

## مبئی آرٹ اسکول

سر عنوان بالا کے ضمن میں فن اور تنقید فن کے متعلق ہم سال گذشتہ کے جون کے پرچے میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں، یعنی یہ بتلا چکے ہیں کہ فن کا صحیح مفہوم کیا ہے اور تنقید فن کا موجودہ رنگ کیا ہو۔ اور کیا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ماہ ستمبر کے نمبر میں ہم نے ٹیگور اور ٹیگور کے شاگرد اور خوشہ چیں کے عنوانِ ضمنی میں ہندوستان کے سربراہ اور وہ فنی ناہندوں کے اور پانپار رائے کیا ہو اور ضمناً انکا یورپ کے دورِ جدید کے استادانِ فن سے موازنہ بھی کیا ہے۔ مضمون کے اس تیسرے حصے میں ہم ٹیگور کے علاوہ جو اثرات موجودہ فن پر سلاطین ہیں۔ ان پر نظر ڈالیں گے۔ انوس اس کا ہو اور وہ بھی کم نہیں بلکہ نہایت تنگی و افلاس کے ہاتھوں ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم جن مصوروں اور جن تصویروں کا ذکر کرتے ہیں ان کے مرقع بھی شائع کر سکیں۔ اس سے کہنے والے کی بات آدمی ہتی ہے۔ اور پڑھنے والا اگر یہ شک بیانی جھیل بھی لے گیا تو آخر تشنہ رہتا ہے۔ بہر صورت۔

گذشتہ مضمون میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ٹیگور کا کیا عمل اور کیا اثر رہا ہے اور ان کے اثر سے گریز نہ کر سکتے تھے۔ البتہ وہ لوگ اس سے آزاد ہیں جو حکومت حال کے زیر سایہ فن کے یورپی نہیں بلکہ انگریزی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ اور جن کی تعلیم بالذات بالاصغات انگریزی روش کے سب سے بڑے مدرسہ یعنی مبئی آرٹ اسکول میں ہوئی ہے۔ اس رنگ کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اس اسکول کی سالانہ نمائش میں مبئی

کے سر پر آوردہ مصوروں اور صورت تراشوں کے کارناموں کو دیکھا جائے۔ ان نمائشوں میں اگر آپ جائیں تو دیکھیں گے کہ دیواروں پر شروع سے اخیر تک بھڑا دھواں تصویریں نہایت بے ڈسنگ پن کے ساتھ لپی ہوئی ہیں اور ان میں سے بے شمار نمونوں کے نیچے۔ خدایان ذوق کہنے یا امتحان فن کے مختلف شدت نعرہ ہائے تحسین چباں ہیں کسی چٹھی پر لکھا ہے کہ ”خوب“ کسی پر ”نہایت خوب“ کسی ”پرتعذ نقری“ کسی ”پرتعذ طلانی“ کسی پر دو سو کا انعام سرکار کسی پر سید انعام دربار وغیرہ وغیرہ اور جس پر کچھ نہ ہو اس کو جلنے کے امتحان میں نیل۔ پھر اس شدت رائے میں بالعموم حس بدلتی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے تصویروں کو دیکھنے تو ان میں رنگوں کی وہ بے معنی بھرا کر کہ ان میں کہیں انفرادی ذوق نگاہ کا پتہ نہیں چلتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر انگلنڈ کے بنے جرنی کے چپے *Visit Benares* یا *Visit Kashmir* کے اشتہار لٹکے ہوئے ہیں جس طرح سادوں کے اندسے کو ہر اہی ہر ادھائی دیا جی اسی طرح مغرب کے جہانیاں جہاں گشتوں کو پورٹ سعید کے اس طرف بس رنگ ہی رنگ کی بوجھا نظر آتی ہے اور لٹکے مصوروں کے یہاں سال بھڑوں لوں کی ہولی رہتی ہے۔ ان کے زیر اثر ہائے غریب ہم ملک بھی تیز سرخ کی چٹک منگ ڈبل میں آپ ہی آپ بنانے لگتے ہیں یہ نہیں کہ آدمی رنگوں کے پتھار کا قائل نہ ہو یا اس سے منکر ہو کہ ہندوستان بلکہ سائے مشرق میں رنگوں کا نکھار خاص بات رکھتا ہے۔ لیکن رنگ صرف علمی چیز ہے اور نیا آنی والا ایک نئی دنیا میں صرف علمی چیز کو دیکھتا ہو اگر خوش نیت ہو تو شوخی رنگ ہو جو محفوظ ہو گا اگر بے نیت ہو تو مس میو طرح مایوں میں منہ ڈال کر خود پرانگندہ ہو گا اور دوسروں کو پرانگندہ کریگا۔ مگر ہم تو ہندوستان میں نئے نہیں ہیں۔ ہم خدا کے بندے یہ رنگ و پتہ کیوں بھریں۔ ایک جھج ہے کہ رنگ، رنگ، رنگ! رنگ اسے جٹا میں نہیں، منسل روش میں نہیں، راج پوت مصوری میں نہیں، لیکن ہمارے رنگوں کے پس پشت جو شے ہے دیکھنے والا اسکو دیکھے اور دیکھنے والا یہ دیکھے کہ ہمارے رنگ کبھی بے درد نہیں ہوتے اور انے گہرائی پھوٹ پھوٹ کر نمایاں ہونے کی نیت ہم کہیں گوتم بدھ کا شدت سکون نظر آتا ہے تو کمینٹ راجا کے قص کی شدت حرکت کہیں

جنگیر کے عیش و طرب کا شدت لطف تو کہیں سر دشید کا شدت جذب بھبھی میں ہم کو یہ نہیں ملتا بھئی میں ہم دیکھتے ہیں تو ہیں وہاں کے فیل، فیل اور پاس بالعموم درفیل نظر آتے ہیں۔ "کولاکو" کی خیر اکشر تصویریں اچھی ہوتی ہیں بقول بھبھی والوں کے "چلین گا" لیکن اس سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس ناہندی رنگ میں رنگے ہیں جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر بھبھی کے بالعموم تمام مصوروں پر چھایا ہوا ہے۔ ان مستثنیات میں ایک بشر شخصیت ہیں "اسی لوسی" لیکن وہ بھبھی اسکول کے ہاتھوں نہیں بلکہ بہت کچھ پھر ٹیگوری کے ہاتھوں تاہم اسی وہی کا طرز نہایت خاص ہے۔ انکا راستہ بنگال اسکول سے بڑی حد تک جدا گانہ ہے۔ ان کی تصویروں میں ایک بہتر تصویر ہے "بھگت ہریداس" جسکو دیکھنے سے اس دعوے کی دلیل ملتی ہے لیکن بھبھی کے خدایان فن کے منتخب ترین بندوں میں مٹر ٹاسکر معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ان کو اپنے موقلم پر بہت کچھ قابو ہے اور وہ خود داری میں بھی کوشاں ہیں لیکن ایک تو ان کی یہ ہوس ان کو تباہ کرتی ہے کہ دریائے گنگا کے بہر شدت ہندی کناروں پر روم اور یونان کے سسٹے بے سزہ رنگ ڈھنگ پیش کریں اور دوسرے ان کی بت گری میں اپنا راوی و رما کا بد مذاق اور بے وقار رنگ عاوی ہے جو کھاتے پیتے حلوائیوں اور پان بیڑی سگریٹ والوں یا انہیں جیسی ذہنیت کے مہاراجاؤں کے مکانوں کی سجاوٹ میں صرف ہوتا ہے۔ اس قماش کے مصوروں کی انتہا ہم کو وہاں کے دو مسلمان حضرات میں نظر آتی ہے یعنی مٹر علی بخش اور مٹر شریف میں جسکو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا نہایت وطن پرستی کے ساتھ احساس ہے اور بازار کے بھاؤ اور کبری کا نہایت صحیح اندازہ ہے۔ مذہب نہیں لیکن ملائیت کا خطرناک جمود وہ شے ہے جو ہندوستان کے فن کو اسی طرح پامال کر رہا ہے جس طرح ہندوستان کی سیاست کو اور جس طرح سیاسیات میں اسی طرح فنیات میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہمہ وقت عوام کے رکیک احساسات پر اپنے رکیک اغراض کی پرورش کرتے رہیں گے خواہ وہ زمانہ موجودہ کے دیوتا ہوا کی بھینٹ چڑھا کر مکمل ہو یا زمانہ پارینہ کے۔

اور ہر ضحیٰ حلوائیوں اور پان بیڑی سگریٹ والوں کی خوش مذاقی کا ذکر آیا ہے۔ ان

سے شکایت بجا۔ ان کا طبقہ دنیا میں ہر جگہ رہا ہے اور رہے گا۔ ہاں رونما ہے تو اس کا کہہ جائے یہاں ان اونچے طبقوں میں انہیں کا سا مذاق رائج ہے جو ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں صحت مذاق کے حامل رہے ہیں اور جن کے وجود کا سچ پوچھنے تو صرف یہی ایک کفارہ رہا ہے کہ انہوں نے فنی قدروں کی رکھوالی کی ہے۔ صحیح مذاق ہمیشہ ملک رہی ہے ایک مخصوص گروہ کی جس میں ایک طرف تو فن کے برتنے والے اہل فن ہوتے تھے اور دوسری طرف اس کے سمجھنے پر کھنے اور فن سے دلچسپی رکھنے والے اور یہ گروہ سرچشمہ ہوتا تھا فنی قدروں کے انعکاس کا جس سے عاری الحسن بھی ایک حد تک تر زبان ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آج ہمارے یہاں جبکہ فن کی پرانی روشیں بال مال ہو چکی ہیں اور نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہیں ہم اپنے یہاں رو سا کے اُس طبقہ کو سر اسرنا پیدا پاتے ہیں۔ عام طور پر اس طبقہ کا معیار حسن محض قیمت رہ گیا ہے۔ یہ حضرات روس رائس سے لے کر فورڈ کے جو پیسے تک حسب المقدور مشینوں کے علاوہ قیمتی سے قیمتی اور ارزاء سے ارزاء یورپ کی مشینوں کا بنا ہوا کوڑہ خریدیں گے۔ لیکن خود ہندوستان کے فن اور دستکاری کے بہترین نمونہ ان کے پس پشت رہیں گے اور عام درباری اس قیمتی خرافات کو دکھائیں گے اور عیش عیش کریں گے۔ ”جی ہاؤ سکر!“ اکثر شاید معترض ہوں کہ نہیں ہمارے یہاں ایک نئی زمین اور نیا آسمان بن رہا ہے اور ہمارے متمول طبقہ میں فنی قدر کا حس آچلا ہے۔ لیکن ممبئی کی فائش دیکھئے تو اور دہلی کی فائش دیکھئے تو فو وخت سے اس کا بہتہ نہیں چلتا۔ اگر کسی کو کوئی اچھی چیز نظر آئی تو پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کسی سیاح نے لی ہے۔ ایک ہونہار مثال ہیں حیدرآباد کے ایک نہایت درجہ فن پرور نواب جن کے یہاں محل اور فارسی تصاویر کا نہایت بے بااد خبیہ موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دیکھئے تو یورپ کی بیشیں ہماہذلیات بھی نظر آئیں گی جن کو محل کی سجاوٹ میں مست از تریں درجہ نصیب ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جدید اہل فن اپنی ہی کر رہے ہیں اور خوب کر رہے ہیں لیکن عام بد مذاتی کا اثر یا تو یہ ہوتا ہے کہ مصو راہ اپنی اُمنگ کا خون کر کے جس چیز کی مانگ ہے یعنی ”تورے نینا ستمگر جادو بھرے“ بنانے لگتا ہے یا

خود کش نہ اور سخت آگیں بے نیازی میں اپنی پناہ لیتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہندوستان کے نئے اہل فن اسکول کے لڑکوں کی طرح سونے چاندی کے تمغوں کو اپنا ہتھائے نظر نہ بنائیں گے اور اپنے مو قلم کی مٹھو کر دں سے موتوں کو ایک دن جگائے بغیر دم نہیں گے۔

تصویروں کے علاوہ بھٹی میں صورت تراشی کا بھی خاصہ چرچا ہے لیکن کیا صورتوں کے ہال میں داخل ہو جائے تو ہر صورت موت سے مشابہ زندگی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی انگلستان میں مادام توسو کے موم خانہ میں اچانک داخل ہو گیا ہے یا کسی عجائب خانہ کے بکس بھرے آدمیوں کی شبیہوں کے کسرہ میں۔ ان صورتوں کو غور سے دیکھ کر اپنی موجودہ پستی کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور دل کو ایک سخت ٹیس لگتی ہے۔ یہ ہر کہ آیا خدا نے انسان اور دو عالم کو بنایا ہمیشہ کے لئے فلسفیوں کی فلسفہ چینی کا سرگز رہے گا لیکن ہندوستان کے پُرانے بت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس ہر کے شاہد ہیں کہ انسان اگر چاہے تو ایسے خدا تراش سکتا ہے جو اپنے کو منوائے بغیر نہ رہیں اور جن کے سامنے سرنیاز کو خم سجدہ کے سوا یا رانہ ہو! اور یہ ہندوستانی جو یہ سب کچھ کر سکتے تھے اور جو پساڑ کے پہاڑ تراشکر ان کے سینوں میں اہنٹا اور ایلورا جیسے عفرتوں کی جان ڈالنے پرتا درتھے آج اس سے زیادہ کے اہل نہیں کہ ایسے بے جان مردے بنائیں جن میں اگر زندگی کا کچھ شائبہ معلوم ہو تو اس سے زیادہ نہیں جتنا کہ بکس بھرے جانوروں کے ہیولے میں نظر آتا ہے اور انسان کو جس درجہ اپنے وطن کے قدیم صورت تراشوں کی غفلت کا احساس ہو گا اسی درجہ ان ہیولوں کو دیکھ کر اپنی حقارت اور کم مائیگی پر افسوس و ندامت و اسنگیر ہوگی۔ بھٹی کی موجودہ فن صورت تراشی کے سورا تا تلم گورگاؤ ذکر اور واک نظر آتے ہیں۔ سب کے سب ایک سے بے لطف، بے رنگ، بے کار۔ اس لحاظ سے غزنوی کو اب مونا چاہئے تھا کہ جب ہندو نے نامی ایک غیر پیشہ ور



صورت تراش کے ”ہندوستانی بھیا“ سے البستہ اُمید کی ایک ذرا سی جھلک نظر آتی ہے۔ شکل کا انوکھا پن، اظہار کا پرتو، دستکاری کی قدرت یہ سب کچھ مگر ڈرتے ڈرتے کس سے؟ تالم، گورگاؤ، کراو، واک جیسے بے بضاعت پیشہ وروں سے جن کی ملک اور ”گوٹمنٹ بھادر“ میں سا کہہ قائم ہے۔ فن صورت تراشی کو بھی ہندوستان میں ٹیگور جیسے راہب کی ضرورت ہے۔ اس وقت چاروں طرف دیکھئے مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ شاید آگے چل کر کوئی الٹہ کا بندہ نکلے اور ان بے رُس پیشہ وروں سے نجات دلائے۔

ایک اور چیز بھٹی آرٹ اسکول کے پیروں میں خاص طور پر نمایاں ہے یعنی پرانی مذہبی روایات کے علاوہ جو اسلاف کے تخیل خزانہ سے ہر شخص کے لئے خیرات مٹی ہیں، ان کے یہاں فطری منظروں اور شبیہوں کی بھرمار۔ نفسی عنصر ان کے عموں میں تقریباً ناپید ہے اور جہاں کہیں اس کی کوشش کی گئی ہے نتائج نہایت کامیاب رہے ہیں۔ چینی مصوری کے برخلاف ہندوستانی مصوری میں فطری مناظر عام طور پر دوسرے درجہ کی چیز رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ہمیشہ پس منظر کی رہی ہے اور اصل تصویر کا جولا نگاہ نفس انسان رہا ہے یعنی اُس کے دلوں، اُس کے جذبات، اس کی امنگیں۔ چینیوں نے جس چیز کو دامن فطرت کے ہمہ گیر انعکاس میں ظاہر کرنا چاہا اُس کو ہندوستانیوں نے نہ نہٹ راجا کے اضطرابِ رقص یا بدھا کے سکونِ کل کی شدت میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ ان میں سے ایک کی کوشش یا حاصل پر دوسرے کی کوشش یا حاصل کو فوقیت دی جائے بلکہ صرف دو مختلف انسانی صنفوں کے فنی رجحان کے اختلاف کا بیان مقصود ہے۔ لیکن آج کل کے ہندوستانی نہ منظروں کو چینی نقطہ نظر سے بناتے ہیں نہ خود اپنے اسلاف کے صحیح معنوں میں پیروی کر نفس انسان کی پیرکاریوں کی صورت گری کرتے ہیں۔ اُن کے منظر زمین اور آسمان کے

اکھڑے اکھڑے نکلتے ہوتے ہیں جن کو وہ انیسویں صدی عیسوی کی فنی روش کی چاکرانی  
تقلید میں کاغذ یا کینوس کی سطح پر شمشیر پشتم پیش کرتے ہیں۔ ان کے منظر سراسر محدود  
ہوتے ہیں، ان میں وہ ہمہ گیریت نہیں جو چینیوں کے منظروں میں پائی جاتی ہے۔ اور ان میں  
وہ سطحی لطیف تک نہیں پایا جاتا جو انیسویں صدی والوں کے عمل میں تھا کیونکہ یہ انکی فطرت پرستی  
سے بالکل بے واسطہ ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں محض ایک غلام قوم کا غلامانہ رنگ لئے ہوئے۔ اُس  
میں شخصی مشاہدہ اور دلی مجبوری کا عنصر نہیں ملتا جس کے بغیر تو بس "کاغذی  
ہے پیرن ہر پیکر تصویر کا" یعنی جسد بے جان اور مصور کی بیدار ناداری کا فریادی ہندوستان  
کے نورنگ اہل فن خواہ وہ ٹیگور اسکول کے دلدادہ ہوں خواہ راجپوت یا منغل اسکول کے  
پروردہ آج سب کے سب اس نکتہ سے آشنا ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اس قومی وجہ امتیاز میں  
کوشاں ہیں جس کا بیان اوپر کی سطور میں ہوا ہے۔

جہاں تک شبیہ کشی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے مصوروں کو اس موضوع  
سے خاص دلچسپی رہی ہے اور جائز رہی ہے لیکن ہندوستانیوں کی موجودہ شبیہ سازی میں  
صرف بھس بھری کھال والی شباهت نظر آتی ہے۔ یورپ نے بہت کچھ انیسویں صدی میں  
بے رس شبیہ سازی سے اپنے کو آزاد کر لیا ہے لیکن عاری التحیل انگریز اور انکی ساکھ کے  
ماننے والے ہندوستانی ابھی تک اسی دھوکے میں مبتلا ہیں۔

# رباعیات غزنیہ

(۱)

دل ہی نہیں وہ بات کہاں سے لاؤں      عشرت کے خیالات کہاں سے لاؤں  
وہ دانت ہیں موتی سے نہ وہ مے سیاہ      اب تاروں بھری رات کہاں سے لاؤں

(۲)

سب محوِ تحیر ہیں کوئی کیا بولے      غنچہ کہ ہر لب بستہ زباں کیا کھولے  
پرداز پہ مائل ہے چمن کا عالم      جو پھول شکستہ ہو وہ ہے پر تو لے

(۳)

پیانہ جہاں کا حسن سے مملو ہے      شاخوں میں نزاکت ہو گلوں میں بو ہے  
آنکھوں میں کچھے نہ کیوں جاں ہستی      رنگینی نقشِ آفرینش تو ہے

(۴)

ہر پھول میں تیرے گلِ عارض کی مک      ہر نور میں تیرے رُخِ روشن کی چمک  
میرے دلِ تاریک کو بھی چمکائے      روشنگرِ جاں انجمنِ افروزِ فلک

# سیاسیات پر چند عربی تصانیف

ہر چند سیاسیات صدیوں سے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر چکی ہے، ہندوستان میں کم لوگ اس علم سے واقف ہیں، یہ ایک حد تک توجیبہ خود اپنی بے پروائی کا ہے، لیکن اس کی زیادہ تر ذمہ داری ہماری علم پر درسرکار پر بند ہوتی ہے جس نے شاید کسی اندیشہ سے سیاسیات کو اپنے تصائب الیم میں اب تک سرے سے جگہ ہی نہیں دی تھی۔ تاہم نظام کار ہندوستانیوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر بالآخر اس کو اپنے آپ پر حلال کر اسی لیا۔ ادھر ملکی و بین الاقوامی سیاسیات سے تعلقات قریب تر ہو جانے کے باعث سیاسیات سے ہماری وہ بے توجہی بھی نہیں رہی۔ چنانچہ اب کم و بیش ہندوستان کے تمام مراکز علمی میں علم وچپی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے اور ایک محدود دائرہ کے اندر فلسفہ سیاست کے مسائل و نظریات پر مباحثے بھی شروع ہو گئے ہیں۔

مسلمان اس دعوے کی بنا پر کہ اسلام ایک مکمل مذہب ہونے کی حیثیت سے اپنا مخصوص سیاسی نظام بھی رکھتا ہے، سیاسی عقائد کو مذہبی لباس میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اختلاف خیال ہر معاملہ میں اسی قدر ہے جتنا کہ ممکن ہے۔ مثلاً ہندوستانی خلافتیوں کے نزدیک ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام کے ماتحت آنا ان کی بقا و حیات کے لئے ضروری ہے اور ان کے فرائض دینی میں داخل۔ ترک اسے نہ تو عملاً ممکن سمجھتے ہیں نہ مصلحتاً و مذہباً ضروری۔ کوئی کہتا ہے اسلام ”ملوکیت“ کو مٹانے آیا ہے۔ کوئی ”ذولِ نظرت“ ”جمہور سے“ ”متاع معنی بیگانہ“ کی تلاش عیث سمجھ کر مشورہ دیتا ہے کہ

گزیر از نظر جمہوری غلام بختہ کار شو کہ از مغز و صدر فکر انسانے نمی آید

کوئی اجتماعیت کا حامی ہو کوئی انفرادیت کا موید نہ ہو۔ ان اختلافات کو دیکھ کر طبیعت قدرِ اصلی ماخذوں سے براہ راست حقیقت معلوم کرنے کیلئے فکر مند ہوتی ہے۔ لیکن قیمتی سے ابھی تک کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ہے جو اسلامی سیاسی نظریات کو ہمارے سامنے مرتب صورت میں پیش کرے۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جس کا احساس سیاسی بحثوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جلد ہی اگر محض اپنے ذوقِ علمی سے نہیں، تو ضرورت سے مجبور ہو کر ہمیں یہ کمی پوری کرنی پڑے گی۔

اس موضوع سے متعلق پرانی تصانیف کا جن میں بہت بڑی تعداد قلمی کتب کی ہوگی، علم اور انکی فراہمی، مولف کی سب سے پہلی اور غالباً سب سے بڑی مشکل ہوگی۔ کیونکہ یہ سب کچھ ہمیں مل سکتیں انکے لئے یورپ، مصر، عرب اور ہندوستان کے کتب خانوں کی تلاشی لینی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا نظریہ سیاسی معلوم کرنے کے لئے تو قرآن اور حدیث ہی سب سے معتبر ماخذ ہیں لیکن دنیاوی سیاست کی ضرورتوں نے اصلی تعلیم کی تعبیر مختلف اوقات میں مختلف کی ہو اس لئے جو شخص اسلامی نظریات سیاسی کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس بارہ میں فقہ کے مختلف مذاہب کی تعلیم کے علاوہ ان تصانیف کو بھی پیش نظر رکھے جو مختلف زمانوں میں سیاست یا اخلاق پر لکھی گئیں۔ ذیل میں ہم چند عربی کتب کی فہرست درج کرتے ہیں جن کا تعلق سیاسیات سے ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قدیم مسلمان مصنفوں نے اکثر سیاسیات کو اخلاقیات و فقہ وغیرہ کے ضمن میں جگہ دی ہے۔ اس لئے ان مضامین پر جو کتابیں ہیں وہ کلامِ مجید، احادیث شریفہ اور کتبِ تواریخ کے علاوہ بہت کچھ معلومات کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ فہرست میں جباً بجا آپ کو دوسرے مضامین کی کتابیں ملیں گی جن کو اس لئے درج کر دیا گیا ہے کہ بالواسطہ وہ سیاسیات سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔

ہر کتاب کے ساتھ فہرست میں حتی الامکان اس کتب خانہ کا پتہ بھی لکھ دینے کی کوشش

گئی ہے جہاں وہ موجود ہے لیکن کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا نام مصنف کے حال کے ساتھ تو معلوم ہو مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ کہیں موجود ہیں یا ضائع ہو گئیں۔ تاہم احتیاطاً انکا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ شاید کسی اشد کے بندے کو انکا سرانگ لگانا کی توفیق ہو۔ اسی مصلحت سے ان مصنفین کے نام اور حالات بھی درج کر دئے گئے ہیں جن کی بابت معلوم ہے کہ انہوں نے سیاسیات پر کوئی کتاب تصنیف کی تھی لیکن نہ تو کہیں تصنیف کا نام ملتا ہے نہ پتہ۔ (عبد القادر)

۱۔ کتاب الخراج۔ مصنف ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبيب اللکونی الانصاری کوفہ میں پیدا ہوئے سال پیدائش ۱۳۱ھ ہے اور سال وفات ۲۴۵ھ۔ مصنف کے شاگرد محمد بن الحسن الثیبانی نے مذکورہ کتاب مرتب کی۔ مسئلہ میں بلاق میں چھپ گئی ہے۔

۲۔ کتاب الخراج مصنف یحییٰ بن آدم بن سلیمان۔ کسی فقہی مذہب سے تعلق نہ رکھتا تھا ۲۱۱ھ میں انتقال کیا۔ ۳۔ ترجمہ مخطوط اسطونام سکندر۔ مترجم ابو العلی سالم کاتب ہشام بن عبد الملک تھا۔ اسکا زمانہ حیات ۲۶۶ھ کے حدود میں سمجھا جاتا ہے۔ کتاب کوئی سو ورق کی تھی۔

۴۔ کتاب سلوک الممالک فی تدبیر الممالک۔ مصنف شهاب الدین احمد بن محمد بن ابی الرزین۔ خلیفہ معظم (۲۱۱ھ - ۲۲۶ھ) کے لئے لکھی گئی۔ یہ شاید سب سے پرانی اسلامی کتاب ہے جو فلسفہ و سیاست کے موضوع پر آج کل موجود ہے۔ پیرس کے قومی کتب خانہ میں ہے۔ ۵۔ قاہرہ میں چھپ چکی ہے۔

۵۔ کتاب الخراج مصنف قدام بن جعفر۔ یہ ۲۹۶ھ کے حدود میں زندہ تھا۔ پہلے عیسائی تھا پھر خلیفہ مکتفی بائد کے سامنے اسلام قبول کیا۔

۶۔ کتاب السیاست۔ مصنف قدام بن جعفر

۷۔ کتاب السیاست کبیر۔ مصنف ابو زید یحییٰ بن خلیفہ معتز بن متوفی ۳۲۵ھ۔

۸۔ کتاب السیاست صغیر۔ مصنف ابو زید یحییٰ بن

۹۔ کتاب ادب السلطان والرعیۃ۔ مصنف ابو زید یحییٰ بن

۱۰۔ ایسکارم اخلاق۔ مصنف ابن جعفر الخراطی متوفی ۳۲۹ھ

۱۱۔ کتاب الانفاذ الافلاطونیه و تقویم السیاستہ الملکیہ والاخلاق۔ از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی متوفی ۳۲۹ھ۔ یہ کتاب کتبخانہ ایا صوفیہ استنبول میں موجود ہے۔

۱۲۔ تخیص نوامیس افلاطون۔ از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی لاڈن میں موجود ہے۔

۱۳۔ التبیہ علی سبیل السعاده (یا رسالۃ السعاده) از ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی۔ یہ کتاب برن میں بھی ہے اور برٹش میوزیم میں بھی۔

۱۴۔ کتاب سیاستہ المدنیہ۔ مصنف ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی۔ یہ کتاب برٹش میوزیم اور لاڈن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۵۔ کتاب فی سادۃ الاراء المدنیہ الفاضلہ۔ مصنف ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی۔

۱۶۔ کتاب اللہ الفاضلہ۔ مصنف ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی۔ لاڈن میں موجود ہے۔ بلانام سرورق ہے۔ فہرست میں اندراج کی غلطی ہوئی ہے۔

۱۷۔ فصول۔ مصنف ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی۔ کتب خانہ بوڈلین کنفرڈ میں موجود ہے۔

۱۸۔ جوامع السیر المرضیۃ فی اقتناع الفضائل الانسیۃ۔ مصنف ابو نصر محمد الفارابی۔ لاڈن میں موجود ہے۔

۱۹۔ کتاب۔ از امام فخر الدین بن الخطیب الرازی

۲۰۔ تصانیف قائم ابن اصبح بن یوسف متوفی ۳۳۹ھ اس کی تصانیف کا پتہ نہیں۔ لیکن یہ اپنے دور

کا فلسفہ اخلاق و سیاست کا سب سے بڑا مصنف ہے۔ ولید بن عبد الملک کا مولیٰ تھا اور

شہزادوں کا معلم۔ محدث بھی تھا۔ بن الفرصی کہتا ہے کہ عبد الرحمن بن محمد بادشاہ اندلس نے

خلافت سے پہلے اس سے پڑھا ہے۔ پھر اس کے ولیعہد حاکم اور اس کے بھائیوں نے

اس سے پڑھا۔ حکومت کے کام میں اس سے مشورے لیتے تھے۔

۲۱۔ فن حکومت کی ایک کتاب جو عبید اللہ اسمعیلی نے کنگر حاکم ثانی کے نام پر مغلون کی مصنف

۳۴۴ھ کے حدود میں زندہ تھا اور قرطبہ میں حاکم ثانی کے زمانہ ہی میں تھا جس نے اس کو اپنی مجلس شوائے میں داخل کر لیا تھا۔ کتاب کا پتہ نہیں۔

۲۲۔ ابو محمد عبداللہ الغنی بن سعد بن علی بن بشر بن مروان بن عبدالعزیز بن متوفی ۱۸۰ھ نے بھی کچھ سیاسیات کے موضوع پر لکھا ہے لیکن اسکی کسی تصنیف کا نام یا پتہ نہیں معلوم۔

۲۳۔ سیاست ملکی اور اصول حکومت پر دو کتابیں احمد ابن عبدالملک ابن شام متوفی ۲۶۲ھ نے لکھ کر حاکم ثانی کی خدمت میں پیش کیں ایک کتاب کا نام شاید ”کتاب الاستیعاب“ تھا۔ جس کی تیاری میں مصنف کو عبید اللہ المغیطی نے بھی مدد دی تھی۔ اس کو دیکھ کر حاکم ثانی نے دونوں کو اپنی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا تھا۔ احمد ابن عبدالملک کی کسی کتاب کا پتہ نہیں۔ *مذہبہ* کا قول ہے کہ احمد ابن عبدالملک نے سلسلہ میں انتقال کیا۔ یہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔

۲۴۔ کتاب البر والاثم مصنف ابی علی بن سینا۔ مصنف کا سال پیدائش ۳۵۰ھ اور وفات ۴۲۸ھ۔  
۲۵۔ نصیحتہ الملوک مصنف الغزالی۔ یہ ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ میں فوت ہوئے

۲۶۔ کتاب الاحکام السلطانیہ (والولايات الدینیہ) مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوروی یہ شافعی المذہب تھا۔ بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی۔ استوی میں (نیشاپور کے قرب) عرصہ تک قاضی رہا۔ پھر تنقل طور سے بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنی کتابیں شائع نہیں کیں۔ ۸۶ سال کی عمر پا کر ۵۰۵ھ میں انتقال کیا۔

۲۷۔ کتاب نصیحتہ الملوک۔ مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوروی۔ پیرس میں موجود ہے۔  
۲۸۔ کتاب قوانین الوزراء۔ مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوروی بکتب خانہ شاہی شہر دین اسٹریٹ میں موجود ہے۔

۲۹۔ کتاب تحصیل النذر تعیل الطفر۔ مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوروی۔ غالباً مشائخ میں چھپ چکی ہو۔ گوتھا میں موجود ہے۔



۳۰۔ کتاب آداب الدنیا والدین۔ مصنفہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب المادودی قسطنطنیہ میں ۱۲۹۹ھ میں چھپی اور قاہرہ میں ۱۳۹۹ھ و ۱۳۱۳ھ میں چھپی۔

۳۱۔ سراج الملوک۔ مصنفہ ابوبکر محمد بن الولید بن محمد بن خلف الطروشی اندلسی ۱۰۵۵ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۱۶۶ھ میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۸۹ھ میں قاہرہ یا بقول صاحب الکفار القنوع اسکندریہ میں چھپ چکی ہے۔

۳۲۔ سلوان المطاع فی عدوان الطباع۔ مصنفہ محمد بن محمد بن خلف الصقلی متوفی ۵۶۶ھ تونس میں ۱۱۶۶ھ میں چھپی۔ فلورنزا میں ۱۸۵۱ء میں۔ اماری نے اسکا اطالوی میں ترجمہ کیا۔ ۳۳۔ النج المسلموک فی سیاست الملوک۔ یہ کتاب عبدالرحمن بن نصر بن عبداللہ نے سلطان صلاح الدین کے لئے لکھی۔ بلاق سے ۱۱۸۸ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۳۴۔ الشہب اللامعہ فی سیاست النافعہ۔ مصنفہ ابوالقاسم بن حنون۔ ۱۱۸۸ھ کے بعد لکھی گئی۔ لائڈن اور بوڈلین (اکسفورڈ) کے کتب خانوں میں ہے۔

۳۵۔ کتاب قوانین الدواوین اس کتاب کا مصنف ابوالکاسم اسعد بن الخطیر بن الماتی ہے۔ جو سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں عیسائی سے مسلمان ہوا اور وزیر جنگ متعین کر لیا گیا۔ بعدہ وزیر ابن شکر کے در سے حلب بھاگ گیا اور وہاں ۶۷۵ھ میں انتقال کیا۔ کتاب ۱۲۹۹ھ میں قاہرہ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۳۶۔ کتاب ادب الوزراء۔ احمد بن جعفر بن شاذان نے ناصر لدین اللہ المتوفی ۶۶۲ھ کے زمانہ میں لکھی۔ کتب خانہ لائڈن میں موجود ہے۔

۳۷۔ العقد الفرید للملک السعید مصنفہ کمال الدین ابوسالم محمد بن طلحہ بن محمد بن الحسن القرشی العدوی یہ سلطان الملک السعید نجم الدین غازی کا وزیر تھا ۵۱۱ھ میں پیدا ہوا اور ۶۶۲ھ میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ سے ۱۲۸۳ھ میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۳۸۔ بذل النصائح الشرعیہ فی اعلی السلطان وولایة الامور وसार الرعیۃ۔ مصنفہ نجم الدین احمد

بن محمد بن علی بن الرفعہ المصری الشافعی۔ یہ قاہرہ میں محاسب اور قائم مقام قاضی تھا۔ کتاب گو تھا میں موجود ہے۔

۳۹۔ الفرائد لأجل السياسة مصنفه شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی طالب الانصاری الصوفی الدمشقی شامی متوفی ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ قاہرہ میں بھی ہے۔ لیکن یہاں اسکا نام اور سیاست فی علم الفرائد درج ہے۔

۴۰۔ سیاست الامار ودلالة الخیون والمتضمن لثلاثہ محمود۔ یہ کتاب ابراہیم بن عبد الواحد بن ابی النور نے متوکل علی اللہ حفصی (۱۱۸۱ء تا ۱۲۱۳ء) کے لئے لکھی۔ اسکوریاں میں موجود ہے۔

۴۱۔ الطرق الحکمیہ فی الیاسۃ الشرعیہ مصنفه شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن قیثم الجوزیہ الزرعی الدمشقی الجبلی۔ یہ ۶۹۱ھ/ ۱۲۹۳ء میں دمشق میں پیدا ہوا۔ ابن تیمیہ کا خاص شاگرد تھا۔ اور اسکے ساتھ قاہرہ میں قید ہوا۔ ۷۱۳ھ میں انتقال کیا۔ کتاب قاہرہ اور کتب خانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۲۔ منہاج الوزراء فی النصیۃ مصنف احمد بن محمود الجبلی الاصفہانی بادی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۳۔ تبصر حکام فی اصول الاقضیۃ ومنایح الاحکام مصنف ابراہیم بن علی بن محمد بن فرحان الماکی السمری الاندلسی یہ مدینہ میں پیدا ہوا اور عہدہ قضاۃ پر مامور ہوا۔ ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء میں انتقال کیا۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ کتب خانہ لائبن و برٹش میوزیم میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ قاہرہ میں چھپ چکی ہے۔

۴۴۔ تاج السعاده فی النصیۃ المملکیہ مصنف محمد بن الکاشغری۔ ۷۹۳ھ/ ۱۳۹۱ء میں لکھی گئی۔ کتب خانہ ایاصوفیہ میں ہے۔

۴۵۔ واسطۃ السلوک فی سیاست الملوک۔ یہ کتاب دولت زبانیہ کے سلطان ابوحمو موسیٰ ثانی بن یوسف بن زیان العبادوی نے لکھی جو تلمسان المغرب کا۔ (۷۹۳ھ/ ۱۳۹۱ء تا ۸۰۴ھ/ ۱۴۰۲ء) حکمران

۴۵۔ خاندان زیانیہ کی حکومت ۱۵۵۲ء سے لیکر ۱۵۷۷ء تک رہی۔ سلطان موسیٰ ثانی کا کاتب (سکرٹری) علامہ ابن خلدون کا بھائی تھا۔ کتاب تونس میں ۱۵۷۹ء میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۴۶۔ الدرہ الغراری فی نصح الملوک والوزار۔ مصنفہ محمود بن اسماعیل البیہقی۔ سال تصنیف ۱۱۴۱ھ سے کتبخانہ رفاعیہ میں موجود ہے۔

۴۷۔ بذل النصارح الشرعیہ فی ما علی السلطان ودلاۃ الامور و سائر الرعیہ۔ مصنفہ محمد المقدسی محب الدین ابوالحامد۔ یہ کتاب نجم الدین احمد کی کتاب کے اتباع میں لکھی گئی جو اسی نام کی بحر اور اسی نہرست میں دُج کیجا چکی ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ برلن میں موجود ہے۔

۴۸۔ کوکب الملک و موکب الترك، اس کتاب میں اخلاق سلطانی سے بحث کی گئی ہے جہاں شاہ بن قرہ یوسف کے عہد حکومت (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۶ھ) میں لکھی گئی۔ مصنف کا نام نہیں معلوم ہو سکتا ہے۔

۴۹۔ البرہان فی فضل السلطان۔ مصنفہ احمد توفان الحموی الاثر فی الخفی۔ شہاب الدین - یہ ۱۱۶۶ھ کے حدود میں زندہ تھا۔ کتاب برلن میں موجود ہے۔

۵۰۔ منہاج السلوک فی سیرۃ الملوک۔ مصنفہ احمد توفان۔ کتب خانہ اباصوفیہ میں ہے۔

۵۱۔ المحدثۃ السلطانیہ فی الیاسۃ الشرعیہ۔ مصنفہ احمد توفان۔ کتاب قاہرہ میں موجود ہے۔ اس کا تتمہ برلن میں ہے۔

۵۲۔ الابریۃ المسبوک فی کیفیت آداب اللوک۔ یہ کتاب محمد بن علی بن محمد بن قاسم بن الارزق الصبائی نے ۱۱۶۶ھ میں داوی آتش میں لکھی

۵۳۔ بدیۃ العبد القاصر علی ملک الناصر۔ مصنفہ عبد الصمد بن یحییٰ بن احمد بن یحییٰ الصالحی۔ یہ کتاب تقریباً ۱۱۶۶ھ میں لکھی گئی۔

۵۴۔ لطائف الافکار و کاشف الاسرار۔ مصنفہ قاضی حسین بن حسن السمرقندی۔ یہ کتاب جس کا پہلا حصہ ”فی احکام السیاسة“ ہے وزیر ابوسعید پاشا کے لئے لکھی گئی۔ اس کے چار اور حصے ہیں۔ کتب خانہ دین۔ اسٹریا میں موجود ہے۔

۵۵۔ فتح الملک العالم المنان علی الملک المنظر سلیمان۔ مصنفہ محمد بن محمد بن سلطان الدشتی۔ اس کتاب میں حکمران کے حقوق و فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۱۵۶ھ کے قریب لکھی گئی برلن میں ہے۔

۵۶۔ کتاب القوز۔ مصنفہ ابی علی مسکویہ۔

۵۷۔ کتاب اخلاق الناصریہ۔ مصنفہ خواجہ نصیر الدین الطوسی۔

۵۸۔ کتاب الاخلاق الجلالیہ۔ مصنفہ جلال الدین محمد الدوانی۔

۵۹۔ رسالہ۔ مصنفہ مولانا عضد الدین۔ اس کتاب پر ایک شرح مصنف کے شاگرد شمس الدین اکرانی کی لکھی ہوئی ہے اور ایک شرح طاش کوبری زادہ کی۔

۶۰۔ رسالہ السیاسة الشرعیہ مصنفہ ابوسعید بن کثیری زادہ خلیفہ متوفی ۱۱۵۶ھ کتاب برلن کے کتب خانہ میں ہے۔

۶۱۔ اربعون حدیثان فی فضل السلاطین و الاحکام مقطعین۔ مصنفہ ابو الاخلاص حسن بن عمار الوفا فی الشرنبلانی فی الخفی استاد فی الازہر۔ متوفی ۱۱۶۶ھ کتاب برلن میں ہے۔

۶۲۔ حسن السلوک فی معرفت آداب الملک و الملوک۔ مصنفہ احمد بن احمد الفیومی الغرقادی المالکی۔ یہ ۱۱۵۵ھ کے حدود میں زندہ تھا۔ کتاب برلن میں موجود ہے۔

۶۳۔ کشف الاسرار لعلمیہ بدار الضرب المصریہ۔ مصنفہ منصور بن بصرہ الذہبی الکاتبی۔ یہ کتاب ۱۱۳۵ھ میں لکھی گئی۔ قاہرہ میں موجود ہے۔

۶۴۔ رسالہ البیان فی التمدن و اسباب العمران۔ مصنفہ رفیق بک ابن محمود بک انظم المتوفی ۱۱۸۵ھ یہ کتاب سنہ ۱۱۸۵ھ میں قاہرہ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۶۵۔ قانون العمل والانصاف للقضا علی مشکلات الادوات۔ مصنفہ محمد قدری پاشا المتوفی ۱۳۰۳ھ  
یہ کتاب مصر سے سنہ ۱۲۸۷ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۶۶۔ الکلم الثمان۔ مصنفہ حسین المرصفی المتوفی بالقاہرہ سنہ ۱۲۸۷ھ۔ یہ کتاب اسمہ، وطن، حکومت  
وغیرہ وغیرہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ قاہرہ سے سنہ ۱۲۹۱ھ میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔

۶۷۔ آداب القضاۃ للنبلی۔ یہ کتاب حنفی قوانین قضاۃ پر ہے قسطنطنیہ سے سنہ ۱۲۸۸ھ میں چھپکر  
شائع ہو چکی ہے۔

۶۸۔ الشروط والعقود سیاسیہ بن جموریات الیطالیہ و سلاطین مصر فی القرون الوسطی۔ یہ ان  
معاهدوں کا مجموعہ ہے جو اٹلی کی جمہوریوں اور مصر کے سلاطین میں ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ  
فلورنزا میں موجود ہے اور علامہ اماماری کی ادارت میں سنہ ۱۲۸۷ھ میں شائع بھی  
ہوا۔

۶۹۔ مجموعہ خطوط خلفاء۔ مرتب کردہ ابوالفتح ابراہیم بن العباس کاتب، خلیفہ و شاعر۔  
۷۰۔ الدولۃ۔ مصنفہ ابن البطاح۔

۷۱۔ الدولۃ۔ مصنفہ الراوندی۔ یہ راوندی فرقہ کے لوگوں کے ساتھ بہت رہتا تھا، اور انہیں  
حکومت و سیاست کی تعلیم دیتا تھا، کتاب میں کوئی دوسو ورق ہونگے۔

# سنجیدگی کا دوسرا رخ

ہر شخص اور ہر معاملہ اور ہر خیال اور ہر واقعہ اپنی سنجیدگی و متانت کے اندر ایک دوسرا رخ بھی رکھتا ہے جس کی سطح کے نیچے اہل نظر کو تفنن و مزاح کا کبھی ہلکا اور کبھی گہرا رنگ نظر آسکتا ہو۔ تفنن و مزاح کا صحیح مذاق رکھنے والے کسی چیز کی سنجیدگی سے اس درجہ مرعوب نہیں ہوتے کہ اُس کے دوسرے رخ سے بے پروا ہو جائیں۔

یجسلیٹو اسمبلی، یا جمعیت تفنن، ملک کی سب سے بڑی قانون ساز جماعت کہی جاتی ہے یہ جماعت بظانوی دارالعلوم کی سگی تو نہیں مگر سوتیلی بیٹی ضرور ہے۔ فرق یہ ہے کہ ”والدہ محترمہ“ گھر کے خرد کوئی ملک ہیں اور بیٹی ہنوز گریوؤں سے کھیل رہی ہے! کیا عجب ہے کہ عالم بلوغ میں اس بیٹی کا دور دورہ بھی ماں سے کم نہ ہو۔ بہر حال بیٹی تو اسی ماں کی ہے اور رنگ و دھنک بھی وہی ہے مگر ابھی اس بیٹی نے ماں کے سب ”پچمن“ نہیں سیکھے ہیں۔ وہاں تو اب نزل و تفنن آنا گندہ ہو جاتا ہے کہ گالی گلوٹ اور گھونے لات تک نوبت آجاتی ہے۔ مثلاً دارالعلوم کا تازہ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ فوجی بجٹ پریکٹ ہو رہی تھی اور ارل وٹرٹن شب کے ۲ بجے تقریر فرما رہے تھے وہ اپنی تقریر میں سوشلسٹ ممبران کے متعلق کچھ اس قدر جلی کٹی فرما رہے تھے کہ ان ممبران کو کبھی زبان عام طور پر بہت بے تکلف ہے، اشتعال پیدا ہوا، دوران تقریر میں کسی شخص نے ایک گوشہ سے کوئی آواز نہ کیا، اس پر ارل وٹرٹن نے فرمایا کہ یہ حضرت جنہوں نے مجھے ابھی ٹوکا ہے کچھ قابل توجہ نہیں، بس پھر کیا تھا، قوم کے نامزدوں کے بادل گرجنے لگے۔ ملاحظہ ہو:-

”ارل وٹرٹن نے کہا کہ میں اُن تکمیل التعداد اشخاص کو قابل توجہ نہیں سمجھتا جو خود اس وجہ

سے اپنے اہل ملک کی نظروں میں حقیر ہیں کہ انہوں نے جنگ یورپ میں اپنے ہی

ملک کو قابل الزام ٹھہرایا۔“

یہ کہنا تھا کہ ایک طوفان برپا ہو گیا۔

”او بدتمیز بندر!“ مشر ہیپک نے چیخ کر کہا،

سوشلسٹ کی صفوں سے ”کاذب“ اور ”نامعقول“ کی آوازیں ابل و ٹرٹن کا خیر مقدم کرنے لگیں اور تھوڑی دیر تک دارالعلوم میں کان پڑی آواز نہ آتی تھی یہ لندن کے اخبار ایوننگ نیوز کا ذرا سا اقتباس ہے!

قیاس کن زنگھان من بہار مرا!

یہ تو بڑی میم صاحب کا حال ہے۔ ہندوستانی اسمبلی کی ”مس بابا“ کا تفضیل ابھی چھوٹے چھوٹے چٹکوں تک محدود ہے۔ اسمبلی کے گذشتہ اجلاسوں کے چند لطائف و ظرائف ہر دیناظرین کے جانتے ہیں :-

۱۔ مایح مسئلہ۔ بجٹ

مشر کلیر وزیر ہند کی کونسل کے ممبران کے مشاغل کا یوں ذکر فرماتے ہیں :-  
”چار بجے تک کیسے گذرے!“

گیارہ بجے جب بارہ بج چکے تو بلائے آئے“ (دفتر میں)

بارہ بجے تا ایک بجے — آئے بھی اور ناحق پیتا ہے“

ایک بجے دو تک — کرنا دھڑنا کچھ نہیں پھر کیا کیا جائے“

بیٹھے بیٹھے دو بجے تین بجے کیونکر جی بہلائے“

چار بجے تک کیسے گذرے!“

(مترجم عروض سے ناواقف ہے، معاف فرمایا جائے)

”وزیر ہند کی کونسل میں کام کرنے کا طریقہ یہ ہے اور لوگ میں جو ہمارے کے بہترین

نظم و فن کے ذمہ دار ہیں“

۲۲ فروری سنہ - ریلوے بجٹ

مسٹر ایٹورسرن کھڑے ہوتے ہیں۔

پریسڈنٹ: کیا آئریبل ممبر تقریر کرنا چاہتے ہیں؟

منشی ایٹورسرن: معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جناب!

پریسڈنٹ: مجھے امید ہے کہ اس مباحثہ میں اب گرمی پیدا نہ کیجئے گا۔ منشی ایٹورسرن صاحب۔

منشی ایٹورسرن: جناب! مجھے تعجب ہے کہ مجھ جیسے صلح پسند، غیر مضرت رساں، سرد مزاج اور ٹھنڈا دماغ رکھنے والے شخص کو کسی طرح انتہائی غیر سنجیدگی کی حالت میں بھی گرمی پیدا کرنے کا گناہگار سمجھا جائے

۲۲ فروری سنہ - ریلوے بجٹ

مسٹر آنے: جناب والا! عام طور پر میں اس بحث میں کوئی حصہ نہ لیتا لیکن چونکہ میرے آڑ پہل

دوست مسٹر داس نے بار بار کمیٹی کے سرکاری وغیر سرکاری ممبروں کا ذکر

کیا تھا اور اب وہ تمام وقت سوتے رہے ہیں، اس لئے مجھے اس بحث میں حصہ لینے

کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کم از کم مسٹر داس کی تقریر کے دوران میں اس مجلس کو

معلوم ہے کہ میں ذرا نہیں سویا!

مسٹر جناح:- اب اس وقت تو آپ ضرور جاگ رہے ہیں!

مسٹر آنے: میں تو برابر جاگتا رہا، یہی تو مجھے کہنا ہے۔

۱۹ فروری سنہ - ریلوے بجٹ

پریسڈنٹ: آئریبل ممبر کے لئے صرف ۵ منٹ اور باقی ہیں، اس کے بعد تقریر کرنے کا کوئی



موقعہ نہ ملے گا۔

مسٹر غزنوی : جناب ! آج نہیں، بلکہ جب میں تخفیف کی تجویز پیش کروں گا۔ اب میں اپنی تقریر پانچ منٹ کے اندر ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر پہلے اس سے کہ میں آگے کچھ کہوں مجھے اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ میری شکل بہت بڑی ہے اور وہ شکل سیر آزیل دوست ممبر تجارت کے شکلات سے ملتی جلتی ہے جو ایک ہی وقت میں دو سبکی بہنوں سے ازدواجی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں !

سر پر ختم داس ٹھاکر داس : کیا دو سبکی بہنوں سے شادی کرنے کا ارادہ ہے ؟  
مسٹر غزنوی : یہ دو سبکی بہنیں ”سرکاری ریلوے“ اور ”کمپنی کی ریلوے“ ہیں۔ مگر سر جان کو بتا دینا چاہئے کہ اُس کی بہنوں سے بیک وقت شادی کرنا روا نہیں ہے۔  
مسٹر بی داس : مگر ابھی شادی ہوئی تو نہیں۔

ایک آنریبل ممبر : شادی کب ہوئی، ابھی تو شادی کے لئے تعلقات پیدا کئے جا رہے ہیں۔  
مولوی محمد یعقوب : ایک اور ساردا ایکٹ کیوں نہ پاس کر لیجئے !  
مسٹر غزنوی : مگر آنریبل ممبر تجارت دونوں مجبوریوں سے یکساں محبت نہیں کر سکتے یہی تو دشواری ہے۔

مسٹر ویا ساگر : میرا خیال تھا کہ ممبر تجارت بحث میں بہت قابل غور اعداد و بیانات پیش کریں گے اور مجھے امید تھی کہ ہم کچھ تخفیف اور آسانی گرایہ وغیرہ میں دیجائے گی۔ لیکن پہاڑ کو دروازہ ہوا اور اس میں سے صرف ایک چوہا تولد ہوا۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ وہ اب ایک ایسی ایکم پیش کرنے کی بہت کوشش کر رہے ہیں جس سے ریلوے کے ادنیٰ ملازمین کی حالت بہتر ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں ان کی کوشش اتنی مایوس کن نہ ہوگی جتنی کہ بیٹ میں ہے۔

مولوی محمد یقوب : اب کی دفعہ بجائے چوسے کے ایک ہاتھی تولد ہوگا!

### ۱۸ فردری - بحث

پریسٹنٹ : (غشی ایٹور سرن سے مخاطب ہو کر) اب اس سوال کے اٹھانے سے کیا فائدہ ہے یہ تو گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔  
 مشر گیا پر شادنگ : جناب نے صحیح فرمایا، معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب یہ گویا مردہ گھوڑے کے چابک مارنا ہے۔ مگر اس مجلس کو احتجاج ضرور کرنا چاہیے اور اس مردہ گھوڑے کے کفن دفن کے لئے ایک پیسہ نہ دینا چاہئے۔

### ۱۹ مارچ - بحث

نواب سر عبدالقیوم : کیا صوبہ سرحد کی ہر حالت ہمیشہ قائم رہے گی۔ اگر یہی صحت ہو کہ ہم وہیں سکے جائیں گے جہاں میں تو پھر میرے لئے .....  
 مشر جناح : سوائے ناخرمانی قانون اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔  
 سر عبدالقیوم : کوئی چارہ کار نہ ہوگا سوائے اس کے کہ میں اپنی قسمت پر لغت بھیجوں اور جو کچھ فیصلہ ہو اس پر صبر کروں۔

سید محمد رفعتی : ہم جانتے ہیں کہ صوبہ سرحدی کے لوگ گورنمنٹ سے کتنی ہمدردی کی توقع کر سکتے ہیں۔ فارسی میں ایک مثل ہے کہ  
 چچہ زدی چچہ زدی علو کو ؟  
 گورنمنٹ کب تب ہم کو لے گی۔

## ۱۲۔ پارچہ سہمہ - بحث - آمدنی پر ٹیکس

سرپرثوتم داس ٹھاکر داس : میں محسوس کرتا ہوں کہ اس تحریک پر روز دنیا ہمارے لئے بہت غیر ذمہ دارانہ ہوگا

مسٹر اچاریہ : ہرگز نہیں !

سرپرثوتم داس : نہ معلوم کس نے ”نہیں“ کہا ؟

مسٹر اچاریہ : میں نے کہا -

سرپرثوتم داس : مجھے کچھ بھی افسوس نہیں ہو جناب کہ مسٹر اچاریہ نے ”نہیں“ کہا - اس لئے کہ جھکو وہ ”سرمایہ دار“ کے نام سے یاد کرتے ہیں ، وہی ممکن ہے انکم ٹیکس سے بچ جائیں - مجھے اُنکے نہیں کہنے کی زیادہ پروا نہیں مسٹر اچاریہ نے سوال کیا ہے کہ کیا آسمان پھٹ پڑے گا اگرہ فیصدی کمی بحث میں کر دی گئی - مسٹر اچاریہ کے خیال میں آسمان تو اس وقت پھٹنے والا تھا جب سارے دابل پاس ہوا تھا ! میں مسٹر اچاریہ کو اُن کی منطق کے اندر چھوڑتا ہوں -

مسٹر اچاریہ : آپ کی منطق بہت غلط ہے -

سرپرثوتم داس : آپ کی منطق سے کچھ بہتر ہے !

مسٹر اچاریہ : میں آپ سے کچھ بہتر منطق کا متوقع تھا

سرپرثوتم داس : اگر آپ میری تقریر میں اس طرح دخل دیں گے تو آپ مجھ سے اسی قسم کی بات کی توقع کر سکتے جس قسم کے آپ مستحق ہیں !

## ۱۳۔ فروری سہمہ - مسودہ قانون از دو واج بین الاقوامی

ڈاکٹر سہروردی : جب تک سرسہری سنگھ گوراپنی کوشش کو اس حد تک محدود رکھینگے کہ اُن کا مقصد آئندہ نسلوں کے لئے منہ کی برابر ہو جائے اُس وقت تک ہمیں کوئی اعتراض نہیں -

مگر ابکا حوصلہ اب اس سے بھی بہت زیادہ ہے۔ یورپ سے تازہ دم آکر اور نئے نئے خیالات لاکر جن کا ذکر منشی ایثور سرن نے کیا ہے، اور یورپ میں میرے اور منشی ایثور سرن کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ شاید اب جدید خیالات کے زیر اثر ہیں اور شاید وہ اُس دن کو دیکھ رہے ہیں جب ازواج اور تعداد ازواج اور اس قسم کے تمام مسائل آزادانہ محبت اور آزادانہ خیالات کے نئے اصولوں سے حل ہو جائیں گے۔

مولوی محمد تقی عوب : سوال یہ ہے کہ آپ لندن اور پیرس کی سڑکوں پر کن اوقات میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔

ڈاکٹر سہروردی : میرے دوست ڈبٹی پریسڈنٹ کو ابھی انٹیکنڈیا فرائس جانے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ وہاں وقت کا کوئی امتیاز نہیں۔ عیش و عشرت اور روز روشن کی اُس دنیا میں ہر وقت شام کا وقت ہے۔

۲۳ جنوری سنہ - قانون جواز شادی آریہ سماج  
مشرغزنوی : آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آریہ سماجی اس قسم کے قانون کی خواہش رکھتے ہیں؟  
منشی ایثور سرن : یہ ایک معقول سوال ہے۔ غیر غنیمت ہے کہ مشرغزنوی نے ایک معقول سوال تو کیا!

پنڈت مدن موہن مالویہ : یہ ایک بہت وسیع قانون ہے اور اس پر بہت زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

میر عبد القیوم : تو آپ کچھ دنوں کے لئے کسی آشرم میں چلے جاتے

۲۲ جنوری سنہ - دودھ پیٹنے والے جانوروں کے متعلق ریزولوشن  
 پنڈت مالوی : سب سے پہلے میں اس اسمبلی کے ہر ممبر سے خواہ اس کا عقیدہ کچھ ہو اور وہ  
 کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی رائے میں تمام انسان  
 گائے کے کس قدر رہن منت ہیں، میرے خیال میں اکثر ممبران، اگر سب نہیں،  
 گائے کا دودھ صبح شام پائے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں.....  
 ڈاکٹر سہروردی : جہاں تا گاندھی تو بکری کا دودھ پیتے ہیں!

مشیر کلگر : بعض اصحاب کہتے ہیں کہ تمام فوج میں ہندوستانیوں کے عمل دخل کے لئے سو دو  
 برس کی ضرورت ہے

ایک ممبر : یہ اندازہ کس قدر معتدل ہے!  
 مشیر کلگر : واقعی بہت معتدل ہے! یہ کہنا کہ ہندوستان کی فوج ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دو  
 سو تین سو برس بعد آئے گی۔ لیکن اگر دو سو برس بعد ایسا ہوگا تو میں اس وقت  
 برطانوی حکومت سے کہوں گا.....  
 ایک ممبر : برطانوی حکومت اتنے عرصہ بعد ہوگی کہاں!

۱۸ مارچ سنہ - فوج میں ہندوستانیوں کا داخلہ  
 مشیر کلگر :۔ ایک دن لائبریری میں مجھے ایک لال کتاب ملی جس میں سیکڑوں صفحات پر ان ہندو  
 سپاہیوں کے نام تھے جنہوں نے جنگ عظیم میں وی۔سی۔ کا اعزاز حاصل کیا تھا۔  
 کسی کسی وقت پر میرا یہ جی چاہتا ہے کہ اس کتاب کو ہر اس شخص کے سر پہنچانے کے لئے  
 جو یہ کہے کہ ہندوستانی افسری کے لئے نایاب ہیں۔ لیکن میں اس موضوع کو اپنے  
 آئینہ دل دوست ڈاکٹر مونجے کے لئے چھوڑتا ہوں جو زیادہ قابلیت سے اس صنوع

پر بحث کر سکیں گے.....

ایک آئینہ نمبر: لال کتاب بھی اُن ہی کو دیدیجئے!  
 مٹر کلکر: میں آپ کو وہ کتاب بھی دیدوں گا وہ غالباً مجھ سے زیادہ قوت سے اس کو پھینک کر  
 مار سکیں گے۔

---

یہ لطائف و ظرائف گو وزن میں زیادہ نہیں، مگر مقدار میں کافی ہیں اگر کسی کو انکے جمع کرنا  
 شوق ہو۔ خالی وقت کی تفریح بری نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ اُن احمقانہ باتوں کے  
 بھی کچھ نمونے جمع کر لئے جائیں جو اسمبلی کے اجلاسوں میں ملک کے نمائندوں کی زبان سے ادا  
 ہوتی ہیں تو اسمبلی کے نفسیات کا یہ ایک اچھا مطالعہ ہو گا۔

(باقی)

---

## جدید علم کلام

دہلی کے موقر سالہ کامیابی بابت ماہ نومبر ۱۹۰۹ء میں سب سے پہلے ”حق پسند“ صاحب کا لکھا ہوا مضمون شائع ہوا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ماضی میں مذہب کی ضرورت تھی یا نہ تھی گزرنا نہ موجودہ میں ترقی علوم کے ساتھ عقل سلیم کی ہدایت انسان کی ترقی و ادراج کے لئے کافی ہے۔ اور یا تو ہم میں مذہب کی ہدایات سے منتفع ہو کر صلاحیت نہیں رہی ہے۔ اور یا مذہب ہمارے لئے کافی نہیں ہے۔ چند صاحبوں نے اس مضمون کے مدلل جواب بھی لکھے ہیں مگر میں نہ ان مضامین میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس بحث کو بلا وجہ طول دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ گذشتہ چالیس برس کا جو ہم انگریزی خوانوں کے خیالات کا محمولہ ذاتی تجربہ ہے اور جس قسم کے اعتراضات میں نے اپنے انگلستان، جاپان، برہما اور ہندوستان کے تبلیغی سفروں میں تعلیم یافتہ مسلمانوں سے سنے ہیں ان سے میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سے اکثر کے دل میں دیانتداری کے ساتھ اسلام کی تعلیم کے متعلق اہم شکوک ہیں۔ جب سر سید مرحوم اور ان کی نیک نیت پارٹی نے یورپ کی فلسفیانہ رو کا مقابلہ کر کے اسلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنے۔ خوش عقیدتی کے خلاف عقل و معتقدات کی تاویل کرنے اور گویا ایک ”جدید علم کلام“ تیار کر کے اپنی کوشش تبلیغ شروع کی تو علماء اور پرانے خیال کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ اسی قسم کا کام مصر میں مولوی عبدہ اور ان کے رفقاء نے بھی کیا۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی مستقل کتاب ہندوستان یا مصر یا اور کسی اسلامی ملک میں ایسی جامع اور مانع نہیں لکھی گئی جس سے قدیم علم کلام میں معتد بہ اضافہ ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس کتاب کو تھوڑے سے پڑھ لے تو خدا اور معاشق کے متعلق جو ہدایتیں یا معتقدات بادی النظر میں غلط عقل معلوم ہوتی ہیں ان کا قلع قمع ہو جائے۔ سید صاحب مرحوم اور ان کی پارٹی نے زیادہ تر حضرت

امام غزالیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ شاہ رحمہ کی قابل قدر تصانیف سے جا بجا تمسک اختیار کیا اور عقل و نقل میں تطابق پیدا کر نیکو کشش کی۔ یہی مشکور ہوئی۔ اور ہم ”پیچروں“ میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اصل اصول اسلام سے واقف اور اسکا دل سے احترام کرنے والے ہیں۔ مگر آخری تدوین فقہ کے ہر جزو کل کو نہیں ملتے۔ اگر یورپ وہیں رہ جاتا جہاں وہ سید صاحب کے زمانے میں تھا تو ان کی پارٹی کا پیدا کردہ لٹریچر دائماً ابدا ہمارے لئے دلیل ہدایت رہتا۔ مگر یورپ میں مادی علوم یعنی سائنس کی ترقی مسئلہ ارتقاء اور جدید نفسیات کی تحقیق و تحقیق نے بے شمار مسائل ایسے پیدا کر دیے ہیں جن کے ساتھ اسلام کی تعلیم کا تہا بقی یا انکی تردید ضروری ہو گئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنے رسالہ اقل قلیل اسلام میں عرض کیا تھا کہ قدیم و جدید علم کلام سے قدم اگے بڑھا کر ایک جدید ترین علم کلام مرتب کیا جائے جس میں حسب ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

(الف) عام مذہبی نقطہ نظر میں ترقی اور تبدیلی یعنی ایڈیٹزم کے بجائے ریشنیلزم کا دخل وعت نظر وغیرہ (ب) فلسفہ و سائنس میں معتد بہ جدید ترقیاں مسئلہ ارتقاء تانسع للبقا، سنی الحیات۔ (ج) جدید علم نفس اور اس کے اصول تحت ادراک۔ ادراک، فوق الادراک وغیرہ اور قدیم فلسفہ کے بعض مسئلہ کلیں مثل قوت ارادی تابع رشح ہے۔ فوق الادراکیات کا تعلق فلسفہ، الہیات اور مادی روحانیات سے ہو۔ وغیرہ وغیرہ کو تو ذکر ان سب کو ان کی نارمل و مانع جو لانگاہ کے حدود میں تسلیم کرنا (د) جمالیات۔ آرٹس (میوزک۔ قص۔ نقاشی۔ بت تراشی۔ ادبیات وغیرہ کو ترقی یا زندگی کا جزو لاینفک تسلیم کرنا۔

(۵) مطالعہ مذاہب دیگر Comparative study of Religions کی ضرورت تسلیم کر کے جملہ مذاہب عالم میں سے وہ باتیں انتخاب کرنا جو بطور قد ز مشترک انسانوں کے لئے مفید ہیں (ز) فلسفہ نظریات پر مشایدات کو بین تریسح دینا۔ (ز) تصوف کو قابل توجہ تسلیم کرنا۔

(۲) جدید علم کلام کیونکر مرتب ہو۔

(الف) قدامت امام رازی۔ ابن تیمیہ۔ امام غزالی۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ کے



اصولوں پر تذکرہ بالا جدید تحقیقات کی روشنی میں محققانہ اور مجدوانہ تنقید کرنا۔

(ب) سرسید، مولوی عبدہ، مولوی شبلی۔ نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی وغیرہ کی تحقیقات پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (ج) تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر بشرح ایضاً تنقید کرنا (د) انتہا دیانتداری کے ساتھ ان جملہ تحقیقات کا خطرناک لکرا ایک آزاد جدید ترین علم کلام مرتب کرنا اور اس پر حقیقی اسلام کو (رواجی اسلام کو نہیں) اکسنا

جس قسم کے شکوک حتیٰ پسند صاحب کے مضمون میں درج ہیں۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے شکوک تعلیم یافتہ طبقہ کی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور قطعاً ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جاوے گی۔ اور موجودہ شکوک سے بڑھکر اور نئے اہم شکوک بھی پیدا ہوں گے۔ اسکا علاج میری رائے میں صرف جستہ جستہ مضامین رسالوں میں شائع کرنے سے نہ ہوگا۔ بلکہ مبلد یا بدیر ہم کو ایک جدید ترین علم کلام تیار کرنا پڑے گا۔ جیسا میں نے اپنے رسالہ اقل قلیل اسلام میں وضاحت کے ساتھ عرض کیا ہے۔ پہلے اس امر کی تفتیح کر لیجائے کہ تعلیم اسلام کا وہ حصہ جس سے کم کرنے میں مواخذہ اخروی لازم آئے کیا ہے اور صرف اسے فرض و واجب قرار دیا جائے۔ اس کے بعد ”جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگی“ رو سے باقی سب تعلیم کو بالکل علیحدہ کر کے دکھایا جائے اور اس دوسرے حصہ کو مسنون مستحب اور اختیاری قرار دیا جائے۔ نیز اس اختیاری تعلیم کو پبلک میں اظہار اور بحث و مباحثہ کا قیصل نہ بنایا جائے۔ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ سنت کو جو تعلیم اسلام کا نہایت ممتاز عنصر ہے پس پشت ڈالا جائے۔ یا موجودہ نظام کو جس میں من واجب سنت۔ مستحب سب شامل ہیں درہم برہم کر دیا جائے۔ بلکہ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ فرض و واجب۔ اور مسنون و مستحب میں حد قائل قرار دی جائے۔ اور امت محمدیہ کے موجودہ انتشار کو مد نظر رکھ کر مسنون و مستحب کو قابل بحث و مباحثہ نہ قرار دیا جائے۔ اسلام کی تعلیم میں بغلو سے رہنا اتنا فی الدنیا حسناً و فی الآخرة حسنہ۔ و قضا عذاب النار۔ نجات کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں ایک نجات دنیوی اور دوسری نجات اخروی۔ ان دونوں کو ہم نے اپنے رسالہ اقل قلیل

میں حسب ذیل الفاظ میں عرض کیا جو۔

نجات دہیوی۔ کا قریب قریب مفہوم یہ ہے کہ جس زمانہ میں اقوام تمدن کا باعتبار کثرت جو معیار تہذیب تمدن تعلیم، تربیت، صحت وغیرہ کا ہوا اس معیار پر کم و بیش پورا التزام۔ ہر مذہب نے اپنے وقت میں ان باتوں کا معیار مقرر کیا ہے۔ مگر کسی مذہب کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ یہ حکم دے کہ میرا مقرر کردہ معیار ان شقوں میں ابدالاً بادیکم بلا تخیر تبدیل کے جوں کا توں قائم رہے۔ جن لوگوں نے خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو کیوں نہ ہوں اپنی نیک نیتی سے مذہب کے ذمہ بار ڈالا ہے۔ ان کو وہ باتوں کی غلط فہمی ہوتی ہے اولاً یہ کہ خداوند تعالیٰ نے دنیا اور انسان کو ترقی کن اور ترقی پذیر نہیں بنایا اور گویا جانوروں کی طرح ایک حالت پر قائم رہنے والا بنایا ہے۔ یہ بات بدائتہ غلط ہے۔ اس لئے کوئی مذہب اس بات کا دعویٰ مستحقاً نہیں کر سکتا کہ نجات دہیوی کے پارہ میں میرے بنائے ہوئے اور بنائے ہوئے قواعد یا قیام قیامت بلا کم و کاست جاری ہیں گے۔ ثانیاً یہ کہ انسان کم و بیش ایک غیر ذمہ دار مخلوق ہے۔ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اس کو اعلیٰ درجہ کی ذمہ داریاں بھی تفویض کرتا ہے۔ اور کوئی تعلیم ربانی اور روحانی کہلائے جانے کی مستحق نہیں جو انسان کی واجب ذمہ داریوں کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔ ایسا کرنا انسان کے ساتھ بھلائی کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے ان قویٰ کوشل اور رفتہ رفتہ بیکار کرنا ہوگا۔ جن کے صحیح طور پر استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے ان ذمہ داریوں کو باحسن وجہ پورا کرنا فطرۃً واضح کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کسی شخص کو شروع ہی سے بلا اشد طبی ضرورت کے ہضم شدہ (ڈالی جڈ) خوراکیں دی جائیں اگر ایسا کیا جائے تو اسکے معدہ کی قابلیت ہضم نازل ہو جائیگی قرآن کی فطری تعلیم لیس الانسان الاما سئلی نے جدوجہد کی دوڑ انسان پر فرض کر دی اور یہ دوڑ انسان اسی وقت جیت لے گا جس وقت وہ اپنے دل و دماغ۔ وقت صحت اور مال سے صحیح طور پر کام لیکر اپنے زمانے کی اقوام تمدن کے اوسط معیار نجات دہیوی کو پورا کرے، یہ مراد نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں بالکل جداگانہ قواعد بنائے جائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دنیا کی روز افزوں ترقی و ترقی و ترقی

ذہن چاہئے بلکہ بھگوائے سار عوام الی الخیرات اس میں پورا حصہ لینا چاہئے۔  
 نجات اخروی، کے دو حصے ہیں، ایک اُن حقائق کا یقین کرنا (بلکہ ممکن ہو تو علم یقین کو یقین  
 کے درجہ تک پہنچانا) جس سے مرنے کے بعد دوچار ہونا ہے۔ (اصطلاح مذہب میں انکو عقائد  
 کہتے ہیں۔ دوسرے اعمال کے ذریعہ سے وہ عام صلاحیت پیدا کرنا جس سے مادی اور روحانی  
 دنیا میں ربط پیدا ہو سکے، انہیں عبادات کہتے ہیں، ان دونوں کو پورا کر نیکی کے بعد دنیا کو انسانوں  
 کے لئے جائے راحت بنانے کے لئے ایک تیسری انجیسی کی ضرورت ہے جسے عرف عام میں خلافت  
 کہتے ہیں، انہیں تینوں چیزوں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۱) دیا چاہے الکلام  
 حصہ دوم مرتبہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم)

ظاہر ہے کہ نجات دنیوی کی تعلیم کا بیشتر حصہ عقل سے متعلق ہے اور زمانہ کا رنگ دیکھ کر علماء  
 دین کو اپنے میں اس قدر وسعت نظری پیدا کرنی چاہئے کہ اس حصہ کو عقل والوں پر چھوڑ دیں یعنی  
 اگر عقل والے اس میں تصرف کریں تو اس سے نہ بچ سکیں۔ لباس وضع قطع اور بہت سی ایسی  
 ہی باتیں غالباً اسی شق کے تحت میں آئیں گی۔ اس پر صبر کر لیا جائے۔ نجات اخروی کی مد میں  
 بعد عقائد کے عبادات کا درجہ ہے۔ عبادات کی بھی میز تقسیم کر دیا جائے۔ ایک لازمی عبادات۔ دوسرے  
 متعدی عبادات۔ لازمی عبادات جیسے نماز روزہ اور متعدی عبادات جیسے مدارس اور تعلیم خانے  
 وغیرہ قائم کرنے۔ بکاح بیوگان کا انتظام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ انکے متعلق یہ اصول دل و  
 جان سے تسلیم کر لینا چاہئے کہ لازمی عبادات متعدی عبادات سے مستغنی نہیں کر سکتیں اور دونوں  
 لازم و ملزوم ہیں۔ متعدی عبادات میں اہل عقل کے مشوروں کو تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔  
 رہیں لازمی عبادات ان میں جو طویل نظام قائم ہے اس پر علماء کو اجتہاد ہی نظر ڈالنی ہوگی۔ دنیا  
 کے اور مذاہبوں میں بھی عبادتیں ہیں اور مذاہب عالم یا کم از کم دنیا کے بڑے بڑے اور مشہور  
 مذاہب کی عبادات کو سامنے رکھ کر طے کیا جائے کہ اسلام کی تعلیم کا قائل اور اہل حصہ کیا ہے۔  
 اور اسی پر زور دینا چاہئے۔ یہ اہم کام بڑے جتہ اجتہاد کا محتاج ہے۔ اس کی تفصیل ہم اسلئے

نہیں کرتے کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پبلک میں تفصیلات پر بحث و مباحثہ شروع ہو جائے اور امت محمدیہ کے انتشار میں اضافہ ہو۔ ایسے مسائل پر بھی غور کرنا ہے۔ جو اتفاق و اتحاد کی اہم مفید غایت کو مد نظر رکھ کر اسلام میں داخل عبادت قرار دئے گئے ہیں۔ مثلاً نماز باجماعت۔ جملہ کی مسجدوں میں نماز باجماعت میں زیادہ تر غریب اور بے پڑے لکھے مسلمان شریک ہوتے ہیں مگر امیروں تعلیم یافتہ لوگ نہیں ہوتے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس کی وجہ یہ نہیں معلوم ہوتی کہ آخر الذاکر فرقہ نماز باجماعت کا منکر ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ برابر کا میل جول رکھنا دل میں پسند نہیں کرتے خواہ زبان سے تسلیم نہ کریں۔ یا یہ کہ ان کے مشاغل اس کے مانع آتے ہیں۔ اس پر اور مثل اس کے بہت سی اور باتوں پر ٹھنڈے دل سے اجتہاد اُغور کرنا ہے۔

۴۔ استاد مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ارشاد فرمایا ہے:-

”علم الکلام حقیقت میں جس چیز کا نام ہے وہ عقائد کا اثبات ہے اور علم الکلام کی تیغ میں یہی چیز جان سخن ہے لیکن انوس یہ ہے کہ اس کے متعلق قدما کی تصنیفات ناپید ہیں اور متاخرین کا اگرچہ دفتر بے پایاں موجود ہے لیکن وہ بالکل اس مصرع کے صدق ہے۔ ع۔ شذر پشیاں خواب من اذ کثرت تعبیر ما“ (علم الکلام حصہ اول

صفحہ ۱۴۱)

قدما کی تصنیفات ناپید ہو جانے کا اور متاخرین کے مشکل اور پیچیدہ دفتر بے پایاں کے موجود ہونیکا تو ہر اہل دل کو انوس ہو گا۔ مگر ان دونوں باتوں سے ایک یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ علم کلام کی جدید تدوین بالکل از سر نو اور جدید اصول کے موافق شروع کی جاسکتی ہے۔ عقائد میں سب اہم اور گویا سنگ بنیاد تو حید باری تعالیٰ ہے۔ اب قدیم علم کلام اور جدید علم کلام میں بھی بخشیں ہو سکتی ہیں کہ خدا کی وحدانیت اعدادی ہے یا نہیں۔ صفات باری تعالیٰ ذات کا عین ہیں یا غیر۔ روح فانی ہے یا باقی۔ عالم قدیم ہے یا حادث۔ دنیا ستم ہوگی

یہ اسی طرح پہلی جانگی۔ انسان کو مرنے کے بعد کیا پیش آئے گا۔ مشرور شریعہ میں آنے کے قابل ہو یا نہیں۔ یہ اور مثل انکے بے شمار مسائل کے مجموعے کا نام ہمارا علم کلام ہے۔ فلسفہ تو ہمیشہ سے تھا سوہویں اور سترہویں صدی میں رومن کیتھولک مذہب کے زوال اور پروٹسٹنٹ مذہب کے غرور نے یورپ میں یونانیوں کے علوم کا احیاء کیا۔ اور سائنس کی ترقی شروع ہوئی۔ ہوتے ہوئے یہاں تک ہوا کہ دو نظریہ جید اور مستقل دنیا کے سامنے آ گئے۔ ایک نظریہ ارتقاء کا اور دوسرا قدامت عالم جو اسی کا ایک جزو ہے۔ لیپا لاپی یعنی جی چاہے کر لیجئے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مسائل یا ان دونوں کو ملا لیجئے تو اس بڑے مسئلے ارتقاء نے مذہب عالم کے اکثر عقائد پر کڑی ضرب لگائی۔ مذہب کو بیدار کرنے کے لئے صرف یہی کافی تھا۔ مگر جذبات نے اس پر مرے پر سوڈرے کا کام کیا۔ ان دونوں پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنی اس مضمون کی وسعت پر باہر ہے۔ مثلاً ارتقاء نے خود فطرت میں ترقی کے اجزائے مل ہونے کا دعوے کیا۔ اور منسلک جدید نفسیات نے دماغ انسانی کو وہ درجہ دیاجس نے روحانی دست نگری کو صوبہ کر دیا۔ تقدیر و توکل جیسے اہم مسائل اسلامیہ میں ان دونوں مسائل نے بہت کچھ دخل اندازی کی۔ اور جس جدید علم کلام کے تیار کرنے کی ہم رائے سے رہے ہیں اس میں سب سے پہلے انہی اہم مسائل پر بحث ہونی چاہئے۔ تقدیر اور توکل پر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لطیف بحثوں کے موجود ہوتے ہوئے اور کیا لکھا جاسکتا ہے۔ مگر ان کی بحثوں کا جو اصل اصول ہے اسی پر ارتقاء اور نفسیات حملہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد عبادات کا نمبر آتا ہے۔ مادی اور دماغی ترقی تو ارتقاء اور نفسیات والوں کو تسلیم ہے۔ مگر عبادات کا طویل نظام ان کی تعلیم کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر بڑی قوت یہ کہ بعض عبادات فرض ہیں۔ اور ان کی جزا اور سزا عالم آخرت سے متعلق ہے۔ یہ حکمائے یورپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ارکان اسلام کے محاسن پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات مثلاً ”حجۃ اللہ البالغہ“ سے بڑھ کر اور کیا کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر انکی استدلالات کا اصل اصول بھی خالص روحانی بنیاد رکھتا ہے۔ مثلاً ملائے اعلیٰ وغیرہ

ارتقار اور نفسیات سرے ہی سے ان باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جدید علم کلام میں تو کچھ ایسا ہونا چاہئے کہ ارتقار اور نفسیات دونوں میں وحدانیت، رسالت، بقاءے رشح، اصح، حالات شرف و نشر وغیرہ کو ماحول کر دیا جائے۔ مثلاً اقرار وجود باری تعالیٰ کے ساتھ اس عقیدے کو ملا لیا جائے کہ عادت اللہ یہ ہے کہ انسانی عقل کے غیر مکمل اور ناقص ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مرضی اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام پر ظاہر کرتا ہے۔ اور انکو دنیا کا ہادی اور پیشوا قرار دیتا ہے۔ مادہ اس معنی کر کے قدیم ہو سکتا ہے کہ ازل سے ابد تک یعنی جب سو اس کے حکم سے پیدا کیا گیا اور جب تک اسی کے حکم سے فنا ہو گا۔ اپنے میں خدا ہی کی عطا کی ہوئی ارتقائی فطرت رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ ارتقائی منازل کی چھان بین رکھیں۔ اور ان سے متبع حاصل کریں۔ ”روح“ مادے کی طرح سے عالم خلق کی شے تو ہے نہیں اسی لئے اسکا صحیح علم عقل انسانی سے ماوراء ہے۔ مگر دماغ انسانی نفسیات کے اصول مثل تحت لاء اور اک۔ فوق الادراک کے ذریعہ سے روح کے متصرف ہونے اور اس کی قوتوں کا پتہ دیتا ہے۔ یہ بحث یا بحثیں بڑی فاضلانہ اور عالمانہ تحقیق و تدقیق کی محتاج ہیں۔ اور کتنی ہی مشکل سہی ان کو آج نہیں تو کھل، کھل نہیں پر سول ضرور طے کرنا ہو گا۔ یہ اعتراض قائم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے سعدوئے چند حکما کی رائے سے یا اپنے ہاں کے ان تعلیم یافتہ لوگوں سے جو انکے پیرو ہیں مرعوب ہو کر کیوں نظام اسلام درہم برہم کیا جائے۔ مگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آئینہ مذہب ہے۔ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اور نجات دنیاوی اور اخروی کا واحد مکمل ذریعہ ہے۔ تو اس میں خوش عقیدہ اور بد عقیدہ دونوں طبقوں کے لئے مکمل ہدایتیں ہوتی چاہئیں۔ خوش عقیدہ لوگوں کے لئے تو نقل جیسا قرون اولیٰ میں تھا اب بھی ہے۔ اور ہمیشہ رہیگا۔ کافی ہے مگر جس طرح فلسفہ یونان کے بغداد میں ترجمے ہوئے بعد عقلی شکوک لوگوں کے دونوں میں پیدا ہوئے اور یہی علماء ان اسلام کو علم کلام ایجاد کرنا پڑا۔ اسی طرح آج بھی تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک ترسیم شدہ علم کلام کی ضرورت ہے جو تعلیم یافتہ لوگ بجا طور پر قرآن پاک سے

زیادہ اور حدیث۔ اجماع امت اور قیاس مجتہد کے کم تک اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان چاروں شقوں کے لئے علیحدہ علیحدہ چار جماعتیں موجود نہیں ہیں مگر تین جماعتیں ضرور موجود ہیں۔ ایک جماعت اہل قرآن کی ہے۔ دوسری اہل حدیث کی۔ تیسری اہل فقہ کی۔ اگر یہ جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر اپنی ماہر الامتیا ز شقوں میں اجتہاد کریں تو کچھ نہ کچھ وال دلیا ہو ہی جائے۔ مگر نظر بر حالات موجودہ اس کی بہت کم توقع ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر ان نظامات سے امید باندھنے کو جی چاہتا ہے جن میں دنیوی اور دینی دونوں تعلیموں کے مرکز موجود ہیں مثلاً جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، دارالمصنفین اعظم کدہ وغیرہ۔ چونکہ یہ اہم اور متبرک کام نہ کسی ایک فرد کا ہے نہ کسی ایک جماعت کا بلکہ سب کے ملکر کر سکا ہے۔ اس لئے خاکسار کی تجویز ہے کہ ان تینوں انسٹی ٹیوشنوں میں سے کسی ایک کو مرکز قرار دے کر اور باقی انسٹی ٹیوشنس ان کے ساتھ اشتراک عمل کر کے اس کی بنیاد ڈالیں۔ علاوہ قابل آدمیوں کی تنخواہوں کے عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کی بے شمار قیمتی کتابیں بھی خریدنی پڑیں گی جس کے لئے ایک معقول رقم درکار ہوگی۔ یہ رقم بجائے والیان ملک روستاے عظام اور متمول تاجروں سے بطور چندہ کے طلب کرنے کے بہترین تدبیر یہ معلوم ہوتی ہے کہ زکوٰۃ میں سے یہ کل اخراجات اٹھائے جائیں۔

کو مکمل بنا ہوا اس باب میں بالبعد کی تمام الفبیں تقلیدی ہیں تحقیقی۔ ان تقلیدین میں وہ مصنفین ستھے  
مجھے جائیں جنہوں نے ۱۹۲۰ء کے بعد داو تحقیق دی ہو۔

راقم الحروف فی الحقیقت بہت محدود اور معمولی حرف شناسی کی قابلیت رکھتا ہے لیکن باوجود  
۱۰ اہلی، شوق تلاش سے مجبور ہے۔ اہل نظر کے سامنے اپنی ناپیڑ و نامکمل خدمت پیش کرتے وقت اس  
نہ دو کاوش میں رہتا ہے کہ حتی الوسع حد تحقیق تک پہنچا جائے۔ اس محبت تحقیق میں ابتدا و اپنی پیائی  
سے میں بھی طابق النسل بالنسل بنا رہا مگر دل میں یہ خلش برابر جاری رہی کہ جب صوبہ دکن میں اب  
سے پانسو برس پہلے کا سرمایہ نظم و دست یاب ہوتا ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بکثرت نہ سہی  
بقوت ہی ترازو دو کا کوئی نمونہ نہ ہو؟

بالآخر ”جوندہ یا بندہ“ خلیش دور ہوئی اور سلطانین بہنید اور اس کے بعد عادل شاہیوں  
کے عہدوں کی اتنی الفبیں نظر افروز ہوئیں جن کے سامنے یہ قیاس و ہم سے زیادہ وقیع نہیں رہا  
کہ ترازو دو کی پہلی تصنیف محمد شاہ کے عہد میں ہوئی ہے۔

اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں، اور پھر لکھتا ہوں کہ ان پرانی کتابوں کی زبانیں اس زمانے  
کے لئے یکسٹم اصنی ہیں لیکن جب کہ گیارہویں یا بیسویں صدی ہجری کا شعر  
بامن کی بینی ایک موری آنکھوں پر لی گالی دیا و غصہ کیا اور دگر لری  
نظم آرد کے ضمن میں لکھا جاتا ہے تو آٹھویں، نویں صدی ہجری کی یہ عبارت نثر:-

”حضرت اپی مبارک زبان سوں حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہے ہیں، اکل اصحابان ہو  
خاص اصحاب مجلس میں حاضر تھے، کس زبان سے موسوم کیا ہے گی۔ البتہ ان کتابوں کی طرز و نگارش  
کے متعلق اس اہد یا ضروری ہے کہ ابتدا و آرد دو نے اپنے زمانے کی مروجہ روش کو سامنے رکھا  
ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ طرز و ظہوری اور ظاہر و حید و بدر چاچ کے زمانوں میں فارسی استعارات  
و تلمذات کا مجموعہ یہی ہے۔ یک سطر ہی سنہوں کو نئی نئی تشبیہات اور رعایت لفظی کی پیچ در  
پیچ الجھنوں کے ساتھ ہزار سطر دل میں ختم کیا جاتا تھا چونکہ علمی تکلف و صناعت کو فارسی کی مدد



# تاریخِ نثرِ اردو

کم و بیش پانچ سو برس سے اردو زبان کا وجود پایا جا رہا ہے مگر اس طویل مدت میں پانچ چھ کتابیں بھی ایسی نہیں ملتی جن کے مطالعہ سے صحیح علم ہو سکے کہ کس زمانے سے اس زبان کی تصنیفات کو بین الدفین ہونے کا موقع ملا ہے۔ زمانہ حال میں دو چار کتابیں خصوصاً میں شائع ہوئی ہیں اور ان میں تاریخی واقعات لکھے گئے ہیں جن سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو نے عہدِ بہدکتی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، لیکن ہر عہد کے ایسے مکمل و مفصل نمونے نہیں ملتے جن کو پڑھ کر ہر عہد کے اسالیب بیان کا پورا اندازہ ہو سکے۔ چند بلاغۃً ان ایک ایسی تالیف کا نام ہے جس میں عام تصنیف و تالیف سے لے کر شہادۂ تک کے ۱۲-۱۵۔ اصلی نمونے بشرح و بطور ذکر کئے گئے ہیں۔ اور وہ عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ ذیل کا انتخاب اسی مبسوط تالیف سے کیا گیا ہے۔

نثرِ اردو کی تصنیف کا آغاز مسلمانوں کے اکثر تاریخی کارنامے انقلاباتِ زمانہ کی دست برد سے دریا برد ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے آتے ہیں کہ شاہجہاں کے عہد میں شکر کی زبان کی مناسبت سحرِ اردو بازارِ قائم ہوا تھا مگر اُس کا کوئی اثر کسی طرح کا زمانہ زبانی روایت کو تاریخی روایت بنانا نظر نہیں آتا۔ کاش عرب کے ایامِ جاہلیت کی یادداشت انسابِ حیوانی کی طرح اُس زمانہ کے انسانی و ایرانی انسان بھی ایسی روایاتِ زبانی کو علمِ سینہ پر سینہ بنا کر محفوظ کرتے آتے تو شاید آج تلاتر حالات میں اتنی وقت نہ ہوتی اس عدم اعتناء و بے پروائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ فی زمانہ ہم میں سے جس کسی ایک کی محدود تحقیقات، اولیت کے شمار میں آجاتی ہے وہی مختم تحقیقات سمجھی جاتی جو۔ وسائلِ تحقیقات کی قلت سمجھے یا اپنی غفلت، کہ اردو نثر کا پہلا مرقع کتابی شمس العلماء محمد بن آزاد نے فضلی کے ترجمہ وہ مجلس کو بچھا ہے اور اب تک جس کسی نے اردو کی تاریخ لکھی ہے اسی تحقیق

اور فارسی دانوں کی ایف دعادت نے مانوس بنا رکھا تھا اس لئے اس کی عام دل پندی مسئلہ ہو گئی تھی۔ اس کے مقابل میں لاوارث اُردو کی مال دنیا سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور پھر یہ کہ اسکا سودا سات پانچ کی زبانوں سے مل کر بارہ بات ہو رہا تھا۔ کس منہ سے فارسی کی ہمنوائی کر سکتی تھی۔ غرض کہ عہد قدیم کی اردو میں جا بجا تلامذات و رعایات، اور استعارات کی شان تو قریب قریب وہی ہے جو اس وقت کی فارسی میں تھی، لیکن نئی اور محدود وسعت و حالت کی وجہ سے کوئی دل کشی و دل آویزی نہیں پائی جاتی۔ اور یہ بات کچھ اسی زمانے کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ ایف بھی جس کو تقلید آبجیات اردو نثر کی پہلی ایف کہا جاتا ہے اس لچپی سے معرا ہے حتیٰ کہ اس کے بعد بھی فنا نہ عجائب اور آرائش نخل کی طرح تام سنجع و متقی تصنیفیں اس وقت نامسطوع سمجھی جاتی ہیں۔ بہر حال تاریخی حیثیت سے یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس نثر اُردو کو اب تک محمد شاہی عہد کا کارنامہ سمجھا جاتا تھا وہ فی الحقیقت اس سے تین سو برس پہلے سلطان فیروز شاہ (دکنی) معاصر امیر تیمور (۱۳۵۰ء) کے زمانے کی یادگار ہو۔

نظم اُردو کا وجود تصانیف نثر سے قبل و کن میں پایا جاتا ہے اس لئے یہ احتمال ممکن ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں نظم کے ساتھ نثر کی کتابیں بھی لکھی گئی ہوں اور انقلابات کے طوفانوں نے انکو کہیں کا کہیں بہا دیا ہو۔ جس طرح مصنف کی زندگی کے ساتھ تصنیف کی تزییم و اصلاح قائم رہتی ہے اسی طرح اگر ذوقِ ایف کے ساتھ شوقِ تحقیق بھی جاری رہا تو ممکن ہے کہ آج ہم کو اب حیات کی تلاش کے بعد فضلی سے حضرت سید محمد سنی گیلو دراز اور شمس العشاق وغیرہم مقدم نظر آئے ہیں ہمارے بعد دوسروں کے سامنے اور نئی صورتیں رونما ہو جائیں۔

بایں ہمہ اس خصوص میں یہ اعتراف و اعلان ناموزوں نہیں کہ اس وقت تک ہندوؤں کے صوبجاتِ شمال و مغرب میں محمد شاہ عالم گمیر سے پہلے کوئی نمونہ اردو نثر کا نہیں ملتا۔ فضلی جن کو آزاد نے نثر اُردو کا مؤلف اول کہا ہے وہ بھی دکنی تھے مگر چوں کہ ان کی کتاب ہندوؤں کے اکثر صوبوں میں پہنچ گئی ہے اور اس کی ترتیب نثر قریب قریب وہی شان رکھتی ہے جس کے

فضلی کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی قلمسحر رکھا ہے، لہذا اس کو ہندوستان کی شمالی و مغربی تہذیب میں شامل کر لینا بے محل نہیں۔

فضلی سے پیش پیش برس پہلے اور نگ زیب مالگیر کے عہدِ اخیر میں نارنل ضلع کرنال کے سید جعفر ایک نموڑ اور پھکرنا شاعر گذرے ہیں جن کے تعارف کو جب تک زلمی سے معنون نہ کیا جائے پیمانے نہیں جاتے۔ انہوں نے بھی چند خاکے اُردو شعر کے دکھائے ہیں جو دو چار سطروں سے زیادہ نہیں لیکن وہ سب کے سب حدِ تہذیب سے باہر ہیں اس لئے ان کا نمونہ اس کتاب میں لکھا جاسکتا ہے، نہ وہ مستقل تصنیف میں شامل ہونے کے قابل۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ عباراتِ خالص اُردو میں بھی نہیں ہیں۔

شمال ہند میں اُردو زبان کیوں دیر میں مرتج ہوئی | جس ملک میں متعدد صدیوں تک ملک گیری اور انقلابِ سلطنت کی آندھیاں رات دن چلتی رہی ہوں وہاں امنِ عین کے ساتھ علی مذاق کا چرچا اور اہل مذاق کے ہاتوں کسی نئی زبان کے سدھرنے کا سامان کیا ہو سکتا تھا۔ یہاں دہلی یا نواحِ دہلی کے اُن انقلابات کا تذکرہ فضول ہے جو شہاب الدین کے عہد (۱۱۹۹ء) سے پہلے راجہ جہشتر، راجہ جرجوہن، اور راجہ بکرماجیت یا راجہ بھگنوت کی باہمی آویزشوں سے ظہور پذیر ہوئے، کیوں یہ کتاب ملکی یا سیاسی تاریخ نہیں بلکہ صرف تاریخِ زبان ہے۔ تاہم اس ضمنی اشارے سے یہ نتیجہ ہمارے لئے مفید مطلب ہو کہ ہندوستان ہمیشہ سے میدان کا رزار بن رہا ہے اور مسلمانوں کی آمد سے قبل اور اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک یہی عالمِ خلفش نظر آتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شہاب الدین غوری کے زمانے سے نئی زبان کے بنیادی آثار نظر آنے لگے تھے اگر اثرات کو مخالف ہوائیں منتشر نہ کرتی رتیں، اور حضرت امیر خسرو کی پسلیوں کے بوجھنے والے انکے آتے پتے بھول نہ جاتے اور کم از کم ایسی طبع آزمائیوں کا سلسلہ نہ ٹوٹتا رہتا تو آج شمالی ہند میں بھی اُردو پانچ چھ سو برس کی سن رسیدہ زبان ہوتی۔ میرے خیال میں شمالی ہند کے اہل ادب کو اس زبان کی خدمت نہ کرنے کے موانع میں بڑا حاکم سلطان محمد غلق کا وہ سفاکا نہ حکم تھا کہ جب اُس نے

۱۷۷۳ء میں یہ خیال قائم کیا کہ دہلی چھوڑ کر دیوگرھ کو دار السلطنت بنایا جائے اور اُس کا نام دولت آباد رکھا جائے۔ چنانچہ قضاے بہم کی طرح یہ حکم جاری ہوا اور دہلی خالی ہونا شروع ہوئی جس کی ویرانی صحابہ عالم ہو کہ تمام درندگان صحرائی شہر کو ویران پا کر لیں گئے۔ اگرچہ بظاہر اسباب اس انقلابی اثر کا پانچ برس کے بعد ردِ عمل شروع ہو گیا لیکن حقیقت میں جن ہتھیار پست کے باشندوں نے جبراً قہراً ترک سکونت کی تھی اور جو اس بعید مسافت کو طے کر چکے تھے اُن میں بالاکثر معاودت کے قابل نہیں رہے۔

خلاصہ یہ کہ اس انتقالِ مکانی نے احوالِ زبانی کو مدتوں کے لئے یکسر منتشر کر دیا۔ ادھر شمالی ہند کی حکومت کی یہ کیفیت، ادھر بجا پور میں سن گنگو نے بنیادِ سلطنت قائم کرتے ہی غیر ملکی (فارسی) زبان کو دفتر سے خارج البلد کر دیا۔ یہ اتفاقی اور قدرتی اسباب بتا رہے ہیں کہ دہلی دناؤں دہلی میں اُس وقت اس لئے اُردو کا بول بالا نہ ہو سکا اور جنوب ہند میں اس وجہ سے اُس کا عروج شروع ہو گیا۔

امیر خسرو کے بعد سکندر لودمی کے عہد (۱۱۹۱ء) میں سب سے پہلے کایستوں نے فارسی زبان سے لیکھ کر شاہی دفتر میں نام لکھوایا۔ اسی کا اثر تھا کہ اسی زمانے کے گورو رامند کے چیلے کبیر داس (معاہدہ ۱۱۹۱ء) نے اپنے دو ہوں اور بھجنوں میں سیکڑوں، فارسی، عربی الفاظ ملانے شروع کر دیے لیکن اسکا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت کے دباؤ سے ایسا کیا گیا، بلکہ عام استعمال و رواج اور آپس کے میل ملاپ کی وجہ سے ایسا ہونا لازمی تھا۔ ذیل کی مثالوں سے اس دعوے کا ثبوت ملتا ہے۔ کبیر کہتے ہیں:-

حدِ حد تو سبھی گئے بے حد گیا نہ کوئے	بے حد کے میدان میں رہا کبیر اسوئے
چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیر آروئے	ان پائین پنج آئے کے ثابت رہا نہ کوئے
اونچے اونچے محل بناوے گہری نیوین تھا	چلنے کا مقصود نہا میں رہنے کو من کرتا
آڑے ترچے تلک لگا دے گہری لالچتا	ہرے ہتیر کپٹ کترنی صاحب کیسے ملتا

بااگر و نانک بھی اسی زمانے کے ایک بزرگ ہیں اُنکے کلام میں عربی فارسی کے جتنے الفاظ ملتے ہیں اس بہتات سے اُس عہد میں کہیں نہیں ملتے پھر انداز بیان ایسا آسان و عام فہم کہ شخص سمجھ سکتا ہے۔

سانس ماس سب جیو تہارا تو ہے کھر اپارا نانک شاعر کو کہت ہے سچے پروردگار  
 نانک ننھا اور ہو جیسے ننھی دو ب بڑی گھاس جل جائیگی دو ب خوب کی خوب  
 بیجن اور دو ہے کہنے کو بھاشا میں کہے گئے ہیں مگر انکی طرز واد ایسی صاف ہے کہ آج کل کے معمولی اردو خواں بھی آسانی انکا مطلب سمجھ سکتے ہیں یہ نمونے اگرچہ نظم کے ہیں مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی کہ صرف شالیں دستیاب نہ ہونے پر یہ قیاس کر لیا جائے کہ اُس عہد میں شرازدو مریج نہ ہوگی۔ نظم۔ شر کے مقابل میں اختصار اور دل کشی کا سامان زیادہ رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ نومولود زبان بجز معمولی بات چیت کے اور کسی مسرت کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور سب پر طرہ یہ کہ اسلاف ان باتوں کو قلم بند کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان وجہ نے نظموں کی ہم عہد شروں کا ملنا تعجبات سے ہمیں اگر اُس زمانے میں جنوب ہند کی طرح شمال ہند میں بھی معمولی سے معمولی حمایت و دلگیری کسی حکومت کی طرف سے ہو جاتی تو یقیناً حضرت امیر خسرو، کبیر داس، بابا گرو نانک، سور داس (معاہدہ ۱۱۹۹ھ) اور تلسی داس (معاہدہ ۱۱۹۹ھ) کی فارسی آمیز بھاشا کے پہلو پہلو اس نئی زبان کا دامن جمی ہوتا۔ پرنظر آتا۔ حکومت کی حمایت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دکن میں وہ حضرات جو دہلی سے جا کر آباد ہوئے تھے انہوں نے ۱۱۹۹ھ سے ۱۲۲۲ھ تک ایسی متعدد دشر کی تصنیفیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو متذکرہ بالا قیاسات کو یقینات کا جامہ پہناتی ہیں۔

ابتدائی اردو کی کتابوں کے نام | زبان کی ابتدائی سادگی کا ایک نمونہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے مصنف و مؤلف اپنی کتابوں کے نام خالص اردو میں رکھا کرتے تھے، مثلاً "تب رس" (مؤلفہ ۱۱۹۹ھ) اس نام میں دو لفظ ہیں اور دونوں بھاشا کی ابتدا سے اردو کے عہد حاضر تک روزمرہ بول چال میں بکثرت شامل ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ ان سطور

کے پڑھنے تک بعض نگاہ سیرین کا ذہن معنی یاب نہ ہوا ہو گا۔ یہ کیا ہے؟ ہمارے پر تکلف مذاق کی سادگی اجنبیت۔ بہر حال اس کا مفہوم آج کل کے ادب لطیف میں ”سراپا شیریں“ سے ادا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ”پھول بن“ ترجمہ باتین۔ مترجمہ ابن شاطلی (۱۶۶۶ء) اور نلکن مؤلفہ قاضی محمود (۱۶۶۶ء) یہ رنگ سادگی تفسلی کے زمانہ تک پایا جاتا ہے، انہوں نے بھی اپنے ترجمہ وہ مجلس کا نام کر بل کتھا (کر بلائی کہانی) رکھا ہے۔

نویں اور گیارہویں صدی ہجری سے قطع نظر کر کے ترجمہ تفسلی کے بعد پونہ صدی تک کوئی نثر کتاب شمالی ہند میں نہیں ملتی، مجدد شاہی زمانے میں اور اس سے آگے چھپے، ولی۔ حاتم۔ آرزو وغیرہ بکثرت صاحب دیوان شاعر گزرتے ہیں، لیکن کسی ایک نے بھی اردو نثر کی طرف عنان توبہ نہیں پھیری، خان آرزو سے خواجہ میر حسن بلکہ انشا تک جس نے اردو زبان یا شعر کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کتاب لکھی تو اس کی زبان فارسی ہی رکھی۔

مغلیہ خاندان کا لب بام آفتاب (شاہ عالم) اور مٹتا جاہل چراغ سحری (سراج الدین ابوظفر) کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں خال خال نثر اردو کی کتابیں تالیف ہونے لگی تھیں، اگرچہ وہ کتابیں نہ شاہی دربار سے منسوب تھیں، نہ ان کے حکم و فشار سے لکھی گئی تھیں (جس کا سبب ان کی برائے نام بادشاہت کی بے اثری تھی) بائیں ہمہ چونکہ قلعہ معاملے دہلی میں ان کی محدود حکومت باقی تھی اور عموماً ہندوستان میں ابھکا نام و ذکر بادشاہوں کی طرح بخلو سے زبانوں پر جاری تھا، اس لئے ایسی کتابوں کو جو حکومت برطانیہ کے باضابطہ کام و نظام کے علاوہ شائع ہوتی ہیں، انہیں یادگار سلطانین مغلیہ سے منسوب کرنا غیر مناسب نہ ہو گا۔ ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، مگر جس قدر چھٹی قابل افسوس ہے کہ اکثر حصہ غیر مطبوع و نامعلوم ہے۔ اور پرانے خاندانوں میں کہیں کہیں تلاش سے یہ سرمایہ مل جاتا ہے۔ جیسے کہ تفسلی کی کر بل کتھا یا مرزا فرخ سید سودا کا ترجمہ شعلہ عشق وغیرہ۔ لیکن یہ سرمایہ بھی گنج باد آرد و کی طرح انسانہ ہی افسانہ ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہند مضبوط اور مستقل ہوئی اور دوسرے ملکی انتظامات کے ساتھ یہاں کی زبان

کے لئے بھی ابتدائی اور عارضی توجہ شروع کی گئی۔ انہیں توجہات کا نتیجہ ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں  
 پریم سنگر لالو جی نے اور چار درویش کا اردو ترجمہ عطاسین تحسین نے، اور حکام وقت کے اہل  
 میرامن دہلوی، رجب علی سرور اور شیر علی افسوس وغیرہم نے باغ و بہار، آرائش محفل اور افلاک محنی  
 (اردو) وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں، اسی سلسلے میں دوسرے اہل قلم نے بھی بطور خود آردو  
 کا سرمایہ تصنیف فراہم کیا۔ یہ سرمایہ نہ صرف تفصیلات اور کہانیوں تک محدود رہا بلکہ قواعد لغت اور  
 تراجم مذہبی تک وسعت دی گئی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندان رشید شاہ عبدالقادر  
 اور مولانا رفیع نے قرآن پاک کے ترجمے کئے۔ ان مذہبی و اخلاقی مؤلفین و مترجمین کے علاوہ مسٹر  
 جان گلگرسٹ اور وارن جیسنگز، اور مارکونس ولزلی وغیرہ مستشرقین و حکام بالادست نے خصوصیت  
 سے ترقی اردو کو ملحوظ رکھا۔ اردو کی گریمر ترجمہ مسٹر جان گلگرسٹ بھی اسی زمانے (۱۲۱۸ھ) کی یادگار  
 ہے۔ خلاصہ یہ کہ اردو شریکی نمایاں خدمتیں انگریزی عہداری کے قیام کے ساتھ بڑھتی رہیں ان خدمتوں  
 اور کارروائیوں کا یہ عام اثر تھا کہ ۱۲۱۸ھ میں دہلی سے مولوی محمد بہتہ الدین صاحب شمس العلما آؤ  
 نے ہفتہ وار اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار ۱۲۱۸ھ سے پہلے تک جاری رہا۔

## روس میں افسانوں کا ارتقار

فرانس کے بعد غالباً دنیا میں سب سے زیادہ مکمل، دلچسپ، اور فنی اعتبار سے بند پڑے افسانے روس کے ہیں۔ ناول نویسی میں روس نے کسی ملک سے پیچھے رہنا گوارا نہیں کیا۔ اگر فرانس کو لے کر (Les Miserables) اور میڈل واپن (Middle de Maupin) جیسے شاہکار پیش کرنے پرناز ہے تو روس بھی گناہ و سزا (Crime and Punishment) اور اینا کرینینا (Anna Kernina) جیسے فقیدانہ نظیر اور عدیم المثال شاہکاروں پر کھیلنا فخر کرتا ہے۔

روس میں افسانوں کی ابتدا کس طرح ہوئی یا یہ تو بتانا مشکل ہے۔ لیکن منظم اور باقاعدہ مختصر فسانے انیسویں صدی میں لکھے گئے۔ یعنی یہاں بھی مختصر افسانہ نگاری اسی زمانے میں شروع ہوئی جس میں یورپ کے دوسرے ممالک یعنی آسٹریا، ہنگری، بلجیم، ہالینڈ وغیرہ میں۔ لیکن ان ممالک میں فن افسانہ کا ہنوز روز اولین ہے۔ اور روس میں یہ فن اپنے نصف النہار پہنچا۔ جب زار پطرس اعظم نے سینٹ پیٹرس برگ کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا تو گویا روس میں مغربیوں کے لئے ایک دروازہ کھل گیا۔ اور وہ سرزمین جو تاتاریوں کے دوران حکومت میں شرقیت کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، رفتہ رفتہ مغربی تہذیب، مغربی علوم و فنون، مغربی طرز معاشرت، مغربی تمدن، یہاں تک کہ مغربی ادب سے آشنا ہونے لگی۔

مغربی ادب کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا متبع بھی شروع ہوا۔ قدیم فرانسیسی اور جرمن شہزادوں کی بیویوں میں لومونوسوف اور درز ہافین نے (جو روسی شاعری کے دلی پاجا سر کہے جاسکتے ہیں) نظمیں لکھیں جن کا طرز ادا اس قدر قدامت لئے ہوئے ہے کہ جدید ناظرین کے لئے بہت کم دلچسپی کا باعث ہے۔ روسی امراء اور عوامین اکثر اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے فرانس



اور جرمنی بھیج دیتے، اور عوام الناس بے لباغی کے سبب مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم روسی ادب کا بہت بڑا حصہ امریکہ کے قلم کا نتیجہ ہے۔

جب پولین غلام کی تیغ خانہ اشکاف وسطیورپ میں چکی اور ساری دنیا کو خیرہ کر دیا تو روس کو بھی اپنے تحفظ کے لئے پیش قدمی کی ضرورت ہوئی۔ اور روسی جنگجو سرحد فرانس تک جا پہنچے یہ ایک ایسا نادروقت تھا کہ روسی افسر، جن میں بہت سے ادیب بھی تھے، مغربی تہذیب و تمدن مغربی اثرات اور مغربی علم و عمل سے واقف ہونے کا ایک اور موقع پا گئے۔ اور تقریباً اسی زمانے میں روس کے دو نامور شاعر اور افسانہ نگار لوشکن اور لے نطوف پیدا ہوئے، جنہوں نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ اسی دور میں ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ پولین کی فتوحات اور بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے یورپ کے دوسرے ممالک میں خوف اور دہشت نفرت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ روس بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہاں تک کہ روس میں فرانس اور اہل فرانس سے اس قدر نفرت بڑھ گئی کہ فرانسیسی علم و ادب چھوڑ کر روسی ادیبوں نے جرمن اور انگریزی علم و ادب کو اپنا حضور بنا لیا۔ چنانچہ لوشکن اور لے نطوف کو ہم بائرن اور اسکٹ کے نمونے سے منور پاتے ہیں۔

ٹھیک اسی زمانے میں مختصر افسانہ نگاری نے روس میں جنم لیا۔ لوشکن پہلا شخص ہے جس کے مختصر افسانے صحیح معنوں میں مختصر افسانے کہلانے کے مستحق ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم روس میں مختصر افسانے کی ارتقا پر ایک لمبی نظر ڈالیں، یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روس میں مختصر افسانے کی کیا صورت ہوتی تھی۔

روسی افسانے عموماً تین قسم کے ہوتے تھے:-

(۱) رومان (Roman) یعنی طویل ناول جن کی ضخامت دو سو صفحات سے لیکر با آفاق ہزار صفحات تک ہوتی تھی۔

(۲) پوویست (Povest) یعنی مختصر ناول جنکو انگریزی میں (Novellette)

کہتے ہیں۔ ان میں وہ افسانے شامل ہیں جن کی ضخامت تقریباً ۳۰ صفحات ہو سکتی ہے۔ ۲۰ صفحات کی ہوتی ہے۔ پینفٹوس میں سب سے زیادہ مقبول ہے، کیونکہ نہ یہ مختصر افسانوں کی طرح اس قدر مختصر ہے کہ اس میں کرداروں کے ارتقا کی گنجائش نہ ہو اور نہ طویل ناولوں کی طرح اس قدر طویل ہے کہ پڑھنے والا تھک تھک جائے۔

(۳) رسکاز (Razskaz) یعنی مختصر کہانیاں جنکی صفحات ۳۰ صفحات سے کم ہو۔ اور یہی وہ صنف ہے جس میں روسی ادب کے جواہر پارے سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان تینوں اصناف افسانہ میں سے اگرچہ ہر ایک نے اپنی جگہ پر غلبہ ترقی کی ہے۔ مگر مختصر کہانیوں نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی بدوسی ادب کے مشہور نقاد مسٹر کاسٹ کا قول سے کہ ”مختصر افسانہ ہمیشہ روسی ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل رہا۔ اور تقریباً تمام بالکل روسی ناول نویسوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی۔“

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے خلاف روس میں مختصر افسانوں نے طویل افسانوں کے ساتھ جنم لیا۔ یہ خصوصیت صرف روس ہی کو حاصل ہے کہ یہاں طویل افسانے (ناول) اور مختصر افسانے ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ اور ایک ساتھ نشو و نما پائی۔

الگزینڈر سرگئیوویچ پشکین (Alexander Surgeevich Pushkin) روس کا پہلا افسانہ نگار ہے۔ اگرچہ اپنے ملک میں اس کی شہرت کا اصل باعث اس کی شاعری ہے۔ اور یہ روسی زبان کا بہترین شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ تاہم بحیثیت ایک افسانہ نگار کے اس کا رتبہ کچھ کم نہیں۔ اس کا منظوم ناول ”ایجنی اونی جن“ (Evgeni Onegin) اس کا بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں اس نے شاعری اور افسانے کو ترکیب و یکراک ایسا لطیف پیکر تیار کیا ہے جس کی جہد و تعریف کی جائے کم ہے۔ اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لیکن اس مضمون میں ہمیں اس کی شاعری سے کوئی واسطہ نہیں صرف اس کے افسانوں کا ناموں پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ مذکورہ بالا منظوم ناول کے علاوہ اس نے متعدد قصے نثر

میں لکھے ہیں جو اپنی دلچسپی اور دلکشی کی وجہ سے بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ان افسانوں کا ترجمہ مشرٹی لکین نے کیا ہے اور بوہن لائبریری سے یہ افسانے شائع ہوئے ہیں۔

پشکن کے افسانوں میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو اُس کے ہم عصر فرانسیسی اور جرمن مصنفین میں موجود ہیں۔ سب سے زیادہ اُس پر اپنے ہم عصر آف مین (Hoffmann) کا اثر پڑا ہے۔ اس کے قصوں میں وہی دہشت ناک جہنیت پائی جاتی ہے جو آف مین کا طرہ امتیاز ہے۔ اپنے طویل افسانے ”کپتان کی لڑکی“ میں اُس نے ایک بڑی حد تک انگریز ناول نگار اسکاٹ (Scott) کا متبع کیا ہے۔ افسانہ دیکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ قصہ نگار نے یہ افسانہ Rob Roy یا Ivanhoe سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اپنے ایک اور افسانے ”کفن دوز“ میں وہ آف مین کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ قصہ پشکن کا نہیں بلکہ آف مان کا لکھا ہوا ہے۔ اُس زمانے کے مذاق کے مطابق پشکن نے ایک حد تک ا فوق الفطری عناصر سے بھی اجتناب نہیں کیا۔ لیکن یہ صرف ایک حد تک ہے اور باوجودیکہ فرانس میں اس وقت فن افسانہ ارتقا کے بہت سے منازل طے کر چکا ہے تاہم پھر بھی زولا (Zola) جیسے بالکالوں نے بھی اس کو روا رکھا ہے۔

لیکن بعض لوگ حقیقی معنوں میں افسانہ نگاری کا باقی پشکن کو نہیں بلکہ گوگل (Gogol) کو کہتے ہیں۔ پشکن کا معاصر تھا۔ اس نے اکثر افسانے آف مین کے متبع میں لکھے ہیں۔ اس کے قلم میں ظرافت کی جھلک جا بجا نمودار ہے۔ افسانے اکثر مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر اُن میں ظرافت نہ ہوتی تو شاید ایک خاص طبقے کے سوا مقبول نہ ہوتے۔ بالآخر اس کا شمار روس کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہے۔ مشہور روسی ناولست دوستوئی کا قول ہے ”ہکویہ عبا، گوگل کے ورثے میں ملی ہے۔“

یعنی افسانہ نگاری

پشکن کا دوسرا ہم عصر میکائیل رمنٹوف۔ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ نوح میں افسر تھا اور اُس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ کوہ قاف کے گرد نوح میں گزرا۔ ادیب ہیں اُسکی شاعری نے نشوونما پائی۔ اس پر لارڈ بائرن کے کلام کا بڑا گہرا اثر پڑا اور اتفاق یہ تھا کہ اُس کی اپنی سوانح حیات ایک بڑی حد تک بائرن سے ملتی جلتی تھی اُس کی شاعری کا زندہ جاوید کارنامہ ایک طویل نظم ہے ”آسیب“ جس میں نوح قاف کی ایک خوب روٹ کی کا ایک پراسرار عفریت سے عشق، اور اس پرستیدہ خیال کے عشق کی شاعرانہ وارداتیں اس خوبی سے دکھائی گئی ہیں کہ صرف یہی ایک نظم رمنٹوف کو روس کے بہترین شعراء میں گنوا سنے کے لئے کافی ہے۔

مگر یہاں ہمیں اُس کے افسانوی کارناموں پر نظر ڈالنا ہے جو اس قدر شاندار نہیں جس قدر کہ اس کی شاعری۔ تاہم ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اُس کا ناول ”ہارے زمانے کا ہیرو“ روسی زبان میں پہلا ناول ہے جس میں کردار نگاری کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ ناول قدیم ناولوں اور جدید نصابی ناولوں کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے مختصر افسانے لکھے ہیں جو ایک بہت بڑی حد تک شاعرانہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اس کے افسانوں میں لطافت اور محبت کی دلکش چاشنی کی رنگ آمیزیاں غصب ڈھا جاتی ہیں۔ اُس کو فرانس کے شاعرانہ افسانہ نگار گائتری Gautier کا مقابل ٹھرایا جاسکتا ہے۔

پشکن اور رمنٹوف دونوں فن افسانہ نگاری میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ دونوں ہاف مین کے روحانی شاگرد ہیں۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوا یعنی پشکن اور رمنٹوف دونوں ڈوئل میں مارے گئے۔

اس کے بعد روسی افسانہ نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور وہ زمانہ آتا ہے کہ روسی افسانے بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے لگے۔ اس دور کی سب سے پہلی نمایاں شخصیت

آئینہ طر حنیف کی ہے۔ یہ پہلا روسی مصنف ہے جسے مغرب نے قدر کی نظروں سے دیکھا۔ ایک کھلتے پتے زمیندار کا بیٹا تھا جس نے اس کی تعلیم میں خاص توجہ کی اور اُسے مزید تعلیم کے لئے جرمنی بھجوا دیا جہاں اس ہونہار نوجوان کی ادبی زندگی کی دارعیل پڑی۔ اپنی زندگی کا بہت بڑا زمانہ اس نے پیرس میں بسر کیا۔ اور یہاں خرائس کے نامی گرامی آداب، فلاہیر

(Flaubert) ۱، آلفونس (Alphonse Daudet) اور ایلی زولا (Emile Zola) کی صحبت میں اُس نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ اپنی زندگی ہی میں اُسے بہت کافی شہرت حاصل ہو گئی سیاسی نقطہ نظر سے وہ اشتراکیت اور جمہوریت کا حامی تھا۔ اس لئے ملک سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اُس نے کئی ناول اپنے ملک کی سیاست میں اشتراکی روح پھونکنے کے لئے لکھے۔ جن میں ”بنجر زمین“ (Virgin Soil) اور ”باپ اور بیٹے“ (Fathers and Sons) بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں روس میں وہ مواد پک رہا تھا جو بعد میں اشتراکی تحریک بن کر زار کی سلطنت کو زیر و زبر کر گیا۔

طر حنیف نے ہر قسم اور ہر طبقے کے افراد کی مصوری کی ہے اور خوب کی ہے۔ پہلا روسی افسانہ نگار ہے جس نے روسی ادب کا پایہ اس قدر بلند کر دیا کہ وہ دنیا کے بہترین شاہکاروں کے مقابلے میں اپنی پیداوار پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اُس کے ناولوں میں ”دھواں“۔

”روڈن“ اور ”باپ اور بیٹے“ بہت مشہور ہیں۔ لیکن اُس کے ناولوں سے زیادہ اُسکی مختصر کہانیاں پسند کی جاتی ہیں۔ اُس کے افسانوں میں لطافت اور باطنیں پایا جاتا ہے۔ دل کے لطیف جذبات کی ترجمانی، اور محبت کی نازک کیفیات کی نقاشی اُس سے بہتر غالباً کسی روسی مصنف نے نہیں کی۔ اُس کے مختصر افسانے دل کی لطیف کیفیتوں، روح کی گہرائی میں چلنے والی موجوں کو صفحہ قرطاس پر پیش کرتے ہیں۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس کی سیاسی آویزشوں کا اثر اُس کے مختصر افسانوں پر بہت کم پڑا۔ اُس کے افسانوں میں ”دور بہار“، ”آسیا“، ”ہنہی“ ایک کبلاڑی کے تجربے، وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کے جملہ ناولوں اور مختصر افسانوں

کے انگریزی ترجمے کا مجموعہ بین میں کمپنی نے شائع کیا ہے۔

طریف کا ہم عصر فیڈور دوستوفسکی (Fedor Doestovsky) دنیا کے مشہور ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے باعث اسے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ سائبیریا میں ایک قیدی کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ وہاں سے واپس آکر اس نے سلاوا سے وہ غیر فانی ناول لکھنا شروع کئے جنہوں نے اسے دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اس کے ناولوں میں ”گناہ و سزا“، ”ذلت و اذیت“، ”احق“ وغیرہ دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انسانی نگاری اور دوستوفسکی کو بالازم و ملزوم ہیں۔ اُس نے بہت سے مختصر فسانے بھی لکھے ہیں۔ اُس کا اسلوب بیان طویل لیکن دلچسپ ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کا بے حد عمق سے مطالعہ اس نے کیا ہے، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ انتہائی بد نصیبی میں بسر کیا ہے۔ برسوں قید میں رہا۔ گناہگاروں، چوروں، بیکسوں، بد معاشوں، غریبوں، امیروں، غرض کہ ہر قسم کے آدمیوں کی فطرت کا مشاہدہ کرنے کا اُسے موقع ملا۔ اور چونکہ وہ خود زخم خوردہ تھا، اس لئے ان باتوں نے اس کے دل پر ایک گہرا اور نمایاں نقش کیا۔ اُس کے افسانے گویا اُس کے دل کی بھڑاس ہیں۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کا پوشیدہ سے پوشیدہ راز بھی وہ اس خوبی سے عیاں کر جاتا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جس طرح ڈراما میں شکسپیر کے کمال کے آگے دنیا کے تمام ڈراما نگار بیچ نظر آتے ہیں، اسی طرح افسانوں میں دوستوفسکی کے مقابلے میں بہت کم افسانہ نگار نکال پائے جاتے ہیں۔ اُس کے ہم عصر اور روس کے زندہ جاوید ادیب طاسلٹائی نے اس کے مرنے پر یہ الفاظ لکھے ”میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا، اور نہ کبھی مجھ سے اور اس سے تعلقات رہے لیکن اس کی خبر مرگ سنکر میں نے محسوس کیا کہ میرا قریب ترین، اور عزیز ترین شخص مر گیا جو کام وہ کرتا میرے خیال میں نوع انسانی کی پہلانی کے لئے کرتا۔ وہ مر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے ایک جوہر کھو دیا“

پرمی دوسٹونکی کے افسانوی کارناموں کا اگر کوئی بدمقابل ٹھہر سکتا ہے تو وہ اس کا ہم عصر اور روس کا مشہور ترین شخص کوٹ لیوٹالطائی (Count Leo Tolstoy) طالطائی اخلاقیات مذہب، سیاست، اور فلسفے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن افسانہ نگاری میں بھی اس کا مرتبہ کچھ کم نہ تھا۔ بلکہ ملکہ رومانیہ کا قول تھا کہ اس عظیم مہی کے نام کا زناموں سے زیادہ مجھے اسکی مختصر کہانیاں پسند ہیں۔ طالطائی اپنی صدی کا سب سے بڑا آدمی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی ہر تحریر اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس کے افسانوں میں بھی یہی خصوصیت تین طور پر نظر آتی ہے، اس کے ناولوں میں سے انیا کرنینا (Anna Kernina) اور ”ری زکشن“ (Resurrection) دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنگ اور صلح (War and Peace) کا مشہور تاریخی ناول ہے جس میں نپولین کے زمانے کی لڑائیوں کی داستان ہے۔

مختصر افسانوں میں اس کا ایک ناول (Novellette) کروٹزر سوٹا (Kreutzer Sinata) غیر فانی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے مذہبی، تمدنی، اخلاقی اور دیہاتی افسانے ایک کثیر تعداد میں لکھے

ہر مذاق کے لوگوں کو اپنے مذاق کے افسانے طالطائی کے یہاں مل سکتے ہیں۔ اس کے مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ مسٹر اور مسر ایلمر ماڈسنے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور ورلڈس کلاسک میں شائع ہوا ہے۔

طالطائی اور دوسٹونکی کے بعد روس میں افسانہ نویسی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ دوسرے دور میں طویل ناولوں کی طرف خصوصیت سے توجہ کی گئی۔ اور روسی طویل ناول، فرانسیسی ناولوں کے بدمقابل سمجھے جانے لگے لیکن اس تیسرے دور میں مختصر کہانیوں کو اہمیت دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بلجیم میں مارس ماٹرلنگ (Maurice Maeterlink) فرانس میں موبسان

(Maupassant) اور آسٹریا میں آرٹھر سنیت زلر (Arthur Schnitzler) جیسے مختصر افسانہ نگار پیدا ہو رہے تھے اور مختصر افسانے مقبولیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے

روس میں بھی یہی کیفیت تھی۔

تیسرے دور کا سالار کارواں انطون چیخوف (Anton Chekhov) ہے جس کی مختصر کہانیاں اُسے دنیا کے مختصر افسانہ نگاروں کی صفِ اولین میں جگہ دلاتی ہیں۔ اس کی شاہراہ جلدِ تقدیر سے علحدہ تھی۔ اس کا کام صرف فطرتِ انسانی کی عکاسی کرنا ہے۔ اس نے کبھی شیری اسلوب کی پروا نہیں کی بلکہ ایک تقاد کے الفاظ میں ”اُسکے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں فطرتِ انسانی کا صحیح عکس دیکھ لیتا اور پھر یہی عکس دنیا کو دکھاتا“

چیخوف کے مشہور پرستار اور تقادِ مسٹر ولیم گربارڈی جنہوں نے چیخوف کے کمال کے اعتراف میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”جب ہم چیخوف کو پڑھتے ہیں تو بے انتہا پکاراٹھتے ہیں۔ اودہ۔ یہ تو بالکل ہماری تصویر ہے۔ یہ تو بالکل ہم ہیں۔ یہی چیخوف کا کمال ہے۔ یہی وہ کمال ہے جو طویل افسانوں میں دوسٹوفسکی کا طرہ امتیاز رہا۔ دوسٹوفسکی میں اور چیخوف میں فرق یہ ہے چیخوف میں دوسٹوفسکی کا ساطول نہیں۔ دوسٹوفسکی فطرتِ انسانی کے تاثرِ نشیب و فراز، انسانی دل کی تمام کیفیتیں ایک ہی پلاٹ میں بیان کر جاتا ہے۔ اور چیخوف ایک پلاٹ میں زندگی کی صرف ایک فاش پیش کرتا ہے۔ ہر دلی کیفیت کو دوسرے پلاٹ میں بیان کرتا ہے۔ بالکل نظر میں یہ بہت بڑا نقص ہے۔ لیکن یہ چیخوف کی خطا نہیں۔ مختصر افسانوں میں کردار کے نشوونما پانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے اول کو مختصر افسانے پر فضیلت دیا جاسکتی ہے۔ چیخوف نے صرف مختصر افسانے ہی لکھے۔ اور مختصر افسانے کو من حیثِ الفن ترقی دینی شروع شروع چیخوف نے چند مزاحیہ افسانے لکھے۔ مگر جوں جوں سن بڑھتا گیا، دنیا کا تجربہ بڑھتا گیا۔ ہنسی کھیل کی جگہ غور و خوض نے لے لی اور پھر اس نے نہایت متانت سے دنیا کا معائنہ کیا چیخوف کے افسانوں کے ایک مترجم مسٹر کامٹ نے اپنے دیلچے میں لکھا ہے۔ ”اس کے مضامین وہی ہیں جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا تھا۔ اُس کے کردار، بہادارانہ کا زامبل کے منظر نہیں ہوتے بلکہ اُن آدمیوں کا نمونہ ہوتے ہیں جن کو وہ روزانہ دیکھتا۔ کسان اور



متوسط طبقے کے لوگ۔ وہ بڑے بڑے کارناموں کے مالک نہیں، ان کے پیش نظر بڑے بڑے نصب العین نہیں۔ بلکہ اکثر وہ اپنی بذصیدیوں میں اضافہ کرتے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کامیاب ہوتے ہیں اور بعض ناکامیاب۔“

قصہ مختصر یہ کہ چیخوف نے مختصر افسانے کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اُس کے مہمصر میں گارشین (Garshin) خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے طر حریف کے تتبع میں اکثر افسانے لکھے اور ایک بڑی حد تک وہ لطافت اور وہ دلکش اسلوب بیان پیدا کر چکیا۔ اس کا ایک افسانہ ”سرخ بھول“ بہت مشہور ہے۔ موباساں کی طرح گارشین بھی مافی باریوں میں مبتلا رہا۔ چنانچہ اس کے اکثر شاہکار موباساں کی طرح نیم جنون کی حالت میں لکھے گئے ہیں۔ بالآخر خود کوئی کر کے مرا۔

چیخوف کا دوسرا ہم عصر ہے مختصر افسانہ نگاری میں کافی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ سالوگب (Salogub) ہے۔ اس کے افسانے ایک بڑی حد تک چیخوف سے ملتے جلتے ہیں بعض نفسیاتی افسانے اس نے بہت بہتر لکھے ہیں۔

چیخوف کا تیسرا ہم عصر لیونڈ انڈریف (Leonid Andreyev) ہے جس

نے میکیم گورکی اور چیخوف کے برابر شہرت پائی ایک بہت بڑی حد تک وہ ماطر لنگ (Macterlinck) اور ایڈگر ایلن پوڈ (Edgar Allen Poe) کے اسلوب بیان کا تتبع کرتا ہے۔ اس کے افسانوں میں اسرار کے ساتھ غم اور فلسفیت لی بھی ملتی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ خود انقلاب کا بہت بڑا حامی تھا۔ لیکن انقلاب کا نتیجہ دیکھنے سے قبل ۱۹۱۵ء میں مر گیا۔

روسی افسانہ نگاری کا چوتھا یعنی موجودہ دور میکیم گورکی سے شروع ہوتا ہے۔ میکیم گورکی کو اگر یہ کہ چیخوف کا مہمصر بھی کہا جاسکتا ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کا کمال اُس وقت ظاہر ہوا جبکہ چیخوف کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے چیخوف سے کم شہرت نہیں مل کی۔ اُس کا طرز بیان انوکھا، دلچسپ اور شیریں ہے۔ اس کے بچپن کا زمانہ نہایت تلخ دستی

میں بسر ہوا۔ برسوں وہ قلی اور جہاز میں کوندہ ڈالنے والا رہا، چنانچہ جب اُس نے افسانہ نگاری شروع کی تو اپنی سوسائٹی کا حال لکھا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی جس کا خاکہ پہلی بار دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور حد سے زیادہ پسند کیا گیا۔ میکسم گورکی نے اس رنگ کو بہت ترقی دی۔ انقلاب میں اس نے اشتراکیوں کا ساتھ دیا۔ اشتراکی دور حکومت کے افسانہ نگاروں کا سرخیل بھی وہی ہو۔ اب بھی بقید حیات ہو۔

میکسم گورکی کے ہم عصروں میں الکزنڈر کرین سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ ابتدا میں اس نے فوجی زندگی کے متعلق چند افسانے لکھے۔ رفتہ رفتہ اس کے افسانوں میں فلسفیانہ شان پیدا ہوتی گئی۔ جس کو اس کے دلکش طرزِ ادا نے اور زیادہ پُرطف بنادیا۔

موجودہ دور یعنی اشتراکی دور افسانہ نگاری میں افسانہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ اسی سال انگریزی میں اشتراکی دور حکومت کے افسانوں کا ایک انتخاب (Short Stories of the Soviet Russia) کے نام سے شائع ہوا جو روس میں فنِ افسانہ کی دنِ دوئی رات چو گئی ترقی کی تازہ ترین مثال ہے۔

جب دنیا کی تاریخ افسانہ پر نظر ڈالی جائے تو روسی ادیبوں کے شاہکار نہایت واضح اور نمایاں جگہ پر نظر آتے ہیں۔ لیکن کی قدیم رومانی کہانیاں پھر طریف کے لطیف اور شیریں قصے پھر دوطوفسکی اور طاسطانی کے نفسیاتی قصے۔ پھر جیوف کے حقیقت آمیز افسانے۔ پھر میکسم گورکی اور الکزنڈر کرین کے افسانے جن میں فلسفیت کی شان پائی جاتی ہے، روسی افسانہ نگاری کی ارتقا کا نہایت پر شکوہ منظر پیش کرتے ہیں۔

# ایک بد نصیب انسان

ابن راوندی اور اسکی محبوبہ

عالم شرقی میں، اہل علم، ادیب، مصنف اور شاعروں کی زندگیوں اکثر انکامی، تنگدستی اور زمانے کی ناسازگاری میں گزری ہیں۔ یہ مصیبت آج کی نہیں، بلکہ عرصے سے چلی آ رہی ہے، اور شاید اسی میں کوئی قدرت کی حکمت بالعمدہ پنہاں ہے کہ ہر مند خدا بخت کے ہاتھوں پر بادور ہے اور بے ہنروں نے ہر نعمت دنیا کو حاصل کیا، فرسے اڑائے اور اپنی حیات متعارف رنگیلوں، عیش پرستیوں، کامرائیوں، شائمانیوں میں گزار گئے۔ یہی نہیں کہ صرف مغلسی کی تکلیف ان کی شریک حیات رہی بلکہ اور بھی بہت سی آفتیں مختلف بلائیں ان پر ٹوٹیں۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر بہت کم انشا پردازوں اور رباب قلم نے قلم اٹھایا ہے، لیکن مقرر حاضر کے ایک مشہور ادیب محمود کامل ادیب نے اس موضوع خاص پر ایک ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب لکھ ڈالی ہے جس میں ان بد نصیب انسانوں کے حالات درج کئے ہیں جو صاحب قلم، صاحب علم تھے، صاحب فن تھے، مگر اس بہارتان کائنات میں ہمیشہ خزاں زدہ رہے اور اُنکے چمن حیات میں ثروت و کامرائی کی کمی بہار نہ آئی یا آئی تو بہت جلد ہمیشہ کے لئے پامال خزاں ہو گئی۔ اس کتاب کا نام ”ابوہامی فی عصور الاسلام“ ہے یعنی اسلامی دور حکومت کے بد نصیب لوگ۔ کتاب کے شروع میں انہوں نے نبوس دہنجی پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اس کی قسمیں بتاتی ہیں اور یہ کہ حقیقی دہنجی کیا چیز ہے اور اسکی بنیاد اصل کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اس میں زیادہ

گرتا نظر آتا ہے، قدرت کا ملکہ نے زیادہ کسے اس کا اہل سمجھا ہے، اسلام کے مختلف دوروں میں کون کون سے نامور لوگ ایسے گزرے ہیں جن کا دامن بدبختی نے نہیں چھوڑا یہ کتاب اگر اسلام کے بڑھاپے پر ہے لیکن تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اور قومیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ یہ بحث مصنف نے نہایت قابلیت سے کی ہے لیکن انوس ہے کہ ان علماء دنیا اور فلاسفہ اسلام کے حالات بہت مختصر لکھے ہیں اور تفصیل سے کام لیا جاتا تو قیسنایہ کتاب بہت طول کھینچتی، بہر حال اپنے موضوع پر مشرقی زبانوں میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔ اس میں ابن راوندی کا حال بھی لکھا ہے جو میرے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوا اور بے اختیار جی چاہا کہ اپنی زبان میں اسے منتقل کر لوں چنانچہ بلا کم و کاست اسے ”جامعہ“ میں لے رہا ہوں اگر یہ پسند ہوا تو اسکی دو ایک تھیں اور دوں گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ناظرین کی طلب صادق اور لکھکریوں ہی تہذیب پوری کتاب اردو میں آجائے۔ یہ موضوع عام لوگوں کے لئے شاید زیادہ دل پند ہو اور یہ بالکل سچ ہے کہ خوشگوار نہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ ہمارے انشا پرداز و مصنف جو اس بلائے عام میں گرفتار ہیں انہیں پڑھ کر تسکین ہوگی کہ وہ ہی ناقد روانی زمانہ کے شکار نہیں بلکہ یہ قدرت الہی کی منت جاریہ ہے اور شکر ہے کہ کم از کم اس باب میں تو ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر ہیں مجھے امید ہے کہ اردو کے نمایاں ادب ضرور اسے شوق سے پڑھیں گے۔

ابن راوندی، عرب کا ایک زبردست مسلمان عالم گزرا ہے، وہ اجتہاد کا درجہ اور علم و فضل میں بلند پایہ رکھتا تھا، اس امام اہل اور عالم باعمل کا پورا نام حسن بن محمد بن علی راوندی ہے۔ ۱۹۷ھ میں اسلام کی مشہور اجدہ حافی بنیاد میں پیدا ہوا۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ سات سال کی عمر میں اس نے پورا قرآن خریف حفظ کیا، اور اپنی زندگی کی بارہویں منزل میں پہنچ کر اُس نے علم جوید (قرأت) لیکھ کر ساتوں قرأتوں میں کمال پیدا کر لیا وہ نہایت ہی خوش آواز اور اعلیٰ نغمہ

نواز تھا۔ انکی جاں نواز آواز کسی معصوم فرشتے کی دگدگ آواز معلوم ہوتی تھی، وہ دلوں کو مدہوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے اسے حسن صورت اور حسن سیرت بھی عطا کیا تھا، اسکا چہرہ بسیج تھا اور اعضا متناسب، ماتوہی پر ہیز نگار اور متقی بھی۔ اس نے زہد و دیرینہ میں نشوونما پائی تھی، نہایت عبادت گزار تھا۔ رات رات بھر عبادت میں گزارتا اور بہت کم سوتا تھا، صرف بھپکی سے لیتا تھا۔ اس کا شہرہ تمام اسلامی ممالک میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے عراق کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، اسے ہر جگہ لوگوں کی طرف سے، ہر دلعزیزی اور اعزاز و اکرام کا سابقہ پڑا۔ اس نے اور بھی اُسے علم پر بہت توجہ دیا۔ امرا نے اس کی نہایت عزت کی اور بادشاہوں اور ملوک نے اس کو اپنے دربار میں بگڑ دی اور اس کے گرد بیٹھ گئے۔ اور جب اپنی عمر کے میسویں سال میں اس نے قدم رکھا تو وہ خدا کے فضل و کرم سے علم میں کمال اور سنہ انگیز حسن و جمال کے تمام اوصاف کا سرمایہ دار بنا دیا گیا تھا۔ جس جلال کا یہ عالم تھا کہ عورتیں اس پر فریفتہ ہوتی تھیں، زینت و آرائش سے بے نیاز حسن و الیان اور حسین نازنین اس پر مرتضیٰ تھیں اور ہر دولت مند غنیہ و خواتین جن کا حسن و مسلم اور فائق تھا ان کی یہ آرزو تھی کہ کاش وہ اس کی مال ہوتی اور اس کی حسن آفریں طلعت اور نادرہ روزگار صورت سے ہر وقت کامیاب رہ سکتی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ابن الراوندی سوا بادشاہوں کے نہ کسی کے ہم نشین میں رہتا تھا اور نہ امرا کے سوا کہیں اور رات کی صحبتیں گرم ہوتیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ اسے امیر بہا الدین بن شاد نے مدعو کیا۔ اس زمانے میں بنو شاد اس جزیرے کے سادات میں تھا، انکے بہت سے زمین کے کٹھنات تھے، شاد اب چمن زار اور باغیچے اور بلند و شاندار محلات تھے جن کی وجہ سے بجا طور پر وہ اور بادشاہوں اور دوسرے امرا کیساتھ منافرت کا اظہار کر سکتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن شاد کا لشکر مسلم کے زمانے میں بیس ہزار سے کم نہ تھا اور رب کے زمانے میں اس کی تعداد خدا ہی جانے خدا نے راوندی کو جو حسن سیرت و حسن صورت عطا کیا تھا اس کا دور دور تک چرچا تھا۔ اسکا آواز

بہاؤ الدین کے کانوں تک بھی پہنچا، امیر نے اسے دیکھنے اور اس کی خوش آوازی سننے کا ارادہ کیا کہ ایک شاندار دعوت کسے جس میں تمام امراء اور پاس پڑوس کے شہروں کے امراء و شرفاء کو بھی بلائے اور کمال ایک پہنچے تک اپنے ایک خوبصورت شہر میں رنگ رلیاں منائے اس نے اپنے کو تو ال شہر کو خط دیکر ابن راوندی کے پاس بھیجا جس میں اسے دالیمہ شریف لاسنے کی دعوت دی۔ اس کے لئے خاص عماری اور تمام ان ضروری اسباب راحت کا سامان بہیا کیا۔ جس وقت امیر کا پیام پہنچا تو راوندی فوراً روانگی کو تیار ہو گیا اور دل ہی دل میں وہ نہایت شاد و مسرور تھا۔ جب وہ دالیمہ پہنچا تو لوگوں نے نہایت خوش مسرت اور دھوم دھام سے خیر مقدم کیا۔ ڈھول تانے بجائے گئے اور خود امیر بن شاد اس کے استقبال کو نکلا۔ اور ابن شاد ابن راوندی کو دیکھتے ہی لٹکیر ہوا، بغیریت پہنچنے کی مبارکباد دی اور اپنی استدعا قبول کرنے پر اسکا شکریہ ادا کیا اور جب وہ سفر کی صعوبت دور کرنے کے لئے تین روز آرام کر چکا تو امیر نے لوگوں کو جمع ہونے کے لئے بلایا۔ راوندی کے بیٹھنے کو ایک خاص اونچی جگہ تجویز کی تاکہ سارا مجمع اسے دیکھ سکے۔

راوندی اپنی ٹکڑی کے پنج وسط میں بیٹھا۔ یہ اسی جیسے چار نوجوان تھے جو اپنے کمال میں ضرب اشل تھے۔ اور یہ چاروں اس کی آواز کو اٹھاتے اور دہراتے تھے، موسیقی کے انہیں جدید اصول کے موافق جو اس استاد کمال (راوندی) نے بتائے تھے۔ اچھی مجلس قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت سے شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کے بعد راوندی نے ایک عشقہ قصیدہ الاپنا شریع کیا۔ حاضرین کی یہ حالت تھی کہ بے تاباں ذائقہ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ امیر ابن شاد تو یہ سحر آفریں موسیقی نکر حیرت زدہ تھا، اس سر ملی، شیریں اور موہنی آواز کے الاپوں نے اسے بے حال کر دیا۔ اس کی ہر تان اور ہر تار چڑھاؤ میں ایک خواب شیریں کی لذت نمایاں تھی۔ ہر سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تانوں کا سلسلہ قلب کی گہرائیوں تک برابر لگا ہوا ہے۔ امیر کی غیب حالت تھی، وہ اپنے ان احباب اور مصاحبوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: اگر میں یہ قسم کھاؤں کہ آج میں نے فرشتوں کی آواز سنی ہے تو یقیناً میں اپنی قسم میں جھوٹا نہیں ہوں گا۔

ابن راوندی برابر گارہا تھا۔ وہ الاپ اور تائیں اڑا اڑا کر بخود مد ہوش بنا رہا تھا۔ بہانہ کہ ساری محفل اپنے ہوش و خرد کھو بیٹھی، آخر یہ جان نواز مجلس نشاط صبح کے وقت ختم ہوئی تمام حاضرین نماز فجر کے لئے اٹھ اٹھ کر روانہ ہوئے اور پھر اپنے اپنے کاموں کو ادھر ادھر چلے گئے۔ تمام لوگوں پر ابن راوندی کی خوش گوئی کا جاوہل چکا تھا اور انہیں محیرت بنا چکا تھا۔ امیر ابن شداد اس کے پاس آیا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر گلے لگایا اور اس سے نہایت درجہ محبت کا اظہار کیا، جوش مسرت سے آپ سے باہر ہو رہا تھا، دیر تک یہی حالت رہی تب تک کہ راوندی کو اس کمرے میں پہنچایا جو خاص اس کے سونے اور آرام کرنے کے لئے مخصوص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ یہ نہایت گراں بہا فرش فروش اور ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اس میں ایک پلنگ تھا اور اس پر ایک ریشمی اعلیٰ درجہ کا امرا کے آرام کرنے کا بستر۔ اور اس کے لئے ایک خاص خادم مقرر کیا۔ پھر اس سے رخصت ہوا تاکہ وہ آرام کرے۔ ابن راوندی نے شب خوابی کا لباس پہن کر پلنگ پر ذرا لیٹ ہی لگائی تھی کہ اپنے کہہ استراحت کے دوروازے پر ایک خفیف آہٹ اور کندھ کی کھٹ کھٹانے کی آواز سنی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک دو شیرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ اس قدر بصورت نظر آتی تھی کہ اس سے زیادہ حسین چشم زمانہ اور انسانی آنکھ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس حینہ نے اشارہ سے سلام کیا اور نہایت شیریں الفاظ میں کہا:-

میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے بالکل نہیں پہچانتے ہوں گے؟ اور میرے یہاں آئیگی ویرے بھی بے خبر ہوں گے۔ میں ایک پردہ نشین شریف خاتون ہوں۔ آپ سے پہلے کسی مرد سے میری جان پہچان نہیں اور نہ یوں کسی کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہو۔

راوندی نے نہایت احترام اور شرم سے اُس پر ایک نگاہ ڈالی مگر آنکھیں جھکا لیں اور ادب آمیز انداز سے کہا: "میرا خیال اگر درست ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ شاہی خاندان کی کوئی رکن ہیں جو شرافت اور سیادت میں ماں ہوا اور مسلمہ طور پر بلند و سرفراز ہے۔" نازنین دیر تک

اس کے چہرے کو ٹٹکی لگائے دیکھتی رہی، اس نگاہ میں محبت اور رحم کی درخواست شامل تھی پھر اس نے شرملا کر کہا، آپ کا خیال بالکل درست ہو، میں امیر ابن شاد کی بہن ہوں اور آپ کے پاس بس بے حاضر ہوئی ہوں کہ اپنے محبت کے جذبات کو کھول کر رکھ دوں اور آپ کو یہ بتاؤں کہ رات میں آپ کا نغمہ ساحرانہ سنا جس نے مجھے بے تابانہ شدید محبت، بے اختیارانہ جذبہ الفت سے انگوڑی کر دیا ہے۔ میں نے آپ کے حسن آواز کو خوب .... جس نے میرے تمام جذبات کو آپ کی طرف جمع کر دیا ہو۔ اور جب مجھے آپ کی شرافت نفس اور حسن اخلاق و نجابت خاندانی کا پورا ثبوت مل گیا تو کوئی مانع محبت نہ رہا اور آپ کی پاک و شریفانہ شکل نے دل میں بے اختیار گھر کر لیا۔ میں آپ کو اپنے دل کا مالک بنا چکی ہوں۔

ابن راوندی کا نپ اٹھا، اس کے جوڑ جوڑ میں یہ سن کر ایک رشتہ تھا وہ ہٹا بٹھا، جہاں کا تھاں رہ گیا۔ ایک گہری فکر میں اس وقت ڈوب گیا اتحاد یہ تک اس پر ایک گہری خاموشی اور فکر کی حالت طاری رہی، پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر نازنین خاتون سے کہا: یہ آلام محبت کی ایک کھٹک ہے اور عشق خانہ خراب کے لئے پناہ جذبات کی ایک لہک ہے .... میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے بہت زیادہ جلد بازی سے کام لیا اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میرے اور آپ کے درمیان بہت سی ہوسناک اور خطر گہرائیاں حاصل ہیں جنہیں طے کرنا میرے لئے امکان سے باہر ہے۔ آپ شریف پڑھنشین، عفت مآب اور شاہی خاندان کی خواتین سے ہیں ایک فرما زوا بادشاہ کی بہن ہیں، کسی صورت اور کسی حالت میں مجھے یہ ممکن نہیں کہ میں انکے سلسلہ جدم میں شامل ہو سکوں۔ خدا کے لئے آپ مجھے اس سعادت سے محروم ہی رہنے دیجئے۔

نازنین رونے لگی اور بولی: ابن راوندی! تم ایک ایسے نوجوان ہو جسے اللہ نے ناپ و نامد اور محاسن سے آراستہ کیا ہے، اُن اوصاف سے جو عورتوں کی آنکھ میں فکے بغیر نہیں جکتے اور میں ایک ایسی دو شیرہ ہوں جو اپنے نفس پر قادر نہیں میں خود اپنی ایضہ محبت کا ہر پیشہ کرنے آئی ہوں، اور آپ سے رحم و کرم کی خواست نگار ہوں میں چاہتی ہوں کہ اس محبت میں



اس کے اقتضا کے موافق آپ بھی شرکت کریں اگر چاہیں گے لئے جان جاوے اور زندگی کا مسئلہ۔  
 ابن راوندی کو دل اور آنکھوں پر اختیار نہ رہا اور بہت پھوٹ پھوٹ کر دبا اور نازنین کی  
 طرف دیکھ کر بولا: سوز خاتون! بیشک تم ایسی حسین نازنین جس آرا خاتون ہو جس کے حسن و جمال میں  
 کچھ شک و شبہ کی مجال نہیں اور میں نے جب سے نہیں دیکھا ہے اپنے اندر محبت کی تاثیر پاتا ہوں  
 اسے رعنائی شباب کی مالک اور اسے حسن بے مثال کی سرمایہ دار خاتون ابقیے تا تم سے مجھے محبت  
 ہو گئی ہے لیکن میں کل اپنی تابناک امیدوں پر آنسو بہاؤں گا اور اس مبارک زندگی کو عذاب میں  
 مبتلا دیکھوں گا۔ ممکن نہیں۔ فاذ خراب محبت تباہ و برباد کئے بغیر رہ سکے۔

نازنین: پیارے راوندی یاد رکھو کہ تم دونوں زبردست اور ہوناک امیدوں کو اپنے  
 کا ندھوں پر سے چلے ہیں۔ اور ہمارے دل سوز و گداز کے مالک ہیں۔

راوندی: بیشک! لیکن نہایت انوس کہ یہ فریضہ جانیں نقصان و ضرر سے دوچار ہوں گی۔  
 نازنین نے کہا جو کچھ ہو۔ اس کے بعد دونوں نے محبت اور وفاداری کا عہد کیا۔

تقریباً کامل ایک مہینے تک خفیہ طور پر راوندی اور حسینہ دونوں ملتے رہے۔ اس دوران  
 میں دونوں میں کسی کے لئے بھی ممکن نہ تھا کہ ایک دوسرے سے جدا ہو سکیں۔ محبت برابر بڑھتی جا رہی  
 تھی۔ وہ شاہی محفلوں میں محبت کے نغمے گا تا رہتا تھا اور یہ عالم تھا کہ جو بھی سنتا تھا بے اختیار  
 مجروح قلب ہو کر مریخ اٹھتا تھا۔

یہاں ہی آخر ختم ہوئی اور امیر ابن حشا نے ان جلسوں کے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ یہاں  
 اس محبت کی تنہا ملاقاتوں کو نہ دیکھ سکا۔ ابن راوندی اور اس کی محبوبہ شہادت کی بدقسمتی رنگ لائی  
 یہ واقعہ پیش آیا کہ آخری رات سے ایک رات پہلے امیر ابن حشا نے اپنی دعوت پر تمام حضرات  
 کی تکلیف فرمائی کہ شکر۔ ادا کیا اور کہا کہ کل کی رات ان تمام جلسوں کی آخری رات ہوگی۔ آپ لوگوں  
 کی مسلسل تکلیف فرمائی کا یہاں بہت بہت شکر گزار ہوں۔

رات ختم ہوئی اور جلسہ پرمختہ ہوا اور صبح کے وقت تقریباً ٹھیک اپنی عادت کے موافق

نازنین حیات، راوندی کے خوابگاہ عشرت میں آگئی اور دونوں ساتھ میٹھ کر عشق و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ سن کر اس پر کیف انگلیوں میں بدبو شاد و کائنات کی ہر چیز سے لیے غمر تھے۔ انہیں جو ادب پڑھیں وہ کیلکول کر رہے تھے۔ اس پر اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اس نے انہیں چار ہونے ہی کہا: ”سلام علی العتانی فی کل مکان“ ہر جگہ اور ہر مکان میں عشق کو سلام ہو اور سلام ہو تم دونوں کو کہ بیشک تم دونوں ایسے عاشق و مشوق ہو کہ زمانے نے جن میں قسرتہ ڈالا اور جدائی کا حکم سنا دیا۔

دونوں محبت کے ستارے جب تک کر رہ گئے، ان پر شدید خوف چھا گیا، وہ دونوں کھڑے کانپ رہے تھے، ان پر حیا متولی تھی اور اس حیا نے حسن و جمال کی تابش کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

امیر ناز گیا کہ راوندی عشرت براندام ہے اور اس کے عزم و استقلال کمزور ہو گئے ہیں وہ کھڑا رہا، چہرے کا رنگ نفی تھا، منہ کے جوش سے چہرہ تمار با تھا اور خود وہ کانپ رہا تھا۔ اس کے ہنسنے پر حزن اور یاس کا جوش بھان غالب تھا۔

نازنین کو شدت ندامت حیا نے کھینچا دیا۔ اس پر حیا چھا گئی تھی، اس کے دونوں پیروں کے تلے زمین بھل گئی اور وہ زمین پر لڑکھڑکے گر گئی۔

سردار اسے اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا، اور اپنے غصے کو اس نے چھپایا اس کے بعد وہ راوندی کے پاس بیٹ کر آیا اور کہنے لگا: تم رنجیدہ نہ ہو اور نہ کچھ اندیشہ کرو۔ یقین کر دو کہ میں نے حیات کو تمہیں کو بخشا۔

اور اسی قسم کی دلدہی اور تشنہ کی باتیں کرتا رہا، یہ بات کہ راوندی کا دل خوش ہوا شک و شبہ دل سے بھل گیا۔ پھر یہ دونوں دوشیزہ حیات کے کمرے میں گئے، اور جب تک اسے ہوش نہ آیا وہ وہیں رہا۔ پھر امیر نے اسے بھی یہ کہہ کر تسلی بخشی دی کہ تمہیں ابن راوندی کو دے چکا اور تم بالکل ٹھیک رہو۔

یہ بانغراغزوہ نکر دو دنوں دلاؤد محبت نہایت ہی خوش ہوئے اور اس مسرت کو اور زیادہ کرنے کے لئے امیر ابن خشاو نے کہا: اور بب میں تم دونوں کو ملنے اور مفارقت نہ کرنے کا حکم دے چکا ہوں۔ اب ہمیں چاہئے کہ سب یکجا بیٹھ کر انوالی صبح عہدیکہ خیر مقدم کریں آؤ سامان نشاط ہم پہنچا کر شراب سہاری کا جام پیئیں۔

اسی وقت شراب لائی گئی امیر شاد نے راوندی کے لئے پیانا بھرا بہن نے بھائی کا اور بھائی نے بہن کا ساغر لہر لڑ کیا۔ اور ابن راوندی نے اپنا گلدستہ۔ ابن خشاو نے نہایت حیرت انگیز چرنی سے ان دونوں کے پیالوں میں زہر قاتل ملا دیا۔

تینوں میں شراب صافی کا دو درجہ ملا، اور اس کے پیتے ہی نازنین حسنت نے نہایت سخت دوران سر محسوس کیا اور وہ فوراً اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ابن راوندی کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کی آنکھیں چاک چاک ہونی جاتی ہیں، امیر نے اُسے بھی ایک خاص کمرے میں پہنچا دیا اور تنہا چھوڑ کر چلا آیا اس وقت راوندی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد دنیا سے چل بسے گا۔ ابن راوندی یہ بھی سمجھ گیا کہ امیر نے کیا سلوک کیا ہے۔ وہ اسی رات موقع پا کر بھاگا اور اپنی اس بیاری توکان کی کلیف میں تمام رات برابر پیدل چلتا رہا جس کی وجہ سے اسکے لئے جیگل یا پان کا ہونا تک سفر طے کرنا سخت دشوار تھا۔ وہ بیچارہ تین تین تک ایک شخص کی ہمانی میں رہا۔ اس دوران میں وہ صرف بڑی چڑھا رہ گیا تھا، اس کی حالت نہایت دردناک اور افسوس کن تھی۔

اسکے بعد بیماریاں برابر اسکی جان کو لاگو رہیں اور آلام و اندوہ پیش آتے رہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسکی شکل و صورت بالکل بدل گئی۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ اُسے جو دیکھتا پہچانتا بھی نہ تھا کہ یہ آؤدی ہے۔ اسکا ذیل ڈول بالکل بدل گیا، چہرہ سخی ہو گیا اور تمام جسمانی حسن و جمال ضائع ہو گیا اور اسکی آؤد کی نیری و مومقی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ اسکی شکل و صورت بدل کر زوناک اور بیسیا تک سی ہو گئی اور یہ سب اس زہر ہلاہل کی تاثیر تھی جو اُسے ملا دیا گیا تھا۔

اسکی آؤد زہری اور سخت ناگوار ہو گئی تھی جو اس کے زخروں سے بڑی شکل سے نکلتی تھی

اس وقت اس کی عمر تیرہ سال کی ہو چکی تھی۔ اب وہ نہایت کس پر سی کی حالت میں بغداد واپس چلا آیا اور یقین کے ساتھ یہ جان چکا تھا کہ اسکی آواز کا کمال ہمیشہ کیلئے جا چکا ہے اور اب اسکی زندگی نہ ہونیکے برابر ہے۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ حصول علم پر جھک پڑا اور اپنی رات دن کی محنت کی بدولت زبردست عالم ہو گیا۔ ملک کے نامور علماء میں اسکا شمار ہونے لگا لیکن وہ نہایت کم اسکا گھر بار نہ تھا اس نے اپنے اپنی ہی ایک قوم کی اور اپنی ہی جیسی نہایت غریب و مفلس عورت سے نکاح کر لیا۔ خدا کی شان کہ اس نے باوجود ابن راوندی کی مغفلی اور عظیم حالت کے اسے کثرت سے اولاد دی لیکن اسکی خوش نصیبی کا دو خرم ہو چکا تھا۔ ایک بار کا واقعہ یہ کہ وہ تھوڑا سا نا بازار سے خرید کر لارہا تھا۔ اس نے یہ آٹا اپنے دامن کے ایک کونے میں رکھ کر ایک تانکے سے باندھ کر اپنے کان سے پر رکھ لیا تھا، وہ اپنے گھر چلا جا رہا تھا کہ اسے اپنی اس بری حالت کا خیال آیا جس میں وہ آجکل مبتلا تھا اور جس تنگدستی کے عذاب میں گرفتار تھا، اور مصائب و آفات کے اس ہجوم کا جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، اس نے اپنا منہ آسان کی طرف اٹھا کر کہا: ”خدا یا میری خصل آسان کر“ محویت کے ساتھ بار بار یہ دعا کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک پتھر کی ٹھوک لگی اس کے پاؤں پر کھڑکے اپنے جسم کو نہ سنبھال سکا اور گر پڑا۔ اس کی شدت سے وہ تانکا ٹوٹ گیا جس سے آٹا پلو میں بندھا ہوا تھا، زمین پر سارا آٹا پھیل گیا اور مٹی میں بدل گیا۔ یہ دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بچھٹیا منہ سے نکل گئی اور یہ الفاظ زبان پر آ گئے: ”خدا کا شکر ہے کہ میری خصل آسان ہو گئی“ اور اب بال بچے بھی بھوکوں میں گئے، اس واقعہ کا اس کے دل پر اتنا بڑا اثر ہوا کہ اس کی عقل حواس بجا نہ رہے، دماغ مختل ہو گیا، اور راوندی پاگل ماور پھر چند ہی ہفتوں کے بعد اس نے ہمیشہ کے لئے دنیا کے ان بے درد مصائب سے نجات پائی۔ راوندی کی وفات ۳۵۰ھ میں ۹۵ سال کی عمر میں ہوئی۔

دنیا میں اور نہ جانے کتنے ایسے بے نصیب انسان فی افراد ہوں گے، آہ !!!

(ترجمہ عربی)

## مزدور و سرمایہ دار

از مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنؤی - پھر ارغمانیہ کالج اورنگ آباد دکن،  
 دنیا کی راحت کچھ بھی نہیں، دنیا کی مسرت کچھ بھی نہیں  
 سرمایہ دار دبا سکتے ہو، یہ دھن یہ دولت کچھ بھی نہیں  
 یہ دنیا آنی جانی ہے، ہر چیز یہاں کی فانی ہے  
 کیوں ظلم کسی پر کرتے ہو کیا جی میں آخر ٹھانی ہے  
 گر خون غریبوں کا چوسا، مزدوروں کا دل کھپایا  
 ایمان سے کہنا کیا تم نے اس بے دردی کا پھل پایا  
 کچھ مہر دی انسانوں کی، کچھ خوش حیت تم میں نہیں  
 غیروں کی مروت کیا ہوگی، اپنوں کی محبت تم میں نہیں  
 اپنے ہی بیانی بندوں پر ظلم کا ہاتھ بڑھاتے ہو  
 مزدور کھاتے ہیں جو کچھ، تم چھین کے سب کھا جاتے ہو  
 لے لیتے ہو حاصل اس کا، مزدور جو محنت کرتا ہے  
 کچھ یہ بھی خبر ہے پٹ اپنا وہ بیکس کیونکر بھرتا ہے  
 جھموں پر اٹکے کپڑے نہیں، سردی سے بچا کرتے ہیں  
 سڑکوں کے کنارے اندھیرے راتوں کو جا پڑتے ہیں  
 بستر ہے، نہ تن پر کپڑے ہیں، ہلکے نہ کہیں گھر بار ان کا  
 ہے سب یہ تمہاری ہی باعث یہ غربت یہ ادا باران کا  
 غرق اس کے دل کا سینا ہو حق تم نے جو اکھا چینا ہے

بیکاریہ ان کا جینا ہے جب خون جگریوں پینا ہے  
 تم اپنی ثروت کی خاطر بچے میں ان کو مسکرتے ہو  
 وہ روتے ہیں تم ہنستے ہو، وہ کڑھتے ہیں تم اکڑتے ہو  
 اے بے دردو! تم کیا جانو جو ان کے دل پر گزرتی ہے  
 ہر فریاد دل دوزخ ان کی شوق سینہ اپنا کرتی ہے  
 جیب بچے ان کے بلکتے ہیں کس حیرت سے وہ نکلتے ہیں  
 چہرے سے رنج نکلتا ہے، آنکھوں سے اشک نکلتے ہیں  
 آتا نہیں تم کو رحم ذرا، دل ان کا غم سے روتا ہے  
 چہرے پر جھک، ہونٹوں پر تہائے کیا تسم ہوتا ہے  
 اللہ کے تم بھی بندے ہو، اللہ کے وہ بھی بندے ہیں  
 لیکن یہ تہائے دستہوس گردن میں ان کی پھندے ہیں  
 تم ان کو غفلت رکھتے ہو اور اپنا خزانہ بھرتے ہو  
 پھر اس پر سوا حسان اپنے گردن پر ان کی دھرتے ہو  
 ہیں ہاتھ بھی خالی صیہیں بھی اور دامن بھی ان کے خالی  
 سمور تہائے خزانے ہیں۔ اللہ ری تمہاری خوش حالی  
 ان چپاروں کی پامالی ہاتھوں سے تہائے ہونی ہو  
 سرمایہ داری کی یہ ہوس کشتی کو ان کے ڈبو تی ہے  
 پر یہ بھی سوچا ہے تم نے، کیوں حاصل اطمینان نہیں  
 اس ثروت اور اس دولت پر بھی یعنی بجا اوسان نہیں  
 فطرت نے ضمیر دیا ہے جو ہر دم وہ ملامت کرتا ہے  
 اکثر یہ تمہارا دل تم پر تنہائی میں لعنت کرتا ہے

لے کاش سَنو گوشِ دل سے فردور کے دِلگی فریادیں  
 اور دیکھو چشمِ باطن سے پڑتی ہیں جو اس پرافت دیں  
 قسمت میں تمہارے چین نہیں، نسکینِ اطمینان نہیں  
 تم کو یا جسمِ مردہ ہو، ایمان کی جس میں جان نہیں  
 ہو راحت تو کیونکر تمہیں، شک کہ کیا پاؤ آرام ہو کیا  
 نخت نے تمہاری جیبِ تم کو، دکھ سکھ سے انکو سبق دیا  
 یہ عیشِ تمہاری یہ ثروت، اک عبرت ہے دنیا کے لئے  
 یہ ایک طلسمِ دولت ہے، دھوکا ہے دل بیذا کے لئے  
 ہے اپنے ہی آرام کی دمن، اور اپنی دولت میں ہو گن  
 غیروں کی کیا پروا ہو تمہیں، اپنوں کی نہیں جب دلیں لگن  
 راحت ہو تمہاری جو کچھ ہے، فردور کی راحت کچھ بھی نہیں  
 عزت ہو تمہاری جو کچھ ہے فردور کی عزت کچھ بھی نہیں

---

## تنقید و تبصرہ

الجہاد فی الاسلام۔ مصنف مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رفیق اعزازی دار المصنفین۔  
 حجم ۵۰۰ صفحہ تقطیع ۲۰ x ۲۶۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت ص ۱۰۰ کا پتہ دار المصنفین لاہور۔  
 اس منجبت پر اس سے پہلے بھی کتابیں ہم نے پڑھی ہیں مگر مولانا مودودی نے جس شرح  
 بے باور تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا ہے وہ کچھ اور ہے۔ اس میں اسلامی جہاد کی حقیقت اور  
 اصول جنگ اور جنگ کی غرض و غایت پر تفصیلی بحثیں ہیں۔ اقوام سابقہ کے جنگ کی کیفیتیں دکھا کر  
 انہوں نے بتلایا ہے کہ اسلام نے اس میں کس قدر اصلاحات کیں اور اس کے اغراض کو کس قدر  
 مقدس اور مفید بنایا۔

مفسرین جو اسلام کے مسلک جہاد پر اپنی نادانی سے اعتراض کرتے ہیں انہیں تحقیقی جوابات  
 دئے ہیں۔ اور جملہ خلک کو ازالہ کیا ہے۔ اور دوسرے ادیان کی تعلیمات کے ساتھ مقابلہ کر کے  
 اسلامی جہاد کی برتری اور فضیلت ثابت کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے معتبر کتب کے حوالہ سے لکھا ہے  
 خاص کر اسلامی جہاد کے متعلق قرآن اور حدیث اور فقہ کی تعلیمات کو تاریخی روشنی کے ساتھ  
 واضح کیا ہے۔

آخر میں جنگ اور تہذیب جدید کے عنوان سے موجودہ مغربی تہذیب کے اصول اور  
 اغراض جنگ دکھائے ہیں اور نور و ظلمت کے فرق کو اچھی طرح نمایاں کیا ہے۔

بیان سادہ اور سلیس ہے اور معلومات سے لبریز یہ خیال ہے کہ کتاب زیر تنقید  
 مسلک جہاد کے متعلق ان تمام کتب میں جو اب تک اس عنوان پر نہ صرف اردو بلکہ عربی میں بھی  
 لکھی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ پر مغز اور فیصلہ کن کتاب ہے۔ اور دار المصنفین اس کی اشاعت پر  
 شکریہ کا مستحق ہے۔



اسلامی کا زمانے - مؤلف مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب جنرل سکرٹری مسلم ایسوسی ایشن و سکرٹری انجمن تعلیم الاطفال چلواری شریف - مجلہ قیمت عمر حجم ۱۳۶ صفحہ - لکھائی چھپائی کا غد متوسط -  
 سنے کا پتہ: محمد نصیح اللہ صاحب - مسلم بک ڈپو - چلواری شریف - پٹنہ -  
 اس کتاب میں مؤلف نے مسلمانوں کی ملکی، علمی اور صنعتی ترقیاں دکھانے کی کوشش کی ہے - تاریخ اسلام سے اسلامی فتوحات - علمی تصانیف - مدارس - کتب خانے اور ثقافتی پھر عمارات اور صنائع وغیرہ دکھائی ہے - اس کو پڑھکر یہ سوچنے کی ضرورت ہو کہ کن وجوہ سے ہم اسے اسلاف نے ترقی کی تھی اور کیوں ہم قعر مذلت میں گر گئے ہیں -  
 کتاب میں چند مشہور اسلامی عمارات کی تصویریں بھی دی گئی ہیں -

اسلام کی پہلی کتاب - مصنفہ مولوی حکیم سید عبداللطیف صاحب پتہ قیمت دینج نہیں  
 ناٹا ۲۲ ہونگی - سنے کا پتہ: اکبر بک ڈپو سعید منڈن - دہلی -  
 مولوی عبداللطیف صاحب جو ایک اسکول میں غربی کے مدرس ہیں بچوں کے لئے  
 وینیات کا سلسلہ لکھنا چاہتے ہیں یہ رسالہ اس کی پہلی کڑی ہے - اس میں ابتدائی عقائد کی  
 باتیں بطور سوال و جواب کے لکھی گئی ہیں بعض اہم اخلاقی تعلیمات اور نماز کا بھی بیان ہے  
 بیان کا طریقہ سادہ ہے جو بچوں کے لئے مناسب ہو -

تاریخ الامت حصہ ہفتم - تاریخ الامت کا آخری حصہ چھپرک شائع ہو گیا - اس میں سلاطین و  
 خلفاء آل عثمان یعنی ترکوں کی شروع سے آج تک کے تاریخی حالات حسب معمول نہایت تحقیق  
 اختصار اور سلاست کے ساتھ عربی ماخذوں سے لیکر لکھے گئے ہیں - ترکوں کی تاریخ میں اردو  
 زبان میں اسکو پہلی تصنیف سمجھنا چاہئے کیونکہ آج تک جو کچھ اس کے متعلق اس زبان میں لکھا گیا ہو -  
 وہ ترجیحے ہیں - لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت فی نسخہ مدد ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قزوین - دہلی -

معلومات - اس سال سے یہ جدید ماہانہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر احمد الدین صاحب احمد مارہوی ایم لے کی ادارت میں الہ آباد سے شائع ہونا شروع ہوئے قیمت سالانہ چھ روپے کا ہے۔ دفتر معلومات الہ آباد

اس میں مختلف قسم کی معلومات صنعتی، تجارتی اور تجارتی وغیرہ جو زیادہ تر اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہو سکتے ہیں لئے جاتے ہیں۔ دو جز کا نہایت معمولی رسالہ ہے۔ کاش اس کو دلچسپ اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی جاتی۔

کعبہ - یہ ہفتہ وار اخبار آٹھ صفحے کا آل انڈیا جمعیتہ القریش کی سرپرستی میں حضرت گوپنہ دی سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس میں قوم قریش قصا بن کی اصلاح اور یہود کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مضامین نظم و تراجم اور مفید دین کے جاتے ہیں۔

بہشتی سے ہندوستان میں ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی پیشہ اور نسل کے لحاظ سے ذات پات کی تعزین پھیل گئی۔ اور امام حسینؑ کو مٹانے کے لئے آیا تھا اسی میں مسلمان پھر گرفتار ہو گئے۔ یہ سال اگرچہ ایک خاص حیات کا اگر گن لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کو مٹانے والا اور وحدت کا حامی ہے۔ قیمت سالانہ تین روپے

ساقی - اردو کا علمی اور ادبی ماہوار صحیفہ مشر شاہد احمد بی لے آرز کی ادارت میں دہلی سے اسی سال سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ لکھائی چھاپائی اور کاغذ عمدہ حجم چار جز قیمت یہ سالانہ ۸ روپے شاہد احمد مشہور عالم شمس العلماء ڈبئی ندیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں۔ ادب اور ادوکا ذوق انہیں سوروشی ہر چنانچہ اسی ذوق نے ان کو اس رسالہ کے نکاسے پر آمادہ کیا۔

ان کے اعوان و نصار کا حلقہ اچھے اچھے ادیبوں، کاتبوں اور شاعروں پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے ان کا یہ رسالہ نہایت دلکش اور زبانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ خود بھی ایک خوش بکار قلم رکھتے

ہیں کہ احکامیہ رسالہ ترقی کرے گا اور اردو ادب کی خدمت کر سکے گا۔  
 طے کا پتہ: دفتر رسالہ ساقی - کھاری باؤلی - دہلی۔

**البلاغ** - یہ ایک مذہبی علمی اور ادبی ماہانہ رسالہ ہے جو نظیر آباد لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم ہر جلد تقطیع ۲۶×۲۰ قیمت سالانہ صر ہے جو نسبتاً زیادہ ہے۔

البلاغ پہلے سال ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ میں ہفتہ وار اخبار کی صورت میں جاری ہوا تھا لیکن پھر بند ہو گیا۔ اب اسی کو ماہانہ رسالہ کی شکل میں نکالنا شروع کیا ہے۔ اس کے مدیر سید محمد نسل شاہ ثاقب ندوی بہرائچی ہیں۔ مضامین متوسط درجہ کے ہیں۔ فرید و جدی کے ایک مضمون کا ترجمہ اچھا ہے۔ اگر مدیر رسالہ قرآن کی تعلیمات کو ہمیشہ کرنیکا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھیں تو امید ہے کہ یہ رسالہ زیادہ مفید اور کارآمد ہو جائے گا۔

**قیام الدین** - حضرت مولانا عبدالباری مرحوم آخری آفتاب فرنگی محل کے غروب ہو جانے پر ان کی یادگار میں انکے نام سے فرنگی محل سے یہ ماہانہ رسالہ زیر ادارت حسن انصاری صاحب نکالنا شروع ہوا ہے رسالہ کا حجم ۲۶×۲۰ تقطیع پر تین جڑ ہے اور چھپائی لکھائی معمولی ہے۔ قیمت للہ سالانہ ہے جو زیادہ ہے۔ مضمین مذہبی اور اصلاحی ہیں۔ طلبائے علوم عربیہ اور مذہبی خیال کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ مفید ہے۔

**معاون** - چودہری غلام مصطفیٰ صاحب بیرسٹر کی زیر نگرانی یہ ماہوار رسالہ گوجرانوالہ سے شائع ہوتا شروع ہوا ہے۔ علمی ادبی طبی، اقتصادی، اصلاحی، زرعی اور امداد باہمی غرض قوم کی جس قدر ضرورتیں ہیں ان سب پر مضامین شائع کرتا ہے۔ بڑی تقطیع پر ۵ صفحے کا حجم ہر لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ اور قیمت سالانہ ہے۔ تصویریں بھی دیتا ہے۔

مضامین کے لحاظ سے نہایت قابل تعریف ہو۔ ہم کو امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کرے گا۔

**سروش** - یہ ماہوار باتصویر رسالہ محمد عنایت خاں صاحب حیرت کی ادارت میں ماہانہ لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ حجم چار جز اور قیمت سالانہ قسم اول للعرضہ - قسم دوم ہے۔ مضامین اور ترتیب نیز لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے یہ رسالہ ادب کے اچھے رسالوں میں سے ہو۔ مارچ نمبر ہمارے پاس بغرض ریویو موصول ہوا تھا جس میں اچھے اچھے اہل قلم کے مفید اور دلکش مضامین نظم و نثر ہیں۔ دو تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

**ضیاء القریش** - یہ رسالہ حکیم محبوب الہی صاحب صدیقی زبدۃ الکلمار کی ادارت میں گوجرانوالہ پنجاب سے اس سال ماہوازی کلنا شروع ہوا ہے۔ قومی، اسلامی، تاریخی، تمدنی اور ساتھ ہی طبی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے۔ تین جز حجم ہوتا ہے اور قیمت بھی سے سالانہ ہے۔ منیر صاحب ضیاء القریش گوجرانوالہ سے طلب فرمائیں۔

# شذرات

جو پیدا ہو تسہی وہ مرتا بھی ہے۔ اس دنیا کا بھی دستور ہے۔ مرنے والے کی موت پر سبے جھوٹے آنسو بھی بہائے جاتے ہیں، اتنا اٹل تو نہیں پر یہ بھی دستور ہے، امیروں کی موت پر لوگ چلا چلا کر روتے ہیں اور غریب کی تربت پر کوئی غمزہ چنہ خاموش آنسوؤں کے موتی چڑھا دیتا ہے۔ اچھا تو نہیں ہے شرافت انسانی کا یہ تقاضا ہونا چاہئے پر کیا کیجئے یہ بھی دستور ہے۔ مگر کچھ موتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر آدمی چلا تا بھی ہے اور چلانے سے زیادہ خاموشی سے آنسو بہاتا ہے۔ یہ اُن ہنسیوں کی موت ہوتی ہے جو اگرچہ غنی اور امیر تھیں مگر جن کے دل غریب تھے اور دردمند۔ جو اپنی دوت کو اپنے نبی نور کی امانت سمجھتی تھیں اور اس امانت کے فرض کو زندگی بھر دیانت سے ادا کرتی تھیں۔ اس ہینہ میں ہماری بدنصیب قوم سے ایک ایسی ہستی اٹھ گئی۔ اور اس کے اٹھنے سے اس تشنہ کام زمین میں سے فیض کا ایک چشمہ بند ہو گیا۔

ہر مانس نواب سلطان جہاں نیگم صاحبہ مرحومہ کی موت پر جتنا ماتم اشخاص نے کیا ہو گا اس سے زیادہ اداروں نے کیا ہے۔ اس لئے کہ شاید ہی ملک کا کوئی مفید ادارہ ہو جو اس فیاض خاتون کے دستِ کرم سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔ اور مدد بھی بے بھی مدد نہیں کون ادارہ ہے جس کی ان خوبیوں کو جنہیں ظاہر ہیں نگاہیں نہیں پہنچاتیں اس نے نہ سمجھ لیا ہو اور اس پر کارکنوں کی حوصلہ شکنائی نہ کی ہو اور کوئی دہ برائیاں ہیں جو ظاہری شان و شوکت کی وجہ سے کم نظر لوگوں سے پوشیدہ رہتی ہیں انہیں اس نے نہ دیکھ لیا ہو اور بے لاگ تنبیہ نہ کر دی ہو۔ ہمارے ملک میں اور بھی اہل کرم ہیں پر انہیں ہم نے سرفلک عمارتوں میں فقدانِ روح پر ماتم کرتے اور غلٹ و نادار کارکنوں کی جھوٹریوں میں اگلوں کے نمونوں سے ڈھارس بندھاتے نہیں سنا۔ یہ چیز

مرحومہ ہی کے ساتھ مخصوص قلمی اور اب شاید اس اجتماع صفات کو آنکھیں دھوٹیں گی اور  
خوشگوار ہو جائیں گی۔

گزشتہ سال جب جامعہ کا وفد بھوپال حاضر ہوا اور مرحومہ نے اسے شرف باریابی بخشا اور  
حکیم صاحب مرحوم کا ذکر آیا تو فرمانے لگیں کہ مجھے جب حکیم صاحب مرحوم جامعہ دکھارہے تھے تو  
میں نے ان سے کہا تھا کہ حکیم صاحب اب میری دنیا میں بس ایک آرزو ہے۔ کہ جب یہاں  
سے جاؤں تو آپ اور میری قوم یہ کہہ دے کہ یہ خادمۃ المسلمین تھی۔ انہوں نے حکیم صاحب ذیل  
انہوں نے تو مسلمانوں کی خدمت ہی میں جان دی۔ ہاں حکیم صاحب تو نہیں ہیں لیکن مسلمان  
ہند آج زبان حال سے اس خادمۃ المسلمین کا جو اسی خدمت کی وجہ سے انکی محذومہ تھی قائم  
کر رہے ہیں اور جب تک انکا کوئی بھی تعمیری کام جاری ہے اس محنت کی یاد باقی رہے گی  
خدا مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور حضور نواب صاحب بھوپال اور دیگر پس ماندگان کو صبر  
جمیل عطا فرمائے اور قوم کو ان کاموں کو اچھی طرح چلانے کی توفیق دے جن میں سے اکثر کا وجود  
اور بہتوں کی ترقی مرحومہ کے دست کرم کی رہیں منت ہو۔

دور حاضر میں شاید مسلمانان کے اندر تنظیم تعمیر ملت، اتحاد پر کبھی تقریر و تحریر کی اتنی قوت نہ  
نہی گئی ہوگی جتنی کہ پہلے ۵۰-۶۰ سال میں۔ اور شاید اس ملک میں ہماری پوری تاریخ کا کوئی زمانہ  
ایسا نہ بتایا جاسکے جب انتشار، تخریب اور نفاق کی قوتیں اس سے زیادہ قوی ہوں جتنی کہ اس  
زمانہ میں رہی ہیں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر کہہ اس کے ذکر اور خیال سے کلیہ منہ کو آتا ہے یہ حقیقت کہ  
چشم بینا سے پوشیدہ نہ ہوگی کہ اس زمانہ میں مسلمانان ہند کے سامنے کوئی ملی مصلحت نظر، کوئی ترقی  
مشق، کوئی سیاسی پروگرام، نہیں رہا۔ انکی سیاست، انکی تعلیم، انکی تنظیم، انکی تبلیغ سب کسی دوسرے  
کے حجاب میں کسی دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے، کسی بے غصبہ اتارنے کے لئے رہی ہے۔

اور یہ نہیں کہ یہ مخالفت صرف قومی یا معاشی ہو، اکثر و بیشتر خود مختلف ”رہنمایان ملت“ کی باہمی رقابت، مزاجوں کی عدم مناسبت، طبیعتوں کی عجلت پسندی، تعاون کی کمی اور رواداری کے بیگانگی اس مصیبت کا باعث ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہماری جماعتی سعی کے تمام میدانوں کا مجموعی حاصل صفر ہے۔ اور یہی نہیں کہ پچھلے زمانہ کی بے ثمری پر ہی آنسو بہا ہوں آئندہ کی توقعات بھی کچھ بہت حوصلہ نہسر نہیں۔ اسلئے کہ جماعتی کاموں میں اہم کام تقریباً سب صبر آزما اور دیر طلب ہوتے ہیں۔ اور ایک نسل کو اپنے کاموں کے چلاتے رکھنے کے لئے آئندہ نسلوں کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی اس نسل نے جس کے ہاتھ میں بظاہر اس وقت ملی زندگی کی باگ ہو۔ جب حال کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو ان سے استقبال کے لئے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملی زندگی کے کسی شعبہ پر نظر ڈالئے موجود کام کرنے والوں کے جھگڑے مٹنے دکھائی دینگے اور آئندہ کام کرنے والوں کا کال۔ شاید کسی جماعت کے نوجوان اپنے رہنماؤں سے اتنے یزار ہونگے جتنے مسلمانان ہند کے۔ اس لئے نہیں کہ ہمارے نوجوان کام سے جی چراتے ہیں، قربانیوں سے ڈرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ اس باب میں مسلمان نوجوان کسی سے پیچھے نہیں لیکن جب وہ خلوص و عقیدت، خدمت و ایثار کی نظریں لے کر کبھی اپنے رہنما کے سامنے جاتے ہیں تو انکے دل امیدوں، حوصلوں اور دلوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ سب سے یابوس ہوتے ہیں۔ پھر حسدیت کی انکی امیدیں ٹھیس اسی شدت کی مایوسیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ شخصی اغراض کو حاصل کرنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے لگتے ہیں۔ جماعتی معاملات سے بس اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ جھڑپ کے اوقات میں اس فطری قوت مبالغہ سے کام لیکر جو شباب کی خصوصیت، جوان رہنماؤں کی جھجھک اپنی مجلسوں میں گرمی یا تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قومی کاموں میں ذرا اعتماد اور مایوسی کی فضا دن بدن قومی تر ہوئی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ اب ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہے کہ مسلمانوں کی سیاست ہو یا تعلیم، اصلاح معاشرت کی کوشش ہو

یا تبلیغ دین کی سب کی سب خود پرستی اور شخصی خدا اور ہٹ یا شخصی اغراض کے مظاہر اور پرتوئیں۔  
قومی زندگی کا انتشار اس عقیدہ کی تصدیق کرتا اور تصدیق سے اسے اور قوی بناتا ہے۔

پھر کیا اس قوم کے لئے جس نے دنیا کو چھوڑی خود ہندوستان کے لئے اتنا کچھ کیا کہ کسی  
اور نے بس اتنا ہی کیا ہو گا اس سے زیادہ نہیں، جس نے اس ملک کے تمدن کی جسم مردہ  
میں جان ڈالی، جس نے اس کی مذہبی زندگی کو رسمیت کے جمود سے اٹھا کر خلوص کی راہ پر لگایا  
جس نے اس کی سرزمین پر ایسی عمارتیں کھڑی کر دیں جنہیں آج تک انسانوں کی آنکھیں نہیں  
آسمان، ستارے بھی حیرت سے دیکھتے ہونگے، جس نے اس کی موسیقی کو جلایا، اس کو ایک  
نئی زبان دی جو اور سب زبانوں سے زیادہ اس کی قومی زبان بننے کی اہل ثابت ہوئی جس  
نے اس کی مشترک سیاسی زندگی میں مرکزیت پیدا کی اور اس طرح ایک متحدہ ملک اور قوم کی بنیاد  
ڈالی، جس کے بہادروں نے اس کی تاریخ کو شجاعت و جواغروی کے وہ افسانے وئے جنہیں  
پڑھ کر ہر عسکر اسکی آئندہ نسلیں ہمیشہ اپنے دل گرائیں گی جس کے فیروں نے بے غرض خدمت  
خلق کی وہ روایات چھوڑیں کہ ان پر جگر ہی آج تک اس ملک میں کوئی مفید سیاسی و سماجی کام ممکن  
ہے۔ تو کیا اس قوم کے لئے دوسروں کے ظلم و ستم سے نہیں خود اپنی غفلت اور اپنے انتشار سے  
مستقبل کی کوئی امید نہیں؟ کھتے ہوئے قلم کا پتا ہے لیکن ہاں، اگر اب اس کے پاس شخصی  
خود غرضی اور انفرادی خواہش تفوق کے علاوہ جماعتی زندگی کے لئے کوئی تحفہ نہیں تو اس کے رہنا  
اپنی خود غرضیوں اور خود پرستیوں پر "حقوق المسلمین" کے لاکھ پرے ڈالیں یا گوارہ حقیقت: زچہ پیگی  
اور اس بنیاد جماعت کا وہی حشر ہو گا جو ہر اس مجموعہ کا ہوتا ہے جس کے اجزائیں خود سری کیل  
ہو کر اس کے ذرہ ذرہ کو منتشر کر دیتی ہے۔ اور پھر ہوا کا ہر لہکا سا جھونکا ان دونوں کو جدا کر دیتا ہے  
اور اسے پھرتا ہے۔



جامعت کے ذروں یعنی افراد میں ارتباط، اشتراک، مقاصد، اشتراک روایات، اشتراک عقائد سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ انتشار کو بھی اگر کوئی چیز رفع کر سکتی ہے تو یہی اور جب ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے ساری گفتگو کی اور حقوق طلبی کی بنا ہی یہ ہے کہ ہم تمدنی شخصیت مٹی رکھتے ہیں جسے ہم کسی دوسری سماجی شخصیت پیچہ نہیں کرنے کو آمادہ نہیں اور جس کی ہلاکت کو ہم نوع انسانی کا نقصان جانتے ہیں تو مسلمانوں پر اور بھی لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کو اپنے مخصوص تمدنی و معاشرتی وظائف سے آگاہ کریں اور انہیں انکے لئے سعی و کوشش کا جذبہ اور اس جذبہ کو بار آور بنانے کے لئے محنت و استقلال کی عادت ڈالیں۔ یہ کام از سر تا پای تعلیمی کام ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک مسلمان ہند کے لئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت انکی ملی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

ہندوستان میں سرسید مرحوم کے وقت سے مسلمانوں کی توجہ کم و بیش اس تعلیمی مسئلہ پر رہی ہے لیکن خیرازہ ملی کی عام پراگندگی، معاشی حالت کی پستی، اور حکومت کے شوق نے مسلمانوں کی توجہ تا مگر اسی تعلیم کی طرف رکھی جو انہیں سرکاری ملازمتوں کے لائق بنا دے۔ اور اس تنگ نظری کے باعث مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد کے نتائج بہت حقیر اور جماعتی اعتبار سے بہت ہی ناقابل اعتنا رہے۔ اور اس وقت اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب ملک میں جمہوری ادارے قائم ہو رہے ہیں تو مسلمان ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ علیگڑھ اور چند دوسری اعلیٰ تعلیم گاہوں نے بعض ایسے لوگ تو پیدا کر دیئے ہیں جو وزارتیں کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور اہلیت سے زیادہ خواہش بھی۔ لیکن وہ رائے دینے والے اب تک ناپید ہیں جو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی صورت میں بھی اچھے نمائندے بھج سکیں۔ ملک کے موجودہ سیاسی اداروں میں خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب کے چنے ہوئے نمائندوں کے کارناموں پر نظر ڈالئے اور ان کی قابلیت، حالات سے واقفیت، معاملات

کے فہم کا اندازہ لگانے اور دوسرے نمائندوں سے اسکا مقابلہ کیجئے تو سوائے شرم سے سر جھکا لینے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ غرض ہر لحاظ سے خواہ اپنے تمدنی و مذہبی خصائص کی حفاظت کیلئے خواہ اپنی سیاسی حیثیت کو منبھانے کے لئے، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اس ملک میں اچھا ہو۔ ہمیں امید ہے کہ اس انتشار کے زمانے میں بھی دو چار مسلمان تو ایسے ہوں گے جو اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کے تعلیمی پروگرام کو انکی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے طے کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر دو چار آدمی ایسے بھی ہونگے جو اپنے بس بھر اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے اور شاید یہی جماعت اپنے کام کی خوبی اور اپنی راہ کی صحت کے سبب بہت سے ساتھی جمع کرے اور یہ اہم قومی ضرورت پوری ہو جائے

اس باب میں غوطلب مسائل کی تعداد غیر محدود سی ہے لیکن چند چیزیں بہت اہم ہیں اور ان پر غور کرنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ مسلمانوں کے لئے سخت مضرب ہے۔ سب سے اہم مسئلہ تو غالباً ابتدائی تعلیم کا ہے۔ آیا مسلمانوں کا عام اور لازمی ابتدائی تعلیم کا نظام حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، چاہے وہ پردہ سی حکومت ہو چاہے ہندوستانی، انہیں خود اپنا جدا گانہ نظام رکھنا چاہئے۔ اس ابتدائی تعلیم میں اپنی مخصوص ضرورتوں کی رعایت کرنا مسلمان ماہرین تعلیم کا نہایت مشکل مگر اتنا ہی ضروری فرض ہے۔ وہ کم سے کم عقیدے جنگی جگہ ہر مسلمان کے دل میں ہونی ضروری ہے، وہ کم سے کم ملی روایات جن سے آشنائی حیات ملی کے لئے از بس ضروری ہے۔ وہ ضروری رجحانات جن کے بغیر ایک ملت مونی دنیا میں زندگی ممکن معلوم نہیں ہوتی وہ ضروری عادات جن کا بغیر کارزار جیٹیل کامیابی کا قیل بھی ناممکن ہے کس طرح ہر مسلمان پیدا کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو کیسے نصاب تعلیم سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیسے معلولوں کی معرفت یہ سب سوال اپنی جائے کیسے بہترین قابلیت کے لوگوں کی مخلصانہ فکر کے محتاج ہیں۔

شمالی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وسیع پیمانہ پر خود اسکا انتظام کرنے یا

حکومت سے انتظام کرنے کے بجائے اپنی معاشی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے بہتر نہ ہو گا کہ صنف و دستکاری کے مدارس کے قیام کی طرف زیادہ توجہ کی جائے۔ اور علمی و ادبی تعلیم کا انتظام صرف ان لوگوں کے لئے ہو جو یا تو اسکی خاص اہلیت رکھتے ہیں یا اپنے وسائل کی فراخی کے باعث اعلیٰ تعلیم سے بھی فیضیاب ہونا چاہتے ہیں۔ ثانوی تعلیم گاہوں میں اور نیز مخصوص اعلیٰ مذہبی درس گاہوں میں دین کی تعلیم کی طرف بھی فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ کیا دین کی تعلیم کا نام چندے وصول کرنیکے لئے ہی لیا جاتا ہے اور دین کے نام سے غلط سائنس اور نامکمل فلسفہ اور کچھ قانون پرچایا جائے۔ یا واقعی اس تعلیم سے دین کی عزت و عظمت دل میں پیدا کرائی جائے اور اس سے محبت و تعلق، دل کی صفائی اس کا مقصود ہو یا دماغ پر بوجھ۔ اس ضمن میں موجودہ اسلامیہ سکولوں اور عربی دینی مدارس کی مذہبی تعلیم کی پوری تحقیق اور اس کے نتائج کی جانچ اذلیں ضروری ہے کہ کہیں دین کی جڑ کھو چکی کرنے کا نامبارک کام سمجھو انہیں کی معرفت نہ انجام پارہا ہو۔

علوم جدیدہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق جسیرات تک مسلمانوں نے اپنی ساری قوت صرف کی ہے، یہ سوچنا ہے کہ اس کے لئے اپنے مخصوص جامعات اور کٹیوں کی ضرورت کس حد تک ہے اور اگر ہو تو کیا انہیں سب وہ کچھ کرنا چاہئے جو دنیا کی یا ملک کی اور جامعوں میں ہوتا ہے یا اپنے کام کو محدود کر کے پہلے صرف ان چیزوں پر توجہ کرنی چاہئے جس سے ملت کے اہم فوائد وابستہ ہوں۔ یہ سوچنا ہے کہ ہم اپنی ملی جامعات میں طبیعیات و کیمیا، حیاتیات و فلکیات کے اعلیٰ شعبے ایسی حالت میں بھی قائم کریں کہ ان سے چند سو میل پر دوسری تعلیم گاہیں ان چیزوں کی تعلیم کا ویسا ہی یا اس سے بہتر انتظام کر رہی ہیں۔ اور اپنے ملی مدارس کو چلانے کے لئے اچھے معلم تیار کر نیکا کام ہم دوسروں پر چھوڑتے رہیں جو ایسا کام ہے جسے یہی نہیں کہ دوسرے کرتے نہیں بلکہ کری نہیں سکتے۔ کیا ہم یونان دروہائی تاریخ پر اپنی جامعات میں اس سے بھی بہت درجہ کی تعلیم کا انتظام

کرتے ہیں جتنی یورپ کے معمولی سے معمولی مدرسہ میں ہوتی ہو اور ہندوستانی اور اسلامی تاریخ پر تحقیق کا کام پس پشت ڈال کر یورپ کے مستشرقین کیلئے چھوڑ دیں جو باوجود اپنے علم و فضل کے اس تاریخی مواد کے فہم سے بوجہ اختلاف تمدن و اختلاف تخیل بڑی حد تک قاصر ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہو کہ آیا وہ انہیں بھی دیہی غلطی کرینگے جو مردوں کی تعلیم میں ان سے ہوئی۔ یعنی اپنی تمدنی متاع کو چھوڑ کر دوسروں کے خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی ہاکام و نامراد کوشش کیا عورتوں کی تعلیم میں بھی کیجاگی اور اس طرح ایک مضل ملت کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو بالکل منتشر کر دیا جائیگا۔ ہم اپنی عورتوں کو اچھی باتیں بتانے کی کوشش کرینگے یا اچھی دلیل؟ اس سلسلہ میں بھی موجودہ رجحانات بہت خطرناک ہیں اور اگر کسی صحیح رہنمائی نے انکی فکری کور کو کا نہیں تو زیادہ عرصہ نہ گزرے گا کہ قیام و بقا ملت اسلامی کی امید کا یہ آخری مورچہ بھی اندھے تقلید اور مردہ جمود دونوں کے ہاتھوں سر موچکے گا۔ اللہم حفظنا۔

بچوں اور بچیوں، لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے ان مسائل کے علاوہ بالغوں کی تعلیم اور انہیں عام ضرورت ملی سوجھی اور لگاؤ پیدا کرنے کا مسئلہ بھی مذکورہ بالا مسائل سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا۔ کہ نہ تو اس کے بغیر کم عمر افراد ملت کی تعلیم کا مسئلہ صحیح طور پر حل ہو سکتا ہو اور نہ ملک کے جمہوی اداروں میں شرکت اسکے بدون مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہو۔ غرض متعدد مسائل ہیں جن پر غور و فکر کی شد ضرورت ہو۔ ہم نے صرف چند مسائل کی طرف اس امید سے اشارہ کیا ہے کہ اہل فکر حضرات انکی طرف توجہ کریں گے اور ہم اسے بڑی خوش نصیبی سمجھیں گے اگر جامعہ کے صفحات ان مسائل پر بحث و نظر کے لئے کام میں لائے جائیں۔ ہمارا مقصد ہے کہ ملک کے اہل فکر کو ان مسائل پر اظہار رائے کی علیحدہ شخصہ طور پر بھی دعوت دیں لیکن اس وقت ان مسئلہ کے ذریعہ ناظرین جامعہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان یا ان جیسے اور مسائل کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔



چاند کا دیکھنا اچھا مانا جاتا ہے۔ دُوح ہو تو مبارک، اور پورن ہو تو دلکش ہوتا ہے۔ اردو چاند کا بھی یہی حال ہے، اس کو دیکھنا صلاح و فلاح کی فال ہے، اس رحمت کا نور پھیلتا ہے، علم و سہنر کی

چاندنی چھٹکتا ہے، آنکھ، دماغ، روح اور دل کے لئے سرمایہ نور و نور ہے۔ زن و مرد سب کا غیر خواہ،

بچوں کا دل بہلاؤ، بوڑھوں کا ہوم، جوانوں کا رقی، اور بزمزد دلوں کے فنج ہائے دل کو ٹھکانا، ثابت ہو رہا ہے۔ آٹھ روپیہ میں ہر مہینہ سوا سو فوٹی سے بھی زیادہ عمدہ کاغذ، صاف لکھائی، اعلیٰ چھپائی، اور نفیس مضامین شرفِ نظم کے ساتھ کثرتِ دلکش تصاویر کا مرقع دیکھئے اور سال میں ایسی ہی بارہ کتابیں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کوئی تنگ کا سودا نہیں ہے۔ نمونہ نگاہ کر دیکھئے

ماہنامہ بلاتوقف مندرجہ فہرست خریداران کرایہ ہے

چاند اردو میں اشتہارات دینا  
کامیابی کا وسیلہ مستعمل ہے  
مفصل کیفیت فیمو دفتر چاند  
(اردو وایتلین) چند لوک  
الہ آباد سے دریافت کیجئے۔  
ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۔  
بار کا پتہ "چاند"  
خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر  
اور دیگر ٹیبلٹ مضامین کی باتہ مراسلا  
بامراجہ چاند اردو کا ہونا چاہئے۔

یقین ہے کہ آپ خود پسند فرمائیں گے، اور دل و جان سے خریدار بنیں گے۔ عی۔ ہاتھ لنگن کو آری کیا ہے؟  
انجمنِ فنی انجمنِ لال ایم، ایل، ایل، بی ایڈ کیٹ۔ چند سالانہ شے ششماہی صرف ملاحظہ فرمائیے بلا تین ابراہیم





# THE NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY.

## BOOK-DEPOT

### DELHI.

---

*The Spirit of Islam:* New and revised edition. A History of the evolution and ideals of Islam with a Life of the Prophet. Two new chapters have been added to this new addition, on the Apostolical Succession and on Mysticism, as well as considerable new matter in the Introduction and in the chapter on "The Rationalistic and philosophical Spirit of Islam" By the Rt. Hon. Syed Amir Ali, P. C., L. L. D. C. I. E.

Rs. 20.

*Studies in Persian Literature:* An account of the birth of Mohammadan Persia and the Persian Language, and the rise of the Ghazna with a digression on Critics and Persian Literature and a Criticism of the poetry of Firdawsi, Manuchehri and Unsurī. By Syed Hadi Hasan B.A., B.Sc. (Cantab)

Rs. 5.

*Islamic Culture and National Education:* By Dr. Sir P. C. Roy, with a Foreword by A. M. Khwaja, B. A. (Cantab) Bar-at-Law.

As. -8-

*Laolus and other Poems:* Charminglly bound. printed at the Jamia Press in Clear type. The Volume makes an appropriate gift for those who not only appreciate handsome books but desire to read and re-read the books they possess By Eric Dickinson.

Rs. 2-4-

*Thoughts on the present Discontent:* Reprinted from the "Times of India" and the "Indian Spectator." By Maulana Mohammad Ali.

Re. 1.

---



۱۳۵۳

رجسٹرڈ



پیشکش  
۱۳



جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۶

بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ ع

جلد ۱۳

مجلد مکتبہ



مجمع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927



بِسْمِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# جامع

زیر ادارت

مولانا اسلم جلیو جیوی ڈاکٹر عید حسن ایم اے پی ایچ، ڈی

جلد	بابۃ ماہ جون ۱۹۳۷ء	نمبر
-----	--------------------	------

فہرست مضامین

- |                                    |  |     |
|------------------------------------|--|-----|
| ۱۔ ارض نخی                         | قاضی عبدالغفار صاحب                        | ۲۰۲ |
| ۲۔ جدید علم کلام                   | قاری سرفراز حسین صاحب                      | ۲۱۳ |
| ۳۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ | محمد اشرف صاحب بی اے (علیگ) حال تعلیم لندن | ۲۲۳ |
| ۴۔ سرکاری قسود                     | شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)      | ۲۴۵ |
| ۵۔ ملازمی صاحب کا خط               | ملازمی صاحب                                | ۲۵۶ |
| ۶۔ چراغ راہ                        | محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)                | ۲۶۲ |
| ۷۔ شذرات                           |  | ۲۷۳ |

# ارضِ نفی

## وسط ایشیا کی تاریخ حاضر پر ایک نظر

وسط ایشیا کا پورا صفحہ ماضی، حال اور استقبال سے نقش ہے۔ ایک ہنگامہ خیز اور بہت طویل ”ماضی“ کے بعد اُسکا ”حال“ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن میں اس کو ارضِ نفی اس لئے کہتا ہوں کہ اُس کے حالات ہماری نظر سے بہت دور رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی، اصطلاح جدید میں وہ ماہرین بھی جو ایشیا کے حال و استقبال پر نظر غائر ڈالتے ہیں وسط ایشیا کی اجتماعی زندگی کا بہت کم کھوج پاتے ہیں۔ ایشیا کے جسم کا یہ نظاہر مرکز و مغلوب مگر آئندہ پیدا ہونے والی قوتوں کے تمام امکانات رکھنے والا عضو گو آج معطل و مغدور ہے مگر اپنی رگوں کے اندر زندگی کی کافی حرارت رکھتا ہے وہ حرارت جو قوتوں کے بقا کی ہمیشہ ضامن ہو اکر ترقی ہے جس دن کسی طوفان کا کوئی جھونکا اس سیاہ چادر کو اٹھا دے گا جو وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں کو ارضِ نفی بنائے ہوئے ہے۔ اُس دن دنیا کے روبرو ایک نئی طاقت زندگی کے میدان میں اپنا حصہ طلب کرے گی۔ ان اعتقادات و جذبات سے قطع نظر میں صرف واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کے تمام ذریعہ رسل و رسائل نہ صرف محدود بلکہ کلیتاً حکومت کے ماتھے میں ہیں۔ یعنی جس وقت حکومت چاہے ہندوستان کو ساری دنیا سے علیحدہ اور بے خبر کر سکتی ہے اس امکان کا ایک نمونہ ہم جنگِ عظیم میں دیکھ چکے ہیں۔ جب ہماری آنکھیں غیروں کی آنکھیں تھیں۔ ہمارے کان دوسروں کے کان تھے اور جو رنگی ہوئی خبریں ہم تک آتی تھیں اُنکے علاوہ ہم کسی چیز سے باخبر نہیں ہو سکتے تھے۔

ہندوستان اس اعتبار سے محض ایک قید خانہ ہے جس کا کوئی درجہ شاف و ناوری کبھی کھل سکتا ہے۔ اور سوچ کی روشنی اتنی ہی دیر اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے جتنی دیر کہ دار و فہم جس اس کی اجازت دے! جنگ عظیم کے زمانہ میں جب وسط ایشیا ایک بہت بڑے انقلاب کے لئے تیار ہو رہا تھا اس قید خانے کے قیدی وہاں کے حالات سے نا آشنا تھے۔ انقلاب روس کے بعد جب وسط ایشیا کی ریاستوں میں بوشویکوں نے مداخلت شروع کی تو اس وقت کچھ اڑتی اڑتی خبریں ہندوستان تک بھی پہنچیں۔ مگر ان میں سے اکثر کا نہ سر تھانہ پاؤں۔ اور ان میں سے بیشتر پر و پگندہ لگے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں جو غلام رہتے ہیں۔ وہ رسل و رسائل کے معاملہ میں۔ ہسپتال کے ان مریضوں سے بدتر ہیں جن کو سوائے اس غذا کے جو ڈاکٹر تجویز کر دے ایک تک کا ریزہ بھی نہیں مل سکتا۔ اگر ڈاکٹر نے تپلی وال کا پانی تجویز کر دیا ہے تو اب ممکن نہیں کہ اس کے ساتھ ایک نوالہ چادل کا بھی مل جائے! ڈاکٹر کی سخت گیری کے علاوہ خود بیمار کی معذوری و مجبوری کس قدر ماتم انگیز ہے۔ ہندوستان کی اخباری زندگی دوسرے متمدن ممالک کے مقابلہ میں محض صفر ہے۔

الایہ کہ چند انگریزی کے اخبارات اور چند انگریزی خبر رساں ایجنسیاں ایک خاص سیاسی جماعت یعنی (گورنمنٹ) کی اغراض کو پورا کرتی ہیں۔

ذریعہ معلومات | میں نے یورپ میں متعدد سفر کئے اور ہر سفر میں وہاں کے عام باخبری سے تھوڑی بہت خوش چینی کی۔ آخری سفر یورپ میں ایک دوست کی عنایت سے وسط ایشیا کے کچھ مقبرہ سیاسی حالات معلوم ہو سکے میری فرمائش پر ان دوست نے یہ تمام معلومات ایک طویل تحریر کی صورت میں مرتب کر کے مجھے دی۔ لیکن جن دوست نے یہ تکلیف اٹھائی وہ خود ایک مخصوص سیاسی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ اور انکی تحریر ان کے ذاتی عقائد کی رنگ آمیزی ہو پاک نہ تھی۔ وہ خود ایک پر جوش کینونٹ تھے۔ اور اسی رنگ میں وسط ایشیا کے حالات مجھے

سمجھانا چاہتے تھے۔ میرے لئے یہ دشوار تھا کہ میں اُنکے سیاسی عقائد کے جزو کل سے متفق ہو سکوں۔ انکی امیدوں اُنکے ارادوں اور اُنکے منصوبوں کا وسیع میدان میرے لئے ہندوستانی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھا لہذا میں نے ضروری سمجھا کہ اُنکے دے ہوئے کاغذات کو دوسرے ذریعہ سے بھی جانچا جائے۔ اور پھر جو کچھ لکھا جائے اس کو سیاسی عقائد کی بحث کا ایک میدان بنانے کے بجائے تاریخی گفتیش و جستجو تک محدود رکھا جائے۔ جو حقائق صاف نظر آئیں ان کو کچھ مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔

وسط ایشیا کے حالات و واقعات سے ہندوستان کی ہجری اتنی زیادہ دور کہ پرسلسلہ مضامین اس ملک کی تاریخ حاضرہ کا بہت ادنیٰ جزو ہونیکے باوجود اہل نظر کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپ ضرور ہوگا۔ انہیں خیالات نے مجھے اُن اجزاء پریشان کے یکجا کرنے کی ترغیب دی جو ایک عرصہ سے میرے کاغذات میں ردی کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

تاریخ قدم و جدید | خیوا، بخارا، سمرقند، توران (یا ترکستان) بدخشاں و بلخ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے ہندوستان میں اب بھی مسلمان بچوں کے کان نا آشنا نہیں ہیں۔ جب تک مکاتیب مدارس میں فارسی زبان کا دور دورہ رہا اور جب تک ایران کی تہذیب و تمدن کا نقش ہندوستان میں باقی رہا۔ اُس وقت تک وسط ایشیا کے یہ اسلامی نشانات ہم سے زیادہ دور نہ تھے جس کسی نے چنگیز خاں کا حال پڑھا یا تیمور کا نام نہ سنا وہ خیوا اور بخارا سے بھی نا آشنا نہ رہا۔ ترکستان میں تیمور کے عہد ”طلائی“ کا تذکرہ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ تھی۔ یہ تو سب اب تائیں قدیم ہے لیکن تاریخ حاضر بھی سلجوقیوں، چنگیز خانیوں اور تورانیوں کے جنگاموں سے کم ہنگامہ خیز نہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم نے یورپ کے دفاتر خارجہ میں اس حقیقت کو خوب واضح کر دیا ہے کہ کسی نہ کسی دن وسط ایشیا دنیا کی دو سب سے بڑی اور سب سے زیادہ خطرناک طاقتوں کی کشمکش کا میدان بنے گا۔ ترکستان و بخارا کے گزشتہ انقلاب نے وسط ایشیا کا بہت بڑا حصہ حکومت روس (سویٹ) کے زیر

اثر کر دیا ہے۔ اور اس طرح برطانوی ہندوستان اور روسیوں کے درمیان فاصلہ پہلے کے مقابلہ میں کم اور اسی اعتبار سے تصادم کا امکان بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں جس وقت دارا کی فوجوں نے پہلی دفعہ ترکستان میں روسی شہنشاہیت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔ اسی دن سے انگلستان کے درمیان رقبہ جنگ کے امکانات زیادہ قوی ہو گئے تھے۔ برطانوی ہندوستان اور روس کے درمیان افغانستان کی آزادی ہی صرف ایک ایسی چیز تھی اور ہے جس نے اب تک انگلستان کے سرمایہ داروں اور روس کے مزدوروں کی شہنشاہیت کو تصادم ہونے سے روکا ہے۔ لیکن اس پیشین گوئی کو تسخیر انگیز نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا کی دوسری اور غالباً آخری جنگ عظیم اسی وسط ایشیا اور افغانستان کے میدان میں سرمایہ دار اور مزدور تہذیب قدیم و جدید شہنشاہیت اور جمہوریت کا فیصلہ کرے گی۔ وہ فیصلہ بہت خونریز اور بہت انقلاب انگیز ہو گا!۔ ترکستان پر روسی شہنشاہیت کا ابتدائی قبضہ محض ایک سیاسی فتنہ تھی بلکہ ایک بہت بڑی اقتصادی کامیابی تھی جو روس کے اقتصادی اور تمدنی فلاح و بہبود کی مدد و معاون ہوئی۔ زمین کی پیداوار سے زیادہ انسانوں کی خونریزی کا باعث کوئی دوسری چیز نہیں ہوئی۔ ہرگز در ملک اس لئے غلام بننا ہے یا بنایا جاتا ہے کہ اس کی زمین غلہ یا روٹی پیدا کرتی ہے۔ خصوصاً ہر ایشیائی ملک کا سب سے بڑا گناہی ہے جس کی نرا اس کو یورپ کا امپیریزم دیتا ہے دنیا کی ہر طاقتور جماعت یا قوم غلام اور روٹی مانگتی ہے اور یورپ کے ہر ملک گیر کی یہ راستہ ہے کہ وہ کمزور ملک جو غلہ یا روٹی پیدا کرتے ہیں آزاد رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتے ترکستان میں غلام اور روٹی کے نہر دل اور ریلوں کا وسیع سلسلہ روس کے لئے ایک بہت بڑی اقتصادی برکت ثابت ہوا۔ روسی قبضہ کے بعد ترکستان میں روٹی کی کاشت بہت زیادہ ہو گئی حتیٰ کہ آج دنیا کے روٹی پیدا کرنے والے ممالک میں ترکستان کا دوسرا درجہ ہے۔ روس کی اقتصادی طاقت میں یہ اضافہ عام طور پر سائے یورپ کے لئے ولد و زار خصوصاً انگلستان کے لئے مرجح فرماتا تھا۔ اور اسی وقت سے روس کے اس دیرینہ رقیب کے دل کو ترکستان کی

رونی اور غلہ کے خیال نے بے چین کر دیا تھا۔ مصر کی برطانوی روئی جس طرح روس اور دیگر یورپین ممالک کے دل میں ٹھٹھک رہی تھی اسی طرح ترکستان کی روئی انگلستان کی آنکھ کا کٹا بن گئی تھی باہمی رقابتوں کے اس عالم میں یکا یک جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔

سلسلہ کا روسی انقلاب | گو اس کی بظاہر توقع نہ تھی مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ جرمنی کی طرحی ہوئی طاقت نے انگلستان و روس کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے رقیب نہ جذبات کھلا کر یا ہی تھنکی فکر کریں اور جنگ کے پہلے ہی ہفتے میں دنیا سے سیاست نے یہ عجیب منظر دکھا کہ زار کی شہنشاہیت انگلستان کی امپیریلزم سے بغلیں ہو رہی ہے بڑے بڑے جنگلوں میں جب طوفان آتا ہے تو سراسیمگی کے عالم میں شیر اور ہرن ایک ہی جگہ پناہ لیتے ہیں۔ اور شتر کہ مصیبت میں اپنی دیرینہ دشمنی کو بھول جاتے ہیں۔ یہی حال جنگ عظیم میں دونوں یورپ کا تھا۔ اور شتر کہ خطر کے مقابلہ میں وہ پرانی رقابتوں کو نظر انداز کر کے اپنی متحدہ قوت جرمنی کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ سلسلہ تک یعنی جب تک کہ زار کی خود مختاری کا علم سرنگوں نہ ہوا تھا انگلستان و روس کا اتحاد دنیا کے سارے جغرافیہ کو بدلنے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن روسی شہنشاہیت صدیوں کی سنت گیری اور مظالم کے باعث بنی بنیادیں کمزور کر چکی تھی۔ اور سلسلہ میں عامۃ الناس کے انقلاب عظیم کا مقابلہ نہ کر سکی وہ ایک طوفان نوح تھا جس نے سرزمین روس پر شہنشاہیت کا کوئی نشان باقی نہ رکھا۔ اس خونریز انقلاب نے حقیقت نہ صرف روسی قوم کی آئینی زندگی کو بدل دیا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا کی سیاست کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے ایک نئی عمارت تیار کی جائے۔ یہ مقصد کسی نہ کسی وجہ سے حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن جو تحریک روس میں پیدا ہوئی تھی وہ اپنی اخلاقی تمدنی سیاسی اور دماغی حیثیت میں ہنوز زندہ ہے۔ اور ملک کے اندر ایک حد تک کامیاب بھی ہے۔ یہ موقع اس بحث کے چھڑنیکا نہیں ہے۔ کہ فی نفسہ روسی انقلاب کے بنیادی اصول برے ہیں یا اچھے کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں لیکن جہاں تک ان اور



کا تعلق ہے۔ اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس انقلابی تحریک سے ایشیا کے بعض ممالک کم و بیش متاثر ہو رہے ہیں۔ قدرتا انقلاب کا سب سے زیادہ اثر وسط ایشیا پر پڑا جو پہلے ہی سے روس کے زیر اثر تھا۔ آپ ان اوراق میں دیکھیں گے کہ ترکستان و بخارا کا انقلاب بھی عام سیاسی انقلاب کی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کے اندر بھی تمدنی جماعتوں کی دہی آدیزش صاف نظر آتی ہے جس نے روس کی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کو کسے فنا کر دیا۔ وسط ایشیا کے انقلاب کی بنیاد بھی سوسائٹی کے مختلف طبقات کی باہمی رقابت تھی اور یہی وجہ ہے کہ روس کے انقلاب سے وسط ایشیا کی ریاستیں بہت جلد متاثر ہوئیں اور انکو جدید و قدیم جنگ میں بالشویک اور کمیونسٹ سے کافی امداد حاصل ہوئی۔

وسط ایشیا میں روسی سرمایہ دار۔ وسط ایشیا میں سرمایہ داروں نے اپنے قدم جما دیے تھے۔ جس طرح ہر مفتوحہ ملک میں فاتح قوم کے سرمایہ دار بجایا کرتے ہیں یہ صورت حالات اندرونی نہ تھی بلکہ بیرونی اور ایک فاتح اور شہنشاہیت پرست قوم کی لائی ہوئی تھی۔

زار کی حکومت نے جب وسط ایشیا کو روئی کی کاشت اور غلہ کی تجارت کا مرکز بنایا تو قدرتا روسی سرمایہ داروں کا پنجہ وسط ایشیا کی گردن پر حاوی ہو گیا۔ روئی کی کاشت اور ریلوے جن سرمایہ داروں کے قبضہ میں تھی وہی ملک کی اقتصادی زندگی پر حاوی تھے۔ زار کی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ وسط ایشیا کو گورے رنگ والوں کے لئے ایک تو آبادی بنا دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوتا رہا کہ یورین روس سے روسی تارکان وطن بھیجے جاتے تھے اور ان کو مرکزی حکومت بڑے بڑے قطعات زمین خاص رعایتوں اور مخصوص حقوق کے ساتھ روئی کی کاشت کرنے کے لئے دیتی تھی یہی لوگ ترکستان میں مالکانہ اقتدار رکھتے تھے۔ ذمہ زقہ ملک کی زمین کا بہت بڑا حصہ روئی کی کاشت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ اور زمین کا حاصل روسی سرمایہ داروں کی جیب میں جانے لگا۔ اس طرح ایک خالص زراعتی ملک تجارت اور اس

کے ساتھ آئیوالی اقتصادی مشکلات کا شکار ہونے لگا۔ جیسا کہ ایشیا کے ہر محکوم ملک میں پیش آتا ہے۔ یہاں بھی جو زراعت اہل ملک کی زندگی کا سہارا تھی وہ کم ہو گئی اور ملک کے خوشحال کسان کا رخانوں اور روئی کے بازاروں میں یورپین تجارت کے دست نگر ہو گئے۔ بجائے زراعت کے وہ مجبور ہوئے کہ مزدوری کریں یا کارخانوں میں نوکری کو وجہ معاش بنائیں ریلوے کمپنی کے دفاتروں میں روئی کے کارخانوں میں نہر کے محکموں اور یورپین تجارت کے دفاتر میں وہ ملازمتیں ڈھونڈنے لگے اور بے روزگاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا عہد جدید کا یہ تباہ کن انقلاب ہر محکوم ملک میں یقیناً پیدا ہوتا ہے۔ خواہ کتنا ہی آہستہ اور بتدریج ہو روس کے سرمایہ داروں نے اہل ترکستان کی دنیا بالکل بدل دی اور ایک ایسی اقتصادی واروگیر پیدا کر دی کہ ملک میں ایک دوسرے سے رقیباً نہ آؤ زرخش رکھنے والے دو طبقے پیدا ہو گئے۔ مزدور اور سرمایہ دار

قدیم تمار | دنیا کے ملک میں شاید ہی کوئی ملک تمار سے زیادہ قدیم اور تاریخی ہو۔ لیکن ہم اُن اس کی تاریخ قدیم و جدید سے زیادہ آشنا نہیں۔ جغرافیہ دان یہ بتا رہے ہیں کہ ترکستان بحیرہ ارل سے بحیرہ کیسپین تک ریگستان دریا اور سبزہ زاروں کا ایک وسیع ٹکڑا ہے اُس کے ریگستان کسی عہد قدیم کی تاریکی میں سمندر کے نیچے تھے۔

لیکن عہد قدیم کا وہ سمندر خشک ہو گیا جہاں پانی تھا وہاں اب ریگستان ہے جہاں سرسبز جزیرے تھے۔ وہاں اب عہد جدید کی پانچ آبادیاں ہیں جو وسط ایشیا کی ریہتیں کہلاتی ہیں یعنی خیوآ، تاجک، آفغان، کورہ گند اور مرد موخ بتاتا ہے کہ ان پانچ خانوادوں میں سے ہر ایک ۱۹ ویں صدی عیسوی تک ایک ایک رئیس یا خان کے زیر نگیں تھا۔ یہ خان اپنے قبیلے کے سردار اعلیٰ ہوتے تھے اور اپنے علاقہ میں آزادانہ حکومت کرتے تھے ۱۹ ویں صدی کے وسط میں زار روس کے آہنی پنجہ نے ان خانوادوں کو کچل ڈالا اور وہ روسی شہنشاہیت کے باجگزار اور غلام بنائے گئے جو علاقے کسی زمانہ میں ایک دوسرے سے دور تھے اُن

کو ۹ سو میل کی ریلوے نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ تمدن جدیدہ کی غلامی کی پہلی بٹری ریلوے جو آزاد قوموں کو غلام بناتی ہے، اُن ریگستانوں پر جو ان خانوادوں کو ایک دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھے۔ ۹ سو میل لمبی آہنی پٹری کا جال پھیلا کر روسی حکومت نے خانوادوں کی خانہ خانی کو ختم کر دیا۔ آج لینن گراؤ جس کا نام جنگ سے پہلے پروگراڈ اور اِس سے پہلے سینٹ پیٹرسبرگ تھا اسے سمرقند تک جہاں دنیا کے عظیم الشان تاجمین میں سے ایک تیمور مخو خواب ابھی۔ جو۔ زیل کا سفر بائیں دن میں ختم ہو جاتا ہے اسی ریلوے کی دو شاخیں مرو اور بحیرہ کمپین کے بندرگاہ کراستوڈوسک تک جاتی ہیں۔ یہ دو مرکز وہ ہیں جن کو کہا جاتا ہے کہ ہندوستان پر حملہ کر نیکلے روسی حکومت نے قائم کیا تھا۔ اگر اس جغرافیہ حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ مرد ہرات سے شمال کی طرف صرف ۳۰۰ میل کے فاصلے پر ہے اور یہ تاریخی حقیقت بھی یاد رکھی جائے کہ ہرات افغانستان کا وہ دروازہ ہے جن سے ہندوستان کے بہت سے فاتح گزر چکے ہیں تو ماننا بڑے گاہک ۱۹ ویں صدی کے برطانوی ماہرین سیاست کا یہ خطرہ بے بنیاد تھا۔ اسکندر تیمور چنگیز اور مادر کے بعد ایک دن نکالنے کی فوجیں بھی روسی راستہ پر قدم بڑھا سکتی تھیں۔ لیکن یہ یک گروٹش چچ نیوفسری "وہ سارے نقتے درہم برہم ہو گئے اور زمانہ کے بے پناہ ہاتھ نے نکالنے کے تن بے جان کو گوشہ قبر سے بھی محروم کر دیا۔ ہندوستان کے ہونے والے تاجمین عرصہ تک ایک ایسی خوزیری میں مبتلا رہے کہ جس کی مثال کم از کم عہد جدیدہ کی تارخ کے اندر ملنا مشکل ہے تاہم اگرچہ ہرات کی طاقت باقی نہیں لیکن برطانوی ہندوستان کے متعلق روسی نہیں ہنوز باقی ہے۔ ہوا کے جھونکے اب بھی مرو ہرات کی طرف آرہے ہیں وہ وقت دور ہو مگر ششہ نہیں ہو!

وسط ایشیاء کے باشندے زیادہ تر منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں مذہب عام طور پر اسلام ہے۔ بخاریوں اور ترکستانوں کی طرح ترکمان تاتاری اور کرغی وغیرہ بھی ایسے قبائل ہیں جن کا خون ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے انکی سیکڑوں نسلوں نے صرف ایک

ہی طرز تمدن دیکھا ہے یعنی قبائل پر قانون اور بلاؤں کی حکومت اور ایک قسم کی مذہبی خود مختاری روسی فتوحات نے اس تمدنی حالت کو بدستور چھوڑ دیا اور صرف کیا یہ کہ عامۃ الناس سے اپنر لئے زیادہ مقدار میں کیس وصول کر کے انکو مجلس بنا کر پہلے سے زیادہ سرمایہ داروں کا غلام بنا دیا۔ وسط ایشیا کی ان ریاستوں کے باشندے روسی حکومت کے تحت میں تعلیم سے ہمیشہ محروم رہے۔ اس لئے کہ محکوم اقوام کی تعلیم و تربیت کو زار کی گورنمنٹ اپنے لئے خطرناک سمجھتی تھی۔ چنانچہ روسی فتوحات کے بعد بھی وسط ایشیا جدید تمدن و علوم سے اتنا ہی دور رہا جتنا کہ پہلے تھا البتہ زندگی کی ساوگی جو وسط ایشیا کے لئے ایک قدیم برکت تھی ناپید ہو گئی روسی حکومت کی رشوت ستانی سخت گیری اور تہذیب جدیدہ کے مکروہ خصوصیات کی بدولت ملک کے بنصب باشندوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی ملک کی زمین روئی کی کاشت کے لئے روسی سرمایہ داروں کے قبضہ میں محفوظ کر لی گئی اور کاشتکار روز دہ بے روزگار ہو کر نکار ہونے لگے ایک محکوم ملک میں ان حالات کا جو نتیجہ پیدا ہوا کرتا ہے اُس کے آثار وسط ایشیا میں بھی نظر آنے لگے اور جنگ کے جو اثرات دنیا کی دوسری محکوم قوموں پر مرتب ہو رہے تھے وہ وہاں بھی اپنا کام کرنے لگے۔ حکومت کی سخت گیر لوں اور عام افلاس نے وسط ایشیا کے باشندوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا اور رفتہ رفتہ ایک حقوق طلب جماعت عالم ظہور میں آئی جس نے اپنے حقوق شہریت کا مطالبہ شروع کر دیا اُس زمانہ کی روسی حکومت نے جو بلاشبہ اُس وقت دنیا کی جاہل ترین حکومت تھی اپنے غلاموں کی اس جبارت کو انتہائی سختی کے ساتھ روکا۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔

قومی تحریک کے خلاف اس قسم کی انسدادی کارروائیوں نے اصل تحریک کو بظاہر مٹا دیا۔ مگر حقیقت سطح کے نیچے پہنچا دیا اور ایک آنمی تحریک ایک خفیہ سازش بن گئی، وہ مردوں کے پیچھے اور حکومت کی نظر سے دور اپنا کام کرنے لگی۔ قوم پرستوں کی یہ عجیب جو ایک ہی مقصد کے لئے مختلف ناموں کے ساتھ کام کر رہی تھیں اندر ہی اندر اپنا پروگرام مضبوط

بنائی رہیں ”نوجوان سارو“ ”نوجوان کرغی“ ”نوجوان بخاری“ وغیرہ سب اُن جماعتوں کے نام تھے جو انقلاب روس کے بعد اور کرئسکی کے برسرِ اقتدار آتے ہی پر دے سے باہر آ گئیں۔

**آغاز انقلاب** | جس وقت روسی انقلاب شروع ہوا اُس وقت وسط ایشیا میں دو طبقے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیار تھے۔ ایک طرف عمال حکومت کی جماعت تھی جس کے حامی تھوٹے سے مقامی اکابر خوشامدی اور دو لختہ اشخاص اور کچھ ”ملا“ تھے اور یہ سب اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے خیال سے حکومت کی اعانت پر تلے ہوئے تھے اور جانتے تھے کہ اگر انقلابیوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور موجودہ حکومت کا نظام قائم نہ رہا تو وہ اپنے ہم قوموں کی جماعت اور کمزوری سے وہ فوائد حاصل نہ کر سکیں گے جواب تک اس غیر ملکی حکومت کے سایہ عاطفت میں انکو حاصل تھے۔ اور جس کے متعلق ناواقف اور جاہلانہ مذہبی جذبات رکھنے والے لوگ کبھی اعتراض نہ کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ایک محدود طبقہ وسطی کے نوجوانوں کی مختصر جماعت تھی جنہوں نے اپنے مطالبہ حقوق کا جواب اکثر تلوار اور بارود سے پایا تھا اور اس لئے جانتے تھے کہ جب کبھی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر وہ بغاوت کریں گے تو اُنکا خون بہانے کے لئے حکومت اُن ہی کے ہم قوموں سے کام لے گی۔ جیسا کہ وہ پہلے ہی کئی دفعہ کر چکی ہے۔

روس میں مابین سلاسلہ کے ابتدائی انقلاب کا اثر وسط ایشیا تک نہ پہنچ پایا اُس کے اثرات زیادہ تر یورپین روس تک محدود رہے تھے۔ روس کی اس جدید حکومت نے صرف اتنا ہی کیا کہ ترکستان میں ایک نیا گورنر بھیج دیا اُس کے مشورہ اور ہدایت کے لئے مسلمان عمال حکومت کی ایک مقامی کمیٹی بنا دی جس کا کوئی اثر امن و نظم حکومت پر نہ پڑ سکتا تھا امیر بخارا و خیوا کی حکومت کو جو درحقیقت روسی حکومت کے اس لئے غلام تھے بدستور مضبوط رکھا گیا۔

لیکن اس انقلاب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ قوم پرستوں کی جماعت نے اپنی قوت اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ مبذول کر دی اور جب انکو یہ معلوم ہوا کہ روس میں خود مختاری کا خاتمہ کیا جا چکا ہے تو قدرتنا انہوں نے بھی اپنا یہ مطالبہ پیش کیا کہ اب وسط ایشیا کو کافی آئینی حقوق دے جائیں ابھی زندگی کا یہ نیا نقشہ قائم نہ ہوا تھا کہ ابتدائی انقلاب کے بعد ہی دوسرا خود زیر انقلاب رونما ہوا جس نے سلطنت روس میں بولشویک جماعت کو برسر اقتدار کر دیا۔ اس انقلاب نے وسط ایشیا کی سیاسی فضا میں دفعتاً ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ بولشویک حکومت کی انقلابی پالیسی نے وسط ایشیا کے مظلوم اور مجبور کسانوں اور عامۃ الناس کی آنکھیں کھولیں اور سوسائٹی کے ان طبقات کی بیداری نے زندگی کے ساکن بانی میں تلاطم پیدا کر دیا۔ بولشویک حکومت نے نومبر سلسلہ میں اپنا پہلا اعلان وسط ایشیا میں شائع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

(۱) آئندہ روسی قوم کے تمام عناصر خواہ کسی نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں حکومت کی نظر میں مساوی حقوق اور مساوی درجہ رکھیں گے۔

(۲) اہل روس کو (بلا لحاظ قومیت و مذہب) تجویز طرز حکومت خود اختیاری

(۳) ~~سب سے زیادہ اہم~~ کا پورا حق حاصل ہو گا حتیٰ کہ اگر کوئی جماعت روسی حکومت سے قطع تعلق کر کے آزاد رہنا چاہے تو اس کو بھی ایک جداگانہ ریاست قائم کر لینے کا حق حاصل ہو گا۔

یہ اعلان تھا جس نے وسط ایشیا میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور اس اعلان کے ایک ایک لفظ کا نہایت جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔

نومبر سلسلہ کے اس انقلاب کے اثرات وسط ایشیا کی مختلف ریاستوں پر مختلف صورتوں میں نمودار ہوئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر حصہ ملک کے متعلق واقعات کو جداگانہ مرتب کیا جائے۔

# جدید علم کلام

۴۔ ہم اس بات کو واضح کر دینا بہت ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام نہ مغرب کے خیالات سے مرعوب ہو سکتا ہو اور نہ مشرق کے ان لوگوں کے خیالات سے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر ہیں۔ اسکی یہ وجہ نہیں کہ ہم میں کوئی جاہلانہ ہماہمی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر حسب ذیل عین اہم نظریہ ہیں :-

(۱) اسلام ساری دنیا کے لئے ہے۔ نہ کسی خاص ملک کے لئے

(۲) اسلام کی تعلیم وقت تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے

(۳) اسلام ساری دنیا اور سب ملکوں کے لئے نجات دہی اور نجات اخروی کا واحد مکمل ذریعہ ہے۔

ان نظریوں کو پیش نظر رکھ کر ہم جدید علم کلام سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم میں جو کچھ مختص بال مقام۔ مختص بالوقت اور مشترک بمذہب دیگر ہے اس کو بالکل علمدہ کر کے دکھانا چاہئے۔ اور اگر ممکن ہو تو اسے صراحتاً اختیاری قرار دینا چاہئے۔ اس کے بعد جو کچھ باقی رہیگا وہ متذکرہ بالائینوں نظریوں کے لئے کافی نور وافی ہونا چاہئے۔ اور یہی فرض و واجب اور لازمی ہو سکتا ہے اس عنوان سے اسلامی تعلیم و محصور میں تقسیم ہوگی۔ لازمی اور اختیاری۔ لازمی اسلام کا پاس مارک ہوگا۔ اختیاری نظام اسلام کو قائم رکھنے کے لئے کہیں ضروری ہوگا کہیں غیر ضروری۔ اب اسلام کا ایک اور رز کو رس باقی رہ جاتا ہے جس میں خدا رسول کی محبت تعلیم اسلام پر صدق دل سے کار بند ہونا۔ شرافت نفس کو ترقی دینا۔ دوستوں کے لئے اپنا وقت روپیہ اور ہمت صرف کرنا وغیرہ وغیرہ آتا ہے یہ تصوف ہے اور اسی لئے اس کی تعلیم شروع ہی سے سینہ بسینہ رہی۔ اور سفینہ کی محتاج قرار نہ دی گئی۔ اختیاری اور تصوفی تعلیم

کسی حال میں بھی پبلک بحث مباحثوں اور مظاہروں کی فیصل نہ کیجائے۔ اگر ہمارا مجوزہ علم کلام بہ نقیضیں کرے تو موجودہ غلط بحث اور انتشار رفع ہو جائے۔ اسلام میں جو بہتر تہذیب فرستے گئے ہیں۔ ان پر نظر ثقیق کر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوگی کہ متکلمین کے اختلافات زیادہ تر فروعی ہیں۔ اصولی نہیں ہیں۔ آپر جدید علم کلام میں نہایت وضاحت سے بحث کی جائے۔ اور متذکرہ بالاتینوں نظریوں کو ہر حال میں مشعل ہدایت قرار دیا جائے۔ اس کو ہم صرف ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق مضمون قرآنی و علی العرش ستوی ید اللہ فوق ایدیہم۔ فاین ما تو لوفثم وجہ اللہ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ظاہری فرقہ کے محکمین اس سے جسم لازم قرار دیتے ہیں باطنیہ اور معتزلیہ ان سے خداوند تعالیٰ کا حاضر ناظر ہونا۔ قدرت وغیرہ مراد لیتے ہیں۔ ان اختلافات کی نوبت ایک وقت میں تکفیر تک پہنچی۔ حالانکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ اسکی عظمت قدرت اور محیط ہونے پر یقین رکھنا لازم ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو محض مثال کے طور پر مسئلہ خلق قرآن کا پیش کیا جاتا ہے جس پر عرصہ دراز تک کیا کیلے لے رہی ہے اور کیسے کیسے جلیل القدر علماء راجعہ و تشدد کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہو کہ عادت اللہ کے موافق انبیاء علیہم السلام پر بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے احکام صادر فرمائے۔ ہمارے ہاں اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اب اس بحث میں کیا رکھا ہے کہ احکام حادث ہیں یا قدیم۔ ہمارے اوپر کے لکھے ہوئے تینوں نظریوں میں سے تیسرے نظریے کے تحت میں کہ اسلام ابدالاً و تکملاً نبی اور اخروی کا مکمل اور واحد ذریعہ ہے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام جب تک دنیا موجود ہے جاری رہنے والے ہیں۔ نہ اس میں حادث کی بحث آتی ہے نہ قدیم کی۔ ہمارا نیا علم کلام ان مسائل پر اور ان جیسے اور پیشمار مسائل پر معقول اور مفصل بحث کرے اور ہر معاملہ کو صاف کرے۔

۵۔ عبادات کا مسئلہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے خصوصاً نازک مسئلہ ربیعہ بڑی امتیازی نشان اسکی نچوائے ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً۔ (تحقیق نمازیان والوں پر



بپابندی وقت فرصت میں تمدن فقہ کی رو سے مثلاً صبح کی نماز ساری دنیا میں سوچ بکھنے سے قبل ادا کرنی چاہئے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ضروریات سے فایز ہونے اور وضو کرنے کے لئے آدھ گھنٹہ یا دو گھنٹہ سوچ بکھنے سے پہلے آدمی اٹھے۔ میں جون جولائی کے مہینہ میں لندن میں تھا۔ جہاں صبح کے تین بجے صبح صادق ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں میں وہاں مغرب کی نماز ۹ بجے ہوتی تھی۔ اس کے گھنٹہ سوا گھنٹے کے بعد عشا کی نماز محبوب کر لیجئے تو لندن میں نمازی مسلمان کو دس بجے سے دو بجے تک صرف چار گھنٹے سونیکے لئے ملتے ہیں جو کافی نہیں ہوتے۔ جو لندن کا حال ہے ساری دنیا کے سرد ملکوں کا قریب قریب وہی حال ہے۔ عام طور پر اسکا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ صبح کی نماز تو سوچ بکھنے سے پہلے پڑھ لو اور اس کے بعد سو رہو۔ اس جواب کی خوبی ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتی۔ ہم تو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کی ہر عبادت الہی کے انسان کی ذہنی اور جسمانی فلاح و بہبود ہی مرکوز خاطر ہے یعنی دن بھر کام کر کے رات کو چھ سات گھنٹے آدمی سوئے۔ اور صبح کو اٹھ کر دن کے کاروبار کے لئے طہارت جسمانی اور طہارت نفس یعنی عبادت الہی سے مسلح ہو کر دو دو عانی بجے رات کو بیچ میں نیند توڑ کر دوبارہ سوئے اور صبح کے آٹھ بجے اٹھے تو نشا، فطرت پورا نہ ہوا۔ عیسوی مذہب نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ انکی نماز باجماعت کے اوقات موسم کے اعتبار سے بدلتے رہتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھ سے منصوری میں ایک گر جا کے آگے سائن بورڈ دیکھا جس میں صبح کی نماز کا وقت ۳۰ ستمبر تک کے لئے یعنی گرمی میں ساڑھے چھ بجے یا سات بجے تھا۔ اودی کم اکتوبر یعنی شروع جاتے سے ایک گھنٹہ آگے بڑھا دیا گیا۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اسلام ساری دنیا کے لئے ہے نہ صرف سرد ملکوں کے لئے ہے اور نہ صرف گرم ملکوں کے لئے۔ مگر موجودہ زمانے میں زیادہ تر دنیا کے گرم ملکوں (ہیٹ بلٹ) میں ہی مسلمان رہتے ہیں۔ اس لئے جو احکامات اسلام زیادہ تر گرم ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں رد و بدل کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر ہمارے مجوزہ علم کلام میں ساری دنیا کی اسلامی ضرورتوں کا

خیال کرنا ہو گا۔ اور نہایت قوی اجتہاد سے کام لینا پڑے گا۔ اسی طرح روزہ - حج - زکوٰۃ سب پر ملحدہ ملحدہ مفصل اجتہاد ہی نظر ڈالنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام نہایت مشکل ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اپنے لئے آپ مجتہدین میٹھے اگر ملت اسلامیہ بحیثیت ایک جماعت کے اجتہاد کرے تو وہ بہت کم مضر ہو گا۔ نماز کے مسئلہ کے ساتھ ایک اور اہم مسئلہ بغیر معنی سمجھے ہوئے قرآن شریف پڑھنے کا ہے۔ بے پڑے لکھے آدمیوں کو تو ہم متفقہ کرتے ہیں مگر یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان معمولی پڑھا لکھا ہو اور اس کی مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی موجود ہو۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ کئی چھوٹی چھوٹی سورتیں قرآن شریف میں ایسی ہیں جو مع ترجمے کے آسانی سے یاد ہو سکتی ہیں اس کے لئے بڑی معنی کا قرآن شریف کا پڑھنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ میرے ایک استفتاء کے جواب میں ایک جید عالم نے یہ جواب لکھا تھا کہ ذکر کے لئے معنی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے۔ البتہ تذکرہ کے لئے معنی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اہل عرب کو تو یہ وقت پیش آتی ہی نہ تھی کیونکہ انکی مادری زبان عربی ہے عجیوں کو (اصطلاح میں ہر غیر عرب کو عجی کہتے ہیں) یہ وقت ضرور پیش آتی ہے۔ غالباً احناف میں کوئی فتویٰ موجود ہے کہ عجی لوگ اپنی اپنی زبان میں تلاوت قرآن کر سکتے ہیں اور نماز ادا کر سکتے ہیں۔ غالباً یہ فتویٰ زیادہ تر اہل فرائض کے لئے تھا۔ ہمیں اس کی پوری تحقیق نہیں ہے اور صرف سبیل تذکرہ اس کو بیان کر دیا گیا ہے۔ مجوزہ علم کلام کو اس نازک مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے۔

۶۔ بے شمار فقہی مسائل بیع و شریکاء و طلاق وغیرہ وغیرہ کے ایسے ہیں جن پر نہایت نیک نیتی سے غور کرنا ہے۔ اور ان میں حسب ضرورت اجتہاد سے کام لینا ہے۔ اگر شیعہ اور سنیلوں میں کم از کم معاشرتی اتحاد مقصود ہے تو کوئی راستہ ایسا نکالنا پڑے گا جس کی رو سے سنی شیعہ کے پیچھے اور شیعہ سنی کے پیچھے نماز ادا کر سکے۔ اور کہ مغضہ میں جہاں سنیلوں کے چار حصے قائم ہیں وہاں امامیہ صلی علیہ قلم ہو جائے۔ نادر کے وقت میں جو خطہ

کتابت سلطان روم سے اس معاملے میں ہوئی تھی اس پر از سر نو غور کرنا ہوگا۔

اسی کے تحت میں یہ مسئلہ بھی طے ہو جائے کہ مسلمان مجتہد رافقہ قرار دے جائیں نہ مجبوراً فقہ اب جو یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص ضعیف ہے تو وہ علی طور پر شافعی حنبلی اور مالکی فقہ کو بایکٹ کر دیتا ہے حالانکہ اپنی اپنی جگہ تینوں جائز قرار دی گئی ہیں اسی طرح اگر ایک شخص شافعی ہے تو وہ باقی اڈ فقہوں کو بایکٹ کر دیتا ہے۔ پولیسکل اور عدالتی ضرورتوں کے واسطے یہ احتیاط ضرور منعید ہے مگر شد و مد کے ساتھ مثل ناجائز ہونے کے دوسری فقہ کو بایکٹ کرنا اسلام کی حقیقی خوبی پر پانی پھیر دیتا ہے اصطلاح فقہ میں اس مسئلہ کو متیق کہتے ہیں۔ ہمارا مجوزہ علم کلام اس مسئلہ کو از سر نو صاف کرے ہمارا انشاریہ ہے کہ مثلاً ایک شخص صبح کی نماز حنفی طریقہ سے پڑھتا ہے ظہر کی نماز شافعی طریقہ سے عصر کی نماز مالکی طریقہ سے مغرب کی نماز حنبلی طریقہ سے اور عشاء کی نماز امامیہ طریقہ سے تو یہ سب کچھ جائز سمجھا جائے۔ پیکاس برس کے قریب ہوئے کہ حنفیوں اور اہل حدیث میں دلی شریف میں آمین بالجہر پڑھانی جھگڑا شروع ہوا۔ لاہور تک جہاں اس وقت چیف کورٹ تھی اور اب ہائیکورٹ ہو مقدمہ گیا۔ وہاں سے یہ فیصلہ ہوا کہ اخات اپنی مسجدوں پر مسجد حنفی لکھ لگا دیں۔ پھر اگر غیر حنفی وہاں آکر آمین بالجہر کہیں گے تو انکا عذر قابل سماعت نہ ہوگا۔ آج بھی دلی میں سینکڑوں مسجدوں میں یہ الفاظ پتھر پر کندہ موجود ہیں، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مسجد اسلامی مسجد ہے اور اس کو کسی خاص فرقہ کے ساتھ مخصوص کر دینا صحیح نہیں ہے۔ ہمارا مجوزہ علم کلام اس پر بھی غور کرے۔

۷۔ عرصہ ہوا پنجاب میں ایک فرقہ قرآنی نکلا جس کے سرگروہ مولوی عبداللہ صاحب چکرا لوی تھے اب بھی اس فرقہ کے بہت سے لوگ موجود ہیں اور اس فرقہ سے تعلیم قرآنی کو معقول مدد مل سکتی تھی۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے انکی تعلیم میں حدیث اجماع اور قیاس تینوں سے استغناء برتا گیا ہے۔ اہل حدیث کا بھی معقول گروہ ہے۔ مگر انکا نقطہ نظر زیادہ تر فقہ سے ایک بڑی حد تک بکدوش کرنا ہے۔ اب فقہ والوں میں مسئلہ متیق نے جس کا اوپر

ذکر کیا گیا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے چار مستقل ہاد علیحدہ علیحدہ کیمپ قائم کر دے ہیں اور ہر فرقہ کا ماننے والا کسی فقہی مسئلہ کو اپنے امام تک پہنچا دینا کافی سمجھتا ہے۔ غالباً اس کا سبب انحطاط علم ہے۔ ورنہ عملی طور پر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسئلہ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے متعلق نص یہ ہے کہ معتبر اخبار یہ ہے اجماع امت یہ ہے۔ اور قیاس مجتہد یہ ہے۔ جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں متذکرہ بالا فرقے اپنی اپنی تحقیقات میں اجتہادی خصوصیت پیدا کریں۔ یعنی اس کے اکسپرٹ ہو جائیں۔ پھر کوئی جماعت ایسی ہو جو ان کی تحقیقات پر نہ صفا نہ نظر ثانی کرے۔ اسی طرح سے یہ جماعت صوفیا کی مختلف جماعتوں سے سوالات قائم کر کے جوابات مانگے۔ اور پھر یہ جماعت ان سب کو سامنے رکھ کر جدید علم کلام تیار کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام جتنا مشکل ہو اس سے زیادہ سب فرقوں میں اتفاق اور اتحاد کا محتاج ہو۔ اگر یہ نہ ہوگا تو غیروں کے اعتراضات اور انہوں کے تشکوک و ن بدن بڑھتے جائیں گے۔ اور پھر قرآن حدیث اجماع اور قیاس۔ ان سب کا سنبھالنا علیحدہ علیحدہ ہر فرقے کے لئے اور مجتمعاً کافہ المسلمین کے لئے خاتم بدھن دشوار سے دشوار تر بلکہ ناممکن ہو جائیگا۔ اگر اس خالص اسلامی ضرورت کا ہم لوگوں میں احساس پیدا ہو سکے اور یہ اہم کام ایک مرکزی حیثیت اور سب فرقوں کے اتفاق اور اتحاد سے شروع ہو سکے تو توہی امید ہے کہ معترضین اور تشکیلیں کی سیل رواں کا سد باب ہو جائیگا۔ اور یہ کام نہ صرف مسلمانان ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے کارآمد ہوگا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خصوصاً ہندوستان میں بہت سے اہم نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اور آئندہ ضرور اور ہونگے۔ مثلاً ایک مسئلہ ملکی اور مقامی ٹیکسوں کا ہے۔ اگر ایک صاحب نصاب سلطان نہایت نیک نیتی کے ساتھ زکوٰۃ شرعی بحال دے تو اجتہاد اس کا ذمہ دار ہونا چاہئے کہ ملکی اور مقامی سارے ٹیکس اسی میں سے ادا ہو سکیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً ایک صاحب نصاب مسلمان کے پاس سو روپیہ واجب الزکوٰۃ ہیں اس کو چاہئے کہ دیا تدار کی کیا تھ ڈھائی روپیہ زکوٰۃ کے نکال کر علما کی اس انجمن میں داخل کر دے جو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول

کرنے اور ملکی اور میونسپل ٹیکس ادا کر نیکے لئے قائم ہو۔ اب با انجمن ایک پرچہ بنائے کہ اس کو کیا کیا ٹیکس  
 دینے ہیں اگر وہ ڈھائی روپیہ کے اندر اندر ہیں تو جتنا روپیہ اسے ٹیکس میں ادا کرنا ہو وہ واپس  
 کر دیں۔ اگر ٹیکسوں کا مجموعہ ڈھائی روپیہ سے زائد آتا ہے اور وہ شخص لطیف خاطر زائد دینے پر مستعد  
 نہیں جو تو یہ علماء کی انجمن انفرادی طور پر نہیں بلکہ جماعتی طور پر گورنمنٹ اور میونسپل کمیٹیوں سے اپیل کرے  
 کہ ڈھائی روپیہ سے زائد ٹیکس میں تخفیف کی جائے۔ خیر یہ تو نہایت مشکل کام ہے اور کون ایسی  
 انجمن بناتا ہے اور اپنے ذمہ یہ رد دوسری لیتا ہے۔ سر دست اتنا ہی کافی ہے کہ علماء قوت سے  
 دیدیں کہ ٹیکس زکوٰۃ میں سے دے جاسکتے ہیں۔ علماء اس کے جواب میں یہ فرمائیں گے کہ زکوٰۃ  
 کا مصرف مخصوص قرآن سے مقرر شدہ ہے۔ اور ہم اس میں مداخلت کرنے کے مجاز نہیں ہیں  
 ہم نے جو اوپر لکھا ہے کہ جستہ ہذا زکوٰۃ میں سے ٹیکس ادا کر نیکہ کفیل ہو اس سے ہماری یہی مراد  
 ہے کہ علماء امت سر جو ڈکٹر ٹھیں اور نیک نیتی کے ساتھ نئی ضرورتوں کے موافق نئے مسائل  
 تیار کریں۔

۸۔ تعلیم عام۔ تعلیم نسوان۔ پردہ۔ اختتام بحاح اور مثل انکے بہت سے ایسے مسائل  
 ہیں جن میں مذہب اور رواج کا خلط ملط ہے رواج صدیوں کی عام ضرورتوں کے اعتبار سے  
 جاری ہوتا ہے۔ اور ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ رواج کی ہر بات کا قلع قمع ہو جائے۔ بلکہ ہم  
 صرف اس قدر چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں نتیجہ کو دیکھ جائے کہ اس میں ناگزیر مذہبی عنصر اس قدر ہے اور فضیلتی  
 رواجی عنصر اس قدر۔ رواجی عنصر پر موجودہ زمانہ کی قومی اور ملکی ضرورتوں کے اعتبار سے نظر  
 ڈالی جائے اور اس نقطہ نظر پر نہایت ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کی جائے کہ فلاں بات سنون ہو  
 یا سبب سنت اسلام کا بڑا امتیازی عنصر ہے۔ اور اسکی تخفیف یا اس سے روگردانی کر نیکے  
 لئے کوئی اہل دل مسلمان مشورہ نہیں دے سکتا۔ مگر اجتہاد اس قدر تو کر سکتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ  
 میں موجودہ ضرورتوں کے اعتبار سے رد و بدل یا نرمی کی ضرورت محسوس ہو تو بدبخت عالم  
 اس نظریہ کو سامنے رکھ کر اجتہاد کریں۔ کہ اگر آج رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور

مجتہدین دنیا میں تشریف فرما ہوتے تو وہ کیا حکم دیتے۔ بہ تبدیل الفاظ قرآن حدیث کثیفہ سے احتیاط کر کے نئے مسائل میں بڑی احتیاط اور دیا ننداری کے ساتھ اجتہاد کریں۔ اس سارے مضمون کا خلاصہ یہ نکلا کہ جدید علم کلام بنائیکی ضرورت ہو یا نہ ہو، قرآنی فرقہ حق پر ہو یا اہل فتنہ حق پر ہوں۔ یہ شکایت صحیح ہو یا غلط کہ مسلمان سست عمل ہوتے جاتے ہیں اور مذہب کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اجتہاد کی اشد ضرورت ہو اور اسی پر ہم زور دینا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈکنن بی میکڈونلڈ ایم اے بی ڈی اپنی کتاب موسومہ

## Development of Muslim Theology, Jurisprudence & Constitutional Theory

”اسلامی دینیات قانون اور اصول تنظیم کی تدریجی ترقی“ میں فرماتے ہیں۔  
”اگر اسلام میں آئندہ ترقی کرنیکا موقعہ ہے تو تعلیم کو اچھی طرح وسیع کیا جائے تربیت یافتہ و ماعوں کا واسطہ بہت زیادہ بڑھایا جائے اور ان میں اور ان عوام میں جو سیکندری ہے اس کو بٹایا جائے۔ قلت تعلیم نام کام ہو چکی۔ اس نے اس اصول کو تباہ کیا جس کی حفاظت اسے منظور تھی۔ شاگرد کی غلامی اپنے استاد کے ساتھ بالکل سدو ہو جانی چاہئے۔ تقلید کے برخلاف طالب علم کے واسطے ہمیشہ یہ ممکن ہونا چاہئے کہ وہ ابتدائی اصول اور ابتدائی واقعات پر نظر ڈال سکے۔ اور جو بڑے اماموں اور مجتہدوں نے سکھایا ہو اس کو نظر انداز کر سکے۔ اہل ظواہر میں کم از کم اتنی خوبی ضرور تھی۔ ابتدائی واقعات میں طبعیات کے سائنس کے واقعات شامل ہونے چاہئیں۔ طالب علم کو چاہئے کہ مختلف طبقوں کے جوئے کو اپنی گردن پر سے اتار کر اپنی ذات اور نفس کے مطالعہ سے روگردانی کر کے دنیا سے عظیم کا مطالعہ کرنے اور یہ مطالعہ ابعد الطبیعات کے طور پر صرف ان قوانین کا جو دنیا پر بحیثیت ایک

( ۱ ) متقدم جامع کے حاوی ہیں نہ کرے بلکہ اس سائنس سے بحث کرے جو زندگی سے اس کے ہر شعبہ میں بحث کرتا ہے۔<sup>۲</sup> اور طالب علم کو یہ چاہئے کہ اپنے آپ کو حقائق کی بھول بھلیوں میں کھودے۔ بلکہ بجائے بلند نظریہ قائم کرنے کے خود تجربہ کرے اور آزمائے۔

ڈاکٹر موصوف کا ارشاد ہمارے واسطے نعوذ باللہ قرآن و حدیث کا حکم تو رکھتا نہیں مگر جس وقت نظر کے ساتھ انہوں نے ان اصول کو بیان کیا ہے جو انکی رائے میں اسلام کی آئندہ ترقی کے لئے ضروری ہیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہر اہل علم کا خوشگوار فرض ہونا چاہئے۔ زندگی کے ہر شعبہ کی تحقیقات سے سائنس کی نہایت وسیع اور صحیح کوشش مراد ہے اور یہ اسلامی تعلیم کے آئندہ نصاب میں قطعاً داخل ہونا چاہئے۔ ہم نے دسمبر ۲۵ء میں اپنے مضمون خلاصہ تعلیم اسلام میں جو رسالہ ”المذہب“ میں چھپا تھا عقیدہ توحید کے ضمن میں عرض کیا تھا۔

”اس عقیدہ میں ذات واحد کی برتری اور قدرت کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ کل مادی اشیاء کا فانی اور تغیر پذیر ہونا بتایا ہے اور اس میں ایک یہ بھی مصلحت ہے کہ انسان ان میں سے کسی کو اپنے خیالات کا منہا اور منہا مستحق توجہ خاص یعنی معنی عبادت نہ ٹھہرے۔ مگر اسلام کا منشاء ہرگز ہگز یہ نہیں ہے کہ ان کو روگردانی کی جائے اور عقل اور تجربہ کی مدد سے انکی مابیت نہ دریافت کی جائے اور ان سے خاطر خواہ کام نہ لیا جائے مادی اشیاء فانی اور تغیر پذیر ضرور ہیں مگر بے کار اور بے سود نہیں ہیں ربنا ما خلقت هذا باطلا (لے پر در و گار تو نے اسکو عبث پیدا نہیں کیا) کا زیر اصول انکے کارآمد ہونے کی دلیل ہے اور انسان پر جس کا حق پیدائش ترقی کرنا ہے لازم ہے کہ مابیت اشیاء کی تحقیق کرے اور ان سے بنی نوع انسان کی خدمت کا واجبی کام لے۔ اس کلیہ سے سائنس کا پڑھنا قریب قریب فرض کے ہو جاتا ہے اور اس میں مصروف ہونا ایک امر اختیاری اور منجملہ کمالات دنیوی کے ایک کمال قرار نہیں پاتا بلکہ ایک صحیح عقیدہ کی تائید اور تکمیل کا فن تسلیم ہوتا ہے صلح

Biology

۱ Cosmology

حقیقی کی صنعتوں کا علم خواہ انسان کو کتنا ہی محدود کیوں نہ حاصل ہو اُس کی عظمت و جلال کو دل میں مضبوط کرنا ہے اور مادی اشارے انسانوں کی خدمت لینا مبین نشانہ الہی کے موافق معلوم ہوتا ہے جو لوگ مامیت اشارہ دریافت کرنے اور ان سے انسانوں کی خدمت کا کام لینے کے علوم اور فنون کو نظر انداز کرتے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ معنوی طور پر صالح حقیقی کی صنعت کا ملکہ کا احکا کر رہتے ہیں اور جو رموز انکشاف و عظمت و جلال الہی کے ان میں منظر ہیں ان سے بے خبر رہتے ہیں اور ایک نیا انہیل پی اس غفلت اور لاپرواہی کا جواب دینا ہو گا۔ اُس سلمان کا جس کو خدا نے وحدہ لا شریک اور قادر مطلق کا پورا یقین ہے جیسا کہ تعلیم اسلام کے موافق ہونا لازمی ہے۔ سائنس بہترین خادم اور رفیق راہ ہے نہ کہ دشمن زین اور گمراہ کرنے والا۔ خلاصہ اسکا یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے نصاب کی پوری چھان بین اور پڑتال کرنی ہے اور غالباً بالکل نیا نصاب اختیار کرنا ہو گا۔ پھر ساری ہندو دنیا کی طرح ایک حد خاص تک علما اور دنیا داروں کی تعلیم کو قدسے مشترک کرنا ہو گا جس طرح ایک پادری صاحب ایم۔ اے اور ڈی ڈی ہوتے ہیں یہی ڈاکٹر کثرت ڈی ڈی یعنی عالم دینیات کا کورس انہوں نے ایم۔ اے کو کورس کے علاوہ پڑھا ہے۔ اس ایم۔ اے کے کورس میں وہ اس پروفیسر یا سول انسر سے تعلیم میں اشتراک عمل رکھتے ہیں جو ان کی طرح ایم۔ اے ہے مگر ڈی ڈی نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے علما کی تعلیم ایم۔ اے نہیں تو بی۔ اے تک ضرور رہی ہونی چاہئے جو دنیا دار بی۔ اے کی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ کہ بعض اسلامی مدارس میں صرف انگریزی بطور زبان کے تھوڑی سی پڑھائی جاتی ہے یا تو انہیں تھوڑا سا جغرافیہ تاریخ اور حساب سکھایا جاتا ہے۔ بالکل ناقص اور ناکافی ہے۔ ہم تواجتماع سے یہ کام لینا چاہتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر بھی اچھی طرح غور کرے اور مسلمانوں کی تعلیم کا مکمل اور یہ فیصلی پروگرام بنائے۔

آخر میں مودباہ مستعدی ہوں کہ اسلامی اخبارات و رسائل اور دوسرے اہل قلم مسلمان اس وسیع اور اہم مضمون پر اظہار خیال فرما کر عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں۔



# مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ

از علامہ ہوشی

ہندوستان میں ہمیشہ سے لیکن یورپ میں جنگ عظیم کے بعد سے نمایاں طور پر ہمیں ایک ایسی جماعت نظر آتی ہے جو روزِ مغرب کے زوال کا خواب دکھائی دیتا ہے علاوہ کانٹ کا یز رنگ *Conservative* اور سینو رتی کے برین فلنی اسپنگلر کی کتاب "اکھلاطیورپ" کے عنوان اور مضامین سے قارئین کرام واقف ہونگے۔ ہندوستانیوں کے لئے اس قسم کے خیالات کوئی عجوبہ نہیں ہیں جنگ سے بہت قبل حضرت اکبر الہ آبادی مغرب کی ہجو کر چکے ہیں۔ کچھ تھوڑے ہی دن بعد علامہ قبل نے اپنا مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اور خیر آج تو یہ عالم ہے کہ ہر کس و ناکس یہی راگ گاتا ہے۔ ضرورت اب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر مشانت سے غور کیا جائے۔

تمدن کی قسمت کا فیصلہ اس طرح تو نہیں ہو سکتا کہ لسانِ اعصر مرحوم نے فرمایا کہ:-

مشرقی کو ہر ذوق روحانی مغربی کو ہر میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈار دن بولے بوز نا ہوں میں

غالباً علامہ اقبال کو خود ہی کچھ تسکین اس شعر سے ہوئی ہوگی کہ موصوف نے جمہوری طرزِ حکومت کے متعلق ایک فیصلہ صادر فرمایا کہ:-

گریڈ اڈسز جمہوری غلامِ بختہ کا رہے شو

کہ از مغزو و صد خرنگہ کراف نے نمی آ یہ

اس قسم کی تعلیمات پر صرف وہ سوسائٹی وجود میں آ سکتی ہے جس سے ہم سب اس عجلت اور بدحواسی سے نجات پانا چاہتے ہیں۔ مگر خیر شاعر کے لئے سب کچھ جائز ہے۔

میں اس سلسلہ میں ایک نوجوان چینی علامہ ہونگی (Shen - Hu) کے خیالات جامعہ کے قارئین کو کام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف کا رجحان میں کچھ نپٹت جواہر لعل جی جیسا ہے۔ اگر عوام موصوف کے نام سے آشنا نہیں تو اسکی وجہ یہ ہو کہ علامہ موصوف عام سیاسی تحریکات کے بجائے علمی تحریکات سے وابستہ ہیں۔ موصوف کی اہمیت کے متعلق صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ سلسلہ میں علامہ موصوف ایک تحقیقی مقالہ قدیم چینی فلسفہ اور منطق پر لکھ چکے ہیں جو انگریزی زبان میں تنگھانی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سلسلہ آپ کی تصنیف ”چین کی نشاۃ ثانیہ“ پبلنگ سے شائع ہو کر ہر طبقہ کے لوگوں سے آپ کو روشناس کرا چکی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مصنف ظواہر کا پرستار نہیں بلکہ اپنی اور مغربی تہذیب کے تمام پہلوؤں پر عالمانہ عبور رکھنے کے بعد مشرقی تہذیب کی تنقید پر مجبور ہوا ہے۔ باقی فیصلہ قارئین خود کر لیں گے کہ مصنف کو مغربی تمدن کی ترجمانی میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہو۔

اس ضمن میں میں قارئین کو مسٹر بیروڈ (K. Harold A. Beards) کی ایک کتاب سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ مسٹر بیروڈ نے جو علم الحیثت اور تاریخ کے ماہر اور بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مجموعہ مضامین ”انسانیت کس رخ پر جا رہی ہے“ کے نام سے امریکہ میں شائع کیا تھا جس میں متعدد بین الاقوامی شخصیات رکھنے والے صاحبان بصیرت کو بلا قید لکھنے کی دعوت دی تھی۔ تمدن جدید کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پوری تہذیب کا جائزہ مصنفین نے لیا ہے اور مسٹر بیروڈ نے ایک پر بصیرت مقدمہ اور تتمہ اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر ہونگی کو مشرقی اور مغربی تمدن کے موازنہ پر لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مولف نے علت طبع پر اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے :-

”یہ کتاب ایک قسم کا دعوئے ہے۔ بے معنی ادبام کی بوٹ نہیں ہے۔ کوئی صفا  
 دغزاس میں پنہاں نہیں ہے۔ ہمارا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اس کرہ زمین پر سائنس اور  
 مشین دونوں نے واسے حقائق ہیں جن سے ہر ایک کو چاہے وہ مصنف ہو یا معلم۔  
 واعظ ہو یا قاتل ملت ضرور دوچار ہونا پڑیگا۔ اس کے منکر کی قیمت میں پہلے سر  
 ہی شکست اور نامرادی لکھی ہوئی ہے۔ یہ تصنیف چہتر مین بیلک اور اینگلز جیسے  
 فلسفیوں کے مایوسانہ خیالات کو صحیح ماننے سے انکار کرتی ہے اور بجائے مایوسا  
 کے مغربی تمدن کے امید افزا پہلوؤں کو پیش کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

میں نے ترجمہ میں وہ چند سطور حذف کر دی ہیں جن میں خصوصیت  
 سے چینی حالات کو سامنے رکھ کر چینی فلسفہ کے مخصوص ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔  
 میں مصنف اور پبلشر کا خصوصیت سے ممنون ہوں کہ انہوں نے جامعہ کے لئے  
 مجھے اس مضمون کے ترجمہ کی بلا قید اجازت دی ہے۔

### محمد اشرف

کچھ مدت سے بعض مغربی مصنفین کی مایوسانہ طبیعت نے وہی پرانی خام خیالی کی صورت  
 اختیار کر رکھی ہے یعنی مغربی تمدن کی مادیت اور بے بنیادی اور مشرقی تمدن کی روحانیت اور  
 برتری کے راگ گائے جانے لگے ہیں۔ گزشتہ سال جب میں جرمنی میں مقیم تھا تو ایک جرمن عالم نے  
 نہایت متانت کے ساتھ مجھے باور کرایا کہ مشرقی تہذیب کے بنیادی اصول روحانیت پر مبنی  
 ہیں۔ وہ اس درجہ جوش میں تھے کہ وہ تشریح کے طور پر فرمائے لگے کہ مشرق میں آدمی تو آدمی  
 انکی روحانی تقسیم بھی اخلاقی مراتب کے مطابق کیجاتی ہے۔ گو اس قسم کے خیالات جنگ زدہ یورپ  
 کی نیم بیمار ذہنی کیفیت کے مظاہر ہیں اور اس سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتے مگر بغیر جیسی سے اس  
 کا یہ برا اثر ضرور ہوتا ہے کہ اس سے مشرقی تہذیب کے مدعیوں اور رجعت پسندوں کے دہشت  
 منہ مسئلہ تنازع کی طرف اشارہ ہے۔

باز و مشرق میں اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مغرب میں بھی جیسا کہ مجھے اپنے حال کے سفر سے اندازہ ہوا ایسے حضرات کی تعداد کم نہیں ہے جو اس قسم کی خام خیالی کی بدولت اپنے تمدن کے صحیح معانی جواب یورپ سے بڑھکر انسانیت کا تمدن ہو جاتا ہے۔ سمجھنے سے قاصر ہوئے جا رہے ہیں میں ایک نئے سطح نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتا ہوں اور ایک نئی بنیاد پر اس بحث کو منتقل کر کے مشرقی اور مغربی تمدن سے بحث کر دوں گا۔

(۱)

ایک سچے چینی کی طرح میں کنفوشش کے فلسفہ سے ابتدا کروں گا۔ کنفوشش کی تعلیمات کے مطابق تمدن کے تمام آلات کلہا ابتداء روحانی ہوتے ہیں۔ آخر انکا ماخذ تصورات داعیان ہیں۔ اگر ایک طرف انکے ذہنی تعلق کا نام تصورات ہے تو دوسری طرف انکی جسمانی صورت کو ”آلات“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب ایک آدمی اُن سے کام لینا چاہتا ہے تو وہ اس کا ”شکل“ یا ”سانچہ“ نام دیدیتا ہے جب وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان سے کام لیتا ہے تو وہ اسپر خیران رہ جاتا ہے اور انہیں دیوتاؤں کے کارناموں سے منسوب کرتا ہے۔ تشریفاً اس سلسلہ میں کنفوشش نے بہت سی مثالوں سے اپنے خیال کو واضح کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے پہل آدمی نے سطح آب پر لکڑی کے ٹکڑوں کو تیرتے دیکھا اور اسکی مدد سے شدہ شدہ اُس نے جہاز اور کشتیاں ایجاد کیں۔ شاید کبھی اس کی نظربانی کے نیچے دبی ہوئی لکڑی پر پڑ گئی اور اپنے والدین کے مردہ اجسام کو محفوظ رکھنے کے خیال سے اُس نے تابوت اور فرارات بنا ڈالے اُس نے آسمان سے بارش کے قطرے گرتے دیکھے اور غالباً اس خوف سے کہ آہستہ آہستہ واقعات انسانی حافظہ سے محو ہو جاتے ہیں اس نے گرہ لگا کر یاد رکھنے کے بجائے طرز تحریر ایجاد کیا۔

یہ ایک خالص چینی خیال ہے اس لئے کہ چینی حروف اور سے نیچے اچھوتے طریقے پر لکھے جاتے ہیں۔

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہ ہوگی کہ نقوشش کے اس خیال کی مغرب میں غلطی اور ارسطو نے تائید کی ہے غرض انسانی آلات اور ادارات کی ابتدا تصورات سے ہوئی یا خیالی سانچوں سے جنہیں سقراط ”علت علوی“ سے موسوم کرتا ہے۔ کائنات نقوش غلطی اور ارسطو اس بھلے زمانہ میں تھے جب انسانی ذہن قرون وسطیٰ کی اس دوئی میں مبتلا نہوا تھا جس نے روح اور مادہ کی بے معنی تقسیم کی اور اس زمانہ تک انسانی ایجادات کی مادی اور روحانی صورتوں کی یکسانیت کو نہ بھولا تھا۔ حقیقتاً ایسا کوئی وجود نہیں ہے جس پر خالص مادی تہذیب کا اطلاق کیا جاسکے۔ تمدن کا ہر آلہ کار انسانی ذہن کا ہی کرشمہ ہے جو فطری و دلیکے کام لیکر مادہ اور قوت سے اپنی ضرورتوں خواہشوں اور روحانی و ذہنی پیاس کو فرغ کرتا ہے مٹی کا ہر کوزہ اسی درجہ روحانی ہے جس قدر کہ شاعر کے شعر اور اسی اعتبار سے دو گور تھ بلڈنگ گرجاے سنٹ پال سے کم روحانی مرتبہ نہیں رکھتی۔ دراصل جب پہلی بار انسان نے لکڑی کی گرڑے آگ پیدا کی تو یہ ایجاد فی نفسہ ایک روحانی کرشمہ بھی گئی اور اسے ایک بڑے دیوتا سے منسوب کر دیا گیا۔ تمثیل چین میں مذہبی فنانہ کے بڑے بڑے کٹر تمام موجود تھے فلسفی نہ تھے مثلاً چین آگ کا موجود تھا۔ یوشونے پہلی بار دنیا میں سکونت کی بنیاد ڈالی بسٹینگ زراعت اور طب کا استاد اول سمجھا گیا۔

ہم اے اجداد آلات کے موجودوں کو دیوتا قرار دینے میں حتی بجانب تھے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان ایک آلات ساز حیوان ہے اور آلات بنانے کا دوسرا نام تمدن ہے آگ کا علم انسانی تمدن کی ایک منزل ہے۔ زراعت دوسری منزل کا نام ہے۔ طباعت تیسری کا۔ تیس علی ہذا کچھ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب ہی بجا طور سے اس کا دعوے کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بحر چین سے لیکر جزائر برطانیہ تک دنیا کی بڑھتی ہوئی تمدنی ترقی کو قرون وسطیٰ کی مخصوص روایات

کے سیلاب میں ڈبو دیا۔ خدا خدا کر کے خوردین۔ دھانی انجن۔ بجلی اور ریڈیو کی بدولت تمدن دنیا اب اس جگہ پہنچی جہاں ہم اسے پاتے ہیں۔ اور اگر گزشتہ زمانے کے عابد اور زاہد اس قابل سمجھے گئے کہ انہیں دیویوں اور رکشیوں کا مرتبہ دیا گیا تو آج گلیلیو، واٹ، اسٹینفس، ارس۔ سیل ایڈیسن بلکہ فورڈ بھی قطعی اس کے مستحق ہیں کہ انکی دیوتاؤں کی طرح عزت اور حرمت کجائے بلکہ پرامتھیوں اور کینڈمس کی طرح انکے نام کے عبادت خانے قائم کئے جائیں۔ یہ ہمتیاں انسان کی انتہائی الوہیت کی منظر ہیں یعنی اس ذہانت استراعیہ کی جو آدمی کے لئے اوزار فراہم کرتی اور تمدن کو معنی پہناتی ہو۔

ہر قوم کا تمدن اس کے مجموعہ کمالات پر مشتمل ہو جو اس نے اپنے ماحول سے مانوس ہونے میں پیدا کیا ہو۔ اس میں کامیابی یا ناکامی اس قوم کی اپنی ذہانت کے استعمال کرنے کی قابلیت پر منحصر ہے یعنی یہ کہ وہ کس درجہ موثر اور تعداد میں کتنے ضروری آلات اپنی ضروریات کے لئے فراہم کرتی ہے۔ تمدن کی ترقی کا دار و مدار ان آلات کے بہتر ہونے پر منحصر ہے۔ تمدنی ادوار کے مختلف ناموں میں مثلاً دور حجری دور آہنی دور دھاتی دور برقی تمدنی ترقی کی داستان نمایاں ہے اور جس طرح یہ تعریف تمدن کے تاریخی ارتقا پر صادق آتی ہے اسی طرح یہ تمدن کی جغرافیائی تقسیم پر بھی ہو جو صبح اترے گی۔ مشرقی اور مغربی تمدن کا فرق ان کے آلات مستعملہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں مغرب مشرق کو اس اعتبار سے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے، کیونکہ بعض مغربی قوموں نے فطرت پر قابو پانے کے نئے آلات اور اپنے کام کرنے کی قابلیت بڑھانے کے نئے وسائل معلوم کر لئے ہیں۔ مشرق جو متعدد معرکہ آرا آلات کا موجودہ چمکا ہے آج اپنی اس پُرانی عظیم الشان روایت کو بھول چکا ہے اور اس کی بدولت آج جسمانی محنت کے دور میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک زمانہ ہوا کہ مغرب دھاتی طاقت اور برقی قوت کے استعمال سے بھی دو قدم آگے بڑھ چکا ہو۔

غرض کہ مشرقی اور مغربی تمدن کا فرق صرف اس قدر ہے کہ مشرقی تمدن کی بنیاد بیشتر

جسمانی شقت پر ہے یعنی اس اعتبار سے کہ جسمانی محنت تمام قوت عالمہ کا سرچشمہ ہے۔ مغرب کا جدید تمدن مشین کی قوت پر تعمیر ہو رہا ہے۔ یا بالفاظ دیگر جس طرح میرے ایک محترم امریکن دوست نے نہایت خوبی سے ادا کیا کہ ”امریکہ میں ہر مرد عورت اور بچے کی چاکری میں ۲۵ سے ۳۰ تک مشینی غلام لگے رہتے ہیں۔ جبکہ اسی نسبت سے چین میں ہر مرد عورت اور بچہ کے حصے میں مشینی غلام کا صرف تین چوتھائی حصہ آتا ہے“ ایک امریکن انجینئر نے تقریباً ہم معنی الفاظ میں اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا کہ ”ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر فرد واحد کے لئے ۲۵ تا دیدہ غلام کام میں لگے رہتے ہیں۔ امریکن مزدور روزی کی غلامی میں نہیں بلکہ ایک بڑی قوت کے مالک کی حیثیت سے چاہے وہ خود اس کا احساس کرے یا نہ کرے، زندگی بسر کرتا ہے۔

یہاں اگر دونوں تمدنوں کے اختلاف کی تشریح ہو جاتی ہو۔ ابتداء یہ فرق صرف کسیت میں نمایاں تھا لیکن ہوتے ہوتے اب یہ فرق کیفیت میں بھی بین نظر آتا ہو۔

۲

جولائی ۱۸۴۰ء میں یورپ جانے کے ارادے سے میں بندرگاہ ہاربن میں آیا۔ موجودہ شہر ہاربن اس سے پہلے روسیوں کے قبضہ میں تھا۔ ایک نہایت مختصر تجارتی مرکز سے بڑھتے بڑھتے ہاربن اب شمالی چین کا شنگا ہی سمجھا جاتا ہے۔ روٹنی شہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چند میل دور ایک چینیوں کا شہر بھی آباد ہو گیا ہے۔ جہاں ابتداء میں چند کسانوں کے گائوں تھے۔ شہر سے گذرتے ہوئے میں نے خصوصیت سے اس امر پر غور کیا کہ اگرچہ چینی شہر میں تقریباً تمام ذرائع آمد و رفت رکشا یا دہ گاڑیاں ہیں جو آدمی خود چلاتے ہیں لیکن پُرانے روسی علاقہ میں رکشاؤں کا داخلہ بند ہے۔ گو اب یہ روسی شہر بھی چینیوں ہی کے قبضہ میں ہے۔ لیکن پرانی روسی روایات اور ان کے اثرات بدستور سابق جاری ہیں یعنی یہ کہ جدید شہر میں بھی آمد و رفت و رسل و رسائل ٹرام اور ٹکسی کے

ذریعہ سے ہے۔ اور رکشاؤں کا داخلہ ممنوع ہے بلکہ حکم یہ ہے کہ بغیر کرایہ دیئے انہیں حدود شہر سے باہر کر دیا جائے۔

یہاں میں نے اپنی جزائیاں سلومات میں ایک عظیم الشان اضافہ کیا یعنی مجھے اس درمیانی خط کا پتہ پتلا جو مشرقی اور مغربی تمدن کا حد فاصل ہے شہر باربن مشرق اور مغرب میں اس طرح امتیاز قائم کرتا ہے کہ ایک میں رکشائی یعنی آدمی کی چلائی ہوئی گاڑیوں والا تمدن ہے اور دوسرے میں موٹر والی یعنی مشین والی، تہذیب ہے۔ مشرقی تہذیب کے حمایت کرنیوالو۔ خدا را اس واقعہ پر غور کرو۔ آخر ایک ایسے تمدن میں جو انسانی غلامی کی اس خوفناک اور مسخ صورت کو جسے رکشائی کہتے ہیں گوارا کرتا ہو کیا رشتہ کے عناصر ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم سنجیدگی اور متانت سے خیال کر سکتے ہیں کہ ان انسانی صورت کے بارکش جانوروں میں جو ان عجیب غلامانہ پابندیوں میں مبتلا ہیں، میسر مزدوری سے واقف ہیں نہ ان کے کام کرنے کے اوقات کی کوئی حد انتہا ہے۔ بھلا ایک دوڑ و صوب اور خون پانی ایک کرنے میں کوئی روحانی زندگی ممکن ہے۔ کیا سچ ہمارا خیال ہے کہ ایک رکشائی کی زندگی اس امرجن مزدور سے زیادہ روحانی اور اعلیٰ اخلاقی سطح پر ہے جو روزانہ موٹر پر کارخانے آتا جاتا ہے۔ جو التوار کے دن اپنے تمام خاندان کو باہر سیر تفریح کے لئے عمدہ سے عمدہ پارک اور خوشنما جنگلوں میں لیجاتا ہے۔ جو تقریباً مفت میں بہتر سے بہتر گارائیڈیو کے ذریعہ سے سنتا ہے اور جس کے بچے ان مدارس میں تعلیم پاتے ہیں جہاں بہتر سے بہتر کتب خانے اور جدید سے جدید محکموں کی سہولتیں موجود ہیں۔

جب ہمارے دل میں پورا پورا احساس ہو جائے کہ رکشا چلانے میں کیا کھفیتیں اور سختیاں چھپنی پڑتی ہیں۔ اور ان انسانی صورت کے بارکش جانوروں پر اس کے چلانے سے کیا کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ صرف اس وقت ہر شخص صدق دل اور



بچی روحانیت سے مجبور ہو گا کہ موجود ان عہد مثلاً مارگرٹ۔ کارٹ رائٹ۔ واٹ فلٹن  
اشفٹن۔ اور فورڈ کو دل سے دعا ہے جنہوں نے انسانی کام کے لئے مشینیں مہیا کر دی  
ہیں۔ اور اسے بہت سی وحیانہ مشقوں سے نجات دلا دی جو اس کے مشرقی بھائی کے کام  
کے ساتھ اب بھی وابستہ ہیں۔

اس مقام پر اس مادی تہذیب کی حقیقی روحانیت بلکہ مشین والی تہذیب  
کی من حیث النوع روحانیت معلوم ہوتی ہے مشین کی ترقی کا مدعا صرف اس قدر ہے  
کہ آدمی اپنے آلات اور اخلاقی قوت کا استعمال کرے تاکہ کام کرنے کی سہولت  
اور پیدا کرنے کی قوت فروغ پائے اور وہ اس لعنت سے نجات پا جائے کہ بلا امداد  
غیرے کرنے کو تو دن رات لگاتار کام کرتا ہے۔ مگر مشکل اپنے لئے قوت لایوت مہیا  
کر پاتا ہے۔ مشین کے استعمال کا ایک نتیجہ یہ ہو گا کہ مشین کے استعمال کی بدولت اس کے  
پاس اتنی اہلیت اور طاقت باقی رہے گی کہ تہذیب کی اعلیٰ برکتوں سے مستمع ہو جہاں  
انسان کو ادنیٰ سے ادنیٰ قسم کے روزی فراہم کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑے  
بھلا سوچو کہ تمدن اور تہذیب تو درکنار اس غریب میں جان کیا باقی رہ جائے گی۔ اگر  
تمدن تمدن کہلانے کا مستحق ہے تو اس کی بنیاد صرف مادی ترقی پر ہونی چاہئے جسے  
۲۶ سال ہوئے کہ ایک چینی مدبر نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ دولت و عزت کا  
امتیاز صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تن کو کپڑا اور پیٹ کو روٹی میسر ہو جائے اور  
لوگ اچھے آداب و اخلاق صرف اس وقت سیکھتے ہیں جب کھلیان باج سمجھ رہے ہوں  
ہوں۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ کو اس فلسفہ کی تعلیمات پر متوجہ کروں جتنا سچ کی  
اقتصادی تاویل سے بحث کرتا ہے۔ یہ باتیں عام فہم اور ناظرین لاشعش ہیں۔ اپنے قصود  
میں فوراً اس تمدن کی تصویر کھینچو جہاں لڑکے لڑکیاں اور ستر عورتیں بانس کی ٹوکریاں  
پیٹھ پر باندھے نکلی لکڑیاں ہاتھوں میں لئے جہاں کہیں کوڑا کرکٹ دیکھتی ہیں جمع ہو جاتی

ہیں اور غلامت کے ہر انبار میں ایک چتر ایا اودھ جلا کو کہ تلاش کرتی پھرتی ہیں بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ اس فضا میں کوئی اخلاقی یا روحانی تمدن پرورش پائے۔

ایسی صورت میں لوگ جب کسی تمدن کو مادی اعتبار سے پسپائی میں پاتے ہیں تو ان مقامات کی روحانی زندگی پر زور دینے لگتے ہیں۔ میں اس موقع پر ان مشرقی مذاہب سے بحث نہیں کروں گا جتنے بڑے بڑے دیوتا گذر گاہوں پر اعضائے نسلی کی صورت میں نظر آتے ہیں میں صرف اس قدر مودبانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کوئی مجھے سمجھا دے کہ آخر اس بڑبڑاہ میں کیا خاص روحانیت جلوہ گر ہے جو انتہائی حسرت میں جان دیدیتی ہے مگر مرتے دم تک اس کی زبان سے ”نا ما اتنا بدھا“ کا حکم نہیں چھوڑتا اور اس کا ایمان ہے کہ وہ مرتے ہی اس بہشت میں پہنچ جائے گی۔ جہاں اتنا بدھا کی روح جاری و ساری ہے۔ یہ کہاں کا اخلاق اور کہاں کی روحانیت ہے کہ اس بد نصیب کو ایک غلط عقیدہ ایسا کہہا پڑھا دیا گیا کہ وہ ایک نہایت پست اور ذلیل زندگی میں اس ساحری کی بدولت نہایت خوش رہی۔ اور اسی مسرت میں مر گئی۔ اگر وہ ایک دوسرے تمدن میں پیدا ہوتی ہوتی تو اس کے لئے زندگی کے سنی اور اس کی لذتیں مختلف ہوتیں۔

میں ایک بار نہیں ہزار بار باصرار کہتا ہوں کہ اس زندگی میں کوئی روحانی عنصر نہیں ہے۔ یہ تمام ساحری جسے مذہب کے نام سے پکارتے ہیں اس دور انحطاط کے آثار میں سے ہے۔ جب انسانی قومی پست ہو چکے تھے۔ اور وہ فطرت کے مقابلہ میں اپنے آپ کے بے بس پاتا تھا۔ اس بے بسی سے عاجز اگر وہ مایوس ہو گیا اور اس نے ہمت ہار دی اور جس طرح لومڑی اور انکور کا قصہ ہے کہ انکو کھٹے ہیں صرف اس لئے کہ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ اب اس نے اپنی طبیعت بھلا کر دنیا کو بھی سکھانا پڑا شروع کر دیا کہ دولت اور راحت نفرت کے قابل ہے۔ اور صرف غربت اور ناداری کی تناکرنا چاہئے۔ اس راہ میں ایک قدم بڑھانا تھا کہ اس نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ زندگی خود

رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اور انسان کو صرف حیات مابعد کے انتظار میں جینا چاہئے اور اس وقت جب صلا بہت اطمینان سے ان تعلیمات کی تلقین میں مصروف تھے چند من پہلے جوشیلے دو قدم اگے بڑھے اور انھوں نے خود فراموشی۔ خود آزاری بلکہ خود کشی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مغرب میں زاهدوں نے اعتکاف کیا۔ فاتے کئے۔ اپنی آپ کو ستونوں سے باندھ کر محینہ اوقات پر کوڑوں سے مارنے کی ریاضتیں جاری کیں قرون وسطیٰ میں چینی رہبانوں نے پوجا پاٹ کی۔ روزے رکھے۔ اور روزانہ تیل کھا کر اور جسم پر تیل کے پھائے باندھ کر مہایانا بدھ مت کے کسی دیوتا کے نام پر جل کر قربان ہوئے ان یاس و حسرتوں سے بھرنا سکھانے والے مذاہب نے تمام تمدن دنیا کو اس طوفان بے تیزی میں ڈبوایا جنہیں قرون وسطیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہزاروں برس کی کشمکش کے بعد انسانیت کا ایک گروہ ہاتھ پاؤں مار کر اس تمدن سے باہر آیا جس نے عورت کو قابلِ فخر اور علالت کو قابلِ حرمت قرار دیا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ ایک نئے تمدن کی بنیادیں قائم کیں۔ جو موجودہ زندگی کو باعثِ مسرت اور ناداری کو جرم قرار دیتا ہے۔

آج ہر طرف نظر ڈالو۔ قرون وسطیٰ کے مذاہب اب بھی موجود ہیں۔ مگر جا اور مسجد اب بھی آباد ہیں۔ رہبانوں اور خانقاہوں کا اب بھی چرچا ہے لیکن اب دنیا کا عظم نظریہ کچھ بدلا ہوا ہے۔ آخر یہ کیوں۔ اس انقلاب کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو صدیوں میں انسان نے بعض بنیادی ایجادیں معلوم کر لی ہیں جن کی بدولت بیشمار آلات اور مشینیں فطرت کے خزانوں اور ان کے ذرائع حصول پر قابو پانے کے لئے وجود میں آگئی ہیں۔ ان مشینوں کی بدولت آدمی کی سخت جسمانی محنت کم ہو گئی ہے۔ فاصلہ محدود ہو گیا ہے۔ ہوا میں پرواز ممکن ہو گئی ہے۔ پہاڑوں میں سرنگیں بن گئی ہیں۔ اور بڑے بڑے سمندروں کی تہ میں جہاز رانی ممکن ہو گئی ہے۔ اب ہماری گاڑیاں چلائے

کے لئے بجلی ہماری غلام ہے۔ اور ہم اپنے پنومات کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لئے اثر سے پامبری کا کام لیتے ہیں۔ سائنس اور مشین کے مقابلہ میں فطرت عاجز اور بے بس معلوم ہوتی ہے۔ اس سبب زندگی زیادہ سہولت اور آسائش سے بسر ہوتی ہے اور انسانی خود اعتمادی کم ہوتی ہے۔ آج انسان اپنے مقدر کا خود مالک ہے۔ ایک انقلاب پسند شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

بہرستی کو خود ہی کرنا، پار امداد کرے نہ کوئی میری زہر پار

مصلوب ہو میرے بخشوانے کے لئے! عیسے نہیں مجھ کو کوئی ایسا درکار  
فرشکہ دور جدید کے نئے تمدن نے انسان کو ایک نئے مذہب کی تعلیم دی جو خود اعتمادی پر اس قدر زور دیتا ہے جس طرح شکست دیا یو سی قرون وسطی کے مذاہب کی خصوصیت تھی۔

۳

ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ قرون اولیٰ کا ترکہ پہنچا ہے اور تمدن جدید کی خصوصیات صرف اس وقت صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکتی ہیں جب قرون وسطی کے تمدن سے اس کا علاقہ سمجھ میں آجائے۔ مشرق اور مغرب کے تمدن میں فرق صرف اس قدر ہے کہ قرون وسطی کے خیالات اور ادارات سے جو کبھی تمام تمدن دنیا پر حکمران تھے ایک کم اور دوسرا زیادہ متعلق ہے۔ مغربی تمدن کی بڑی خصوصیت جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ وہ نسبت دوسروں کے بڑی حد تک قرون وسطی کی خصوصیات سے آزاد ہو چکا ہے۔ مغرب کے مقابلہ میں دوسری طرف ہندوستانی تمدن ہی جو قرون وسطی کی تمام خصوصیات میں وعن ظاہر کرتا ہے۔ ان دوسرے گروں کے مابین ہم مشرق کے تمام اقسام تمدن کو ترتیب دے سکتے ہیں۔

چین نے قرون وسطی میں بہت سے علوم تاریخی اور فلسفہ میں ترقی کر لی تھی لیکن باوجود

یہ ترجمہ میرے مقررہ دستِ افہام قدوائی کے زورِ طبیعت اور قوتِ فکر کا نتیجہ ہے جو موصوف کی سال

تک جاسمیں ابتدائی ایام میں تصحیح پائی گئی۔ ترجمہ

ان سب ترقیوں کے اور باوجودیکہ چینی فلسفہ مذہب کی کثافت سے آہستہ آہستہ آزاد ہو چلا تھا چین آج بھی اس پستی میں ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ مانگہ چین نے دتیائوس مذہب سے نجات پائی ہے لیکن عام آدمی کی زندگی میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے میں یہ بھی تسلیم کرتے دیتا ہوں کہ چین نے علمی تحقیقات کی بنیاد عقل اور ادراک پر رکھی ہے لیکن ابھی تک اس کا رواج کتا بوں تک محدود ہے کسی مذہب کا خفیہ د اور پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ہمیں انجروادی ماحول پر وہ قابو حاصل نہیں ہوا جو خود اس ذہنی آزادی کے لئے اور اس لئے عوام کی روزمرہ زندگی میں کوئی حقیقی تغیر و نما ہو ضروری ہے سترہویں صدی کے حکمران اس تلخ حقیقت پر حسرت کے آنسو بہا چکے ہیں کہ ۵۰ سال کی فلسفیانہ مونگائی اس پھیب تک کو قوط و غارت گری اور ایک اجنبی اور وحشی قوم کے تسلط سے بچا سکیں اس تکلیف دہ انکشاف کے بعد جب کہیں ان کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے فلسفہ سے منہ موڑ کر ان علوم کی طرف توجہ کی جنہیں اب جا کر انہوں نے مفید علوم کا درجہ دیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ آئندہ ۳۰ صدی کی باضابطہ تعلیم بھی ایک نئی منقولیت کی صورت اختیار کرے گی اور عوام کی نجات اور ترقی کے لئے اسی درجہ بے سنی اور دور از کار ہوگی۔

چین کے مقابلے میں دوسری طرف جاپان ہے جس نے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ مغربی تمدن اختیار کیا ہے۔ جاپان کی ترقی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغربی آلات اور مشینوں کے اختیار کرنے میں کسی امتیاز سے کام نہیں لیا کچھ زیادہ دن نہیں گزرے جب پہلی بار بیرونی (مغربی) نے جاپان کے دروازہ پر دستک دی تو جاپانی زمانہ وسطی کی روایات میں گہری یزید سوز ہے تھے کچھ تھوڑے سے کشاکش کے بعد جاپان نے اپنے دروازہ مغربی اثرات کے لئے چوٹ کھول دی۔ باوجودیکہ جاپان کو اپنے قومی جذبات کی پامالی اور عام تباہی کا خوف لاحق تھا۔ اس نے دتیائوس مذہب اور فرسودہ فلسفہ اخلاق کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اور دل کھول کر اس نے اپنے آپ کو جدید انکھوں سے سلج کیا۔ نئے نئے آلات حرب،

وساکی تجارت، کام کرنے کی مشینیں اور تنظیم کے اصول منوال اختیار کئے نتیجہ یہ کہ نصف صدی میں جاپان کا یہی نہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی تمدن اقوام میں شمار ہونے لگا بلکہ اس نے بہت سے اہم مسائل کا حل معلوم کر لیا جسے نہ بدست سمجھا پایا تھا نہ چینی فلسفہ۔ جاپان میں اس دور وسطی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ دستوری حکومت اور پارلیمنٹ کی نمائندگی تسلیم کی گئی اور دوقیانوسی مذاہب کی بیچ کئی برابر جاری ہے۔ کل تک جاپان رکش کا موجد سمجھا جاتا تھا لیکن آج کوئی یا کوہاما اور ٹوکیو کے صنعتی مرکوزوں پر نظر ڈالے تو رکشاقی کے دور کا جنازہ آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ رکشاقی کی سنت دور کرنے میں جاپانی یا دوسرے مذاہب کی "انسانیت کو کوئی دخل نہیں ہے نہ ان انجنیوں کے ارکان کی مساعی کو دواسطہ ہو جو حیوانات کی حفاظت کرتے رہتے ہیں بلکہ صرف غریب فورڈ کی موٹر کو جو جاپانی محاورہ میں "ہر جگہ نظر آتی ہے بہتول اور خوشحالی کے ساتھ جو مشین کے استعمال اور جدید حرفت کے فروغ سے جاپان کو حاصل ہوئی، جو اس مختصر سے عرصہ میں جاپان نے نئے فنون لطیفہ اور ایک نیا ادب کو اپنی مادی ترقی کی نسبت سے پیدا کر لیا ہے آج جاپان میں سائنس اور حرفت کی تحقیقات کے لئے ۹۰ ادارات ہیں اور اس کی انجینیری کی انجین کی فہرست کمیت میں ۳۰ ہزار نام نظر آتے ہیں۔ ان کارکنوں اور ان مسائل کار کی بدولت ایک عظیم المرتبت تمدن جو کیسے طرح روحانیت خالی نہیں ہے مشرق میں فروغ پا رہا ہے۔

اس طول طویل داستان کا سبق واضح ہو یعنی یہ کہ انسانی تمدن کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ وہ پہلے پہل اوزار بنانے والا حیوان تھا اور اس نے تمدن کی بنیاد اپنے مادی ماحول پر قابو پانے کے لئے نئے نئے اوزاروں پر رکھی جب انسان اپنے فطری ماحول سے جنگ کرتے کرتے عاجز آ گیا تو اس نے روحانی زندگی میں پناہ لی اور تمدن اس قومذلت میں گر گیا جس کا نام دور وسطی ہو۔ حرفت اور سائنس کی بدولت انسان نے اپنی کھوئی ہوئی خود اعتمادی حاصل کی اور اس کی بنا پر جدید مغربی تمدن کی عمارت تعمیر کی اسی سائنس اور حرفت نے

جپان کی ہیئت بدلدی اور اسے جدید تمدن کی برکتوں سے مالا مال کر دیا اور اس سرکار  
یہی سائنس اور حرفت ہو گئی جو مشرق کی صورت بدلے گی اور چین اور ہندوستان کو تمدن  
دنیا میں دوش بدوش لاکر کھڑا کرے گی۔

۴

میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے جدید مغربی تمدن کے سب سے مادی شعبہ یعنی  
اس کے صنعتی کارناموں کا روحانی پہلو آپ کے سامنے پیش کیا۔ جدید حرفت بدرجہ  
اولیٰ روحانی ہے اس لئے کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ انسانی ذہانت اور قوت فکری کو کام  
لیکھ (جو دینہ فطرت ہیں) انسانی کوشش کو غیر ضروری مشقت سے نجات دلا دے اور  
اس کے لئے موجودہ زندگی کی سرتیں اور اس کے حاصل کرنے کے لوازمات فراہم کئے جائیں  
انسان بعد میں جس طرح بھی اس راحت اور مہلت سے کام لے صوبت اور روح فرسا  
محنت سے نجات دلانا فی نفسہ ایک عمل روحانی ہو ورنہ یہ اسی قسم کا استدلال ہو گا کہ  
چونکہ بعض سچے اور حق پرست لوگ خدا کے نام پر جلا دیئے گئے تھے اس لئے خدا خود ایک  
مذموم سچی کا نام ہے۔

میں اب چاہتا ہوں کہ مغربی تمدن کے دوسرے پہلوؤں کا روحانی پہلو آپ  
کے سامنے پیش کروں۔ میں سر دست اپنی بحث سے فنون لطیفہ موسیقی اور ادب کو خارج  
کئے دیتا ہوں کیونکہ یہ سب کے نزدیک مسلم الثبوت ہو کہ مغربی ادب اور فنون لطیفہ کم از کم مشرق  
کے ہم پل ضرور ہیں اور اس کا علم موسیقی اس سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو جس پر مشرق  
نازاک ہے۔ لاؤ سائنس سے ابتدا کریں۔ روحانی زندگی کے معنی جو بھی ہم سمجھتے ہیں غالباً  
آج دنیا میں کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علم کی جستجو، ایک نئی چیز کی تلاش انسان  
کے جائز روحانی مطالبات میں شامل ہو لیکن تقریباً تمام پرانے مذاہب نے انسانی دماغ  
کی اس خواہش کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق آدم علیہ السلام کا بہشت سے

اخراج بی بی ہوا نہیں بلکہ حصول علم کی بدلت ہوا بہت سے مشرقی پیشواؤں نے اس قسم کی تعلیم دی ہیں کہ ”اعتیاج علم کی بدلت ہے اسلئے نہ علم ہو گا نہ جستیا ج ہوگی۔“ دنیا میں کل کے لئے سوچنے کی کیا ضرورت ہے آدمی کو راضی برضا رہنا چاہئے۔“ دیوانہ باش تا غم تو دیگر اں غور نہ کا زاکہ عقل بیش غم روزگار بیش۔“ مشرق کے ایک بزرگ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ ”زندگی مکان و زمان کی پابند ہے اور علم لامکان ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ لامکان شے سے مکان و زمان کی عقدہ کشائی کرنا چاہتے ہو؟ ان عقائد کی بدولت ”مسلمان انسانیت“ نے علم کی جستجو سے پرہیز کیا اور احتساب نفس عرفان۔ دھیان اور سمدھی کے پیچھے ہولنے ”عرفان“ کی تلاش میں جس کے سنی کچھ وہ خود ہی سمجھے ہوئے بعض نے ”علم لدنی“ کے حصول کے طریقے بتائے اور ”استغراق“ کو اسکے لئے شغل راہ قرار دیا۔ کسی نے ”دھیان“ کے لئے ہاتھ کا پچا کر لیا جس سے ۱۶ الہی قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔

دور کیوں جائے جنوری سنہ ۱۸۷۱ء میں امریکن ناظرین کے سامنے ایک مصری دانشمندی نے مشرق کے اعلیٰ روحانیت کا اس طرح ثبوت دیا کہ وہ دو گھنٹہ ۵۶ منٹ ۵ فیٹ نیچو زمین میں زندہ درگور رہنے کے لئے آمادہ تھا اور اس طرح اس نے مشہور جادوگر ہوونی کے وقفہ میں بقدر ۸ منٹ کے سبقت کی لیکن لوہے کا کپنی نے اس کو س سے کہ غالباً دیکھنے والے صبر کے ساتھ ۳ گھنٹے انتظار کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ اس مشرقی پیکر روحانیت کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھیں معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ٹوٹکوں میں روحانیت کا شاہدہ برائے نام ہے لیکن مشرق کا روحانی طبقہ اب بھی اس قسم کی لائینی حرکات کو مایہ ناز شمار کرتا ہے۔ اس قسم کی زندگی تو بہت سے جانور بھی بسر کرتے ہیں کہ مہینوں زمین میں چھپے رہتے ہیں اور ایک خاص موسم میں کچھ دنوں کے لئے باہر آجاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر غور کیا جائے تو سائنس والوں

۱۔ یہ سبھی بلکہ بدلت کا عقیدہ ہے۔ مترجم



کے کاموں میں ایک حقیقی روحانیت نظر آتی ہے یہ طبقہ بڑی بڑی ریاستیں کر کے فطرت کے چھوٹے چھوٹے پوشیدہ راز معلوم کرتا ہے حقیقت بہت پردوں میں مستور رہتی ہے اور کبھی ان بے ادب انسانوں کے سامنے بے نقاب نہیں ہوتی جو فطرت کے بالمقابل بے سر و سامانی غیر تربیت یافتہ قومی شعوری کی مانند جاتے ہیں۔ سائنس ہماری قوت فکری کی تربیت اور پرورش کرتی ہے۔ اور اس کے لئے ضروری آلات اور طرق کار فراہم کرتی ہے۔ وہ ہر قدم پر ہمیں سبھاتی ہے کہ علم کے لامحدود ہونے سے ہمت نہ ہارو۔ انہیں چھوٹے چھوٹے علمی دوس سے ہی فطرت کا راز معلوم ہوتا ہے۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ اضافہ معلومات ترقی کی منزل میں ایک قدم ہے اور ترقی کا ہر قدم چلنے والے کے لئے ایک وجدانی کیفیت رکھتا ہے جب اترتھیش پر غل خانہ میں داخل ہوتے ہی سائنس کے ایک پیچیدہ مسئلہ کا حل نکشت ہوا تو وہ خوشی کے مائے اس درجہ آپے سے باہر ہو گیا کہ برہنہ سرٹک پر دوڑتا پھرتا تھا اور ہر ایک سے بکار بکار کے کہتا تھا کہ ”میں نے پایا ہے“ روحانی مسرت کی یہ وہ کیفیت ہے جو سائنس کی تحقیقات میں ہر طالب علم مثلاً گلیلیو۔ نیوٹن۔ پاسیمورل کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ وجدانی کیفیت ہے جس سے گذشتہ تمدن کی پیغمبر اہل بے بہرہ تھے حقائق عالم کی جستجو میں وہ استغراق اور خود فریبی سے آگے نہ بڑھ سکے بس اسی قدر ان کا بسلف نظر تھا۔

سائنس کا انتہائی روحانی عنصر اس حالت شبہ میں منظر ہے جو ہر شے کو بے اعتباری سے دیکھنا سکھاتی ہے اور بغیر تشکیکی ثبوت کے کسی چیز پر ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتی یہ انداز صرف منفی ہی نہیں گواہ صورت میں بھی اس نے انسانی دماغ کو اسناد اور توہمات کی غلامی سے نجات دلا کر ایک گرانقدر خدمت کی ہے۔ یہ حالت شبہ حقیقتاً مثبت اور بڑے بڑے نتائج سے پُر ہے۔ صحیح عقاید و بابت داری سے صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتے ہیں۔ اس کا مقصد خود اس کیفیت ”شبہ“ پر قابو پانا اور عقاید کو جدید بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ اُسے

اپنے اس بے پناہ ہتیار سے کہ ”ہر بات کی دلیل پیش کرو“ صرف فرسودہ عقائد سے ہی سب رو آزمائی نہیں کی بلکہ اس نے نئے نئے مسائل بھی پیش کئے ہیں اور انہیں شواہد و اثبات کے اصرار کی بدولت اس نے نئے نئے انکشافات بھی کئے ہیں یہی وہ تعمیری ارتداد کی روح ہے جس نے روح روانان سائنس مثلاً ڈارون کہلے۔ پاسٹیور اور کوخ کے سوانح حیات کو انسانی تاریخ میں الہامی مرتبہ دیدیا ہے جس طرح قرون وسطی میں عیسائی عقیدت کی بدولت اولیاء اور شائخ بنائے تھے اسی طرح اس روح ارتداد نے اپنے پیشوا پالتے ہیں جو فطرت کو تابو میں لا کر انسانیت کو اس کے خزانوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔

## ۵

مغربی تمدن کا انتہائی روحانی پہلو اس کے اس نئے مذہب میں ظاہر ہوتا ہے جس کے لئے میرے ذہن میں ”مذہب جمہوریت“ سے زیادہ موزوں کوئی اور نام نہیں ہے جدید تمدن کی ابتداء مذہبی جستجو سے نہیں ہوئی، مگر اس کی انتہا ایک نئے مذہب کا آغاز ہے۔ اس نئے تمدن نے بہت زیادہ فلسفہ اخلاق پر توجہ نہیں کی لیکن اب اس نے ایک نیا نظام اخلاق مرتب کر لیا ہے۔ چند رہویں اور سو لہویں صدی کی یورپین حکومتیں کھلم کھلا طور پر غارت گروں کی ریائیں تھیں۔ اس دور کے بڑے بڑے نامور مثلاً گوئٹس، میگن۔ ڈریک اور ان کے ہمجنس بڑے بڑے بحری قزاق تھے جو بے دھوک سونے چاندی۔ مسالوں اور ہر وہ گیری کے لئے نامانوس سمندروں میں اپنی جان سیلی پر لئے پھرتے تھے۔ اکثر اوقات ان کی نوابوں اور بادشاہوں نے محنت افزائی کی ہے اور ان کی غارتگری اور شہرت میں حکومتیں اور حکمران ان کے شریک رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت لا پرواہی سے اپنی مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا جو انسانی ہمدردی کی تعلیم دیتی تھیں اور جن کے نزدیک سود لینا منوع تھا۔ اس غارت گری نے یورپ کی تجارت اور مستعمرات کے لئے نئے نئے براعظموں کے دروازے کھول دیے جس کی وجہ سے بعض یورپین حکومتوں کی مادی طاقت اور دولت میں گراں قدر

اضافہ ہو گیا اور ان میں ایجاد کی بڑی حرص پیدا ہو گئی۔ اس کا ثمرہ وہ صنعتی انقلاب تھا جس نے اکتساب کے طریقے سرے سے بدل ڈالے اور یورپین ریاستوں کی قوت اکتسابی کو ایک ساتھ بڑا دیا۔ آدمی آسائش اور ایک نئے طبقہ کے عروج کے ساتھ انسانی تعلقات کا تختہ الٹا اور پھر دہائی کے مٹی بھی بدل گئے ہیں۔ اپنے اوپر بھروسہ کرنے سے انسان اب چونکہ اپنے آپ کو اپنی قسمت کا مختار و مالک سمجھنے لگا ہے مدینیت کے احساس اور مدنی خصائص کے اعتبار سے کسی شرم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایک نئے دور جمہوریت کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ اس کے تاریخی ارتقا میں اٹھارہویں صدی کے فلسفہ انفرادیت اور گزشتہ سو سال کے اشتراکی خیالات کو بھی شامل کرتا ہوں۔ اٹھارہویں صدی نے حریت، مساوات اور اخوت کے جدید عقاید کا اضافہ کیا۔ گزشتہ صدی کے وسط میں جا کر اس نے مذہب سے ”اشتراکیت“ یا سوشلزم کا نام اختیار کر لیا ہے۔ یہ سب وہ روحانی قوتیں ہیں جو پرانے تمدن کے کبھی خواب میں بھی نہ تھیں۔ یہ مانا کہ مشرق میں ایسے مذاہب ہوئے ہیں جنہوں نے نوع انسانی کی بہرہ رسانی کی تعلیم دی، جو ایسے حکیم بھی گذرے ہیں جنہوں نے زمین اور مال کی مساوی تقسیم سکھائی ہے لیکن تمدنی اعتبار سے یہ عقاید صرف کتابوں تک محدود رہے ہیں اور کبھی سوسائٹی یا نظام سیاسی میں اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ برطانیہ اس کے مغرب میں انقلاب امریکہ، انقلاب فرانس اور انقلاب روس نے حریت، مساوات اور اخوت کو اپنا نعرہ جنگ قرار دیا اور اس کے بعد یہ خیالات جملہ انقلابی تحریکات کے سرچشمہ حیات بن گئے ہیں۔ نئی جمہوری حکومتوں نے ان پر اپنی دستوروں کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کی اشاعت کی وجہ سے ملکیت، شہنشاہیت اور امارت کا زوال ہوا۔ ان تعلیمات سے قانوناً مساوات، حریت، عقاید، حریت، اشاعت اور مذہبی آزادی کو تسلیم کیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان خیالات نے عورت کو آزادی دی اور تعلیم عامہ کو عملی صورت بخشی ہے

اشتراکی خیالات اپنے قابل جمہوری فلسفہ کا جو انفرادیت کا رنگ لئے ہوئے تھے  
تتمہ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ اسی وسیع جمہوری تحریک کا جزو ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط

میں یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ ایک نہایت منظم اور مرکز نظام اقتصادی میں مساوات اور حریت پھیلانے کے لئے "عدم مداخلت" کی پالیسی کافی نہیں ہے لوگ لازمی تعلیم کو اپنی آزادی میں مداخلت تصور کرتے تھے اور مزدوری اور کارخانوں کی نگرانی کے قوانین کا "جماعتی قانون" نام رکھ چھوڑا تھا۔ اس نئے اقتصادی دور کی ضروریات ایک جدید تمدنی اور سیاسی فلسفہ کی متقاضی تھیں اس کا صریح نتیجہ یہ تھا کہ اشتراکیت کی تحریک پھیلنا شروع ہو گئی۔ اگر اس تحریک پر "جماعتی جنگ" اور اقتصادِ دی تاویل کی ابھنوں سے قطع نظر کر کے غور کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ سوسائٹی یا حکومت کی مجموعی قوت سے جمہور کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی جائے اس تحریک نے عملاً دو صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک طبقہ اسطوف متوجہ ہے کہ مجموعی اجرت ٹھہرانے کے طریقوں اور ہڑتال سے کام لیکر مزدور پیشہ جماعت اور اس کے جماعتی حقوق کا موثر تحفظ کیا جائے۔ دوسری طرف اسے قدر شدت کے حکومتوں نے اسکا اس طرح سد باب کرنا چاہا ہے۔ کہ بجائے جماعتی کشمکش میں قوت ضائع کرنے کے انھوں نے بہت سے اشتراکی عقاید کو اپنا لیا ہے اور اس قسم کی تجاویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے مثلاً ضمیمی کے لئے مزدوروں کا بیمہ کرنا۔ مزدوری کے اوقات کی نگرانی۔ کم سے کم معیار اجرت کا اجراء وغیرہ وغیرہ غرض کہ ایک صورت سے یا دوسری صورت سے بلکہ بعض اوقات دونوں صورتوں

کے مجموعی اثر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر حکومت نے اپنے قانون اور دستور میں وہ خیالات اور عقائد شامل کر لئے ہیں جو کبھی نہایت خطرناک اور تباہ کن سمجھے جاتے تھے۔ عجب نہیں کہ بہت لوگ ملکیت شخصی کی حرمت میں ایمان رکھتے ہوں لیکن آمدنی اور میراث کے ٹیکس حکومتوں کی آمدنی کا ایک مستندہ حصہ ہیں۔ آپ جب چاہیں جماعتی جنگ کو بڑا اور مذہم کہہ سکتے ہیں لیکن مزدوروں کی تنظیم اور قوت ایک امر ذاتی ہے۔ اور تقریباً تمام دنیا میں ان کا ہڑتال کرنے کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے انگلستان میں جو سرمایہ داری کا کبہہ رہ چکا ہے۔ ایک بار مزدور حکومت برسرِ اقتدار آ چکی ہے

*Economic Interpretation of Laissez Faire*  
*Private Property*

اور ممکن ہو کہ جلد دوبارہ مزدور جماعت حکومت کرے۔ رہائش گاہ متحدہ امریکہ جو کبھی انفرادیت کی بڑی حامی تھی آج سکرات کے لئے قومی اتنماعی قوانین نافذ کر رہی ہے۔ غرض کہ دنیا بجانے اشتراکی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ مذہب حریت صرف اسی پر قناعت نہیں کرتا کہ ایک شہری کی آزادی کی حفاظت کرے یا دوسروں کی آزادی قائم رکھنے کے لئے ایک فرد کی آزادی پر قیود قائم کرے بلکہ برابر اس میں سرگرم ہے کہ ہر مرد اور عورت کے لئے آزاد زندگی ممکن اہل بنائے اس مذہب کو اسپر صبر نہیں ہے کہ سائنس اور مشین پر قابو پا کر لوگ نہایت آرام سے زندگی بسر کریں بلکہ یہ قانون اور نظام سیاسی سے کام لیکر کوشاں ہے کہ دنیوی راحت کے اسباب بیاہ سے زیادہ شہریوں کے نصیب میں آجادیں۔ اور یہ نفست مغربی تمدن کی سب سے بڑی روحانی میراث ہے۔ میرے لئے ضروری ہے کہ میں قارئین کرام کو اس موقع پر یہ یاد دلاؤں کہ عورت کے حقوق کی آزادی یا جمہوری طرز حکومت یا تعلیم عامہ کے اصول نام نہاد مشرقی تمدن کی بکارت سے باطل بے نیاز ہیں۔ بے ادبی نہ بھی جائے تو میں اس کا بھی اضافہ کر دوں کہ ایسے تمدن میں جس نے اپنی مستورات کے پاؤں تقریباً ایک ہزار برس تک جکڑ دیئے تھے اور لطف یہ کہ کبھی ایک اواز بھی احتجاج کی بلند نہیں ہوئی یا ایک دوسرے تمدن میں جس نے مدتوں سچی اور بیوہ کے بھانے کی رسم گوارا کر لی اور جو آج بھی ذات پات کی تقسیم قائم رکھتی ہے۔ روحانیت کا کوئی عنصر نہیں ہو سکتا

۶

اس خاصی طویل بحث کے خاتمہ پر میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کلام کے طور پر چند غلط متعل اور سخن میں ڈالنے والے الفاظ ”روحانی تمدن“ ”ماوہ پرست تمدن“ ”مادی تمدن“ اور ان کے مفہوم پر اپنے خیالات پیش کر دوں جہاں تک یہ سرائے ناقص ذہن کام کرتا ہو میرے نزدیک

---

مے مصنف نے مزدور پارٹی کے دوبارہ حکومت قائم کرنے سے قبل یہ مضمون تحریر فرمایا تھا۔ ترجمہ

مطالعہ پستی رسم جو زمانہ حال تک جاری رہی۔

اصطلاح ”مادی تمدن“ کا اطلاق غیر ذی روح اشیاء تک محدود ہونا چاہئے اسلئے کہ تمدن کے تمام آلات کا تخیلات کی جسمانی صورت کا نام ہیں۔ مشرقی تمدن جو چرخہ لگا کر کام نکالتا جو اسبقہ رادی ہے بقدر رائج کی قوت مغرب میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”مادہ پرستی“ کا اطلاق جو مغربی تمدن کو مسخ صورت میں پیش کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اس کا بدرجہ اولیٰ مشرقی تمدن مستحق ہے اس لئے کہ میرے نزدیک صرف وہ تمدن مادہ پرست ہی جو مادہ کی قید سے باہر نہ جاسکے اور جو اپنے مادی ماحول کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہو۔ اور انسانی حالات کو بہتر بنانے کے لئے فطرت پر قدرت پانے میں انسانی ذہانت کا کما حقہ استعمال نہ کر کے صوفیا اور شائخ جو چاہیں قناعت پسندی کے راگ گاتے رہیں اور جس صورت سے چاہیں اپنا اٹو سیدھا کرنے کے لئے راضی برضا رہنے کی تعلیم دیتے رہیں لیکن حقیقتاً یہ فلسفہ اسبقہ رادیکہ اس سے زیادہ گندہ ہے جس قدر گندہ ان کے مکان جن میں وہ سکونت کرتے ہیں ان کے چند لقمے جو شاہد انہیں میسر آتے ہوں ان کے سنگھڑ چوب جن سے وہ بت تماشے ہیں نظر آتے ہیں اس کے مقابلہ میں بلند انصاف کر دو کہ کیا وہ تمدن انتہائی روحانیت اور الوہیت سے پر نہیں ہے جو انسانی خدمت کے لئے فطرت کو قابو میں لا کر مادہ کی ہیبت منقلب کر دے اور اس راہ میں انسانی ذہانت اور قوی اختراعی سے پورا پورا کام لے جو انسانی رجحان کو باطل پرستی جہالت۔ ادہام پرستی اور فطرت کی غلامی سے نجات دلاوے اور جو تمدنی اور سیاسی اداروں کی ادھیڑ بن میں صرف اس لئے برابر سرگرم ہو کہ زیادہ سے زیادہ بندگان خدا راحت اور آرام سے بسر کر سکیں یقیناً مغربی تمدن برابر فروغ پائے گا اور دن دونی رات چو گئی ترقی کرے گی لیکن اس کا کوئی گمان یا شبہ نہیں ہو کہ تمدن لوگ کسی منزل پر پہنچے دوبارہ مشرقی روحانیت کی طرف رجوع کریں گے۔ مستقبل میں لوگ اور زیادہ باخبری سے اور پورے غور و فکر سے کام لیکر ان روحانی امکانات کو دست دیں گے جو اب تک اس تمدن کی ترقی میں انہیں نظر آئے ہیں

## سرمکاری قرضہ

ابھی وہ وقت تو نہیں آیا جب ہلوگ اپنے ملک کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے دلچسپ واقعات کو بڑھکے نہیں اور سطح نہیں بیسے دنیا آج ہمہ سن رہی ہے لیکن اگر کبھی فرصت کے وقت اپنے گرد و پیش کے حالات سے ایک لمحہ کے لئے قطع نظر کر کے ہم اپنی غلامی کی تاریخ کی درد گردانی کریں تو جس طرح ہماری آزادی کا خون خود ہمارے ہاتھوں سے اور ہمارے روپیہ سے کیا گیا ہے اسکو بڑھکے نہیں کہ شرم و ندامت کے کچھ آنسو ہماری آنکھوں سے نہ گر پڑیں، کون یقین کر سکتا ہے کہ ہماری موجودہ سرکار دولت دار نے ہمارا ملک، ہمارا وطن، ہماری جان اور ہمارا مال ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن جس روپیہ سے خرید اوہ روپیہ بھی ہماری جیبوں سے لیا گیا تھا اور اس میں جتنی کمی اسوقت رہ گئی تھی اس کا بار نسل بعد نسل ہماری گردنوں پر منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ آج دو سو برس کے بعد بھی ہلوگ اس قرضہ سے بکدوش نہیں ہو سکے ہیں اور سال بسال اس اس کا گردوں روپیہ سود ادا کر رہے ہیں۔

کانگریس نے اپنی گذشتہ اجلاس میں جہاں کامل آزادی کی اہم تجویز منظور کر کے اپنے جائز سیاسی حقوق کو حاصل کرنے کا مقصد مصمم کیا ہے اسی کے ساتھ ایک دوسری اہم قرارداد کے ذریعہ یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ سرمکاری قرضہ کا جو بار ہندوستان کے ذمہ ڈالا گیا ہے اور جس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اس کی کلیتہ ادائیگی کی ذمہ داری آئندہ ہندوستان کی آزاد حکومت پر نہ ہوگی بلکہ اس رقم میں سے صرف اسقدر رقم ہندوستان ادا کرے گا جو ایک غیر جانبدار پنچایت کے فیصلہ کے مطابق جائز اور ہندوستان کے ذمہ واجب الادا قرار دی جائے گی اس قرارداد کو منظور کر کے کانگریس نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو اس عظیم سماجی نقصان کی طرف متوجہ کر دیا ہے جو موجودہ غیر ذمہ دار اور خود غرض حکومت اپنی پیش رو ایٹ انڈیا کمپنی کی غارتگرانہ طرز حکومت کی روایات کی وارث بن کر ہندوستان کو اسوقت تک

برابر ہو چکا ہے، اس قرارداد سے قدرتنا ایک خاص ٹپل اور بے صافی پھیل گئی ہے، ہندوستان میں انگریزوں کا طبقہ شہر کر رہا ہے اور انگلستان میں بھی شاید ہی کوئی ایسا متشدد اخبار ہو گا جس نے بڑے بڑے افتتاحیہ اس موضوع پر نہ لکھے ہوں، انگریز یہ ہوا کہ ہندوستان اور انگلستان کے صرافوں میں مبادلہ کے اتار اور چڑھاؤ کا اندیشہ ہونے لگا، مجبوراً دارالعوام میں طرح طرح سے سوالات کر کے وزیر ہند سے اطمینان حاصل کیا گیا کہ برطانوی حکومت ہند اس امر کی ذمہ داری لیتی ہے کہ ہندوستان کی آئندہ ذمہ دار حکومت اپنے تمام قرضوں کو تسلیم کرے گی۔ لیکن جو لوگ ابھی کچھ عرصہ قبل روس کے ادائیگی قرضہ سے انکار کر دیے کا فخر چکے ہیں وہ کیونکر وزیر ہند کے اعلانات سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔

غرض ایک طرف تو کانگریس کے اس رویہ پر ہر طرف سے احتجاج کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف وہ احسانات شمار کر اے جا رہے ہیں جو برطانوی سرکار نے ہندوستان کے معاشی وسائل کو بار آور بنانے کے لئے اور ہندوستانیوں کو مہذب اور تمدن بنانے کے لئے نہ صرف ہندوستان پر بلکہ تمام مشرق پر کئے ہیں، بیشک یہ احسانات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ نہ میں شمار کر اول نہ تم شمار کرو، بغیر ہندوستان سے زیادہ کون دوسرا برطانوی قوم کے احسانات کی قدر بھی کر سکتا ہے! اور یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں بھی برطانیہ ہندوستان پر حکومت کر رہی اور اسی شان تہاری اور استبداد کے ساتھ جسے مقابلہ میں ازمنہ وسطیٰ کی بدنام اور سواتر حکومتیں بھی شرمناک ہیں اور ہندوستان نہایت ناداری کے ساتھ ہر برطانوی سیادت کا جو اپنی گردن پر اٹھاتے ہوئے ہے۔

دو سو سال کے تجربہ کے بعد ہندوستان کو اپنے دوست اور دشمن کی اچھی طرح تیسر ہو گئی ہے اور یہ ہماری احسان شناسی اور سیاست میں بھی ایسا نداری کرنے کی انتہا ہے کہ کانگریس نے کل قرضہ کی ادائیگی سے انکار نہیں کیا بلکہ صرف اسی رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری لینے سے انکار کیا جو ہندوستان کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ صراحتہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف صرف



کرنے کے لئے قرض لی گئی تھی، اس وقت تقریباً دس ارب پیسہ کا بار جو ہندوستان پر ہے اس میں بڑا  
وہ رقم بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں ریل، تار اسٹریک، نہر اور دیگر مفاد عامہ کے کاموں پر  
صرف کرنے کے لئے قرض لی گئی تھیں لیکن اس میں کم از کم چار ارب روپیہ ایسا بھی ہے جو کسی  
پیدا آور کام کے لئے نہیں بلکہ تاج برطانیہ کے سب سے گرانقدر موتی کو حاصل کرنے کے لئے  
قرض لیا گیا تھا، پھر یہ کونسا انصاف ہے کہ اس موتی کی قیمت شاہ انگلستان کے خزانے نہیں  
بلکہ غریب ہندوستانیوں کی جیب سے ادا کی جائے؟ اگر اس حقیقت سے کیسے انکار ہے تو ہندوستان  
میں برطانوی عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالو اگر اپنا اطمینان کیا جاسکتا ہو  
ناظرین جاسمہ کے لئے اگر باخاطر نہ ہو تو یہ سرگذشت بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اور آئندہ سطور  
میں ہم اپنے سرکاری قرضہ کی ابتداء اور اس کی نوعیت اور تدریج اضافہ کا مختصر حال پیش کرنا  
چاہتے ہیں تاکہ اس کے متعلق ناظرین خود کو کافی رائے قائم کر سکیں۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ موجودہ حکومت ہند وارث ہے ایسٹ انڈیا کمپنی  
کی جو مسئلہ میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی، ابتداء کمپنی کی  
حیثیت محض تجارتی تھی، لیکن بہت جلد اس ملک کی سیاسی باطل پر دوسرے مہروں کے مقابلہ  
میں کمپنی بہادر کی حیثیت شطرنج کے ”فرضی“ کی ہو گئی، کمپنی نے پہلے اپنی مدافعت کے لئے اس کے  
بعد بیرونی رقبوں کے استیصال کے لئے، پھر ملک کے اندر اپنے دشمنوں اور اپنے دوستوں کی  
سرکوبی کے لئے اور آخر میں تمام ملک کے اندر اپنی حکومت کا سکہ جانے کے لئے ملک کے  
اندراور ملک کے باہر بے شمار جنگیں اور لڑائیاں مول لیں

کمپنی کا کل وصول شدہ سرمایہ چھ ملین پونڈ تھا جس سے وہ حکومت بھی کرتی تھی اور  
تجارت بھی اور یہ اس لئے ممکن تھا کہ بقول آدم اسمتھ کے ایسٹ انڈیا کمپنی *Traded*  
*like rulers and ruled like merchants* (حکمرانوں کی سی تجارت کرتی تھی،  
اور تاجروں کی سی حکومت) پھر بھی ظاہر ہے کہ کمپنی کا وصول شدہ سرمایہ تجارت کے لئے تو

یقیناً کافی تھا لیکن ہندوستان کی سیاست میں اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لئے اور اپنی سلطنت کے قیام اور استحکام کے لئے یہ رقم کہاں تک کافی ہو سکتی تھی! خصوصاً ایسی صورت میں جب کمپنی کے حصہ دار اپنے سرمایہ پر منافع کے لئے ہمیشہ تقاضہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ جنوبی ہند میں جب پہلی بار فرانسیسیوں سے سخت مقابلہ پڑا تو ان کی قوت کو توڑنے کیلئے کمپنی کو بالآخر قرض لینا پڑا اور یہی ابتداء کہی جاسکتی ہے ہمارے سرکاری قرضہ کی ۱۷۹۵ء میں جب شیراز کاٹنے بنگال کی دیوانی حاصل کی تو اس وقت اس قرضہ کی ادائیگی کا بار صوبہ بنگال کی مالگذاری پر ڈالایا گیا اسکے بعد جو محرک آرائیاں ہوئیں ان کی وجہ سے قرض میں اضافہ ہوتا گیا اور ۱۷۹۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کل قرضہ تقریباً سات ملین پونڈ ہو گیا۔ دارن ہینٹنگز کے غارتگرانہ طرز حکومت نے بنگال کو لوٹ کر ویران کر دیا لیکن کمپنی کے قرض میں کمی کی بجائے برابر اضافہ ہوتا رہا اسلئے کہ کمپنی کے ایجنٹوں کو ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کا ٹھیکہ اسی شرط پر دیا گیا تھا کہ کمپنی کو تجارت میں منافع ہو یا نہ ہو کمپنی کے حصہ داروں کو دس فیصدی سالانہ منافع ضرور تقسیم کیا جائے، اور یہی نہیں بلکہ چار لاکھ پونڈ سالانہ برطانوی قوم کو بھی بطور مال غنیمت کے ایک حصہ کے تذر دیا جاتے، ایک طرف یہ مطالبات دوسری طرف ہندوستان میں آئے دن کی جنگیں لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی آمدنی کی ضمانت پر ہمیشہ قرض لیا گیا اور ۱۷۹۹ء میں کمپنی کا کل قرضہ دس ملین پونڈ ہو گیا، اس کے بعد لارڈ ویلی کے عہد حکومت ۱۸۰۳ء میں قرضہ اور بڑھ کر دو لاکھ ہو گیا اور دو سال کے اندر سات ملین کا سپر فزید اضافہ ہوا یعنی ۱۸۰۵ء میں کمپنی کا کل قرض ۲۷ ملین پونڈ تھا، کمپنی کو اپنی اس پالیسی سے فائدہ ہوا اور بنگال کے روپیہ سے سیور اور میسور کے روپیہ سے مرہٹوں کی طاقت کو یکے بعد دیگرے ختم کیا گیا، اگر ایک طرف قرض میں اضافہ ہوا تو دوسری طرف کمپنی کی بادشاہت بھی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں کمپنی تقریباً تمام ہندوستان پر بلاشرکت غیرے مسلط اور قابض ہو گئی حکومت انگلستان اب زیادہ عرصہ تک اتنی بڑی سلطنت کو اپنی رعایا یعنی کمپنی کے قبضہ میں نہیں رہنے دینا چاہتی تھی، لیکن کیا بارگی کمپنی کو عیودہ کر دینا بھی اس وقت مناسب تھا؟

اس لئے کچھ مدت کے لئے اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، البتہ حکومت انگلستان نے اب اس نئی سلطنت کو کمپنی سے کھیتہ حاصل کر لینی تیار کیا شروع کیا اور عرصہ کے مشور میں ایسی دفعات بھی گئیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کمپنی کی سلطنت حکومت انگلستان کے اہتوں میں عنقریب منتقل ہو نیوالی ہے کمپنی کو ڈائریکٹرز نے ہوا کا رُخ دیکھ کر حکومت کے ساتھ معاملہ کرنا چاہا، اور جو کچھ مانگنا تھا مانگا، حکومت نے بھی دل کھول کر دیا، پھر ایب سودا کہاں نصیب ہوتا کمپنی کا قرضہ اس وقت، ۳ ملین پونڈ چھوٹا تھا، اور یہ پہلے عرض کیا گیا کہ کمپنی کی حیثیت اس وقت تک تاجر کی بھی تھی اور زمیندار کی بھی، دشواری یہ تھی کہ تجارت اور زمینداری کے بے کھاتے شروع سے علیحدہ علیحدہ نہیں رکھے گئے تھے ۱۸۱۴ء میں بہت غور و فکر کے بعد دونوں حسابات الگ الگ رکھنے کی تجویز کی گئی تھی لیکن اگر اس نقطہ نظر سے کمپنی کے حسابات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علاؤ اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اسکی وجہ سے کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے میں حکومت کو کچھ دشواریاں ضرور پیش آئیں لیکن طویل گفت و شنید کے بعد جو شرائط فریقین نے منظور کئے وہ حسب ذیل تھے:-

- ۱۔ کمپنی کی تمام املاک اور جائیداد شاہ انگلستان کے نام لکھی جائیں۔
- ۲۔ کمپنی کے تمام قرضہ جات نیز دیگر نقصانات کا بار حکومت ہندوستان پر ڈالا جائے۔
- ۳۔ کمپنی کے سرمایہ پر بشرح ۱۰ فیصدی کل ۶ لاکھ تیس ہزار پونڈ سالانہ منافع ہندوستان کی مالگاری میں سے سب سے پہلے وضع کر کے انگلستان میں ادا کیا جائے۔
- ۴۔ عرصہ کے بعد اگر پارلیمنٹ چاہے تو منافع تقسیم کرنے کے بجائے ہر سو پونڈ حصہ کو دوسو پونڈ کی شرح قیمت سے خرید سکتی ہو یعنی کمپنی کے ۲ ملین پونڈ کے وصول شدہ سرمایہ کی قیمت ۱۲ ملین پونڈ ادا کرنا ہوگی۔

۵۔ کمپنی کی تجارتی املاک میں سے ۲ ملین پونڈ نکال کر ایک علیحدہ محفوظ سرمایہ کانسٹو انگلستان میں قائم کیا جائے جس میں سود و سود کا اضافہ ہوتا رہے تاکہ آئندہ اس

فنڈ سے کمپنی کے حصے خریدے جائیں نیز یہ کہ اگر کسی وجہ سے حکومت ہند کمپنی کے حصہ داروں کو کسی سال منافع بر وقت تقسیم ذکر کے تودہ رقم اس فنڈ میں سے وضع کر لی جائے۔  
۴۔ کمپنی کے دہلا زمین جن کے سپرد کمپنی کا تجارتی کا دبار تھا ان کو مناسب مسا وضع ان کی خدمات کا دیا جائے۔

مندرجہ بالا شرائط کسی تفصیل کے محتاج نہیں کمپنی نے سونے کی چڑیا سستے داسوں فروخت کی یا بیٹے اس سے بھی ہکو کچھ سروکار نہیں، البتہ جو چیز ہیں واضح کرنی مقصود تھی وہ یہ کہ چڑیا خریدی تو گئی لیکن دام کس کی جیب سے ادا ہوئے؟ اگر یہ بات واضح ہو گئی تو پھر مال مفت دل پر ہم کے مصداق حکومت انگلستان کے تنہا کمپنی کے مفاد کا خیال رکھ کر مندرجہ بالا شرائط منظور کر لینے پر آپ کو تعجب کیوں ہے؟

۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی کی تجارت بالکل ختم ہو گئی اور اب صرف حکومت کے فرائض باقی رہ گئے تھے، ہندوستان کا نقشہ تو ہماری آزادی کے سُرخ خون سے رنگا ہی جا چکا تھا اب ہندوستان کے حدود کے باہر پیش قدمی شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب لارڈ کلینڈن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے تو اس زمانہ میں روس اور انگلستان کے تعلقات بہت کشیدہ تھے، اور روس کو نیچا دکھانے کیلئے کسی وجہ کی تلاش تھی، چنانچہ براندیشہ ظاہر کر کے کہ روس افغانستان کو حریف بنا کر ہندوستان میں انگریزی طاقت کو نقصان نہ پہونچا دے حفظ قائم کے طور پر ہندوستان کے شمالی و مغربی سرحدی صورت پر جنگی کارروائیوں کے شروع کر دینے کی قرارداد منظور ہوئی۔ جنگ انگلستان ہی سے تیار ہو کر لارڈ کلینڈن کے ساتھ آیا اور اسی کے مطابق افغانستان سے جنگ ہوئی اور اس جنگ کے تمام مصارف ہندوستان کے ذمہ ڈالے گئے، اس زیر باری پر تو وائسٹ انڈیا کمپنی نے بھی احتجاج کیا اور خود دار العوام کے بعض مشہور اراکین نے اس نا انصافی کی شدید ترین مخالفت کی جس کا اندازہ جان برائٹ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے ۱۸۵۹ء میں ایک تقریر کے دوران میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے۔

”پندرہ ملین پونڈ چنگ افغانستان میں صرف ہوتے اسکا تمام تر بار انگلستان پر پڑنا چاہئے، اس لئے کہ یہ جنگ انگریزی وزارت کے حکم سے ہوئی اور محض انگلستان کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لڑی گئی تھی۔“

لیکن برطانوی عہد کی تاریخ کا یہ کوئی پہلا واقعہ تھا نہ آخری، خود برطانوی حکومت کا نظام اور دستور تمام تر ایسی ہی مقدس بات چیتی ہے جن کے سامنے قانون انصاف اور اخلاق سب کو سر جھکا نا پڑتا ہے، پس اگر کمپنی کے احتجاج اور برائٹ کے مشورہ کو نظر انداز کیا گیا تو اسی لئے کہ خود کمپنی اور حکومت انگلستان کے ناجائز فوجی مصارف کا بار ہندوستان پر ڈالنے کی رسم اور رویت پہلے سے قائم تھی۔ بہر حال ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ جنگ افغانستان کی وجہ سے بھی کمپنی کے قرض میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کمپنی نے سندھ کی طرف پیر پھیلائے، اور برما کی طرف بھی ہاتھ بڑھایا اور جو کچھ جہاں سولہ لاکھ اپنے قبضہ میں کیا اور برقی بھی اسی کا تھا اسی وقت وہیں کمپنی کا قرضہ ۵ ملین پونڈ ہو گیا۔ اس کے بعد ہی سال بسال کچھ کچھ اضافہ ہوتا رہا بالآخر کمپنی کی دست درازیوں کو نگاہ کرنا دیگر وجہ سے جب ہندوستان کے اندر حکومت کے خلاف غدر پڑا ہو گیا تو اس کو فرو کرنے کے لئے اور اُنھیں ہوتے نقصان کو دبانے کے لئے حکومت انگلستان کو براہ راست مداخلت کرنا پڑی اور اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے انگلستان سے فوجیں بھیجیں دوبارہ امن و امان قائم کرنے میں صرف ایک سال کے اندر تقریباً دس ملین پونڈ کا اور انسانیہ سرکاری قرضہ میں ہوا۔ یہ کہا تک جائز تھا؟ اس کے متعلق مسٹر ریش چندر روت اپنی معاشی تاریخ ہندوستان میں تحریر فرماتے ہیں۔

”فعلی برطانوی حکام کی تھی لیکن جرمانہ ہندوستان کو ادا کرنا پڑا اس سے قبل ہندوستان کی فوجوں سے عین میں اور افغانستان میں کام لیا گیا اور جو خدمات ہندوستانی سپاہ نے ہندوستان کے حدود کے باہر انجام دیں ان کا کوئی معاوضہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو نہیں ادا کیا گیا لیکن جب برطانوی سپاہ غدر کو فرو کرنے کے لئے ہندوستان بھیجی گئی تو انگلستان نے تمام مصارف حکومت ہند سے وصول کر لئے۔“

معارف بھی پورے پورے نہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ میجر ونگٹ نے اپنی ایک تصنیف میں اس سلسلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”برطانیہ عظمیٰ نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوج کے تمام معارف کی ادائیگی کا مطالبہ کیا بلکہ ظلم یہ کیا کہ انگریزی فوج جس تاریخ کو ہندوستان کے لئے انگلستان سے روانہ ہوئی اس سے چھ ماہ قبل جو کچھ اس فوج پر صرف ہوا اتحادہ بھی ہندوستان سے وصول کر لیا۔“

میجر ونگٹ کو یہ شکایت شاید اس لئے پیدا ہوئی کہ برطانیہ عظمیٰ کا رویہ اس قسم کے معاملات میں اپنے دیگر مقبوضات اور نوآبادیات کے ساتھ بالکل مختلف رہا ہے جس کی تائید میں ہم ایک اور انگریزی مصنف کا قول نقل کئے دیتے ہیں

”وہ نوآبادیات یا بالفاظ دیگر ہندوستان کے تمام برطانوی نوآبادیات مقبوضات کا تمام خرچ نیز بری اور بحری افواج کے معارف و دولت متحدہ کی مالگنداری کو ادا کئے جاتے ہیں اور یہ ایک قدرتی نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے معاملہ میں بھی اسی قسم کے تمام اخراجات اس ملک کو برداشت کرنے پڑے ہیں۔ لیکن اصل واقعہ کیا ہے؟ برطانوی مالگنداری سے ایک پیسہ بھی ہندوستان کے فوجی تحفظ پر خرچ نہیں کیا گیا۔“

غرض جہاں تک ہندوستان پر صرف کرنیکالعلق ہے انگلستان کو ہندوستان سے کسی قسم کا سروکار نہ تھا۔ اور تمام باتیں معاملہ کی اورتاجرانہ اصول پر طے کی جاتی تھیں۔ البتہ ہندوستان کے خزانہ سے براہ راست اور بالواسطہ جن جن طریقوں سے ممکن تھا روپیہ لیا گیا۔ ایک ”مطالبات وطن“ ہی کے نام سے جو رقوم سال بہ سال ہندوستان کے خزانہ سے انگلستان میں ادا کی جاتی تھیں ان کو اگر شمار کیا جائے تو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ۵۰ ملین پونڈ سے کسی طرح کم نہ بنیگی، اس میں سے زیادہ سے زیادہ دس ملین پونڈ کا سامان ہندوستان کو باقی رقم کو یا نذر کے طور پر ادا کی گئی۔ سرحدت کا خیال جو کہ ہندوستان کے سرکاری قرضہ کی اصل وجہ یہی مطالبات وطن ہیں مصنف موصوف نے کمپنی کے تمام حسابات کا جائزہ لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ باوجود کمپنی کی فتنہ خیز چیلوں اور اسراف کے ۱۸۵۷ء تک

کمپنی کی کل آمدنی کی میزان کل خرچ سے زیادہ نکلتی ہے اسلئے اگر برطانوی حکومت کے آخاڑے  
ہندوستان کو مطالبات وطن نہ ادا کرنے پڑتے تو ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان کی حکومت براہ  
راست تاج انگلستان کے قبضہ میں آگئی اس وقت ہندوستان کی تحویل میں ایک کثیر رقم فاضل موجود  
ہوتی، ہندوستان کا سرکاری قرضہ جو کمپنی نے اپنے صد سالہ عہد حکومت میں لیا تھا وہ  
حقیقتاً نا جائز مصارف کے لئے تھا جو ہندوستان کی طرف سے انگلستان میں ادا کئے جاتے  
تھے اور جو انصاف کسی صورت سے ہندوستان کے ذمہ واجب الادا نہ تھے۔

مصنف مذکور نے سرکاری قرضہ کی جو وجہ بتلائی جو وہ غلط تو نہیں کہی جا سکتی لیکن ہمارے  
نزدیک مسٹر ان سی وکیل کی یہ رائے زیادہ صحیح ہو کہ سرکاری قرضہ کی ابتداء تو ان جنگوں کی وجہ  
سے ہوئی جو کمپنی کو لڑنا پڑیں لیکن اس میں بند رنج اضافہ جنگوں کی وجہ سے اور مطالبات وطن  
کی وجہ سے ہوا، یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کل قرضہ میں کتنی رقم مطالبات وطن کی وجہ سے ہوئی اور  
کتنی جنگوں کی وجہ سے!

بہر حال خواہ مطالبات وطن کی وجہ سے خواہ جنگوں کی وجہ سے خواہ دونوں وجوہ سے  
ہو، ایک کثیر رقم کمپنی کے ذمہ قرض ہو گئی اور ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو کل قرضہ کی میزان  $\frac{1}{4}$  ۶۹ ملین  
پونڈ ہو گئی تھی، غدر فرد ہونے کے بعد ہندوستان براہ راست برطانوی پارلیمنٹ کے ماتحت  
آگیا اور ہندوستان کی بہتر حکومت کے لئے جو قانون پارلیمنٹ نے منظور کیا اس میں ایک دفعہ  
یہ بھی رکھی گئی کہ کمپنی کے تمام قرضہ جات اور مالکین کمپنی کے حصوں پر سانحہ ہندوستان کی لگژریا  
سے ادا کیا جائیگا!

کمپنی نے اپنے حسن انتظام سے تقریباً ۷۰ ملین پونڈ کا قرضہ چھوڑا تھا، اب برطانوی پارلیمنٹ  
کی براہ راست نگرانی میں اس قرضہ میں دن دوئی رات چو گئی ترقی شروع ہوئی اور بیس سال  
کے اندر کل قرضہ ۱۳۹ ملین پونڈ ہو گیا یہ اضافہ بھی زیادہ تر جنگی کارروائیوں اور فوجی مصارف کی وجہ سے ہوا اول  
غدر کے سلسلہ میں ۲۰ ملین پونڈ کل خرچ ہوئے اس کے بعد ۱۸۶۷ء میں جنگ ابی سینیا کے مصارف

کے لئے ایک کثیر رقم ہندوستان کے خزانہ سے وصول کر لی گئی حالانکہ ہندوستان کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ سولہ لاکھ سے زائد روپے تک ۵۰ ملین پونڈ کا مزید اضافہ ہوا لیکن اس میں سے بیشتر رقم ریپوں کے جاری کرنے پر صرف کی گئی اور باقی رقم افغانستان کے غلات ان جنگی کارروائیوں میں صرف کی گئی جو سولہ لاکھ اور سولہ لاکھ کے درمیان حکومت نے کس ۱۹۱۴ء میں کل قرضہ ۱۰۰ ملین پونڈ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ سولہ لاکھ میں حکومت ہند نے ڈیڑھ ارب روپیہ قرض لیکر جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کی امداد کی اور ان جنگ میں اور جنگ کے بعد بھی حکومت ہند کے میزانیہ میں کئی سال تک مسلسل خسارہ رہا۔ اس کی وجہ سے بھی قرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور مارچ ۱۹۲۷ء میں حکومت ہند کا کل قرضہ پید آور اور معمولی ملا کر تقریباً سات سو ملین پونڈ یعنی دس ارب روپیہ ہو گیا، اس وقت سے اب تک اس رقم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ تخفیف کیلئے کوششیں کیا جاتی ہیں جنگ عظیم میں جب برطانیہ دشمنوں کے زعم میں تھا اس وقت ہندوستان نے اپنی فوج اور سپاہ سے جھڑپیں ادا کر تھی کی اور برطانیہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے جس قدر خون غریب ہندوستان کے جسم میں تھا بہا یا گیا لیکن یہ کافی نہیں سمجھا گیا۔ اور ڈیڑھ ارب روپیہ اور قرض لیکر حکومت انگلستان کو نذر دیا گیا اس کے تعلق مسٹر کے شاہ کی رائے سے غالباً شخص اتفاق کر سے گا کہ وہ تحفہ یا نذر جو عطیوں کی خواہش یا منظوری یا مشورہ کے بغیر ان کے نام سے قرض لیکر وصول کر لیا جائے اس کی ادائیگی کی ذمہ داری قانوناً، اخلاقاً اور انصافاً ان لوگوں پر کیونکر ہو سکتی ہے جن کو اس کی خبر تک نہیں ہے!

اب ان واقعات کی روشنی میں جو سطور بالا میں بیان کئے گئے ہیں یہ دعویٰ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ سرکاری قرضہ تمام تر اس انگریزی سرمایہ پر مشتمل جو ہندوستان کے معاشی وسائل کو ترقی دینے کے لئے اس وقت انگریزی سرمایہ داروں نے لگایا تھا جب ہندوستانی ریلوں اور نہروں کے لئے سرمایہ فراہم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا، حکومت ہند نے اپنے کل قرضہ کی دو تہیں فراہم دی ہیں۔ ایک معمولی اور دوسرا پید آور۔ آخر الذکر سے مراد وہ قرضہ ہے جو ریلوں نہروں اور



دیگر تجارتی کاموں پر صرف کیا گیا ہے اور اس سے منافع کی توقع ہے۔ اور اول الذکر سے مراد وہ رقم ہے جسکے مبادلہ میں کوئی منافع مادی شکل میں حکومت کو وصول نہیں ہو سکتا! اس معنوں میں ہم نے صرف اول الذکر کی نوعیت سے بحث کی ہے آخر الذکر قسم کے قرضہ کو پیدا آور کاموں پر صرف کیا گیا ہے لیکن اس پر بھی اقتصادی نقطہ نظر سے بہت سی اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن طوالت کی وجہ سے اس وقت ہم اس پر تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس قدر اشارہ ضروری ہے کہ اس قسم کے بیشتر رقم انگریزی سرمایہ داروں سے لی گئی ہے۔ چنانچہ سود کی کثیر رقم جس سے ہندوستان کے سرمایہ دار فائدہ اٹھا سکتے تھے اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو سکتا تھا وہ برطانوی سرمایہ داروں کے نیگ لگتی ہے۔!

---

## ملازموزی صاحب کا خط

گرامی منزلت ایڈیٹر صاحب رسالہ ”جامعہ“ دہلی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! معلوم ہوا کہ آج رسالہ جامعہ بابۃ ماہ مارچ ۱۹۳۳ء ملا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا، اور اسی سے ”آل محترم“ کی خیریت معلوم کر کے خوشی حاصل ہوئی اور از حد خوشی حاصل ہوئی۔

دیگر احوال یہ ہے کہ وہ اپنے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب سے بھی بدشتم دید ملاقات ہوئی تھی اور جب سے کہ مسلمانوں کے صحیح معنی کے ہمدرد اور اسلامی اخلاق کے لائق تقلید نمونہ حضرت قبلہ حکیم اجل خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انکے ہمارے مصافحہ کر دیا ہے اسوقفے ان سے برابر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کبھی ہمارے گھر پر آتے نہ ہم انکے گھر پر جاتے مگر جناب ملاقات ہے کہ ہوتی ہی رہتی ہے اور جب ہوتی ہی رہتی ہے تو ہوتی ہی رہے گی اور جب ہوتی ہی رہے گی تو ہوتی ہی چلی جائے گی اور جب ہوتی ہی چلی جائے گی تو بس ہر وقت اسے ”ہوئی“ سمجھئے اور جب ہوتی تو پھر ہوتی ہوئی، مگر ہاں اس مرتبہ کا..... دیگر احوال یہ ہے کہ

ڈاکٹر صاحب مدنیج کے ہمراہ وہ کسی زمانے میں اخباروں میں چھپنے والے قبلہ عبدالمجید خواجہ مدظلہ سے بھی ہوئی تھی، بس نہ پوچھیے کہ کس درجہ خلیق اور ملنسار بزرگ ہیں اور خیر ملنسار تو ہر علی گڑھ والا ہوتا ہی ہے وہ تو کہنے کہ فرائج میں خشکی تو بس یہ کچھ بریلی، مراد آباد اور تھانہ بھون ہی کے حصہ میں آئی ہے اور خود یہ آپ کا ناچیز سا ملازموزی ”ملنساری“ کے معاملہ میں کیا کم ہے آخر آپ نے برادر مرڈاکٹر عابد حسین صاحب مدظلہ نے برادر مرڈاکٹر علیا جیبی نے اور سارے ہندوستان نے ہمارا تجربہ کر ہی لیا ہے۔ اُسے صاحب اور تو اور وہ

آف انڈیا کی گورنمنٹ تک اس معاملہ میں ہماری قائل ہے کیونکہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ بس جس سڑ  
 طے تو پھر طے ہی طے اور حضرت وہ خواجہ عبدالمجید صاحب یا عبدالمجید خواجہ صاحب کس بلاکے  
 ہمدرد اور قدردان واقع ہوئے ہیں واللہ کہ مصافحہ کرتے ہی اپنے ساتھ لجا رہے تھے مگر  
 وہ تو کہنے صحیح صحت والوں نے ایسا نہ ہونے دیا اور صاحب سبحان اللہ کہ خواجہ صاحب کھدر کا  
 لباس تو اس درجہ سفید اور صاف پہنتے ہیں کہ دنیا کے ایک گاندھی صاحب بھی ایسا صاف  
 کھدر نہیں پہن سکتے اور صاحب ہم تو صاف کہتے ہیں کہ لباس کی صفائی ہی سے انسان کی  
 ذہنی استعداد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص جتنا نفیس لباس پہنے گا اُس کے مزاج  
 میں ترقی، بلندی، عروج اور کامرانی کے اتنے ہی جذبات بھی مشتعل اور بیدار رہیں گے۔  
 اور یہ نکتہ آپ ہماری طرف سے جامعہ کے تمام طلبہ سے کہہ دیجئے گا مگر خدا کے لئے بھول جائیگا۔  
 کیونکہ معاف کیجئے گا مولوی صاحب کہ اب آپ ضروری سے ضروری بات کو بھی بھول جاتے  
 ہیں اور اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ بڑی بڑی گورنمنٹیں جب بڑی بڑی باتیں کہہ کر  
 بھول جاتی ہیں اور رعایا کے یاد دلانے پر بھی انہیں مشکل سے یاد آتی ہیں تو آپ اور ہم تو خیر  
 آدمی گورنمنٹ بھی نہیں تو ہاں وہ نکتہ یہ ہے کہ دیکھو لڑکوں اور لڑکیوں کا جو لڑکی کہ میلا  
 اور گندہ لباس پہنے گا یا پہنے گی اس کے مزاج میں کسل، ہستی، بے ہمتی، بے علمی، بستی  
 جانی اور انگریزائی لینے کی عادت پیدا ہوگی اگر یقین نہ ہو تو دیکھ لو دہلی اور گھنٹو کے چاند و گانجا،  
 اور جس استعمال کرنے والوں کا حال اور لباس۔ مگر جناب اب تو ہوا ہی کچھ اٹھی چلی ہے  
 کہ اکثر مدارس کے لڑکے لباس کی صفائی میں تو کوہ قاف کی مشہور ”نیلم پڑی“ کو مات کرتے  
 ہیں مگر عمل، تعلیم، اور کس کمالات میں کچھ اس درجہ پودے، بھدے اور گندے رہتے  
 ہیں کہ واللہ بات کرنے کو آپ کا جی چاہتا ہو تو چاہتا ہو ہمارا جی تو نہیں چاہتا کیونکہ آپ جانتے  
 ہیں کہ باوجود ملازمت پیشہ ہونے کے ہم عمل کو کس درجہ پسند کرتے ہیں اور ایک طالب علم  
 کی قابل احترام زندگی اس کا وہ پہاڑوں سے زیادہ اونچا عمل ہی ہو سکتا ہے جسے عام

طور پر حصول تعلیم یا حصول علم کہتے ہیں تو بس اس کے یہ معنی ہونگے کہ جو لڑکا کہ حصول علم پر  
حرصیں ہوگا متعدد ہوگا تو پھر وہی عبد المجید خواجہ کھدری "کہلانیکا"۔

دوسری بات یہ کہ خواجہ صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں ہم سے جو ہمدردی فرمائی  
وہ عملی تھی زبانی نہیں تو پھر اس کے ہوئے ناد و معنی ایک یہ کہ خواجہ صاحب میں "عل" کی  
قوت بیدار ہے جو ایک محبوب ملکہ ہے تمام انسانی ملکات میں دوسرے یہ کہ "عل" میں "صدق  
اور سچائی" بھی شریک ہو تو اگر خواب اگر آپ کے ہاں کے طلبہ میں سچائی "عل" میں شریک ہو جائے  
تو پھر لا حول پڑے جو ہماری قومی اور اجتماعی ترقی کو یہ بے چارے پولیس والے روک تو  
لیں مگر لا حول و لا معاف کیجئے گا مولوی صاحب قصہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور اصل بات  
رہ گئی اس لئے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ

ماہیچ کا رسالہ "جامعہ" ماہیچ ہی میں جب مل گیا تو الحاقی کہ ہم آپ کے اونچے صاحب  
کے کاتب صاحب کے اور مطبع والوں کے حوصلے، ہمت اور عمل کے قابل ہو کر رہ گئے یوں  
کہ وہ کل کی بات ہے کہ یہی بے چارہ رسالہ جامعہ تھا کہ تین چار مہینے لیٹ ہو گیا تھا اور ہم  
ہمیشہ جنوری میں پچھلے اکتوبر کے اور اکتوبر میں پچھلے جنوری کے مضامین پڑھا کرتے تھے مگر  
اب اسی رسالہ کو جب ہم وقت پر آدیکھتے ہیں تو دالندرجی خوش ہوتا ہے اور اگر اس پر اس  
رسالہ نے مداومت اختیار کی تو خوش ہوتا ہی رہے گا اور خوش ہوتا ہی چلا جائے گا تو اس  
— ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ جی کا خوش ہونا اصل میں "عل" پر موقوف ہے مگر نہایت  
ہے تو عمل کے نیک اور مفید ہونے میں ورنہ جناب عمل تو یہ بھی ہے کہ آپ جامعہ سے  
فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کر لیں اور پھر مسلمانوں سے یوں ملیں گویا وہ سب آپ کے غلام  
ہیں ان پر جبر ماننے کریں انہیں سزائیں دیں ان سے سیدھی حج بات نہ کریں سلام کا جواب دیں  
تو ایک انگلی سے انہیں ترقی سے روکیں اور خود ترقی کریں، اُنکے خلاف لوگوں سے

غلط شکایتیں کریں اور خود رتی کریں، عام مسلمانوں کی خدمت سے منہ موڑ کر اپنے گھر میں قیصر جرنی بن کر بیٹھ جائیں مگر گھر پر ”گورنمنٹ آف انڈیا“ ملے آئے تو تہہ باندھے ہی دروازہ کے باہر تک استقبال کو بھاگ کر آجائیں۔ اور جو غریب مسلمان حاضر خدمت ہو تو ملازم سے کہلا دیں کہ اس وقت آرام میں ہیں مل نہیں سکتے۔ سچ ہے مولوی صاحب یہ باتیں تو کچھ علوم دین کی تحصیل ہی سے حاصل ہوتی ہیں ”پانیر“ میں ان باتوں کا تذکرہ کہاں؟ یا پھر اس قسم کی باتیں مولانا اشرف ٹو کی قسم کے پروفیسر بتا سکتے ہیں۔

بے شک مولوی صاحب ہم دہلی میں آئے تھے اور ”جمعیتہ علما“ میں قیام کیا تھا مگر وہ کہتے کہ حضرت ہلال احمد صاحب زیری ایڈیٹر اخبار ”الجمعیۃ“ سابق غیر بی لے و حال بی لے نے یہ کہہ کر جامعہ ملیہ نہ آنے دیا کہ وہاں ٹیلیفون نہیں ہے۔ اور قریباغ یہاں سے عراق عرب کے برابر دور جگہ ہے اس لئے ہم علی گڑھ چلے گئے، اسے صاحب مقصد کیا تھا یہی کہ معائنہ کے بعد اندازہ کریں گے کہ مسلم یونیورسٹی نمبر اور آپ کی اس مسلم یونیورسٹی نمبر کے طلبہ کی اخلاقی حالت میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے بعد ہی سے تو مکاری، فریب، غرور، خنجر، منافقت اور روزہ نماز سے نفرت یا انکار کا رواج عام ہو گیا ہے حالانکہ لوگ اس سے پہلے بھی تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور آخر ہم آپ اُسی زمانے کے تعلیم یافتہ ہیں کہ نہیں مگر دیکھئے کہ ہم آپ ماشاء اللہ مسلمانوں کے لئے کس قدر مفید ثابت ہو رہے ہیں تو بس وجہ یہی ہے کہ ہمارا آپ کا زیادہ وقت یا گزرتا تھا حصول علم میں یا پھر مسجد اور مولویوں کی صحبت میں جہاں سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا کہ خدا کے خوف اور حشر کے عذاب سے دل کو ڈرایا جاتا تھا مگر اب تو کلب اور لاہری میں وقت گزرتا ہے اور ان میں سوائے شپیکٹر ملٹن اور نادولوں کے دہرا ہی کیا ہے یا

پیرنیں میں وقت گزر رہا ہے تو پھر آپ ہی فرمائے کہ نینس میں مسلمانوں کی خدمت کرنے کا کونسا وعظ پوشیدہ ہوتا ہے؟ غیر تو جانے دیجئے واقعی ہیں اور آپ کو ان باتوں سے کیا تعلق؟ مگر مولوی صاحبؒ تو بات پر بات مٹکتی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے اب یہ دیجئے ناکہ طلبہ کے فراجوں میں غیر قومی عادات اور غیر قومی اخلاق کا رنگ تو گیا پرچ اور قومی اور آبائی عادات و آداب کا رنگ گیا مٹ اور پھر کہتے کیا ہیں کہ ہم ہیں جناب سلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور ہم ہیں جناب اسلامیہ کالج پشاور کے فارغ التحصیل اور حال یہ ہے کہ غیر ملکی لباس اختیار کر کے افلاس پھیلا رکھا ہے اور کہتے یوں ہیں کہ صاحب وہ تو مغربی قوموں کے آنے سے ہندوستان میں ان فلک سام ہو گیا ہے لا حول ولا اے صاحب اگر یہ ہندوستانی اپنی معاشرت میں قومی لباس اور قومی آداب کو برقرار رکھیں تو ایمان سے کہے کہ پھر افلاس ایک منٹ بھی ٹہر سکتا ہے، تو غرض قصہ کون کہے۔

دیگر احوال یہ ہو کہ بس آپ کے اس حوصلے اور ثبات عمل کی داد دیتے ہیں کہ آپ نے رسالہ ”جامعہ“ کو وقت کا پابند فرما دیا اور کچھ ننگ نہیں کہ یہ آپ کے ہاں کا جہایت درجہ قابل احترام حسن ہے کہ آپ کے ہاں کی ہر چیز میں عمل ہے اور عمل کے ساتھ ہی بخاشی اور حوصلہ وہ جو آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ہمارے ہاں کے جتنے ”فاریخت“ صحافت اردو میں کام کر رہے ہیں ان سے ہمارے ہاں کی تربیت کا اندازہ کر لو تو یہ آپ نے بالکل اور ”بہت ہی بالکل فرمایا ہے“ مگر کیوں مولوی صاحب آپ کے ہاں کے کچھ ”فاریخت“ ”ڈپٹی کلکڑی“ ”ججی“ اور کٹھنری“ کے عہدوں پر بھی فائز ہوئے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ مولوی صاحب اصل میں انسانی اخلاق اور اسلامی جذبات کا امتحان تو ان عہدوں پر پہنچکر ہوتا ہے کہ یہاں ”نشہ حکومت“ سوار ہوتا ہے تو بس ہم تو تب مانیں گے آپ کے طلبہ کی تربیت کو بہتر کہ وہ ان عہدوں پر پہنچکر ٹھہریں بے کس غریب اور نادار مسلمانوں کے ساتھ برا درانہ برتاؤ کریں، محلے کی مسجد میں ڈپٹی کلکڑی ہو کر بھی پانچ وقت کی نماز پڑھیں جو مسلمان انکے پاس آئے پہلے اسے سیکرٹ پلائیں پھر خود

نوش فرمائیں اردو زبان کے اخباروں کو خریدیں اور پڑھیں۔ تو خیر آپ تو انہیں سمجھاتے ہیں  
 انہیں اہم کام نہ مانتیں اُن کا کام کیا عرض کریں مولوی صاحب واللہ نوکری سے گھڑاتے  
 ہیں تو بس ”تھک نا فرمائی“ کے قابل رہ جاتے ہیں۔ آپ کو خط لکھیں تو کس وقت اور کس  
 طرح اس لئے فی الحال تو آپ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب ہی کو سلام کہہ دیجئے اور برادر محترم محمد  
 صاحب خواجہ کو آئندہ اشاعت میں سلام کہہ دیجئے گا۔ کیونکہ صاحب حق یہ کہ وہ بے چارے  
 ہیں سچے اور وضع دار مسلمان ہیں خدا محفوظ تو رکھے پانیر اخبار کے خریداروں سے اور تمہارے  
 آف انڈیا کے ناظرین سے

بچے بہت بہت سلام کہتے ہیں اور ہاں وہ بھی سلام عرض کرتی ہیں۔ باقی سب  
 طرح خیریت ہے جامعہ کے بچوں کو درجہ بدرجہ کہہ دیجئے گا، بہت یاد آتے ہیں، اور دیکھئے  
 مولوی صاحب آپ براہ کرم اپنے ہاں کے بچوں کو ”پکرک ایٹل کی چوری“ سے ہمیشہ ڈراتے  
 رہئے۔ خدا محفوظ رکھے۔ آمین

# چراغِ راہ

ہمارا مقصد تو ایک چھوٹی سی جگہ تھی، اگر کوئی بڑا شہر ہوتا تب بھی محفوظ علی صاحب کی ہستی اتنی ہی شہور اور رہنمائی میں اتنی ہی کامیاب ہوتی، وہ امیر نہیں تھے، امیدواروں کی سفارشیں نہیں کر سکتے تھے، زیادہ ملنسار بھی نہیں تھے، اور جان پہچان والوں کو ان کی صحبت میں کوئی خاص لطف بھی نہیں آتا تھا یہ سب خصوصیات ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جنہیں قسمت نے اپنی اصل نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔ محفوظ علی صاحب کو قسمت نے دولت اور اقتدار کے بجائے ایک فن میں کمال حاصل کر نیکامادہ عطا کیا تھا، اسیں ہدیس میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو ان سے برابر کی مدد و دعویٰ کر سکے، اس لئے ان کا رتبہ امیروں اور بابر لوگوں سے بہت بلند تھا، کیونکہ دولت اور اقتدار کی نعمت تو چھوٹے بڑے حصوں میں ہزار ہا آرزو مندوں کو ملی ہے، اور محفوظ علی صاحب اپنے فن میں کیتا تھے وہ محض صاحب کمال نہیں تھے، بلکہ اپنے فن کے موجد بھی، اور یہ ان کے تصور کی رسائی، احساس کی نزاکت اور مذاق کی خوبی کی ایسی زبردست دلیل تھی کہ ہر شخص ان کی عظمت کے سامنے سر جھکا کر پر مجبور تھا، ان کا قول تھا جو سب ہاتھ ملاتے تسلیم کرتے کہ بغیر ایشیا کے کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا، اور انہوں نے اپنی زندگی اپنے فن ہی، اپنے سارے حوصلے اپنے فن کی نذر کر دیئے تھے، لیکن ایشیا کی صلاحیت بھی کچھ خون میں ہوا کرتی ہے، اور دوسری خاندانی املاک کی طرح باپ سے بیٹے کو ملتی ہے، محفوظ علی صاحب کے دادا محمود علی نے طوائفوں اور گویوں پر لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا تھا، مرتے وقت تک ان کے گھر میں فاقہ کی نوبت آچکی تھی، مگر انہیں اس کا افسوس تھا کہ افلاس کی وجہ سے وہ ایک رنڈی کی قدر دانی نہ کر سکے، جس میں اور خوش آوازی میں تمام ہم پیشہ عورتوں اور مردوں سے بازی لیگتی تھی، محفوظ علی صاحب کے والد مقصود علی صاحب کو عورتوں اور موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی، ان کے خیال میں صاحب فن کا اپنے جوہر دکھانے کے لئے کسی دوسرے کا محتاج ہونا غامی کی دلیل تھی، انہوں نے مٹی، اشیاء کے استعمال پر مہارت حاصل کی، اولہ پر تمام دنیا دی حوصلے، اور سب سے زیادہ تندرستی شادمانگی، اور



اس فن میں حیرت انگیز کوشش دکھائے، وہ ٹھرا جس کا ایک گھونٹ پست حوصلہ آدمیوں کو ٹا دیتا، مقصود علیصاحب گھڑوں پی جاتے، وہ بھنگ اور چرس جس کا ایک کش دوسروں کے ہوش اڑا لیتا، وہ سیروں پہونک ڈالتے ہمو نایہ کہا جاتا ہے کہ دنیا اہل ہنر کو رسوا کرتی ہے ان کی آرزوؤں کا منہ چراتی ہے لیکن مقصود علیصاحب کا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا ان کے کمال کی شہرت دور دور پھیل گئی، ہر رئیس اپنا فخر سمجھتا تھا کہ انھیں شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں پر بلاتے اور انہو ہانڈو گوانگے کت مکملتے انھوں نے ساری عمر حیرت اور تعریف کا خراج وصول کر نہیں گذاری زمانے کی نافرمانی سے انھیں صرف ایک بار رشکایت ہوئی جب کسی نا اہل باب نے خدا جانے کس بنا پر ان سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا مقصود علیصاحب بد کو جب کبھی اس پر غور کرتے تو اس انکار کی صرف ایک وجہ ان کی سمجھ میں آتی، اور وہ یہ کہ اس زمانہ میں ان کی عمر جو بیس سال کی تھی، اور انھیں اپنے فن میں وہ کمال نہیں حاصل ہوا تھا جس نے آگے چل کر انھیں رشک جہاں بنا دیا۔

دنیا کا مافض بہت کمزور ہوتا ہے مقصود علیصاحب کے انتقال کچھ دنوں بعد ہی لوگ شرب خواری کی مجلسوں میں ان کا نام لینا اور ان کے کا زاموں کی داستانیں سنانا بھول گئے، اسی طرح جیسے طوائف محمود علی صاحب کی قدردانی اور خوش مذاقی بھول گئی تھیں، باب اور واداک یادگار زندہ کرنے کا فرض محفوظ علی صاحب نے ادا کیا، جب کبھی ان کی تعریف کی جاتی تو وہ نہایت درجہ سادہ مندی سے اپنے بزرگوں کا ذکر پھیر دیتے، اور بجائے اس کے کہ کٹھالی پر فاختہ لڑکے غریبوں میں تقسیم کرائیں، وہ اس تعریف کا ایک قصہ خدا کے یہاں مرحوموں کے حساب میں لکھا دیتے حالانکہ انھیں یقین تھا کہ ان کے بزرگوں کو دماغ فیہر کی حاجت نہیں، ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ ایک ایسے شخص کا رتبہ جو اپنے فن پر جان مٹا کر دے، اس جو ہر دے کم نہیں جو میدان جنگ میں اپنی جان ملت پر قرآن کرے، دونوں اپنا اپنی طرح پر شہید ہوتے ہیں ان کے رتبوں میں اونچے نیچے کا فرق کرنا انتہائی گستاخی ہے۔

خود محفوظ علیصاحب کے کمال کا ذکر آتا ہے تو میرا قلم رک رک جاتا ہے، اور میری خامیاں

مجھے سہا دیتی ہیں، میں ہرگز اس لائق نہیں کہ ایسے نازک مسئلے کو اپنا موضوع بناؤں میرے قلم میں یہ قدرت کہاں کہ ایسے باریک نقش آثار کے جو محفوظ علیصاحب کی صورت نگری کے لئے درکار ہیں، میں اپنی تحریر میں وہ نیز لگیاں، وہ شوخی وہ تیزی اور طراری کیسے پیدا کر سکتا ہوں جو محفوظ علیصاحب کی تقریر کو سنواری تھی لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں محفوظ علیصاحب کی یادگار بالکل بھلا نہ دی جائے میں اپنی خامیوں کو محسوس کرتا ہوں مجھے افسوس ہے کہ محفوظ علیصاحب کی یادگار زندہ رکھنے کے لئے میری نگلڈمی لولی تحریر کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، اور اس داستان کے پڑھنے والوں سے میری التجا ہے کہ وہ میری کوتاہی محفوظ علیصاحب کی طرف منسوب نہ کریں، میری دشواریوں کا لحاظ کر کے میرے اوپر رحم کریں، اور اپنے تصور سے اس تصویر کو روشن کر لیں جو مجھے اندیشہ ہے کہ باوجود میری کوششوں کے دُہندگی رہ گئی ہے۔

محفوظ علیصاحب کا فن آموں کا کھانا اور کھانا تھا، یوں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں مسلم ہوتی، ہر کس ونا کس جس کی گرہ میں کافی دام ہوں آم خرید کر کھا اور کھلا سکتا ہے، محفوظ علیصاحب کا کمال اسی میں تھا کہ انھوں نے اس معمولی سی بات کو فن کے درجے تک پہنچایا، اور اسی طرح جیسے بڑے شاعر و زمرہ کہسکر زبان پر قادر ہونے کا انتہائی ثبوت دیتے ہیں، محفوظ علی صاحب چند اجاب کو آموں کی دعوت دیکر ثابت کر دیتے کہ جس شخص کو خدا نے احساس اور مذاق عطا کیا ہو وہ اس معمولی سی بات میں کیا کیا کیفیتیں پیدا کر سکتا ہے، ان کے دادا شہوت کو عطر میں بہاتے تھے نفس کی بھوک کو نموں سے اور حسن کے نظارے سے تیز کرتے تھے، اور ایک خواہش جو نظر ناہر شخص میں ہوتی ہے اس اہتمام سے پوری کرتے تھے کہ پارساؤں کو ان پر رشک آتا، اور بواہوسوں کو عبرت ہوتی، عینقت انہیں ان کے کمال ایشار نے بہم پہنچائی، اور یہی ایشار محفوظ علیصاحب کے والد مقصود علی کی شہرت اور ہر دلعزیزی کی بنیاد تھا، وہ ٹھہرے کے گلاس چڑھا کر دوسروں کی طرح نشہ سے چور نہیں ہو جاتے تھے، شراب ان کی رگوں میں دوڑتی پھرتی تھی، شراب کے تصور میں وہ ہر دقت اس طرح بخود دہستے تھے کہ نشہ ان کی محویت میں صرف حقیقت کی شان پیدا

کر دیتا تھا، یوں ہی ہمارے محفوظ علیصاحب کے لئے آم کھانا محض ایک لذیذ شے سے ہیٹ بٹا نہیں تھا، ان کی ہستی آموں کی زنگت اور بو اور مزے میں گم ہو گئی تھی، جب تک درختوں میں بو نظر نہ آتا، ان کی طبیعت نڈھال رہتی، ان پر وہ ساری مصیبتیں گزرتی جاتیں، جو سچے عاشق پر ہجر کے زمانہ میں گزرتی ہیں انکے یابوس چہرے اور دامن شہ خاطر اور بے پردہ انگاہوں سے ہر شخص پر ظاہر ہو جاتا کہ بس وہ ایک وعدہ پر جی رہے ہیں، فروری اور مارچ کے مہینوں میں جب بو ٹھنیوں سے چھوٹ کر نکلتا شروع ہوتا تو محفوظ علیصاحب کا کنگفہ چہرہ، تیز رفتار گرم گفتار اور سستی سے ناچتی ہوئی نگاہیں کھینچتیں نہ آتا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو کچھ دن پہلے بوڑھوں کی طرح کمر جھکائے خلق خدا کی ہمدردانہ نظر دل کے سہارے لوکھڑا لوکھڑا کر کہیں چل چراتے تھے اور ایسے اُداس تھے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی تھی، اپریل اور مئی محفوظ علیصاحب کے لئے بڑی بے مینی تھے، یہ وہ مہینے ہیں جب موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، بیرحم آندھریوں سے باغ کے باغ برباد ہو جاتے ہیں، بیوقت بارش فصل کی فصل کا مزہ چھینا کر دیتی ہے، ان مہینوں میں محفوظ علیصاحب دن رات اضطراب میں تڑپ تڑپ کر گزارتے تھے کبھی ایمان اور توکل سے امید دل کو جگاتے اور صلا تے کبھی کفر کے کلہوں سے دل پر نشتر لگاتے لیکن وہ دن کبھی نہ کبھی آہی جاتے جب آم نشوونما کے تمام مرحلے طے کر کے رس پر آ جاتے اور مہینوں کی کلفتوں کے بسبب محفوظ علیصاحب کو زندگی میں مزہ آنے لگتا۔

مجھے اکثر ان خوش نصیب بستیوں کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے جنہیں قصبے کی آبادی سے چن چن کر محفوظ علیصاحب اپنی مجلسوں میں بلاتے تھے، میں اپنی عمر کے اکثر واقعات بھول گیا ہوں، لیکن ان مجلسوں کے تشویر نقش میرے دل پر ایسے گہرے ہیں کہ انہیں شاید موت بھی نہ مٹا سکے، دعوتیں عوامیام کو ہوا کرتی تھیں، صحن میں تخت پر آموں کی لگن دیکھ کر تمام احباب داہ داہ، جزاک العنہ سبحان اللہ کے نعرے بھرتے ہوئے خود کو نو دگن کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ان کی نگاہیں آموں پر اسی طرح جم جاتی تھیں جیسے پردانوں کی شمع پر، اور جب محفوظ علیصاحب یہ دیکھ لیتے کہ آموں کے نظارے نے اشتیاق کو اتہا تک پہنچا دیا ہے اور اہل ذوق کے دل مرغ اسیر کی طرح تناؤں سے

ترپنے لگے ہیں تو وہ مسکرا کر لگن کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر رونق افروز ہوتے، اور ان کے ہاتھ میں  
 پھری چکنے لگتی، لیکن وہ آموں کے ایسے قدر دان تھے کہ وہ اس اشتیاق کو جو محض نظارے سے  
 پیدا ہوتا ہے، کافی نہ سمجھتے، اپنے احباب کی بے تابی اور اشتہا کو دوبالا کرنے کے لئے وہ ایک ایک  
 کر کے آموں کو اٹھاتے ان کے نام بتاتے، اور ان کے رنگ اور خوشبو کی تعریف میں فصاحت و  
 بلاغت کے دریا بہاتے، جب ادا شناسی کا حق ادا ہو جاتا، تو وہ یہ سوال پیش کرتے کہ کس آم سے  
 بسم اللہ شروع کی جائے، اور اس شکل شکل پر گل احباب کی رے لی جاتی، اسی سلسلے میں ایک تنہا  
 دلچسپ بحث چھڑ جاتی، اور جیسے کسی زمانے میں شاگرد شعراء دوسروں پر فضیلت جتانے کے لئے اپنے  
 استادوں کی خوبیاں بیان کرتے تھے، ویسے ہی محفوظ علی صاحب کے احباب میں سے ہر ایک  
 کو شش کرتا کہ اپنے محبوب آم کی خصوصیات واضح کرے، اور اس کی تعریف اس انداز سے کرے کہ  
 اس سے بڑا کون تعریف کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے، اس بحث میں بلاغت کی جو شہدہ بانیاں دکھائی  
 جاتیں اور زباں دانی و حاضر جوابی کے جو جزے پیش نہ کھاتے انہیں ضبط تحریر میں لانا اس حقیقہ کے امکان  
 سے باہر ہے، لیکن اتنا ہر شخص محسوس کر سکتا تھا کہ اس بابائے اور مناظرے میں چٹ پٹا ہن محفوظ علی صاحب  
 کے فقرے پیدا کرتے تھے، اور پچ پچھتے تو وہ زبان جو یہاں بولی جاتی تھی اس کی نسبت اور  
 اصطلاحات ساری محفوظ علی صاحب ہی نے وضع کی تھیں، وہ اپنے دوستوں کی دلیلیں بڑو شوق  
 سے سنتے تھے، بڑی نکتہ بینی سے ان کو جانچتے، داد دیتے، اور انصاف کرتے، لیکن دراصل وہ  
 اپنے جو ہر اس وقت دکھاتے تھے جب تک احباب کی زبان ہو کہ کہتے کہ ایسے نازک معاملے میں بہادری  
 سے تصفیہ نہیں ہو سکتا، اور ہر شخص فرمائش کرتا کہ اس کا پسندیدہ آم کھلا کہ محفوظ علی صاحب اس کی  
 رائے کو صحیح ثابت کر دیں، اب وہ نہایت پیار سے ایک آم اٹھاتے، اسے ہاتھ میں اچھالتے، اسے  
 سونگھ کر اس کی خوشبو سے مست ہو جاتے، بھوم کر واہ واہ کی صدا بلند کرتے، اور اپنی نیم باز آنکھوں  
 سے احباب پر ایک شفقت آمیز نظر ڈال کر انتہائی نفاست اور صفائی سے ایک تملہ کاٹتے اور اس  
 خاص آم کے سب سے زیادہ چرب زبان شیرازی کو کھلاتے، اسے استادوں کے مشاعرے کی پہلی غزل

سیچے، یا مجلس رقص و سرود میں کسی پری پیکر رقاصہ کے نازک پھول جیسے پاؤں کی پہلی جنبش اس کے گھونگر وکی پہلی جھونکار، محفوظ علیصاحب کا قسے تقسیم کرنا گو یا ساغر کو دور میں لانا تھا، محل پرستی چھا جاتی تھی، ہر ایک جھوٹے لگتا تھا، اور اس کی زبان سیرت انگیز سہولت سے اس کے جذبات پنہاں کی ترجمانی کرنے لگتی تھی، محفوظ علیصاحب کبھی اپنی تقسیم سے شراب کا نشہ بڑھاتے، اور ساتھ ہی اپنے فخر و کبر کے طور پر پیش کرتے کبھی جوش جذبات سے ان کی آنکھیں کجی کی طرح اس نضا پر چمک جاتیں، اسے منور کر دیتیں، اور رندوں کی نگاہوں میں چکا چوندھ ڈال دیتیں جب آخر کار آم سب ختم ہو جاتے، اور لکھن کے پانی میں ہمارا عکس ہیں منہ چڑھانے لگتا، تو محفوظ علیصاحب ایک سرد آہ بھرتے، اور کسی بر محل شعر سے اہل مجلس کو دنیا کی عیاری، اور عمر کی بے ثباتی، اور موسم گل کی ناپائنداری سے آگاہ کر کے ان کے سر سے نشہ اتار دیتے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیں محفوظ علیصاحب کے وعدے زندہ رکھتے تھے اور نہ خدا جانے ہم پر کیا گذر جاتی خود محفوظ علیصاحب کی کیفیت سب سے زیادہ دردناک ہوتی تھی، ان کے گال لٹکتے آنکھوں کی روشنی بجھ جاتی، کمر جھک جاتی، بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کا گلا گھٹ رہا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر ہم یاد رکھیں کہ انہوں نے آموں پر کیسی کیسی نعمتیں قربان کی تھیں اور آموں کے کھانے اور کھلانے کے فن میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے کس عیثیٰ اور استقلال سے اپنے تمام ذہنی قوتوں اس مبارک کام کے لئے وقف کر دئے تھے، تاکہ وہ سحر غزل، اور شہرت کے امیدوار سبق لے سکیں، اور کوئی ایسی غلط فہمی نہ پیدا ہو جو ان کی عظمت میں فرق ڈال سکے، میں اختصار کیساتھ ان کی زندگی کے حالات لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

محفوظ علیصاحب کے والد صاحب فن کے لوازمات کیسے پورے کر سکتے تھے اگر وہ اولاً کی تربیت میں اپنا وقت صرف کرتے، ان کے توکل کا یہ نتیجہ ہوا کہ محفوظ علیصاحب کو ان کی ایک دور کی رشتہ دار نے جو خاصی خوشحال تھیں تنہا کر لیا، محفوظ علیصاحب کی ذہانت نے استادوں کا کام بہت آسان کر دیا، اور انھوں نے ان کو کمال کے تمام امتحانات بہت

کا سیابی سے پاس کر لئے، کلچ میں انھوں نے اپنا سکہ ایسا جگایا کہ فارغ التحصیل ہوتے ہی انہیں ایک اچھی نوکری مل گئی جس میں ترقی کی بہت گنجائش تھی، اور جلد سے پرہیزگار ہوتے ہی ان کی شادی بھی ہو گئی، ان کی بیوی حسن اور سلیقہ میں یکتا تھیں، انہیں اپنے شوہر سے وہ گہری اور سچی محبت بھی ہو گئی تھی، جو صرف اہل دل کا حصہ ہے، لیکن دنیا داری کے گر کچھ اور ہی ہوتے ہیں، اہل فن کے کمالات کچھ اور محفوظ علیہا جب بہت جلد معلوم کر لیا کہ وہ دنیا داری کیلئے سوزوں نہیں ہیں اور اگر انہوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت کے بوسے پر کامیابی حاصل بھی کر لی تو اس ردِ معافی قسلی سے غروم رہیں گے جو انسانی مسرت کا جوہر ہے پچیس سال کی عمر میں ان کے منہ پر انہیں وہ راستہ بھی سمجھا دیا جس کے سوا منزل مقصود تک پہنچنے کا ان کے لئے کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

آسوں کا تو انہیں پیدا ہی شوق تھا، اور انھوں نے دور دور سے قمیص منگوا کر ایک اچھا خاصا باغ لگالیا تھا، گو بہت محنت تھا کہ وہ دنیا داری کی لغویات میں مبتلا ہو کر اپنے اصل کمالات سے بے خبر رہتے، اگر خدا کی طرف سے اشارہ نہ ہوتا، اس کی صورت یہ ہوتی کہ مایوں کی بے پروائی سے کئی درختوں میں دیک لگ گئی، باغ کو آئینہ بد نظمی کے نتائج سے بچانا اس قدر ضروری تھا، اور محفوظ علیہا صاحب نے دفتر سے کچھ دنوں کی رخصت چاہی کہ گاؤں جا کر باغ کی نگرانی کے لئے مناسب انتظام کر سکیں، لیکن ان کے افسر نے جو ان سے بہت جتنا چٹھی نہیں دی، اور محفوظ علیہا صاحب کو یقین ہو گیا کہ اگر انسان کو اپنی عزت آبرو و عزیز ہے تو وہ نوکری نہیں کر سکتا، چنانچہ انھوں نے استعفا دیدیا، اور اس کے بعد جب کبھی ملازمت ترک کرنے کا ذکر آتا تو تو وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ اہل ذوق کے لئے نوکری کرنا بڑی غلطی ہے، اور انھوں نے یہی محسوس کر کے اپنا واسن چھڑا لیا۔

ملازمت سے استعفا دینا معمولی کام نہ تھا، محفوظ علیہا صاحب کی وہ رشتہ دار جنہوں نے انکو پالاکھا یہ خبر سنا کہ انہوں نے استعفا دیدیا ہے اور اب کہیں کسب معاش کی غرض سے نوکری چاکری کر لیا ارادہ بھی نہیں ہے، اس قدر خفا ہوئیں کہ انہیں اپنے گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی محض غلطی

صاحب کی بیوی جو کبھی بھوٹے سے کسی خادمہ کو بھی نہیں گھر کتنی تھیں، اچانک بد مزاج ہو گئیں ہرگز محفوظ علیصاحب سے لڑنے جھگڑنے لگیں، اور کبھی تو گالیوں پر بھی ازاتیں محفوظ علیصاحب کے تمام دوست جو انھیں دنیا داری کے راستے پر چلانا چاہتے تھے ان کو جاوید بھیجیں کرنے لگے اور انکو ایسا بیزار کر دیا کہ وہ تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے، بسبب زیادہ محفوظ علیصاحب پر یہ شاق گذرا کہ وہ لوگ جو ایک زمانے میں ان کا ادب کرتے تھے، ان پر ہنسے اور انکو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے، لیکن محفوظ علیصاحب کی ہمت ایسی تھی کہ وہ یہ ساری جگہ ہنسائی برداشت کر لے گئے اور اپنے فن میں ایسے محو ہوئے کہ ان کو دنیا اور افیہا کی مطلق خبر نہ رہی۔

ناظرین کا شک و در کرنے کے لئے مجھے پھر کہنا پڑتا ہے کہ ایک شغل کو جو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے اور جس کے لوازمات محض گرہ میں دام اور مدے میں گنجائش رکھنا فرض کیا گیا ہے محفوظ علی صاحب کے کمال نے ایک بالکل نئی حیثیت دیدی تھی، اور اس کا درجہ مصوری، شاعری، انشا پردازی اور خطابت سے کچھ کم نہیں، بلکہ فرداً فرداً مقابلہ کیا جائے تو ان سب سے بلند ہی ثابت کر دیا تھا، شاعر صرف شعر کہتا ہے، مصور صرف تصویریں بنا آتا ہے، لیکن محفوظ علیصاحب نے اپنے فن کو ان تمام فنون لطیفہ کا مجسمہ بنایا تھا، ایک اور خوبی ان کے فن میں یہ تھی کہ آرزوئیں اور خواہشیں پیدا کرنے کے ساتھ وہ انھیں پوری بھی کرنا جانتا تھا، محض تماشا نہیں بلکہ اعث تسکین دہی بھی تھا۔

عزیز اقارب کی خوشنودی اور دنیا دار دوستوں کے حسن ظن سے ہاتھ دھونا محفوظ علیصاحب کی ایشیا پرند طبیعت کے لئے کافی نہ تھا، انھوں نے اپنی ذات کے تمام جوہر بھی اپنے فن کے مستند کر دئے۔ کالج میں انھوں نے عربی فارسی کی بہت اچھی تعلیم پائی تھی، طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے شریعی کہے تھے، چند رسالوں کے مدیر جوان کی غزلیں ارتقیدی مضامین شائع کر کے محو نہایت خلوص سے ان کی نسبت طرح طرح کی ہمت افزا پیش گوئیاں کرتے تھے، اور انہیں امید تھی کہ آسمان ادب پر مغرب ایک نیا ستارہ چمکنے والا ہے جس کے سامنے اوروں کی روشنی بالکل ماند پڑ جائے گی، محفوظ علیصاحب نے ملازمت اختیار کرنے کے بعد بھی اپنی ادبی دیکھبیاں

لے گئی، مرحوم کے آخری سال بہت ٹنگی میں گزرے تھے، یہاں تک کہ انہیں اپنا باغ جو انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، بکڑے بکڑے کر کے بیچ دینا پڑا تھا۔ قصبہ کے لوگوں میں سے بہت ایسے تھے جنہیں مرحوم کا نام تک یاد تھا، مگر خدا خدا کر کے کسی نے مجھے ان کی قبر کا مقام بتا دیا، اور میں بیتابی سے بھاگتا ہوا وہاں پہنچا، قبر کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شخص جس کا وطن کے سب لوگ نام تک بھول گئے تھے، اس قدر بلند رتبہ کا ولی تھا اور شیت ایزدی نے اس کی آرزوں کا کتنا پاس کیا تھا، ان کی قبر سے میں سمجھتا ہوں خاص اس مقام سے جہاں مرحوم کا دل ہو گا، ایک آم کا درخت نکلا تھا اور جس انداز سے وہ ہوا میں جھوم رہا تھا مجھے یقین ہے کہ اس نے بہت جلد ایک شاندار درخت کی صورت اختیار کر لی ہوگی۔ کاش وہ لوگ جو شکے شاہ اور دیوانے شاہ کی فرضی قبروں پر مجرم کرتے ہیں، محفوظ علیہا کی قبر کو اپنا مہج بناتے، ان کا آخری مجرہ دیکھ کر اپنا ایسا پختہ کرتے، اور بارگاہِ حقانی میں اپنی دعائیں ایسے کامل بزرگ کے ذریعہ سے پہنچاتے جن پر نظر اتفاقات ہونے کا خدا تعالیٰ نے ایسا روشن ثبوت دیا تھا۔“



## شذرات

خلد آشیانِ حکیم صاحبہ بھوپال کا غم ہمارے دلوں میں ابھی تازہ ہی تھا کہ ایک دوسری اسلامی ریاست کے آجدار، نواب حاج علیخان صاحب، سابق والی رام پور کے انتقال کی پرانم خبر موصول ہوئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ایک ذی علم فرمانروا تھے، خاصکر علومِ دینیہ میں نہایت ہی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ ہم مرحوم کے پس ماندگان و باشندگانِ ریاست رام پور سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں اور بارگاہِ ایزدی میں دستِ بدعا ہیں کہ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگڑے آمین۔  
تم آمین۔

اس ہینہ کا سب سے اہم واقعہ غالباً سائنس کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت ہے جس کا انتظار سیاسی حلقوں میں بے چینی سے کیا جا رہا تھا۔ اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے انگلستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے قابل ترین اشخاص ہیں۔ انہوں نے واقعات سے پوری واقفیت حاصل کر کے کی کوشش بھی کی ہے، جس کا اظہار رپورٹ کی پہلی پراز معلومات جلد سے ہوتا ہے۔ لیکن قوموں میں حاکم و محکوم کا رشتہ اس قدر غیر فطری ہو کہ شاید اس تعلق کے بعد ایک قوم دوسری قوم کی ذہنیت کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہو جاتی ہے۔ سائنس کمیشن کی سفارشات کی توفیق میں برطانوی انجمن تقریباً سب کے سب متفق لفظ ہیں، برخلاف اس کے ہندوستانیوں کو ان میں اپنے قومی جذبات کی اہانت اور استحکامِ حکومتِ برطانیہ کے لئے نئی تدابیر نظر آتی ہیں۔ ان سفارشات سے خصوصاً لوگ سخت مایوس ہوئے ہونگے جنہوں نے کمیشن کی فیاضی سے بڑی بڑی توقعات والیہ کر رکھی تھیں۔ ان سے اگر وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو بس اس طرح کہ آئندہ سے اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنے کا سبق لیں، اور آزادی بطور بخشش حاصل کرنے کا خیال خام چھوڑ دیں۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ کیشن نے حقیقی آزادی کے تمام مطالبات کو ناقابل عمل قرار دے دیا ہے، اس کی سفارشات سے ہمیں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ایک اندیشہ ایسا جو اس کے سبب سے ہمیں سفارشات کے بعض حصص کو نظر اعتنا دیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس موقع سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا کہ انتہا پسند تعاون کریں یا نہ کریں حکومت اپنے مجوزہ پروگرام پر عمل کر کے رہے گی۔ اور جب تک انتہا پسندانہ مضبوط نہ ہو جائیں کہ اپنے بنائے ہوئے دستور اساسی کو حکومت سے متوالیں ملک میں وہی دستور اساسی نافذ ہو گا جسے اوڈنٹیل کانفرنس کے انعقاد کے بعد برٹش پارلیمنٹ منظور کر لے۔ اور عرصہ تک ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی پر اثر ڈالتا رہیگا۔ سائن کیشن کی سفارشات اگر اس دستور اساسی کی بنیاد نہ بھی قرار دی جائیں تو بھی اسکی تشکیل میں ایسا خاص اثر ہوگا۔ پس اس خیال سے نہیں کہ وہ ہمیں کیا دیتی ہیں، بلکہ اس خیال سے کہ وہ ہمیں کس طرف لے جانا چاہتی ہیں کیشن کی چند اہم سفارشات پر غور کرنا ضروری ہے۔

پہلے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان سفارشات پر عمل درآمد ہونے سے ہماری قومی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس واقعہ سے قطع نظر کیجئے کہ ڈونین ٹینٹس (درجہ ثوابیات) کا ذکر تک پورٹ میں کہیں نہیں آیا ہے، اس حقیقت کی بھی ختم پوشی اختیار کیجئے کہ اختیارات حکومت صوبوں میں ذرا تو درکنار گورنر اور دیگر اے ٹک کو نہیں حاصل ہیں اور آخری فیصلہ تمام برٹش پارلیمنٹ کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے۔ اور ذرا کیشن کے بنائے ہوئے دستور اساسی پر نظر ڈالئے کہ اس میں کوشش کیسا کی گئی ہے۔ بے بڑی کوشش اس میں بقا بلہ مرکز، صوبوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیکر "دفاقی" طرز حکومت کے دھوکہ میں ہندوستان کی مرکزیت کو توڑ دینے کے لئے کی گئی ہے۔

مرکزی مجلس قانون ساز بے خیر سے "فیڈرل اسمبلی" کا محبوب کن نام دیا گیا ہے، مجوزہ

The Federal Assembly

دستور کے اندر ایک ایسی کمزور اور بے اثر جماعت ہو جائیگی کہ اس سے قومیت کی تعمیر میں بہت ہی کم مدد ملے گی۔ اسکی حیثیت ترکیبی اور اس کے اختیارات کی نوعیت دونوں اسی پر دال ہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع اور مختلف مقامی مفاد رکھنے والے ملک میں اگر ایک طرف صوبوں کو بڑی حد تک خود مختاری دینا مصلحت ہے تاکہ وہ اپنے مقامی مسائل کو خود حل کر لیا کریں، تو دوسری طرف مرکزی اسمبلی کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ صحیح معنوں میں پوری قوم کی نمائندہ ہو، اور اس کی امداد پر بھر و سر کر سکے تاکہ ہمارے قومی مفاد کی تجویزی حفاظت ہو لیکن کمیشن کی مجوزہ فیڈرل اسمبلی کے لئے اراکین کا انتخاب بالواسطہ ہو گا، وہ بھی صوبوں کی مجالس قانون ساز کے ذریعہ۔ اس حالت میں یہ اسمبلی صوبوں کی "خلف" ہوگی، اور انہیں کی غلام۔ وہ بحیثیت مجموعی قوم کی نمائندہ نہیں رہے گی۔ اور اگر ایسے مواقع پیش آئے کہ صوبوں کے مقامی اور ساری قوم کے مفاد میں تصادم ہو (اس قسم کے مواقع فیڈرل حکومتوں کی سیاسی زندگی میں کبھی کبھی پیش آ جاتا کرتے ہیں)، تو ممکن ہے کہ فیڈرل اسمبلی کو قوم کے مفاد پر صوبوں کے مفاد کو ترجیح دینا پڑے۔

اس بات کو ذہن میں رکھنے، اور ذرا آئیو اے واقعات پر چشم تصور سے نگاہ ڈالنے ممکن ہے کہ گولن نر کا نفرنس میں۔ ہندوستان اور برطانوی حکومت کے مابین کوئی سمجھوتہ ہو جائے جس کی رو سے صوبوں کو علیحدہ علیحدہ صحیح معنوں میں خود اختیاری مل جائے۔ اس کا فوری نتیجہ غالباً ہو گا کہ بمقابلہ مرکز صوبوں کو زیادہ یا اختیار دیکھ کر تمام سربراہان اور وہ لوگ جو مرکزی اسمبلی اور اس سے باہر کانگریس میں متفق ہو کر حکومت کی ماہیت بدلنے کی کوشش میں مصروف ہیں اپنے صوبوں کی مجالس متفننہ میں جا کر مقامی سیاسیات بھٹیروں میں گرفتار ہو جائیں گے، اور قومی آزادی کی تحریک قوتوں کے منقسم ہونا کمزور پڑ جائیگی۔ پھر کچھ دنوں بعد ایک دوسری صورت حال کے وقوع پذیر ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ مختلف المفاد صوبوں کے اغراض انگریزی حکومت کچھ اس طرح اپنی ذات سے وابستہ کر لے گی کہ صوبوں کے لئے انگریزی اقتدار کے خلاف متحد ہو کر سر اٹھانا اسی طرح مشکل ہو جائیگا جس طرح اس وقت دی

ریاستوں کے لئے مشکل ہے۔ چونکہ فیڈرل اسمبلی صوبوں کی مقامی مجلسوں کی نمائندہ ہوگی کیٹن نے بھگت  
وزن بڑھانے کے لئے یہاں تک گنجائش رکھ دی ہے کہ صوبوں کی مجالس مقننہ کے اراکین ساتھ ہی ساتھ  
فیڈرل اسمبلی کے بھی ممبر ہو سکیں گے۔ فیڈرل اسمبلی کے نمائندوں میں اسی قدر اختلاف رہیگا جس  
قدر صوبوں کے مقامی مفاد میں۔ پس اسکا بھی کسی متحدہ قومی پالیسی پر عمل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

کمیشن فیڈرل اسمبلی کے اس طرز نمائندگی کے لئے جو دلیل پیش کرتا ہے وہ یہ کہ فیصلہ رائے  
دینے والوں کی کثرت تعداد و حلقہ انتخاب کے وسیع ہونے کی وجہ سے نمائندہ اپنے رائے دہندگان کو ذہنی  
تعلقات نہیں رکھ سکتے، اور رائے دہندگان کا اپنا نمائندوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے  
کہ اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب براہ راست نہ ہو بلکہ ایسا ایسی درمیانی جماعت کے ذریعہ عمل میں آئے جو تعداد  
میں کم اور تعلیمیافتہ ہونے کے باعث ممبروں پر کافی اثر و اقتدار رکھ سکے۔ اول تو ایک ایسی اسمبلی میں جس  
کے پاس کچھ بھی اختیارات نہ ہوں، اسکی ضرورت ہی کہاں پیش آ سکتی ہے کہ کسی معاملہ میں نمائندہ  
اپنا اپنا رائے دہندگان سے استصواب رائے کریں (ضرورت تو مجب ہوتی جب انکی رائے سے کچھ ہو  
بھی سکتا، دوسرے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ استصواب رائے کی ضرورت پیش آ سکتی ہو، اور نمائندہ  
اکثر اوقات اپنے دور دور رہنے والے کثیر القہہ اور دہندگان کے پاس نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے انکی ہدایت  
کے موافق کام نہیں کر سکتے تو بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ بالواسطہ انتخاب سے یہ بعد کم کیسے ہو جائے گا۔  
اس کو رائے دینے والوں اور نمائندوں کے درمیان ایک اور ذریعہ حاصل ہو جائیگی۔ بالواسطہ انتخاب ہونے کی حالت میں اکثر ایک  
بڑے دہنگان کا چنداں لحاظ نہ کریں گے بلکہ اس درمیانی جماعت کی پالیسی پبلیش گے جو انہیں منتخب کرے گی  
خواہ وہ صوبوں کی مجالس قانون ساز ہوں یا کوئی دوسری جماعت۔ اور خواہ ان سے نمائندوں کو  
قابو میں رکھنے کا کام لیا جاسکے، یہ قوم کے مفاد کی نمائندگی کی اہل خود قوم سے بڑھ کر نہیں ہو سکتیں۔

ہماری دلیل پر یہ اعتراض مایہ ہو سکتا ہے کہ اسے اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا کہ

فیڈرل اسمبلی کے اراکین کیونکر اپنے ووٹوں سے قریب تر اور استصواب رائے پر مجبور کئے جاسکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دور جدید کے وسائل آمد و رفت و خبر رسانی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے اور ووٹروں کی اچھی طرح سیاسی تعلیم ہو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ فاصلہ کی دقت دور کرنے کے لئے قومی مفاد کو قربان کر دیاتے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے فیڈرل اسمبلی کے لئے بلا واسطہ انتخاب گے مقابلہ میں بالواسطہ انتخاب کو بھی ترجیح دینا ضروری سمجھا جائے تو اس انتخاب کا کام صوبوں کی مجالس مقننہ سے لینا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا اس کے لئے کسی دوسری جماعت کے انتخاب کی (خواہ اسی طرح جس طرح صوبوں کی مجالس مقننہ کا انتخاب ہو) تجویز ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ صوبوں کی مجالس مقننہ کے سپر مخصوص مقامی مفاد ہوتے ہیں۔ ایک ہی جماعت دو مفاد کی امید نہیں رہ سکتی۔ بالخصوص اس حالت میں کہ وہ دونوں مفاد کبھی کبھی متضاد م بھی ہوتے ہیں۔ اور انتظام بھی نقطہ عارضی طور سے ہوتا اور جس وقت جمہور کو اچھی طرح سیاسی تجربہ ہو چکا، درمیانی جماعت کو ہٹا کر براہ راست انتخاب کے اصول پر عمل ہونے لگتا۔

فیڈرل اسمبلی کے اختیارات پر نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ اس اعتبار سے بھی وہ کمزور ہے۔ نو کمیشن اس کا مقروض سازشی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک جس وقت صوبوں کے انڈسٹریل، سیاسی تجربات "ہوتے رہیں، مرکزی حکومت کو مضبوط (یعنی انگریزوں) کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے لیکن یہاں اعتراض یہ نہیں کہ اسمبلی کو مرکزی معاملات میں مزید اختیار کیوں نہیں دیا گیا اور دیگر کے تمام اختیارات حاکمانہ بدستور کیوں رکھے گئے۔ خود صوبوں کی مجالس مقننہ بھی گورنروں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں۔ اعتراض یہ ہے کہ فیڈرل اسمبلی اور صوبوں کی مجالس مقننہ میں جو باہمی تعلقات ہونگے ان میں مقامی مفاد کو کافی سے زیادہ وزن دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں یہ تمام ترکیبیں صوبوں کو اہمیت دینے اور مرکزیت کو کمزور کرنے کے

لئے معلوم ہوتی ہیں۔ تاکہ ملک جس طرح ایک طرف ہندوستان، مسلم ہندوستان وغیرہ میں تقسیم ہو اور دوسری طرف ویسی ہندوستان اور برطانوی ہندوستان میں، اسی طرح اس کے اندر رہنے والے صوبہ دارانہ اختلافات بھی پیدا ہو جائیں۔

اب ذرا اسپر نطر ڈالنے کو صوبے جنہیں فیڈرل اسبلی کے مقابلہ میں اس قدر اہمیت دی گئی ہے خود ان کے اختیارات کیا ہیں، اور ان سے کیا کام لیا جانے والا ہے۔ صوبوں پر اتنی عنایت تو ضرور کی گئی ہے، کہ تمام شعبوں کو وزرا کے خستیار میں دیدیا گیا ہے۔ البتہ ان کو ”مختار“ اسی طرح دکھایا گیا ہے جس طرح ہندوستان کے دستور اساسی کو ”فیڈرل“ (وفاقی) بنایا گیا ہے۔ کیونکہ وزرا پر گورنر کا تسلط، گورنر پر ڈیپٹی کے تسلط اور ڈیپٹی پر برطانوی پارلیمنٹ کا تسلط ہندوستان کے لئے وفاقی طرز حکومت اور صوبہ جاتی خود مختاری کے منافی سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن صوبوں کو ہر طرح سے گورنر کے اختیاریں دیدیئے گئے بعد میں نے ذرا کی آزادی میں بول چال کر دیا ہے کہ مجالس قانون ساز کا دباؤ ان پر کم کر دینے کی سفارش کی ہو، وزرا کی تنخواہوں پر جو اختیار مجالس قانون ساز کو حاصل تھا اسے معید کرنے اور وزرا کے لئے ”مشترک ذمہ داری“ کے اصول کی سفارش انہیں اغراض کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔

ان باتوں سے مقصود سارا یہ ہے کہ گورنر کچھ ایسے بند گان ہوا ہو جس کو جو اپنی خوش قسمتی مگر قوم کی بد قسمتی سے تھوڑا بہت اثر رکھتے ہوں۔ ہندو مسلمانوں کو لڑا سکیں، تو می تحریکوں کو دبا سکیں، یا خود قومی عقائد سے تاب ہو کر گورنمنٹ سے لمبائیں ان عہدوں کے لئے نامزد کر کے (وزرا گورنر کے امزد کردہ ہونگے) ان سے حکومت برطانیہ کے سخت کم کرنے میں مدد لیتا ہو

اور یہ لوگ اس خدمت کے عومش میں عہدہ ہائے وزارت پر شمعن پہلے سے بھی زیادہ مصون و مامون بن کی جگہ پانچ سال تک پبلک کے روپیہ سے گرانقدر خواہیں لیتے رہیں۔

اگر رائڈ ٹیبل کانفرنس میں صوبوں کی حقیقی خود مختاری کی بابت کوئی سمجھوتہ نہ ہوا، اور کمیشن کی موجودہ سفارشات پر ہی عمل کیا گیا تو کبھی کمیشن نے ایسے انتظامات کر دئے ہیں جن سے ”اصلاحات“ جدید کے نفاذ کے بعد ہی ملک کی توجہ اختلافی مسائل کی طرف منحطف ہو جائے اور قومی تحریک کو نقصان پہنچے۔ صوبوں کو از سر نو تقسیم کرنے کا مشورہ، مجالس مقننہ میں کچھ عرصہ بعد انتخاب اور رائے دہندگی کے مسائل چھیڑنے کی تجویز، اور رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کی سفارش یہ تمام باتیں فرقہ وارانہ نزاعات کے واسطے حد درجہ اشتعال انگیز ثابت ہوں گی۔

رہے فرقہ وارانہ مسائل سو انکی بابت کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ درابھی ہماری دشواریوں کو ہلکا نہیں کرتیں۔ ان مسائل کے حل کی جو مختلف صورتیں خود ہندوستانیوں کے ذہن سے اب تک نکلی ہیں انہیں میں سے کچھ ادھر سے اور کچھ ادھر سے لیکر ایک مجموعہ تجاویز تیار کر دیا گیا ہے جسے شاید کوئی جماعت پسند نہیں کرے گی۔ اس معاملے میں کمیشن کی انکامی بلا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات میں گورنمنٹ ہی کو حکم قرار دیا گیا ہے۔ گویا کمیشن نے تسلیم کر لیا کہ وہ کوئی ایسا آئین پیش کرنے سے قاصر ہے جو تمام فرقوں کے حقوق کی از خود حفاظت کر سکے اور حکومت کی غیر آئینی مداخلت کی ضرورت نہ پڑے غنیمت تھا اگر قصبہ یہیں تک ہوتا۔ لیکن یہیں تو ادیشہ ہے کہ اس موقع پر بھی تجاویز حکومت ہی کے اغراض کو مد نظر رکھ کر پیش کی گئی ہیں۔ کیونکہ ان پر عملدرآمد ہونے سے ہر جگہ کی قلیتیں اپنے

حقوق کی حفاظت میں دائمی طور سے حکومت کی محتاج رہیں گی۔ اور وہ انہیں اپنے استحکام کے لئے ہر طرح استعمال کرتی رہے گی۔

---

مسٹر بارن کے انتقال سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو جو نقصان ہوا اس کا اندازہ مشکل ہے۔ آپ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور یونیورسٹی کے جدید دور اصلاح میں بہت مفید ثابت ہوئے تھے۔ اگرچہ عمر نے وفات کی، لیکن جو تھوڑا سا زمانہ کام کے لئے ملا اس میں بھی آپ نے اپنی سب خدمات سے ازمنہ اور بک کی یاد تازہ کر دی۔ ہمیں اس نقصان پر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ بہت ہمدردی ہے

(ع۔ ق)

---







